تابان

طاہر جاوید مغل

تابان

طاہر جاوید مُغل

تابان

اس کا نام تابان تھا۔ وہ بڑی لاپرواہی سے ایک ٹانگ پر وزن ڈالے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ ایک مضبوط رسی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ گلے میں طوق تھا۔ طوق کی زنجیر ایک ادھیڑ عمر شخص کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس جگہ کوئی اکیلا قیدی نہیں تھا۔ اس کی طرح بہت سے مرد و زن پابہ زنجیر تھے۔ یہ یونان کے عظیم الشان شہر ایتھنز میں غلاموں کی منڈی تھی تین روز پہلے اس منڈی میں بے پناہ رش تھا لیکن اب فقط پچاس ساٹھ غلام ہی بکنے باقی رہ گئے تھے۔ یہ بھی وہ افراد تھے جو بیمار یا کمزور تھے یا ان میں کوئی جسمانی عیب تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تابان میں بھی کوئی ایسی ہی خامی تھی۔ وہ دیکھنے میں ایک بہترین غلام نظر آتا تھا۔ لمبا تڑنگا' ورزشی جسم' مضبوط پٹھے' چوڑے ہاتھ' آنکھیں روشن اور پیشانی کشادہ تھی۔ اس کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ صرف ایک لنگوٹ

پہنے ہوئے تھا اس کے مالک نے اسکے جسم پر زیتون کا تیل مل دیا تھا' جسکی وجہ سے اسکے جسم کا سونا کچھ اور بھی دمکنے لگا تھا۔ اگر تابان ابھی تک فروخت نہیں ہو سکا تھا تو اس کی وجہ کچھ اور تھی اور یہ وجہ جتنی ٹھوس تھی اتنی ہی دلچسپ بھی تھی۔

سورج اب سر پر آگیا تھا۔ فضا میں کچھ حبس سا پیدا ہونے لگا تھا۔ بردہ فروش اپنے اپنے غلاموں کے ساتھ سایہ دار جگہوں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ کچھ بیٹھ کر سستانے لگے تھے یا گپ شپ میں مصروف ہو گئے تھے۔ لمبے چغوں والے کچھ خریدار بے مقصد ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ دفعتاً منڈی کے داخلی دروازے پر ایک اہم خریدار کی صورت نظر آئی اور سارے بردہ فروش چاروں خانے چوکس ہو گئے۔ ایک چمکتا دمکتا رتھ منڈی میں داخل ہوا۔ رتھ کے آگے اور پیچھے تین تین ہم رنگ گھوڑوں کی چار قطاریں تھیں۔ رتھ کے گھوڑے کی طرح یہ گھوڑے بھی خوب سجے سنورے تھے۔ گھوڑوں کے سوار مسلح اور تنومند تھے۔ رتھ میں قریباً پچاس برس عمر کا ایک نیم گنجا شخص نظر آ رہا تھا۔ اس نے سرخ ریشم کا نہایت قیمتی چغہ پہن رکھا تھا پیشانی پر ایک زرنگار پٹی تھی جس پر سامنے کی طرف

ایک بڑا سبز ہیرا جھول رہا تھا۔ اس شخص کا نام غارس زنوب تھا۔ یہ شاہ ایتھنز کا بڑا بھائی تھا۔ جاننے والے جانتے تھے کہ یہ شخص کتنا بارسوخ ہے۔

غارس رتھ سے اتر کر غلاموں کی طرف بڑھا اور اس کے آگے پیچھے چاق و چوبند سپاہی نیزے اٹھا کر چلنے لگے۔ غارس کو غالباً کچھ معمولی درجے کے غلاموں کی ضرورت تھی ورنہ وہ میلے کے تیسرے روز منڈی نہ آتا۔ غلاموں کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے تابان کو دیکھا اور چونک اٹھا۔ رخ پھیر کر وہ تابان کے سامنے پہنچا۔ تابان کا مالک اتنے معزز خریدار کو دیکھ کر کانپنے لگا۔

غارس نے اپنی بھاری بھر کم آواز میں پوچھا۔ "کیا قیمت ہے اس کی؟ "

تابان کے مالک نے سر جھکا کر کہا۔ "ہم سب آپ کے غلام ہیں حضور۔۔۔۔۔۔۔ ہماری کیا قیمت ہو سکتی ہے؟

غارس کے چہرے سے ظاہر ہوا کہ وہ اس کے جواب سے خوش ہوا ہے۔ اس نے کہا

" ہمیں یہ غلام پسند آیا ہے اور پسند کی چیز ہم مول دے کر لیتے ہیں' ہمیں قیمت بتاؤ؟

دھیڑ عمر شخص نے کہا۔ "چوتھائی ٹیلنٹ حضور۔ "

غارس زنوب کے چہرے پر برہمی کی شکن نمودار ہوئی۔ وہ غصے سے بولا۔ "ہمیں حکم عدولی پسند نہیں' وہ قیمت بتاؤ جس پر تم یہ غلام بیچنا چاہتے تھے۔ "

ادھیڑ عمر شخص عاجزی سے بولا۔ "حضور! اسکی یہی قیمت ہے۔"

غارس اور اسکے سپاہیوں نے غور سے تابان کو دیکھا۔ انہیں اس میں کوئی ایسی خامی نظر نہیں آئی جو اسکی قیمت کو چوتھائی ٹیلنٹ تک پہنچا دیتی۔ صرف کندھوں اور پشت پر دو تین زخم تھے یا ایک پنڈلی پر نیزے کا پرانا گھاؤ' مگر ان معمولی نشانات کی وجہ سے غلام کی قیمت اتنی کم نہیں ہو سکتی تھی۔

غارس نے پوچھا۔ "کیا کمی ہے تمہارے غلام میں؟"

تابان کے مالک نے سر جھکا کر کہا۔ "حضور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔۔۔ بھاگ جاتا ہے "

" بہت خوب۔ "غارس نے اپنانے گنجا سر ہلایا۔ "ہمیں خوشی ہے کہ تم نے اپنے مال کا عیب چھپانے سے گریز کیا ہے۔ "ایک دوسرے بردہ فروش نے آگے بڑھ کر کورنش بجایا اور ادب سے کہا۔

"حضور! اس نے تو عیب چھپانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن سچی بات ظاہر ہو کر رہی۔"

"کیا مطلب؟" غارس زنوب نے پوچھا۔

حضور! اس نے غلام کی قیمت پانچ ٹیلنٹ لگائی تھی لیکن اسکے ایک ناراض ساتھی نے منڈی میں سب کو بتا دیا کہ یہ غلام بھاگنے میں مشہور ہے۔ پہلے کا تو معلوم نہیں لیکن پچھلے چار سالوں میں یہ چار آقاؤں کو چکمہ دے کر بھاگا ہے۔ ان چار میں سے ایک کو اس نے قتل بھی کر دیا تھا۔ جب یہ بات منڈی میں پھیل گئی تو کوئی بھی اس کا خریدار نہیں نکلا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اس بوڑھے نے غلام کی قیمت نصف کر دی' پھر مزید کمی کر دی اور اب چوتھائی ٹیلنٹ پر آ گیا ہے۔"

غارس کی دلچسپی غلام میں بڑھ گئی۔ اس نے قریب سے غلام کا جائزہ لینا شروع کیا' وہ اسی طرح ایک ٹانگ پر پاؤں ڈالے کھڑا تھا۔ آنکھیں گہری اور خاموش تھیں۔ چہرے پر ایک ڈھیٹ سی مسکراہٹ جم کر رہ گئی تھی۔ جیسے بہ زبان خاموشی اعلان کر رہا ہو کہ 'ہاں میں بھاگ جاؤں گا تم اپنی زنجیریں جتنی بھی مضبوط اور دیواریں کتنی بھی اونچی کر لو میں انہیں توڑ جاؤں گا۔ اپنے آقاؤں کو دھوکا دینا میری سرشت میں شامل ہے۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ خدا نے مجھے آزاد پیدا کیا ہے۔

اب تین چار اور بردہ فروش وہاں اکٹھے ہو چکے تھے۔ ایک بردہ فروش جو کسی ساحلی علاقے کا باشندہ لگتا تھا' آگے بڑھ کر شاہی خریدار سے بولا۔

" حضور والا! میں جزیرہ سردانیہ کا رہنے والا ہوں۔ اس غلام کو اچھی طرح جانتا ہوں بے حد کام چور اور خطرناک ہے۔ اسے نہ خریدنا ہی جناب کے لیے بہتر ہو گا۔"

غارس نے آگے بڑھ کر تابان کے لمبے گھونگھریالے بال مٹھی میں جکڑے' ان بالوں میں لٹوں کو سنبھالنے والی چھوٹی سی آہنی چمٹی لگی تھی۔ یہ چمٹی عجیب وضع کی تھی اور بالوں میں نمایاں نظر آتی تھی۔ غارس نے بال کھینچ کر تابان کا چہرہ اوپر اٹھایا اور بولا۔

" ہم ایسے بھگوڑوں پر قابو پانا جانتے ہیں۔" پھر اس نے اپنے مصاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔ "سلجوق! اس کے مالک کو پانچ ٹیلنٹ دے دو۔ "

پانچ ٹیلنٹ کا سن کر ادھیڑ عمر شخص کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ جھک جھک کر شاہی خریدار کو آداب پیش کرنے لگا۔ غارس کے مصاحب نے قیمت چکا کر غلام کی زنجیر تھام لی۔ تابان اپنی جگہ اڑیل گھوڑے کی طرح کھڑا تھا۔ مصاحب نے زنجیر کو کئی جھٹکے دیئے' تب کہیں جا کر وہ اپنی جگہ سے ہلنے پر آمادہ ہوا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غارس زنوب کے پُر شکوہ محل کی وسیع و عریض نشست گاہ میں غارس سونے کی منقش کرسی پر گاؤ تکیے لگائے بیٹھا تھا۔ پہلو کی نشست پر اس کی بیوی براجمان تھی۔ غارس کے غلاموں کا نگران اعلیٰ میاں بیوی کے سامنے کھڑا تھا۔ قریب ہی وہ غلام بھی کھڑا تھا جسے غارس زنوب نے آج دوپہر بازار سے خریدا تھا۔ اس کے گلے سے طوق اتار لیا گیا تھا' مگر ہاتھوں کی بندشیں موجود تھیں۔ غارس کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا مزاج خوشگوار ہے اور وہ اس

وقت ہنسی مذاق پر آمادہ ہے۔ اس نے چاندی کے جام میں سے نشہ آور مشروب کے چند گھونٹ بھرے اور غلام کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

"کیا خیال ہے تمہارا' کیا تم ان دیواروں سے نکل بھاگو گے؟"

تابان نے اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کی۔ غارس نے گرج کر کہا۔

"ہماری بات کا جواب دو۔"

تابان کے چہرے پر ہٹ دھرمی اور خود سری کے آثار نظر آئے۔ اس نے اطمینان سے کہا۔ "ہاں جناب آپ کی بندشیں مجھے روک نہیں سکتیں، آپ نے مجھے خرید لیا ہے' اب دو ہی صورتیں ہیں یا آپ مجھے جان سے ماردیں گے یا میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ "

غارس نے پہلے نگران اعلیٰ اور پھر بیوی کی طرف دیکھا جیسے آنکھوں آنکھوں میں ان سے کہہ رہا ہو دیکھو میں کیسی چیز خرید کر لایا ہوں۔

غارس کی بیوی نورا نے کہا۔ "تم بیوقوف ہو' یہ کسی تاجر یا ملاح کا گھر نہیں، شاہ ایتھنز کے بھائی کا مکان ہے' یہاں سے بھاگنا آسان نہیں۔"

تابان نے اپنی مطمئن آواز میں کہا۔ "میں نے بھی کبھی کوئی آسان کام نہیں کیا۔" اتنا کہہ کر وہ ایک لمحے کو چپ رہا پھر سر جھکا کر بولا۔ "مجھے آپ سے کوئی دشمنی نہیں، میری دشمنی اپنی زنجیروں سے ہے' آپ نے مجھ پر پانچ ٹیلنٹ ضائع کر دیے مجھے اس بات کا افسوس ہے' بہتر ہے آپ یہ رقم کسی سے وصول کر لیں۔ مجھے اپنے پاس رکھیں گے تو آپکے نقصان میں اضافہ ہو جائے گا۔ "

" کیا مطلب؟" غارس نے پوچھا۔

" مطلب صاف سیدھا ہے آپ مجھے کھلائیں گے، پلائیں گے لیکن کام نہیں لے سکیں گے' کام لیں گے تو میں بھاگ جاؤں گا' اگر زنجیروں میں جکڑ کر رکھیں گے تو کام کیسے لیں گے، سچ پوچھیں جناب میرے جیسا غلام دردسری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ "

" بہت خوب۔" غارس مسکرایا۔ "خود ہی مصیبت ہو اور مصیبت کا حل بھی خود ہی بتاتے ہو۔۔۔۔۔۔ دلچسپ بھگوڑے ہو، لیکن تمہاری ہر ہوشیاری کا توڑ ہمارے پاس ہے، ہم تمہیں کھلائیں گے بھی پلائیں گے بھی زنجیروں میں جکڑ کر تمہیں ان لوگوں نے سنبھالا ہو گا جو تمہاری عیاری سے ڈرتے ہوں گے' ان دیواروں میں تم آزادی سے گھوم پھر سکو گے اور

بھاگنے کا شوق بھی پورا کر سکو گے لیکن ایک بات یاد رکھنا'بھاگنے کی ہر ناکام کوشش کے بعد قرار واقعی سزا ملے گی'کم از کم سو ہنٹر اور دس دن کی فاقہ کشی'بولو منظور؟ "

تابان نے لاپرواہی سے کہا۔ "ایک آقا کو کسی بھی کام کے لیے غلام سے منظوری لینے کی ضرورت نہیں۔ "

"اس کا مطلب ہے تمہارا جواب ہاں میں ہے۔ "

تابان کے ہونٹ مسکراہٹ والے انداز میں کھنچ گئے'اس کی آنکھوں میں تیز چمک تھی۔

غارس نے غلاموں کے نگران اعلیٰ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اس کے ہاتھوں کی بندش کھول کر اسے بندی خانے میں لے جاؤ اور کسی کام پر لگا دو، اسے بھاگنا نہیں چاہیے۔ "آخری الفاظ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہے تھے۔

لحیم شحیم کرخت چہرہ نگران نے اکڑ کر تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھا اور تابان کو خونی نظروں سے دیکھتا ہوا دروازے کی طرف دھکیلنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے روز تابان کو دوسرے غلاموں کے ساتھ محل کے عقبی باغ میں کام پر لگا دیا گیا۔ یہ ایک وسیع باغ تھا، غارس اس میں ایران سے منگوائے ہوئے انواع واقسام کے پودے لگوا رہا تھا۔ زمین کی کھدائی ہو رہی تھی۔ بڑی مشقت کا کام تھا اوپر سے بحیرہ روم کی گرم اور بوجھل ہوا۔ کام کرنے والے صبح سے شام تک پسینے میں شرابور رہتے۔ ان مصیبت زدہ غلاموں میں تابان کے علاوہ دو ایرانی غلام بھی شامل تھے۔ ان ایرانیوں سے تابان کی جان پہچان ہو گئی۔ انہوں نے اپنے آقا فارس کے متعلق بہت کچھ بتایا۔ ان سب باتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ تابان اپنی عادت کے مطابق یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرے'کیونکہ اس کوشش میں ناکامی اور بے پناہ جسمانی اذیت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا اور بعید نہیں کہ اسے موت کا ہی سامنا کرنا پڑ جائے۔

تابان یہ سب خاموشی سے سنتا رہا وہ ان باتوں سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ مار پیٹ'جسمانی اذیت اور تذلیل اسکے لیے بے معنی لفظ بن چکے تھے۔ باقی رہی موت'تو وہ اس کی محبوبہ تھی۔ وہ جسم اور سائے کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ آنکھ مچولی کھیلتے تھے'اٹھکیلیاں کرتے تھے۔ تابان چھ برس کا تھا جب اسے ایران کے ایک ساحلی علاقے سے غلام بنا کر

یونان لایا گیا تھا۔ اس وقت سے اب تک وہ بھاگتا ہی رہا تھا۔ کبھی کسی آقا کی زنجیر توڑ کر' کبھی کسی آقا کی دیوار پھاند کر' کبھی کسی کو زخمی کر کے' کبھی کسی کی جان لے کر' وہ ایک دائمی مفرور تھا۔ یونان کے جنگل ویرانے اور ساحل اس کی سرکشی کے گواہ تھے۔ بھاگنا' پکڑے جانا' اذیتیں سہنا اور پھر بھاگ نکلنا' یہ تھا تابان کی زندگی کا دائرہ۔ اسے معلوم تھا کہ اسے یہاں سے بھاگ نکلنا ہے۔ اس شاہی محل کی اونچی دیواریں اس کی پرواز روکنے کے لیے ناکافی تھیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کی باتیں سنتا اور دل ہی دل میں ہنس دیتا۔

شام کو باغ میں مشقت ختم ہونے کے بعد انہیں کھانا کھلایا جاتا اور زنجیروں سے باندھ ایک احاطے میں ڈال دیا جاتا۔ اس احاطے کو بندی خانہ کہتے تھے۔ بندی خانے میں وہ کڑی نگرانی ختم ہو جاتی تھی جو باغ میں مشقت کے دوران کی جاتی تھی۔ صرف دو یا تین نگران رسمی طور پر احاطے کے دروازے پر پہرہ دیتے تھے۔ کبھی کبھی ان کا آقا بھی ٹہلتا ہوا اس طرف آ نکلتا اور غلاموں کا معائنہ کرتا۔ تابان کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں مضحکہ خیز چمک سی نمودار ہو جاتی۔ وہ خاص طور پر اس کا حال احوال پوچھتا۔

" اوہ فارسی بھگوڑے! تم ابھی تک ادھر ہی ہو' میں تو سمجھتا تھا نکل بھاگے ہو گے۔ "

غارس کے ساتھ آنے ولے محافظ بھی اسے مسکراتی نظروں سے دیکھتے' جیسے کہہ رہے ہوں بڑا دعویٰ تھا بھاگ جانے کا' اب بھاگتے کیوں نہیں' کہاں گئی تمہاری چالاکی، ہوشیاری' ان نگاہوں کو محسوس کر کے تابان کے جسم میں برق سی کوند جاتی۔ اس کا جی چاہتا وہ ان تمام تماش بینوں کو ابھی کچھ کر کے دکھا دے' لیکن پھر وہ اپنے جذبات پر قابو پا لیتا اور گم صم ہو کر بیٹھا رہتا۔ بے حس و حرکت جیسے کوئی مٹی کا ڈھیر ہو یا درخت کا کٹا ہوا تنا۔ پچھلے تیرہ برس کی بھاگ دوڑ میں اس نے کچھ اور چاہے نہ سیکھا ہو لیکن اپنے دلی جذبات کو چھپانا اسے ضرور آ گیا تھا۔

غارس کی ملکیت میں آئے ہوئے تابان کو بیس اکیس روز ہوئے تھے۔ جب اسے وہ موقع ملا جس کا وہ انتظار کر رہا تھا' وہ ایک طوفانی شب تھی۔ شام ہی سے بادل چھانے شروع ہو گئے تھے۔ رات پچھلے پہر تیز ہوا چلنے لگی۔ وہ ساری مشعلیں بجھ گئیں جنہوں نے احاطے کی بیرونی دیوار کو روشن کر رکھا تھا۔ تابان نے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے سر کے بالوں سے وہ عجیب وضع کی چمٹی نکال لی جس کا ایک سرا بل کھائے ہوئے آہنی تار کی طرح تھا۔ وہ اس چمٹی کی مدد سے اپنی بیڑی کا قفل کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ ایک مضبوط اور وزنی قفل

تھا۔ ذہن نہیں مانتا تھا کہ تابان اس چھوٹے سے تار کے ساتھ قفل کھولنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ تاہم اس کا انہماک غیر معمولی تھا۔ وہ کافی دیر اپنی کوشش میں مصروف رہا اور آخر یہ انہونی ہو گئی۔ مدھم کھٹکے سے قفل کھل گیا۔ قفل کھلنے کے باوجود زنجیر کا دوسرا سرا تابان کے پاؤں میں تھا۔ اس نے زنجیر کو سنبھال کر کندھے پر ڈال لیا اور بے آواز چلتا ہوا احاطے کی دیوار تک پہنچ گیا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بلا کی پھرتی تھی اور آنکھوں کی پتلیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ دیوار کی اونچائی کافی زیادہ تھی۔ اس اونچائی سے نبٹنے کے لیے تابان نے چند روز پہلے ہی انتظام کر لیا تھا۔ کسی بگھی کا ٹوٹا ہوا ایک طویل بانس احاطے میں درختوں کے نیچے پڑا تھا۔ یہ بانس تابان نے دیوار کی جڑ میں پتوں کے نیچے چھپا دیا تھا۔ اندھیرے میں ٹٹول کر اس نے بانس برآمد کیا۔ اس نے کھیل تماشوں میں ان گنت مرتبہ بازی گروں کو بانس کے ذریعے اونچی چھلانگیں لگاتے دیکھا تھا۔ اولمپیائی کھیلوں میں بھی اس قسم کے بہت سے مقابلے ہوتے تھے۔ تابان خود بھی اس طرح کی چھلانگ لگا سکتا تھا۔ اس نے کندھے پر رکھی ہوئی زنجیر کو گلے میں ڈال کر ایک گرہ دی۔ پھر دیوار سے اپنا فاصلہ مقرر کیا اور بھاگ کر بانس کے ذریعے چھلانگ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے وہ بندر کی طرح دیوار سے لٹکا ہوا تھا۔ اس نے کوشش کر کے بانس کو بھی گرنے سے بچا لیا تھا۔

تیز ہوا میں دو بالشت بھر دیوار پر چلنا خاصا دشوار تھا۔ تابان نے پانچ چھے گز کا فاصلہ بمشکل طے کیا اور محل کی چھت پر پہنچ گیا۔ جھک کر چلتا ہوا وہ چھت کے مشرقی سرے کی طرف بڑھا۔ اسے معلوم تھا' منڈیر سے لٹک کر بہ آسانی محل کی بغلی گلی میں چھلانگ لگا سکتا ہے۔ اس چھلانگ کے کامیاب ہونے کا مطلب تھا وہ غارس زنوب کی قید سے آزاد ہو گیا ہے۔ تاہم وہ ابھی منڈیر سے خاصا دور تھا کہ اسے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ گرد و غبار کے باوجود اس کی تیز نظروں نے منڈیر پر کچھ سایوں کو متحرک دیکھ لیا تھا۔ بجھی ہوئی مشعلوں کے قریب وہ چوکس نظر آ رہے تھے۔ تابان اوندھے منہ چھت پر گر گیا اور رینگتا ہوا سیڑھیوں کی طرف سرک گیا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اب وہ چھت سے گزرنے کا ارادہ ترک کر دے اور محل کی زیریں منزل پر پہنچ کر کسی کھڑکی سے نکلنے کی کوشش کرے۔ یہ حربہ وہ پہلے بھی کئی مکانوں پر آزما چکا تھا۔

سیڑھیاں اتر کر وہ محل کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں ایک طویل قطار میں کنیزوں اور خادماؤں کی کوٹھڑیاں تھیں۔ یہاں پہرے کا انتظام نہ ہونے کے برابر تھا۔ ان کوٹھڑیوں کی عقبی کھڑکیاں جس راہداری میں کھلتی تھیں وہاں سے چار دیواری زیادہ دور نہیں تھی۔ تابان

نے سوچا کہ وہ کسی خالی کوٹھڑی میں گھس کر باہر نکل جائے۔ دفعتاً ایک قریبی کوٹھڑی سے اسے ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔ کسی عورت نے سسکی لے کر بات کی تھی۔ تابان نے اس کوٹھڑی میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ایک کھڑکی کی درز سے وہ اندر کا منظر دیکھنے میں کامیاب رہا۔ تنگ سی کوٹھڑی تھی جس میں ایک عورت کی ضرورت کا معمولی سامان پڑا تھا۔ دو صندوق' ایک چارپائی' کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے چند زنانہ لباس' زیوس دیوتا کی ایک پرانی مورتی' ایک انگیٹھی اور چند برتن۔ ایک عورت جو شکل وصورت سے معمولی خادمہ لگتی تھی' چارپائی پر بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں تین چار ماہ کا بچہ تھا، اتنی ہی عمر کا ایک اور بچہ چارپائی پر پڑا تھا۔ غالباً دونوں بچے جڑواں تھے۔ ان تین نفوس کے علاوہ کمرے میں ایک اور فرد بھی تھا۔ یہ ایک دوشیزہ تھی لیکن اسے دیکھ کر تابان کو اپنی آنکھوں پر سے بھروسہ جاتا رہا۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی انوکھا خواب دیکھ رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ انوکھا اور ہوشربا۔ تابان کے لیے دھڑکنوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ کسی نے آنکھوں کے رستے دنیا کا تیز ترین نشہ اس کے جسم میں انڈیل دیا ہو اور اب وہ ایک نہ ٹوٹنے والے خمار میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ وہ دوشیزہ کوئی آسمانی مخلوق لگتی تھی۔ اس کی رعنائی کو احاطہء الفاظ میں لانا ناممکن تھا۔ خوبصورتی کے لیے یونانی، ترکی' اور فارسی میں جتنے الفاظ استعمال ہوتے تھے' تابان کو

معلوم تھے مگر یہ سارے الفاظ ان لمحوں میں اسے ہیچ محسوس ہوئے۔ وہ بے پناہ حسن آنکھ کو عاجز اور ذہن کو ماؤف کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پکار اٹھا۔ "اے خالق کائنات! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں' کیا گنے چنے انسانی نقوش میں اتنا بے شمار حسن سما سکتا ہے۔ کیا کوئی چیز اتنی جاذب نظر اور کوئی پیکر اتنا دلکش بھی ہو سکتا ہے؟ یکا یک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ کمرے میں رکھے ہوئے شمعدان میں شمعیں لرز اٹھیں۔ دوشیزہ کے سر کا زرتار آنچل لہرایا اور اسکا چہرہ گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپ گیا۔ تابان تڑپ اٹھا۔ اس کے رگ وپے سے جان کشید ہو کر اسکی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ اسے لگا دنیا ایک لمحے میں ویران ہو گئی ہے۔ اب یہاں دیکھنے اور چھونے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔ پھر اس نازنین کی شیریں آواز کمرے میں گونجی۔ تابان کے کانوں میں ہزاروں جلترنگ بج اٹھے۔ وہ اپنے سامنے بیٹھی ہوئی خادمہ سے مخاطب تھی۔

"یہ لو کھاؤ۔" اس نے خوان پوش سے ڈھکی ہوئی ایک رکابی خادمہ کے سامنے رکھ دی۔

خادمہ کی انکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس نے لرزاں ہاتھوں کے ساتھ رکابی پر سے کپڑا ہٹایا۔ وہ کئی دنوں سے بھوکی لگتی تھی۔ کھانا دیکھ کر اس کے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ وہ

بے تابی سے نوالے لینے لگی۔ دوشیزہ کے مرمریں ہاتھ آنچل کی اوٹ سے نکل کر صراحی کی طرف بڑھے۔ اس نے پیالے میں پانی بھر کر کھانا کھاتی عورت کے پاس رکھ دیا اور اپنی مسحور کن آواز میں بولی۔

"ہم روز تمہیں کھانا پہنچایا کریں گے، کھانا نہیں کھاؤ گی تو بچوں کو دودھ کیسے پلاؤ گی؟ "

عورت نے لرز کر کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ "نہیں شہزادی! دیوتاؤں کے لیے مجھ پر رحم کریں اگر آقا کو پتہ چل گیا تو مجھے اور میرے بچوں کو نیزوں سے چھید دیں گے۔ اگر ایک روز مشقت نہ کر سکنے کی سزا دس روز کی فاقہ کشی ہے تو اتنے بڑے جرم کی سزا نہ جانے کیا ہو گی۔ "

"کچھ نہیں ہو گا۔ "دوشیزہ کی مہربان سرگوشی کمرے میں گونجی۔ "کیا ہم ایسا ہونے دیں گے؟ "

بچہ عورت کی گود میں رونے لگا۔ دوشیزہ نے بچہ تھامنے کے لیے ہاتھ عورت کی طرف بڑھا دیئے۔ "لاؤ بچہ ہمیں دے دو' تم اطمینان سے کھانا کھالو۔ "

لرزتی کانپتی عورت نے ہچکچا کر بچہ دوشیزہ کے حوالے کر دیا۔ شہزادی نے کمال مہربانی سے بچہ کندھے سے لگا لیا۔ ایسے میں ایک بار پھر اس کے چہرے سے آنچل ڈھلک گیا۔ گھپ اندھیری رات میں یکایک سورج نصف نہار پر چمک اٹھا۔ تابان کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ اسے خدشہ لاحق ہوا کہ کچھ دیر اسی طرح کمرے میں دیکھتا رہا تو اس کے حواس کام کرنا چھوڑ دیں گے اور وہ راکھ کے ڈھیر کی مانند فرش پر پڑا نظر آئے گا۔ تاہم اس خدشے کے باوجود وہ اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹانا نہیں چاہتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ ہٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ ایکا ایکی ہوا کا ایک اور جھونکا آیا۔ یہ جھونکا پہلے جھونکوں سے شدید تھا کمرے میں رکھا ہوا شمع دان بجھ گیا۔ وہ حسن مجسم ایک بار پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ تابان چند لمحے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ ان چند لمحوں میں اس نے بہت کچھ سوچ لیا۔ وہ جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے غارس کے محل کو خیر باد کہنا زیادہ دشوار نہیں تھا۔ آزادی چند قدم کے فاصلے پر تھی لیکن پتہ نہیں کیوں تابان کو یہ آزادی بے معنی محسوس ہوئی۔ زندگی میں پہلی بار اس کا دل قید رہنے کو چاہا۔ وہ تھوڑی دیر بے خیالی میں اپنے گھونگھریالے بال سہلاتا رہا۔ پھر گہری سانس لے کر واپس زینوں کی طرف مڑ گیا۔ جب وہ زینے چڑھ رہا تھا اس کے سینے میں بڑی خوشگوار دھڑکنیں جاگی ہوئی تھیں۔ ان دھڑکنوں کی لذت محسوس کرتا وہ محتاط قدموں سے

واپس دیوار تک پہنچ گیا جہاں سے اس نے چھت پر رسائی حاصل کی تھی۔ دیوار سے کود کر اس نے طویل بانس کو پھر شاہ بلوط کے پتوں میں چھپایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس بندی خانے میں تھا اور اپنی زنجیر کو اپنے ہاتھوں دیوار کے حلقے سے منسلک کر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے روز شام کو غارس زنوب غلاموں کو دیکھنے آیا تو دیر تک تابان پر نگاہیں جمائے کھڑا رہا۔ تابان کو اس کی نگاہیں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ آخر غارس کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

" فارسی بھگوڑے تجھے ناکام کوشش کی سزا یاد ہے نا؟" تابان چونک گیا۔ اسے چونکتے دیکھ غارس مسکرایا۔

"تمہارے قدموں کے نشان محل کی چھت پر پائے گئے ہیں۔ وہ بانس بھی ڈھونڈ لیا گیا ہے جس کی مدد سے تم چھت پر چڑھے تھے۔ "

تابان کے پاس اب کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا۔ غارس نے گرجدار لہجے میں بندی کے نگران کو حکم دیا۔

"اس کے سر سے یہ چمٹی اتار لو اور اس کے پاؤں میں ایسی زنجیر ڈال دو جس میں قفل نہ ہو ۔ یاد رکھو یہ ہر قسم کا قفل کھولنا جانتا ہے۔ "

نگران نے ادب سے سر جھکایا۔ "تابان کے سر سے چمٹی اتاری اور دوسری زنجیر لینے چلا گیا۔ تابان نے دیکھا ایک دوسرا نگران سر جھکائے کھڑا ہے اور ہولے ہولے کانپ رہا ہے۔ یہ وہی شخص تھا جس کی نگران آنکھوں کو رات تابان نے دھوکا دیا تھا۔ غارس نے گرج کر کہا۔

"اپنی سزا جانتے ہو؟ "

نگران اوندھے منہ زمین پر گر گیا اور گڑگڑا کر بولا۔ "ہاں میرے آقا۔۔۔۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں لیکن دیوتاؤں کے لیے میری جان بخشی کی جائے۔ "

کچھ دیر گھمبیر خاموشی طاری رہی' پھر غارس کی بے ہنگم آواز گونجی۔ "تمہارا جرم ناقابل تلافی ہے۔ "

نگران آنسو بہاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسکے چہرے پر موت کی زردی کھنڈ گئی تھی۔ تابان کو لگا جیسے وہ ایک لمحے میں زندہ لاش بن گیا ہے۔ ایک کاہن نما شخص نے آگے بڑھ کر معتوب

نگران سے کچھ سرگوشیاں کیں۔ اس کے بعد نگران خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر بندی خانے کی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے ایک سیاہ پتھر پر کود کر جان دے دی۔ خودکشی کا یہ منظر جتنا اچانک تھا اتنا ہی لرزہ خیز بھی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک انسان فنا کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ تابان اور دوسرے غلاموں کے چہروں پر اندوہ کی گہری پرچھائیاں لرز گئیں۔ بندی خانے سے رخصت ہوتے ہوئے غارس نے حکم دیا کہ تابان کو سو کوڑے لگائے جائیں اور دس روز فاقہ کشی کی سزا دی جائے۔

اگلے روز تابان کو سو کوڑے پڑے یہ کوئی معمولی کوڑے نہیں تھے۔ پشت کی کھال جگہ جگہ سے اکھڑ گئی اور خون ایڑیوں تک بہہ نکلا۔ تاہم تابان نے یہ تمام کوڑے ایک ہی بار میں کھائے اور کوڑازنی کرنے والے اس کی سخت جانی پر حیران ہوئے۔ بعدازاں دس روز کے لیے تابان کو قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ آٹھ پہر میں اسے چند گھونٹ پانی اور روٹی کا چوتھائی ٹکڑا دیا جاتا۔ تنہائی اور بھوک کا عذاب تابان کے خونچکاں زخموں پر نمک پاشی کرتا رہا۔ وہ تاریک کوٹھڑی کے فرش پر لیٹ کر پہروں سوچتا رہتا۔ کیا اس رات اس نے سچ مچ کوئی حسین دوشیزہ دیکھی تھی یا یہ صرف اس کا خواب تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہیں وہ یونانی

داستان کی حسین دیوی تو نہیں تھی جو تاریک راتوں میں چپکے سے لوگوں کے گھروں میں اترتی تھی اور ایفروڈائٹ کی مورتی کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ جاتی تھی جس میں صورت دیکھنے والا ہر فرد حسن لازوال کا مالک بن جاتا تھا۔ یا پھر وہ کوہ اولمپس سے اترنے والی وہ پری تھی جو رات بھر شہر "پیلا" کی گلیوں میں گھومتی تھی اور روتے بچوں کو لوریاں دیتی تھی لیکن کیا کوئی پری یا دیوی اتنی حسین ہو سکتی ہے؟ وہ کون تھی۔ اس رات وہ وہاں کیا کر رہی تھی؟ ایک کنیز کو شاہی برتنوں میں کھانا کھلانا۔ اس کے بچے کو گود میں لے کر پچکارنا' محبت اور انس کی باتیں کرنا۔ وہ سب کیا تھا؟ سوچ سوچ کر تابان کا دماغ پھٹنے لگا۔

جب اسکی قید تنہائی ختم ہوئی تو وہ پھر اپنے ساتھیوں سے آملا۔ روزمرہ کی مصروفیات شروع ہو گئیں۔ تابان کی نگاہیں محل کے در و دیوار میں ہر وقت اس حسن بے مثال کی متلاشی رہتیں۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے بھی سن گن لی۔۔۔۔۔۔۔ پتہ چلا کہ غارس زنوب کی ایک جواں سال بیٹی ہے' جسے مارشا کہا جاتا ہے۔ سنا ہے وہ بے حد حسین ہے لیکن اس کی صورت بہت کم لوگ دیکھ پاتے ہیں۔ مرد تو مرد وہ عورتوں سے بھی پردہ کرتی ہے۔ صرف اسکی حسین آنکھیں نقاب سے باہر رہتیں ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگ خیال

کرتے ہیں کہ وہ حسین نہیں بلکہ بد صورت ہے۔ اس کے چہرے پر کوئی بدنما داغ ہے جسے وہ چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ ویسے وہ بے حد غمگسار اور ہمدرد ہے۔ ہر شخص اس کی تعریف کرتا ہے۔ شہزادی کے خاص غلام اور کنیزیں ایسے لوگوں کی جستجو میں رہتے ہیں جنہیں کسی بھی مدد کی ضرورت ہو۔ وہ خود بھی ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ ہر شخص اس بات پر متفق ہے کہ شہزادی کے اندر کسی نہایت پاک روح کا بسیرا ہے۔ تابان کے ایرانی ساتھی نے ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ چند ماہ پہلے اپنے والد سے دو ملازموں کی جان بخشی کرانے کے لیے شہزادی نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ جب تین چار روز بھوکی رہی تو محل میں کہرام مچ گیا۔ محل کے سب غلاموں اور ملازموں نے شہزادی کا ساتھ دیتے ہوئے بھوکا رہنا شروع کر دیا۔ چھٹے روز آقا غارس کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور دونوں غلاموں کی جان بخشی کرنا پڑی۔ ایسے ہی بے شمار واقعات ہیں جنہوں نے شہزادی کو محل میں اور محل سے باہر ہر دلعزیز بنا رکھا ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں ایسی ہر دلعزیزی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

شہزادی کو دیکھنے کا اشتیاق تابان کے دل میں دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر وہ ان در و دیوار سے بہت دور تھا جہاں اس ملکہ حسن کا گزر ہوتا تھا۔ باغ کا کام مکمل ہو چکا تھا اور آجکل تابان اپنے

ساتھیوں کے ساتھ محل سے باہر کام کر رہا تھا۔ محل کی تین اطراف میں ایک خندق کھودی جا رہی تھی۔ یہ خندق تیس قدم چوڑی اور ایک عام نہر سے دوگنا گہری تھی۔ چالیس سے پچاس غلام صبح سے شام تک اس کی کھدائی میں مصروف رہتے تھے۔ تابان نے دیکھا تھا کہ چند دوسرے امراء کے مکانوں کے گرد بھی ایسی خندقیں کھودی جا رہی تھیں۔ بعض مکانوں کے صدر دروازے یا فصیل کو بھی مضبوط کیا جا رہا تھا۔ تابان ان تیاریوں کی وجہ سمجھتا تھا۔ در حقیقت شہر میں یہ افواہیں گردش کر رہیں تھیں کہ عنقریب ایتھنز پر شدید حملہ ہونے والا ہے۔ حملہ آور ایک مقدونی شہر "پیلا" کے لوگ بتائے جاتے تھے۔ اور ان کے سردار کا نام سکندر لیا جاتا تھا۔ سکندر کے بارے میں تابان بہت کم جانتا تھا۔ ہاں سکندر کے باپ شاہ فیلقوس کا نام اس نے کئی بار سنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شاہ فیلقوس ایک بہادر جری سپہ سالار تھا اور دو تین برس پہلے اس نے اہل ایتھنز پر حملہ کر کے انہیں زبردست شکست دی تھی۔

تابان کے ساتھی سکندر اور اس کی سپاہ کا اکثر ذکر کرتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سکندر اگرچہ کم عمر ہے لیکن وہ اپنے باپ کا صحیح جانشین ثابت ہو گا اور اگر اس نے مشتعل ہو کر ایتھنز کا رخ کر لیا تو اہل ایتھنز کو شکست سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ ایک روز جب تابان اور اسکے

ساتھی سخت دھوپ میں کھدائی کا کام کر رہے تھے شمالی سرحد سے آنے والے چند اور غلام انکے ساتھ شامل ہو گئے۔ وہ اپنے ساتھ شمالی سرحد کی بہت سی خبریں لائے تھے۔ سکندر اور اسکی فوج کے متعلق بھی انہیں معلومات حاصل تھیں۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ سکندر آجکل اپنے دارلحکومت پیلا سے نکلا ہوا ہے اور باغی قبیلوں کی سرکوبی میں مصروف ہے "ہائی مس" نامی پہاڑ کی نواحی آبادیوں میں سکندر کی فوج ان بربری قبائل سے برسرپیکار ہے جو پہاڑوں سے اتر کر شہری آبادیوں میں لوٹ مار کرتے ہیں۔ اس شخص نے بتایا کہ بربری قبائل کے ساتھ نوجوان سکندر کا ایک معرکہ ان لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ بربری قبیلے بلندی پر تھے۔ انہوں نے اپنے سامنے جنگی گاڑیوں سے دیوار بنا رکھی تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ جب سکندر اپنی فوج کے ساتھ یلغار کر کے ان کی طرف بڑھے گا تو وہ اوپر سے جنگی گاڑیاں لڑھکا دیں گے۔ سکندر کو اس چال کا بر وقت پتہ چل گیا لیکن حملہ بھی ضروری تھا۔ اس نے اپنے حملہ آوروں کو حکم دیا کہ لمبی ڈھالوں کے ساتھ یلغار کریں۔ جب اوپر سے دشمن کی گاڑیاں لڑھکتی ہوئی آئیں تو اپنی صفوں میں خلا پیدا کر کے گاڑیوں کے گزرنے کے لیے راستہ بنائیں اور جو ایسا نہ کر سکے وہ اوندھے منہ گر کر ڈھالیں اپنی کمر پر رکھ لیں گاڑیاں انکی کمر پر سے باعافیت گزر جائیں گی۔ سکندر کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات پر اسکے

جانثاروں نے بے خوف و خطر عمل کیا۔ حملے کے دوران جب گاڑیاں لڑھکتی ہوئی آئیں تو سپاہیوں نے سمٹ کر ان کے لیے راستے بنا دیے۔ جہاں راستے نہ بن سکے وہاں سپاہی ڈھالیں اوڑھ کر لیٹ گئے۔ اس ترکیب سے ناقابل ذکر نقصان ہوا۔ مقدونوی فوج دھاوا بولتی ہوئی دشمن پر ٹوٹ پڑی اور اسے تہس نہس کر دیا۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے واقعات سکندر کے بارے میں سنے اور سنائے جا رہے تھے۔ شہر بھر میں جنگ کا چرچا تھا۔ کچھ لوگ سکندر مقدونوی سے خوفزدہ تھے اور کچھ اسے ناقابل فراموش سبق سکھانے کی باتیں کرتے تھے۔ عجیب بے یقینی کی فضا نے شہر کو ڈھانپ رکھا تھا۔

وہ ایک خوشگوار دوپہر تھی۔ خندق کھولنے والے کارندوں کو ایک گھڑی آرام کی مہلت تھی۔ تابان اپنے ایرانی ساتھی کے ساتھ سایہ دار پیڑ تلے آبیٹھا۔ اس ایرانی کا نام ہوشمند تھا۔ چند سال پہلے ہوشمند نے اپنے کسی آقا کے پاس سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی جس کی سزا میں اسکے پاؤں کی انگلیاں کاٹ دی گئیں تھیں لہٰذا ہوشمند تھوڑا لنگڑا کر چلتا تھا۔ وہ دونوں سائے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

ہوشمند نے سرگوشی میں کہا۔ "اب کس دن بھاگنے کا ارادہ ہے؟ "

تابان نے کہا۔ "بھاگتے بھاگتے تھک سا گیا ہوں۔ "

ہوشمند نے کہا۔ "چند روز پہلے تک تو تمہاری سوچ یہ نہیں تھی۔ "میرا خیال ہے آقا غارس کا کوڑا کافی سخت ہے۔ "

تابان نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "یہی سمجھ لو۔ "

دفعتاً گلی میں شور سنائی دیا۔ دو حواس باختہ آدمی بھاگتے ہوئے آئے اور غلاموں کی نگرانی کرنے والوں کو کوئی اہم خبر سنانے لگے۔ چند غلام اور خادم بھی یہ خبر سننے کے لیے پاس جا کھڑے ہوئے۔ خندق کے کنارے چھوٹا سا مجمع لگ گیا۔

ہوشمند نے کہا۔ "میں سن کے آتا ہوں کیا بات ہے۔ "وہ لنگڑاتا ہوا مجمعے میں پہنچا۔ چند لمحے بعد وہ ہراساں چہرے سے تابان کی طرف لوٹ آیا۔

"کیا ہوا ہے؟ "تابان نے پوچھا۔

"پوچھو کیا نہیں ہوا ہے۔ "ہوشمند نے لرزیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "یونانی سپاہیوں نے دو مقدونوی افسروں کو ہلاک کر کے قلعے میں بغاوت کر دی ہے۔ "

"میں کچھ سمجھا نہیں۔ "تابان نے کہا۔

ہوشمند نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "بہت عجیب بات ہوئی ہے۔ اب بڑی سنگین خبریں آئیں گی۔ "

تابان نے بیزاری سے کہا۔ "مگر ہوا کیا ہے؟ "

ہوشمند بولا۔ "تین برس پہلے جب شاہ فیلقوس نے ایتھنز پر قبضہ کیا تو قلعے میں اپنی مستقل فوج رکھنا شروع کی تا کہ شہر پر تسلط قائم رہے۔ یہ فوج اب بھی قلعے میں تھی۔ اہل شہر ان سے سخت خار کھاتے تھے اور عوامی جلسوں میں مقرر لوگوں کو ابھارتے تھے کہ وہ ان اجنبی سپاہیوں کو قلعے سے اٹھا کر باہر پھینک دیں۔۔۔۔۔۔۔اور آج وہی بات ہو گئی ہے۔۔۔۔۔۔اہل ایتھنز قابض مقدونوی فوج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ "

"اب کیا ہو گا؟ "تابان نے پوچھا۔

ہوشمند کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ وہ بولا۔ "سکندر اپنے افسروں کی موت کا خوفناک انتقام لے گا۔ سمجھو جنگ کچھ اور قریب آ گئی ہے۔ "

تابان نے پوچھا۔ "کیا اہل شہر جنگ کے لیے پوری طرح تیار ہیں جو انہوں نے ایسا کام کیا ہے؟ "

ہوشمند بولا۔ "یہی تو سمجھ نہیں آ رہی۔ ابھی تو بغاوت کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی۔ ابھی تو ہتھیار جمع کرنے کی باتیں ہو رہیں تھیں۔ ابھی یہ کام نہیں ہونا چاہیے تھا۔ "

اسی دوران سامنے گلی میں نعرہ زنی کا شور سنائی دیا۔ بہت سے لوگ نیزے اچھالتے اور بازو لہراتے ہوئے آ رہے تھے۔ تابان اور ہوشمند بھی اٹھ کر دیکھنے لگے۔ اس جلوس میں زیادہ تر رؤسا اور امراء کے بیٹے اور ان کے مصاحبین شامل تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جلوس کے شرکاء بڑھنے لگے۔ لوگ گھروں اور دکانوں سے نکل نکل کر ہجوم میں شامل ہونے لگے، ہر چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ تابان اور ہوشمند کے کانوں میں یہ اڑتی اڑتی خبر پہنچی کہ مقدونیہ کا سکندر الیریا کے جنگلوں میں مارا گیا ہے اور تھوڑی دیر قبل قلعے میں جو بغاوت ہوئی ہے اس کی وجہ بھی یہی اطلاع ہے۔ لوگ سکندر کے خلاف اور اپنے مذہبی پیشواؤں کے حق میں زوردار نعرے لگا رہے تھے۔ پھر ایک ادھیڑ عمر یونانی پیشوا کو کندھوں پر اٹھا کر ایک چبوترے پر کھڑا

کر دیا گیا۔ اس دبلے پتلے شخص نے نارنجی چغہ پہن رکھا تھا۔ جوش اور ولولے سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے تقریر کرنے والے انداز میں کہا۔

"دوستو! آج ہماری سماعتوں میں رس ٹپکا ہے۔ آج ہم نے اس شخص کی موت کی خبر سنی ہے جس نے ہماری آزادی سلب کر رکھی تھی اور ہمارے حقِ اظہار پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ آج وہ شخص اپنے انجام کو سدھارا ہے جو ہماری آنے والی نسلوں کے لیے غلامی کا جوا تیار کر رہا تھا۔ مقدونیہ کا وہ خاندان آج بے چراغ ہو گیا ہے جو ہمارے شہروں پر تاریکی کا راج قائم کرنا چاہتا تھا۔ یہ سب دیوتاؤں کی کرم فرمائی ہے۔ اگر ہم نے اس سنہری موقعے سے فائدہ نہ اٹھایا تو آئندہ نسلیں ہمیں بے وقوف اور بزدل گردانیں گی۔ یہ انقلاب برپا کرنے کا وقت ہے' یہ اپنے حقوق چھین لینے کا مرحلہ ہے۔ "

مقرر کا جوش اور سامعین کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ تاہم تابان اور اس کے ساتھی یہ ہنگامہ مزید نہ دیکھ سکے کیونکہ ان کے نگرانوں نے کوڑے لہرا لہرا کر انہیں واپس کام پر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایتھنز اور یونان کے طول و عرض میں حالات بہت تیزی سے بدلے۔ سکندر کی موت کی خبر بیشتر جگھوں پر خوشی سے سنی گئی اور لوگ خود کو مقدونوی تسلط سے آزاد سمجھنے لگے۔ ایتھنز میں جشن کا سماں تھا۔ راگ رنگ کی محفلیں برپا ہو رہی تھیں۔ خیر خیرات بانٹی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ دفاعی تیاریاں بھی جاری تھیں۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ مقدونوی فوج جو قلعے میں موجود تھی محصور کر لی گئی تھی اور کسی بھی وقت قلعے پر ہلہ بول کر اسے ختم کیا جا سکتا تھا۔ اس بات کا بہت امکان تھا کہ مقدونیہ کے سردار اپنی گھری ہوئی فوج کو بچانے کی کوشش کریں گے۔ اس کوشش کا مطلب بھرپور حملہ بھی ہو سکتا تھا۔ بہر حال اب لوگوں پر "سکندر کی موت" سے پہلے والا خوف وہراس طاری نہیں تھا۔ انہیں معلوم تھا اب شہر پر دھاوا بولنا یا اسے تسخیر کرنا آسان نہیں تھا۔ تابان کی پیاسی نگاہیں مسلسل اس رشک جہاں کی تلاش میں تھیں جس نے ایک رات ایک بوسیدہ سے کمرے میں اپنی جھلک دکھلا کر اس کا کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔ اسے آہ کشی کا روگ لگا کر خود وہ نہ جانے کن ایوانوں میں جا چھپی تھی۔ تابان ایک دھتکارا 'پھٹکارا ہوا حقیر غلام' وہ ایک نازنین شہزادی' سات پردوں میں چھپی ہوئی 'اطلس اور کمخواب کے لبادوں میں لپٹی ہوئی۔ صنف نازک کے لیے بھی اسکی جھلک دیکھنا آسان نہیں تھا۔ تابان کی آنکھوں سے یہ کیسی جان لیوا بھول ہو گئی تھی۔ نہ جانے وہ

کیسے اس پھندے میں آ گیا تھا۔ وہ کوئی انجان شخص نہیں تھا اور نہ ہی اس کے لیے عورت کوئی پہیلی تھی۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور در در کی ٹھوکریں کھائیں تھیں۔ آقاؤں کے کوڑے کھا کھا کر ان کے متلاشی گھوڑوں کے آگے بھاگ بھاگ کر تابان نے جینے کا ایک نیا ڈھنگ سیکھ لیا تھا۔ وہ ضد، ڈھٹائی اور بے حسی کا مجسمہ بن چکا تھا۔ سزا پا کر چیخنا چلانا اور پھر جرم کر کے مسکرانا اس کی فطرت ہو گیا تھا۔ شب و روز کی سختیوں نے اسے ایک مختلف روپ میں ڈھال دیا تھا۔ چیتے کی طرح پھرتیلا 'لومڑی کی طرح عیار' بھیڑیے کی طرح خونی اور کچھوے کی طرح ڈھیٹ' ظالم کے مسلسل ظلم نے اسے مظلوم بنانے کی بجائے خود سر اور بے حس بنا دیا تھا۔ آقاؤں کے ہاتھوں تو اسکی ذلت کا تماشا پوری دنیا نے دیکھا تھا لیکن جہاں کہیں اسے موقع ملا تھا وہ بھی ذلالت پر اترنے سے باز نہیں رہا تھا۔

معلوم نہیں کیوں اسے اب سب کچھ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ کوئی ایسا درد اس کے دل میں جاگا تھا جس نے اسے ساری خرمستیاں بھلا دی تھیں۔ سوتے جاگتے' صبح شام ہر وقت شہزادی مارشا کی دید کا آرزومند رہتا تھا۔ پھر ایک روز اسے شہزادی دکھائی دی لیکن اس دیکھنے سے نہ دیکھنا بہتر تھا۔ تابان کے سینے کی تپش کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ شہزادی کا صرف سراپا ہی دیکھ پایا اور وہ

بھی پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے سے۔ یہ واقعہ سہ پہر کے وقت پیش آیا۔ خندق پر کام کرتے ہوئے تابان نے محل سرا کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں محتاجوں اور مفلسوں کی ایک قطار نظر آئی۔ یہ لوگ بڑی عاجزی سے فرش پر بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کشکول اور برتن تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ قطار طویل ہونے لگی۔ چند گھڑیوں میں وہاں کافی لوگ جمع ہوگئے۔ ان کے ارد گرد غارس زنوب کے مسلح پہریدار منڈلا رہے تھے۔ شام سے ذرا پہلے محل سرا کا بیرونی دروزہ کھلا اور چند پہریداروں و خادماؤں کے ساتھ شہزادی مارشا برآمد ہوئی۔ اس کا چہرہ مکمل طور پر سنہری چادر میں پوشیدہ تھا۔ وہ سونے کے تاروں والے ایک سنہری لباس میں تھی۔ اسے دیکھ کر تابان کو یوں لگا جیسے آفتاب ایک ہی جست کے ساتھ غروب ہوگیا ہے اور ہر طرف جادوئی روشنی پھیل گئی ہے۔ اس کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔

شہزادی مارشا جھک جھک کر محتاجوں کے کشکول میں خیرات ڈالنے لگی۔ اس کا متحرک جسم دور سے ایک جھلملاتا ستارہ دکھائی دے رہا تھا۔ نہ جانے کب تک تابان محو نظارہ رہا۔ یکایک ایک طوفانی تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا اور وہ اچھل کر خندق میں جا گرا۔ خندق میں کانٹے دار جھاڑیاں بھری جا رہی تھیں۔ درجنوں کانٹے تابان کے جسم میں گھس گئے۔ بالائی ہونٹ

سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ اس نے بوکھلا کر خندق کے کنارے پر دیکھا۔ کم از کم چار نگران اسے خونی نظروں سے گھور رہے تھے۔ وہ حیران رہ گیا کہ چار نگران یکے بعد دیگرے اس کے سر پر پہنچے اور اسے ان کے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ شہزادی مارشا کے لیے اپنی دیوانگی پر خود ہی مسکرا دیا۔ نگرانوں کے کوڑوں سے لٹک کر وہ خندق سے باہر نکلا۔ نگران اعلیٰ نے اسے زمین پر اوندھا لیٹنے کا حکم دیا اور ننگی پشت پر بے دریغ کوڑے برسائے۔ جب تابان چیخنے چلانے لگا تو اسے چھوڑ دیا گیا۔ تب ایک بار پھر وہ ساتھی کارندوں کے ساتھ مل کر کانٹے دار جھاڑیاں گھسیٹنے اور انہیں خندق کے اندر گرانے میں مصروف ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔ شام کے بعد تک وہ اس کام میں مصروف رہے پھر نگرانوں نے کوڑے لہرائے اور وہ تھکے ماندے بندی خانے کے احاطے کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں ہوشمند نے سرگوشی کی۔

"کیوں بے تابان! بڑی نگاہ گاڑی تھی تُو نے اس کی طرف؟"

"کس طرف؟ "

"شہزادی مارشا کی طرف 'پتھر ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ "

تابان کے ہونٹوں پر کھسیانی مسکراہٹ کھیل گئی' بولا۔ "سب کہتے ہیں وہ بڑی حسین ہے، کسی نے اسے دیکھا بھی ہے یا نہیں؟"

ہوشمند بولا۔ "دیکھنے والوں نے دیکھا ہوگا' ہم تم تو صرف تصور ہی کر سکتے ہیں بلکہ ہم جیسوں کو تو تصور بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ آسمانوں کی چیزیں ہوتیں ہیں پیارے' ہم خاک نشینوں کو ان کے تصور سے کیا نسبت۔

تابان نے ایک ٹھنڈی اور عمیق آہ بھر کر کہا۔ "معلوم نہیں اس رشک قمر کی کرنیں کس کے دل میں اجالا کریں گی۔

ہوشمند نے کہا۔ "اس خوش نصیب کا انتخاب بھی ہو چکا ہے۔ سنا ہے تھسلی کا کوئی شہزادہ ہے۔ اس کی دولت کا کوئی حساب نہیں۔ در حقیقت اس نے شہزادی کو دولت کے بل پر ہی جیتا ہے۔ وہ جس گھوڑے پر بیٹھ کر شہزادی کو بیاہنے آئے گا' اس گھوڑے کے صرف ساز پر چار ہزار ٹیلنٹ خرچ کیے جا چکے ہیں۔ اب تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس شخص کی ثروت مندی کا کیا عالم ہوگا۔ "

تابان حیرت اور صدمے سے گنگ یہ باتیں سن رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اسکے سینے کے اندر کوئی نہایت قیمتی اور نہایت نازک شے چھناکے سے ٹوٹ گئی تھی۔ اس نے بجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کب ہو رہی ہے شہزادی کی شادی؟ "

" چند روز میں' شاید اسی ہفتے کے آخر میں۔ حالات بہت مخدوش ہیں بہت سے لوگ اپنی بیٹیوں کے بوجھ سے فارغ ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر امراء کے طبقے میں بہت ہراس پایا جاتا ہے۔ انہیں اپنی اپنی جانوں کے ساتھ مال و دولت کی بھی فکر ہے۔ "

تابان مرے مرے قدموں سے چلتا بندی خانے میں داخل ہوا۔ نگرانوں نے دوسرے غلاموں کی طرح اسے بھی زنجیر پہنا دی۔ آج یکا یک یہ زنجیر اسے بھاری لگنے لگی تھی۔ اس نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔ ایک بے نام سی اداسی رگ وپے میں سرایت کر گئی تھی۔ معلوم نہیں آئندہ گھڑیوں میں یہ اداسی کیا رخ اختیار کرتی۔ بڑھتی یا گھٹتی لیکن اسی دوران ایک اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ تابان نے دیکھا سو گھڑ سوار گھوڑے بھگاتے بندی خانے کے سامنے رکے۔ ان میں سے ایک گھڑ سوار گھوڑے سے اتر کر بھاگتا ہوا بندی خانے کے

دروازے پر پہنچا۔ بندی خانے کے دروازے پر نگران شمعیں روشن کر رہا تھا۔ گھڑ سوار نے نگران سے دریافت کیا کہ آقا غارس کہاں ہوں گے۔ نگران نے جواب میں بتایا تھوڑی دیر پہلے گشت پر آئے تھے 'اب باغ کی طرف نکل گئے ہیں۔ گھڑ سوار جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے عقبی باغ کی طرف چلے گئے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شاہی محل سے کوئی خاص خبر لے کر آئے ہیں۔ محل سرا میں ایک عجیب سی ہلچل نظر آنے لگی تھی۔ پہریدار تیز تیز قدموں سے اندر باہر آ جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد یہی بے قراری بندی خانے کے نگرانوں میں بھی نظر آنے لگی۔ اتنے میں ایک قیدی نے مغربی افق کی طرف دیکھا اور پکارا۔

"یہ کیا ہے؟ "

احاطے میں موجود ہر قیدی نے اسکی نگاہ کا تعاقب کیا۔ شام کے جھٹپٹے میں افق پر گرد و غبار کا دبیز بادل نظر آ رہا تھا۔ تابان نے بھی اس گرد و غبار کو دیکھا۔ وہ جانتا تھا ایسا منظر آندھی سے پہلے نظر آتا ہے یا کسی بڑی فوج کی یلغار کے وقت۔ وہ اوندھے منہ زمین پر لیٹ گیا اور کان مٹی سے لگا کر کچھ سننے لگا۔ ایک گونج سی محسوس ہوئی۔ اس کا خون رگوں میں اچھل کر رہ گیا۔ کوئی لشکر تیزی سے پیش قدمی کرتا شہر کی جانب آ رہا تھا۔ یہ کیسا لشکر تھا؟ آنے والے

دوست تھے یا دشمن؟ ان کی تعداد کیا تھی؟ بہت سے سوال تابان کے ذہن میں گونجے۔ پھر محل نشینوں کے گھبرائے ہوئے چہرے اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ اس کے دل نے پکار کر کہا 'یہ مقدونوی فوج ہے جو اپنے محصور دوستوں کی مدد کے لیے پہنچی ہے۔

رات کے دوسرے پہر تک محل میں یہی اضطرابی کیفیت برقرار رہی۔ سرگوشیوں میں باتیں ہوتی رہیں اور مختلف افواہیں گردش کرتی رہیں۔ جس وقت نصف شب کا گھنٹہ بجا اہل ایتھنز یہ روح افزا خبر سن رہے تھے کہ ایک بڑی مقدونوی فوج شہر کے سامنے ڈیرہ ڈال چکی ہے اور حفاظت کے پیش نظر شہر کے تمام دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ اس خبر کی سنگینی دو چند کرنے کے لیے ایک اور خبر موجود تھی اور وہ یہ کہ فیلقوس کا بیٹا سکندر زندہ ہے اور وہی فوج کی قیادت کر رہا ہے۔ سکندر کو اپنے مقابل پا کر اہل ایتھنز کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ کل تک جس کی موت کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں آج اسکی زندگی کا ماتم کیا جا رہا تھا۔ ایک جھوٹی خبر نے اہل شہر کو ان کی زندگیوں کے سب سے بڑے امتحان سے دوچار کر دیا تھا۔ خوف کی تند لہر پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ اہل ایتھنز کو اپنی غلطیاں یاد آ رہی تھیں۔ انہوں نے سکندر کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کیں تھیں اور سنیں تھیں۔ انہوں نے اسکے

خلاف ہتھیار جمع کرنے اور فوج بنانے کا عزم کیا تھا۔ انہوں نے اس کے دو اہم افسروں کو قتل کیا تھا اور قلعے پر ہلہ بول کر علی الاعلان بغاوت کی تھی۔ اب اس بغاوت کا انجام کیا ہو گا۔ یہ سوچ کر ان کی روح فنا ہو رہی تھی۔ اہل سپارٹا یونانیوں کے حلیف تھے اور سپارٹا کے کچھ دستے ان کی مدد کے لیے موجود بھی تھے۔ اس کے علاوہ متحدہ یونان بھی ان کی ہم نوا تھی اور سکندر اور اس کے جری لشکر کا خوف اپنی جگہ برقرار تھا۔ یہ لشکر تقریباً تین سو میل کا فاصلہ بڑی رازداری سے طے کر کے اچانک نمودار ہوا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے "ایتھنز" کی شہ رگ پر آ بیٹھا تھا۔

علی الصبح یہ معلوم ہوا کہ سکندر نے شہر سے باہر ایک قبرستان میں پڑاؤ ڈالا ہے۔ وہ لڑنا نہیں چاہتا اور اس نے بات چیت کے لیے اپنے قاصد شہر میں بھیجے ہیں۔ ان قاصدوں نے مطالبہ کیا ہے کہ مقدونیہ کی محصور فوج کو باہر آنے دیا جائے۔ اس کے علاوہ اہل شہر اپنی عسکری اہمیت کی جگہیں خالی کر دیں۔۔۔۔۔۔۔ یہ بات چیت سارا دن جاری رہی۔ اہل ایتھنز سکندر کی شرائط ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں یقین ہو چلا تھا کہ وہ سکندر کو باتوں میں الجھائے رکھیں گے اور اس دوران یونان کے مختلف علاقوں سے ان کو کمک پہنچ جائے

گی۔ انہوں نے شرط پیش کی کہ سکندر صلح کرنا چاہتا ہے تو اپنے دو ہم سرداروں کو شہر کی انتظامیہ کے حوالے کر دے۔

ایک طرف یہ بات چیت جاری تھی اور دوسری طرف اہل ایتھنز شہر کے دفاع کو آخری شکل دے رہے تھے۔ شہر کے گرد لکڑی کی فصیل تھی۔ اس فصیل کے چند شکستہ حصوں کو کئی روز پہلے ہی مرمت کر لیا گیا تھا۔ اب اس فصیل پر دفاعی ہتھیاروں کے ڈھیر لگائے جا رہے تھے۔ سب امراء و رؤسا نے اپنی اپنی ساری قوت لڑائی کی تیاری میں جھونک دی تھی۔ تابان کے آقا نے بھی اپنے غلاموں کی زنجیریں کھلوا دیں اور ان کی گردنوں میں لوہے کے مخصوص کڑے پہنا دیے۔ ان کڑوں پر غلام کی شناخت اور اسکے آقا کا نام درج تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی غلام جنگ کے ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے بعد میں ڈھونڈا جا سکے۔ غارس زنوب نے اپنے تمام تنومند غلام 'نگران اعلیٰ کی قیادت میں فصیل پر بھیج دیے۔ تابان اور ہوشمند بھی غلاموں کے اس جتھے میں شامل تھے۔ انہوں نے فصیل پر بڑی گہما گہمی اور مصروفیت دیکھی۔ کہیں بڑے بڑے کڑاہوں میں تیل کھول رہا تھا۔ کہیں سنگ باری کے لیے پتھروں کے ڈھیر لگائے جا رہے تھے۔ کہیں تیروں سے

بھرے ہوئے چھکڑے اتر رہے تھے۔ ہتھیار بند یونانی فصیل پر مورچے درست کرنے میں مصروف تھے۔ دوسرے غلاموں کی طرح تابان اور ہوشمند کو بھی چھکڑے کھینچنے اور وزن ڈھونے پر لگا دیا گیا۔ سارا دن اور ساری رات یہ مصروفیت جاری رہی۔ اگلے روز صبح سویرے فصیل پر جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ گاہے گاہے نعرے گونجنے لگے اور تیروں کی بارش ہونے لگی۔ اہل ایتھنز اپنے دفاع کی طرف سے بہت مطمئن تھے لیکن دوپہر کے وقت یہ دل دہلا دینے والی خبر ملی کہ سکندر کے ایک سردار ڈاکس نے زوردار حملہ کرکے مشرقی جانب سے فصیل توڑ دی ہے اور مقدونوی فوج تند ریلے کی طرح شہر میں داخل ہو رہی ہے۔ یکایک شہر میں کہرام مچ گیا۔ یونانی سالاروں نے اپنے دستوں کو ٹوٹی ہوئی فصیل کی طرف دوڑایا۔ اسی دوران سکندر بھی اپنے برق پا سواروں کے ساتھ لپکتا ہوا ڈاکس کی مدد کو پہنچ گیا۔ جس وقت تابان موقع جنگ پر پہنچا وہاں قیامت برپا ہو چکی تھی۔ مقدونوی فوج پہاڑی ندی کے منہ زور دھارے کی طرح اندر آ رہی تھی اور یونانی سپاہی قطار در قطار اسے روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیزے چمک رہے تھے۔ ڈھالیں بج رہی تھیں اور زخمیوں کی آہ و بکا نے حشر برپا کر رکھا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی شہر کے تنگ گلی کوچوں میں ہونے لگی۔ مقدونوی فوج کا زور بے پناہ تھا۔ لشکریوں کے چہرے جوش غضب سے تمتما رہے تھے۔ ان کے سالار قہرناک آوازوں میں چلا رہے تھے۔ یہ مناظر دیکھے تو تابان کی چھٹی حس نے پکار کر کہا۔ "آج اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجنے والی ہے۔ یہاں کی گلیاں خون سے رنگین ہونے والی ہیں۔" اس کی نگاہوں میں وہ چہرہ گھوما جو اپنی مثال آپ تھا۔ وہ لب ور خسار اس کے تصور میں چمکے جن پر تابان اپنی ہزار جانیں نچھاور کر سکتا تھا۔ اس نے ایک زخمی سپاہی کے ہاتھ سے نیزہ لیا اور سرپٹ غارس زنوب کے مکان کی طرف بھاگا۔ شہر کی پرہجوم گلیوں میں دیوانہ وار بھاگتا ہوا وہ شاہی محلات کے علاقے میں پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا سکندر کا ایک بازو شہر کے اس حصے پر بھی حملہ آور ہو چکا تھا۔ گلیوں میں لاشے تڑپ رہے تھے اور در و دیوار شعلہ فشاں تھے، بیشتر گھروں کے مکین مزاحمت کر رہے تھے لیکن مقدونوی فوج کے بپھرے ہوئے سپاہیوں کے آگے یہ مزاحمت کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

وہ سیلاب کے تند ریلے کی طرح ہر دیوار میں گھسے چلے جا رہے تھے۔ تابان نے دیکھا غارس زنوب کے گھر سے بھی شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ محل کے تین اطراف کھدی ہوئی خندق میں کئی لاشیں پڑی تھیں اور ایک جنگی گاڑی کا ملبہ بکھرا پڑا تھا۔ تابان ننگے پاؤں بھاگتا ہوا محل کی عقبی سمت میں پہنچا۔ وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ عقبی دیوار کا ایک بہت بڑا حصہ منہدم ہو

چکا ہے۔ وہ بھاگتا ہوا اس شگاف میں سے گزر کر محل میں داخل ہوا۔ جگہ جگہ ملازموں کی لاشیں پڑی تھیں۔ کچھ شدید زخمی حالت میں تڑپ رہے تھے۔ محل کی بالائی منزل پر دشمن ابھی بھی موجود تھے۔ تابان نے دیکھا مقدونوی سپاہی محل کی قیمتی اشیاء کو کھڑکیوں سے نیچے پھینک رہے تھے جہاں انکے ساتھی یہ اشیاء ایک ڈھیر کی صورت میں جمع کرتے جا رہے تھے۔ تابان کو چند عورتیں حملہ آور سپاہیوں کی چنگل میں نظر آئیں' ان حیا سوز مناظر نے تابان کو شعلہ جوالہ بنا دیا لیکن یہ وقت جذباتی پن کا نہیں تھا۔ تابان مقدونوی سپاہیوں کی نظر بچاتا ہوا محل سرا کے اندرونی حصے میں گھس گیا۔ محل سرا کی راہداری میں اسے سب سے پہلی لاش آقا غارس کی نظر آئی۔ ایک چھوٹی تلوار اس کے پیٹ سے آر پار ہو چکی تھی۔ چند قدم دور سیڑھیوں پر خاتون خانہ کی لاش پڑی تھی۔ تابان ان لاشوں کے پاس سے گزرتا ہوا زنانہ حصے کی طرف دوڑ پڑا۔ جگہ جگہ چوبی دروازوں اور ریشم کے دبیز پردوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ یہ محل کا وہ حصہ تھا جہاں تابان جیسا معمولی غلام قدم رکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آج یہ در و دیوار لاوارث پڑے تھے اور اس کی آنکھوں کے سامنے برباد ہو رہے تھے۔ اچانک تابان کو مدھم کھانسی کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایک بند دروازے کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ کھانسنے والا کوئی نو عمر لڑکا یا عورت تھی۔ تابان نے پہلے نیزے کے دستے

سے دروازہ کھٹکھٹایا' پھر ایک کھڑکی توڑ کر اندر گھس گیا۔ کمرے میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ ایک عورت تلوار سونت کر اسکی طرف بڑھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا کر دے گی۔ تاہم تابان کی صورت دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ وہ بھاری جسم کی ایک حبشی عورت تھی۔ ایک ایسی ہی عورت چند قدم پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھی برہنہ شمشیر نظر آ رہی تھی۔ ان دونوں عورتوں سے ہٹ کر ایک شاندار مسہری کے پاس شہزادی مارشا کھڑی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح سر تا پا ایک زرتار لبادے میں لپٹی ہوئی تھی۔ سفید دھوئیں کے مرغولوں میں وہ کوئی طلسماتی کردار معلوم ہوتی تھی۔ پورے جسم میں سے صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں اور ان انکھوں کی روشنی سے پورا کمرہ بھرا ہوا تھا۔

"کون ہو تم؟" شہزادی کی محافظ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"آقا غارس کا ایک ادنیٰ غلام۔" تابان نے جواب دیا۔

" کس لیے آئے ہو؟"

"شہزادی معظمہ کی مدد کے لیے 'دشمن کے سپاہی چاروں طرف دندنا رہے ہیں۔ وہ کسی بھی لمحے یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں شہزادی محترمہ کو یہاں سے بحفاظت نکال سکتا ہوں۔"

تابان نے اتنا ہی کہا تھا کہ مقدونوی سپاہیوں کی آوازیں قریبی راہداریوں میں سنائی دینے لگیں۔ وہ محل کی آرائشی چیزوں کو توڑتے پھوڑتے اندرونی کمروں کی طرف آرہے تھے۔ یہ آوازیں سن کر شہزادی کی محافظ عورتوں کے چہروں پر اضطراب گہرا ہو گیا۔ شہزادی نے بھی بے چینی سے ایک قدم آگے بڑھایا۔ شہزادی کی نظریں ایک لمحے کے لیے تابان کی نظروں سے ٹکرائیں۔ تابان کے جسم میں سینکڑوں بجلیاں کوند گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنا سر جھکایا اور انتہائی مؤدب لہجے میں بولا۔

"شہزادی محترمہ! یہاں رکنا خطرناک ہے۔"

دھوئیں کے سبب شہزادی کھانسنے لگی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں ایک سیاہ فام محافظہ کو مخاطب کیا۔ "ژوالہ! تم ہمارے ساتھ آؤ۔"

ژوالہ نامی محافظہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا آبنوسی دروازہ کھول دیا۔ یہ دروازہ شہزادی مارشا' ژوالہ اور تابان کو ایک نیم تاریک راہداری میں لے آیا۔ ژوالہ نے تابان کو بتایا

کہ یہ راہداری انہیں محل کے عقبی باغ میں لے جا سکتی ہے۔ تابان جانتا تھا کہ اصطبل اور باغ کی دیوار ملی ہوئی ہے۔ وہ شہزادی مارشا اور ژوالہ کے آگے آگے چلتا انہیں باغ تک لے آیا۔ نیزہ اس کے داہنے ہاتھ میں تھا اور چال ڈھال میں کسی درندے کی سی پھرتی تھی۔ مقدونوی سپاہی ابھی باغ کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ کیلے اور سنگترے کے درختوں کے نیچے سے بھاگتے ہوئے وہ تینوں اصطبل میں پہنچ گئے۔ اصطبل میں چند خچروں اور تین چار گھوڑوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ تابان نے تیزی سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو گھوڑوں پر ڈالنے والے چند بورے نظر آئے۔ اس نے ایک صاف بوریا شہزادی مارشا کی طرف بڑھا دیا۔ شہزادی نے اسکا مدعا سمجھتے ہوئے یہ بوریا شال کی طرح سر پر اوڑھ کر بدن سے لپیٹ لیا۔ یوں شہزادی کا چمکیلا لباس بورے میں چھپ گیا۔ شہزادی گھوڑے کی طرف بڑھی تو دستور کے مطابق تابان ہاتھوں پاؤں کے بل چوپائے کی طرح جھک گیا۔ شہزادی اسکی کمر پر پاؤں رکھتی ہوئی گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ چند لمحے بعد وہ تینوں تیزی سے گھوڑے دوڑاتے محل سے باہر نکل رہے تھے۔ راستے میں تباہی و بربادی کے لرزہ خیز مناظر نظر آئے۔ پورے شہر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اہل شہر کی مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔ اور

مقدونوی سپاہی بربریت کی انتہا کو چھو رہے تھے۔ پورے شہر میں صرف تاریخی اہمیت کی جگہیں محفوظ تھیں اور ان کے گرد سکندر کے خاص سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔

لوٹ مار میں مصروف فاتح سپاہیوں کی خونخوار ٹولیوں سے بچتے بچاتے وہ تینوں فصیل کے قریب پہنچے تو چند گھڑسواروں نے انہیں دیکھ لیا۔ گھڑسوار للکارتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔ ایک نیزہ تیرتا ہوا تابان کے سر سے گزر گیا۔ دو تیر یکے بعد دیگرے ژوالہ کی گردن میں پیوست ہوئے اور وہ ایک چیخ کے ساتھ گھوڑے سے نیچے گری۔ تابان نے ایک طرف جھک کر شہزادی کے گھوڑے کی لگام پکڑی اور دونوں گھوڑوں کو ایک تنگ گلی سے گزار کر فصیل کی طرف سے بھگاتا چلا گیا۔۔۔۔۔۔ فصیل کے شگاف میں سے گزر کر شہزادی مارشا اور تابان نے اپنے گھوڑے سرپٹ کر دیے۔ فصیل سے باہر دور تک سرو کے جھنڈ تھے۔ وہ ان درختوں کو پار کر کے مضافاتی علاقے کی طرف لپکے۔۔۔۔۔۔۔ نصف کوس دور جانے کے بعد تابان نے مڑ کر دیکھا۔ ایک مقدونوی دستہ انکا تعاقب کر رہا تھا۔

اونچی نیچی گھاٹیوں' گھنے درختوں اور خطرناک ڈھلوانوں پر وہ ایک طویل کشمکش تھی۔ تابان اور شہزادی مارشا مقدونوی سواروں کے آگے آگے بھاگ رہے تھے۔ ایک دو موقعوں پر تو

متعاقب دستہ اس قدر قریب آ گیا کہ وہ اپنی گرفتاری کو یقینی سمجھ گئے لیکن پھر کسی نہ کسی طرح تابان مقدونوی سواروں کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس دوڑ دھوپ میں شہزادی مارشا کے گھوڑے کی پچھلی ٹانگ پر ایک تیر بھی لگا تھا۔ گھوڑے کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور اسکی رفتار سست پڑتی جا رہی تھی۔ تابان نے دیکھا درختوں کی سبز شاخوں کے اندر سے کوہ پینٹی لیکس کی چوٹی جھانک رہی تھی۔ راستے کے دونوں جانب چھوٹے بڑے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ تابان کو اندازہ ہوا کہ یہاں چھپنے کے لیے کوئی جگہ میسر آ سکے گی۔ اس اندازے کی تصدیق ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگی۔ جونہی وہ درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں داخل ہوئے' تابان کو محسوس ہوا کہ گھوڑے کے پاؤں کے نیچے زمین کھوکھلی ہے۔ اس کا مطلب تھا وہ کسی غار یا کھوہ نما جگہ کی چھت سے گزر رہے ہیں۔ تابان نے راس کھینچ کر گھوڑے کی رفتار سست کی اور اسے ڈھلوان پر موڑا۔ پندرہ بیس قدم نیچے انہیں ایک غار کا دہانہ نظر آیا۔ اس دہانے کے چاروں طرف اخروٹ کے درخت تھے۔ ان درختوں کے سائے سے دن میں بھی شام کا سا سماں نظر آتا تھا۔ کہیں قریب ہی چشمے کا پانی گرتا تھا۔ خوش قسمتی سے غار کا دہانہ اتنا کھلا تھا کہ وہ دونوں گھوڑوں سمیت غار کے اندر داخل ہو سکتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ غار میں پہنچ کر دونوں گھوڑے رک

گئے۔ تابان جلدی سے نیچے اترا۔ حسب سابق چوپائے کی طرح جھکا۔ شہزادی اس کی پشت پر پاؤں رکھتی ہوئی نیچے اتر آئی۔ اس غار میں سنگ مرمر کثرت سے نظر آرہا تھا۔ نہ جانے کہاں سے روشنی پھوٹتی تھی کہ دیواریں روشن روشن دکھائی دیتی تھیں۔ تابان دونوں گھوڑوں کی لگامیں کھینچتا ہوا طویل غار کے آخری سرے پر لے گیا اور انہیں ایک پتھر سے باندھ دیا پھر اس نے ایک ہموار پتھر کو پھونکیں مار مار کر صاف کیا اور ادب سے بولا۔

" تشریف رکھیے شہزادی۔" اس کی آواز پورے غار میں گونجی اور دیر تک بازگشت سنائی دی۔

شہزادی باوقار قدموں سے چلتی ہوئی پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں دم سادھ کر باہر سے آنے والی آوازوں پر غور کرنے لگے۔ کئی گھوڑے دوڑتے ہوئے غار کی چھت پر سے گزر گئے۔ کچھ دیر بعد گھڑ سواروں کی آوازیں فاصلے سے آنے لگیں وہ جنگل میں انہیں تلاش کر رہے تھے۔ تابان شہزادی سے چند قدم کے فاصلے پر دوزانو بیٹھ گیا۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے شہزادی کو دیکھا۔ مرمریں غار میں پتھر پر ساکت بیٹھی وہ کوئی قدیم یونانی دیوی معلوم ہوتی تھی، اس نے بوریئے کی شال کندھوں سے جھٹک دی تھی اور اب اسکا شاہی لباس غار کی

قدرتی روشنی میں دمک رہا تھا۔ کل تک تابان نے تصور بھی نہ کیا تھا کہ سات حریری پردوں میں چھپی ہوئی یونانی شہزادی کے ساتھ اخروٹ کے تاریک جنگل میں ایک مرمریں غار میں بیٹھا ہوگا اور غار کے دہانوں پر کسی شفاف چشمے کا پانی گنگناتا ہوا سنگریزوں پر رقص کرے گا۔ تابان کا دل چاہا وقت تھم جائے، یہ غار اسی طرح خوشبوؤں سے لبریز رہے۔ وہ اسی طرح بیٹھے رہیں اور صدیاں گزر جائیں دفعتاً شہزادی کی الوہی آواز غار میں گونجی اور یوں لگا جیسے غار کا ہر پتھر جلترنگ کی طرح بج اٹھا ہے اس کی آواز میں بے حد نرمی اور لوچ تھا۔ وہ بولی

"غلام۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا اس غار میں ہمارے سوا کوئی اور بھی موجود ہے؟ "

تابان نے آواز کے سحر سے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اس کے احساس نے اس کی تصدیق کی کہ شہزادی اس سے زیادہ تیز نگاہ ہے۔ یقیناً غار میں کوئی تیسرا فرد بھی موجود تھا۔

ایک بڑے پتھر کے عقب سے تیز سانسوں کی صدا آرہی تھی۔ جیسے کوئی سانسوں ہی سانسوں میں کراہ رہا ہو۔ تابان لپک کر پتھر کی اوٹ میں پہنچا۔ اس کا نیزہ جارحانہ انداز میں افقی رخ پر تھا۔ پتھر کی اوٹ میں ایک سفید ریش بوڑھا زخمی حالت میں پڑا نظر آیا۔ اس کے جسم پر فوجی لباس تھا۔ تابان نے جھک کر دیکھا ایک تیز زخمی کی پسلیوں میں ٹوٹا ہوا تھا۔ زخم

سنگین تھا۔ خون نے سارا لباس تربتر کر رکھا تھا۔ تابان نے تیر نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بوڑھا کراہ کر اٹھا۔

"نہیں بیٹا اسے رہنے دو۔ یہ تکلیف جھیل کر بھی انجام موت ہی ہے۔"

شہزادی مارشا بھی پتھر سے اٹھ کر اب بوڑھے کے سرہانے کھڑی ہوگئی تھی۔ تابان نے دیکھا اس کی حسن گیر آنکھوں میں بوڑھے کے لیے ہمدردی کا سمندر موجزن تھا۔ اپنے شاہی لباس کی پرواہ کیے بغیر وہ زمین پر بیٹھ گئی اور جھک کر بوڑھے کا زخم دیکھنے لگی۔ بوڑھا غور سے شہزادی کی طرف دیکھ رہا تھا درد بھری آواز میں بولا۔

"تم۔۔۔۔۔۔۔ تم شاہی خاندان سے ہو؟ "

شہزادی نے کہا۔ "ہاں ہم شہزادی مارشا ہیں۔"

بوڑھے کی آنکھوں میں پہلے تحیر پھر تکریم اور آخر میں تشویش کے آثار نظر آئے۔ اس نے شہزادی کے احترام میں زمین سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن شہزادی نے جلدی سے اس کے کندھے تھام لیے، بوڑھے نے کراہتی ہوئی آواز میں رک رک کر کہا۔

" شہزادی حضور! میں آپ کے ادنی غلاموں میں سے ہوں۔ قریب ہی ایک فوجی چوکی ہے۔ میں وہاں کا نگران اعلیٰ ہوں۔ مقدونوی فوج اسی راستے سے گزر کر شہر پر حملہ آور ہوئی ہے۔ میری چوکی کے زیادہ تر نوجوان وطن کی آن پر قربان ہوئے ہیں۔ میں بھی شدید زخمی حالت میں گھسٹتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں۔ شہزادی حضور جتنی جلدی ہو سکے آپ یہاں سے دور چلی جایئے۔ سکندر اور اسکی فوج کے ارادے بہت سنگین ہیں۔ وہ ایتھنز کو پیوند خاک کرنے کے لیے آئے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس شہر کو پورے یونان کے لیے مثال بنادیں اور آئندہ مقدونیہ کی کوئی نوآبادی سر اٹھانے کا سوچ بھی نہ سکے۔ "

بوڑھے کی آواز مرمریں غار میں گونج رہی تھی اور اس گونج نے بوڑھے کی آواز میں ایک عجیب سا زور پیدا کر دیا تھا۔

شہزادی مارشا نے پوچھا۔ "اے بزرگ آپ یہ سب کیسے جانتے ہیں؟ "

بوڑھے نے کہا۔ "شہزادی! کچھ عرصہ پہلے میں اہل ایتھنز کی جانب سے جاسوسی کے فرائض انجام دینے کے لیے مقدونیہ گیا تھا۔ مقدونیہ میں چرچے ہیں کہ فیلقوس کا بیٹا سکندر عنقریب ایشیا فتح کرنے کے لیے مشرقی زمینوں کا رخ کرنے والا ہے۔ اس طویل مہم پر روانہ ہونے

سے پہلے وہ مقبوضہ علاقوں میں اپنی دھاک بٹھادینا چاہتا ہے تاکہ اسکے بعد کسی کو بغاوت کی جرات نہ ہو، دیوتا نہ کریں میرے اندازے صحیح ہوں۔۔۔۔۔۔۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ آج ایتھنز راکھ کا ڈھیر بن جائے گا اور چند دن میں شہر کے تمام مرد و زن غلام بنا کر فروخت کر دیئے جائیں گے۔۔۔۔۔۔۔

بوڑھے کی آواز درد و کرب میں ڈوبی ہوئی تھی، اپنے شہر کی بربادی کے تصور نے اس کی آخری سانسیں محال کر دیں تھیں۔ وہ حسرت زدہ آواز میں بولا۔ "کاش ہمارے پیشواؤں نے اس وقت فیلقوس کے بیٹے کو للکارنے کی حماقت نہ کی ہوتی۔ "

یکایک قریبی جنگل میں گھوڑوں کی بے شمار ٹاپیں گونجنے لگیں۔ بوڑھے نے ٹوٹتی سانسوں کے ساتھ کہا۔ "شہزادی حضور! یہاں سے چلی جایئے۔ اپنی جان بچالیجیے۔ وہ آپ ہی کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ "

تابان نے شہزادی کی طرف دیکھا۔ "آیئے شہزادی معظمہ!"

شہزادی نے تابان کی بات کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ وہ بدستور بوڑھے پر جھکی ہوئی اس کے زخم سے خون روکنے کی کوشش کرتی رہی۔ بوڑھے نے پھر کہا۔

"چلی جایئے شہزادی صاحبہ۔ ہم غلاموں پر رحم کیجیے۔ "

" نہیں بزرگ محترم! ہم آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ "شہزادی کے لہجے میں سادگی اور سچائی تھی۔ مگر یہ کشمکش زیادہ دیر جاری نہ رہ سکی۔ معمر شخص کی سانسیں اکھڑیں ہوئیں تھیں۔ تھوڑی دیر میں اس نے چند ہچکیاں لیں اور جان ہار دی۔ شہزادی گم صم بیٹھی رہ گئی۔ تابان نے بے حد ملتجی لہجے میں کہا۔

"شہزادی حضور! غلام آپکے حکم کا منتظر ہے۔ "

غار سے باہر اب اندھیرا چھا چکا تھا۔ گھوڑوں اور سپاہیوں کی آوازیں دور کہیں مشرقی جانب سنائی دے رہی تھیں۔ غار چھوڑنے کے لیے یہ موقع مناسب تھا۔ یہ شہر کا مضافاتی علاقہ تھا اور یہاں وہ دونوں زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ شہزادی کے حکم پر تابان نے بوریئے کے دو ٹکڑے کیے اور ایک ٹکڑا جاں بحق ہونے والے معمر شخص پر ڈال دیا۔ دوسرا ٹکڑا شہزادی نے خود اوڑھ لیا۔ تب وہ دونوں گھوڑوں کی طرف بڑھے۔ شہزادی والا گھوڑا زخم سے نڈھال ہو کر لیٹ چکا تھا اب ان کے پاس صرف ایک ہی گھوڑا تھا۔ حسبِ سابق تابان نے نیچے جھک کر شہزادی کو سوار کرایا۔ پھر گھوڑے کی لگام تھامی اور غار سے نکل

آیا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ اخروٹ کا جنگل دور تک سنسان نظر آ رہا تھا۔ مگر یہ ویرانی عارضی بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ تابان لگام تھام کر گھوڑے کے آگے آگے بھاگنے لگا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں نیزہ تھا۔ پاؤں ننگے تھے اور جسم پر حسبِ معمول ایک لنگوٹ۔ راستے کے کنکر اور کانٹے تابان کے پاؤں میں چبھ رہے تھے لیکن وہ بھاگتا جا رہا تھا۔ ایک عجیب سرشاری اور خود فراموشی کے ساتھ۔ اس کے لیے یہ احساس کچھ کم فرحت بخش نہیں تھا کہ وہ اس وقت شہزادی کی محافظت کر رہا ہے۔ وہ شہزادی جو حسن و رعنائی کی اس سرزمین میں اپنی مثال آپ تھی۔ شہزادی کے قرب کا تصور اسے ہر خطرے سے بے نیاز کیے ہوئے تھا۔ تاریک جنگل میں بھاگتے بھاگتے تابان نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ شہزادی اس کے لیے محترم تھی لیکن کیا وہ صرف اس لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہا تھا کہ وہ شہزادی کا احترام کرتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔ پھر وہ کونسا جذبہ تھا جو اسے اس پر خطر جنگل میں کشاں کشاں لیے جا رہا تھا۔ اس کا سیدھا سچا اور بے لاگ جواب یہ تھا کہ شہزادی ایک عورت تھی۔ وہ عورت جس کے پیکر میں قرنوں سے نسل در نسل سفر کرنے والا حسن یکجا ہو گیا تھا وہ اس حسن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے اپنے دل کو سیراب اور روح کو آباد کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ناممکن ہے۔ اسی طرح جس طرح سورج کا مغرب سے طلوع

ہونا۔ پھر بھی وہ اپنی تمنا پر پہرے نہیں بٹھا سکتا تھا۔ اس کی سوچ آزاد تھی جس طرح وہ خود آزاد تھا۔ غلام ہو کر بھی آزاد تھا۔ اس کے ذہن پر شوخ رنگ کے لہریے دار خیالات کی یلغار ہونے لگی۔ ان خیالوں میں پنکھڑیاں تھیں تتلیاں تھیں، زرد رنگ کے انگوروں کے خوشے تھے۔ شہد کے چھتے تھے اور وہ خوش الحان پرندے تھے جو سرما میں شمال کی چوٹیوں سے پرواز کر کے جنوبی یونان کے چمن زاروں میں چہچہاتے تھے۔ ان رنگین خیالوں کا عکس تابان کے چہرے پر نظر آنے لگا۔ تابان کے نقوش بھدے تھے لیکن ان میں ایک طرح کی جاذبیت پائی جاتی تھی۔ جب وہ کچھ سوچتا تھا تو اس کا چہرہ اپنے خیالات کا آئینہ بن جاتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ بھاگتے بھاگتے وہ سوچنے لگا کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ نرم دل شہزادی اس کے پاپیادہ بھاگنے سے آزردہ ہو جائے یا تیز رفتاری سے سفر کرنے کا خیال اسے یہ کہنے پر مجبور کر دے۔ "غلام! آؤ ہمارے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔" اگر اس نے ایسا کہا تو۔۔۔۔۔۔۔ کیا وہ اس حکم پر عمل کر سکے گا۔ کیا خوشی اور حیرت سے اس کی دھڑکن تو بند نہیں ہو جائے گی۔ وہ انہی خیالوں میں بھاگا چلا جا رہا تھا جب اچانک اس کی تیز سماعت میں ایک مدھم آواز گونجی۔ اس کا نیزے والا ہاتھ خود بخود تن گیا۔ کچھ فاصلے پر درختوں میں مشعلوں کی روشنی چمکی۔ تابان روشنی کی طرف متوجہ تھا جب دائیں پہلو پر گھوڑے کی ٹاپیں

گونجیں۔ وہ کم از کم چار سوار تھے، انہوں نے قریب پہنچتے ہی اپنے طویل نیزے تابان کی گردن سے لگا دیے۔ وہ مقدونوی فوج کے سوار تھے۔ اس سے پیشتر کہ مقدونوی سواروں میں سے کوئی اپنی زبان کھولتا تابان نیچے جھکا اور اس کا نیزہ ایک سوار کی ڈھال سے پھسلتا ہوا اس کے پیٹ میں گھس گیا۔ سوار کربناک چیخ کے ساتھ زمین پر گرا اور اس کے ساتھ ہی تین سواروں اور تابان میں خوفناک لڑائی چھڑ گئی۔ تابان جانتا تھا کہ پلہ برابر کرنے کے لیے اسے فوری طور پر ایک اور سوار کو موت کے گھاٹ اتارنا ہوگا اور یہ کام اس نے پہلی فرصت میں کیا۔ ایک دراز قد سوار کی شمشیر کا وار بچا کر اس نے اپنا نیزہ اسکی پسلیوں میں ترازو کر دیا۔ نیزے کا دوسرا سرا تابان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سوار کو پوری قوت سے نیزے پر اٹھا کر دوسرے سوار پر دے مارا۔ طاقت اور پھرتی کا یہ مظاہرہ مرعوب کن تھا۔ باقی دو سوار جن میں سے ایک پیدل ہو چکا تھا تذبذب میں نظر آئے۔ یہی تذبذب ان پر قیامت توڑ گیا۔ تابان نے اپنا خون آلود نیزہ بے پناہ قوت سے گھڑ سوار پر پھینک دیا۔ گھڑ سوار نے نیزہ ڈھال پر لینے کی کوشش کی لیکن وہ اس کے سینے پر آیا اور آر پار ہو گیا۔ تابان نے لپک کر ایک مردہ سوار کی تلوار اٹھالی اور سامنے والے سوار سے نبرد آزما ہو گیا۔ مدمقابل سکندر کی فوج کا کوئی افسر نظر آتا تھا۔ اس نے تابان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن آخر تابان کی عیارانہ چال سے

مات کھائی اور زخمی ہو کر گر گیا۔ اسی دوران تابان کو عقب سے مزید آوازیں آئیں اس نے مڑ کر دیکھا چند گھڑ سوار پہنچ گئے تھے ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ شہزادی نے اپنے لبادے میں سے تلوار نکال لی ہے اور گھڑ سواروں کی بھرپور مزاحمت کر رہی ہے۔ وہ دیوانہ وار شہزادی کی اعانت کو بڑھا لیکن یہاں اس سے ایک بھول ہو گئی۔ وہ اپنے پہلو پر نظر نہ رکھ سکا۔ ایک گھڑ سوار نے پہلو سے نکل کر اس پر برچھی سے وار کیا۔ تابان کے سینے میں انگارے اتر گئے۔ وہ منہ کے بل خشک پتوں پر گرا۔ گھوڑے کے دو پاؤں اسے کچلتے ہوئے گزر گئے۔ تابان کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ ہوش و حواس کھونے سے پہلے اس کے کانوں نے شہزادی مارشا کی چیخیں سنیں۔ مقدونوی سپاہی شہزادی کو دبوچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ تابان نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، شہزادی کا چہرہ مشعلوں کے نرغے میں تھا۔۔۔۔۔۔۔ سرزمین یونان کی حسین ترین آنکھیں مدد طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تابان کی دوبارہ آنکھ کھلی تو اس نے خود کو بدبو اور سیلن میں پایا۔ کراہ کر اس نے پوری آنکھیں کھولیں۔ یہ ایتھنز کا ایک عسکری شفاخانہ تھا۔ مسہریوں پر قطار اندر قطار زخمی پڑے تھے۔ ان کی چیخ و پکار نے طوفان مچار کھا تھا۔ زخمی غلاموں کو فرش پر ہی پھینک دیا گیا تھا۔ کسی کا ہاتھ غائب تھا کسی کا پاؤں۔ ان کے خون اور پیشاب وغیرہ سے فرش گیلا ہو چکا تھا۔ وہ لشتم پشتم پڑے تڑپ رہے تھے اور موت کا انتظار کر رہے تھے۔ تابان نے سر اٹھا کر دیکھا اس کی چھاتی پر بہت سے ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ ان ٹانکوں سے رسنے والا خون اس کی ناف تک بہہ رہا تھا۔ اپنے خون آلود زخم کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں اخروٹ کے جنگل میں پیش آنے والے واقعات گھوم گئے۔ شہزادی مارشا کی چیخیں اس کے کانوں میں گونجیں۔ اس کا آخری بار دیکھنا تابان کے تصور میں آیا اور وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا اسکی گردن میں طوق ہے جس کی زنجیر دیوار سے منسلک کر دی گئی ہے۔ جھٹکا لگنے سے اس کے زخم سے شدید ٹیسیں اٹھیں وہ کراہنے پر مجبور ہو گیا۔

اس شفاخانے میں تابان نے قریباً دس روز گزارے۔ یہ شفاخانہ بھی کسی مقتل گاہ سے کم نہیں تھا۔ علاج کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ تابان کی آنکھوں کے سامنے درجنوں مریض جاں بحق ہوئے۔ تابان بھی نہ جانے کیوں زندہ تھا۔ شاید اسکی سخت جانی کام آ رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ سینے کے درد سے بے حال ہو کر چلانے لگتا۔ اس کی دھاڑوں کی آواز سے شفاخانے کے در و دیوار لرزنے لگتے۔ ایسے میں ایک قصاب نما معالج سٹپٹایا ہوا آیا۔ چند زور دار ٹھوکریں تابان کے سر پر لگاتا اور گہرے سبز رنگ کی ایک لعاب دار دوا تابان کے حلق میں انڈیل دیتا۔ اس دوا سے تابان پر غنودگی طاری ہو جاتی اور اس کا درد بھی کچھ کم ہو جاتا۔۔۔۔۔۔۔ خوش قسمتی سے برچھی کا پھل سینے میں زیادہ گہرا نہیں اترا تھا۔ بیس روز بعد اس کی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔ دس پندرہ دوسرے افراد کے ساتھ اسے شفاخانے سے فارغ کر کے بندی خانے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ بندی خانہ بندرگاہ کے نزدیک ایک وسیع و عریض عمارت میں قائم کیا گیا تھا۔ بند گھوڑا گاڑی میں بندی خانے کی طرف جاتے ہوئے تابان نے شہر کی تباہی کے لرزہ خیز مناظر دیکھے۔ ایتھنز سلگتے ہوئے ملبے اور راکھ کا ڈھیر نظر آتا تھا۔ تابان کی نگاہوں میں وہ دیوار گیر تصویر گھومنے لگی جو دو سال پہلے اس نے اپنے ایک آقا کی حویلی میں آویزاں دیکھی تھی۔ اس تصویر میں مصور نے یونانی شہر ملیطوس کی تباہی کا نقشہ کھینچا تھا۔ یہ تباہی ایرانیوں کے ہاتھوں 493ق م میں ہوئی تھی۔ اب 158 سال بعد ویسی ہی تباہی ایتھنز کا مقدر بن گئی تھی۔ پورا شہر مسمار ہو چکا تھا۔ صرف مذہبی اور تاریخی

نوعیت کی چند عمارتیں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ سکندر نے شاید ان کو بھی سلامت اس لیے چھوڑا تھا کہ وہ خود کو یونان دشمن ثابت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ یونان کے تاریخی ورثے سے اسے بھی اتنا ہی پیار ہے 'جتنا کسی یونانی کو ہو سکتا ہے۔ اہل ایتھنز کو عبرت ناک سزا دینے کے باوجود اس نے ان سے مفاہمت کے در کھلے رکھے تھے اور اسے اس نوجوان سپہ سالار کی دور اندیشی ہی کہا جا سکتا تھا۔

بندی خانے میں بھی تابان کے علاوہ سینکڑوں قیدی بند تھے۔ یہ سب کے سب غلام نہیں تھے۔ ان میں سے بہت سے وہ تھے جو چند روز پیشتر ایتھنز کے امراء و شرفاء میں شمار ہوتے تھے۔ جن کے گھروں پر شاہی محلات کا گمان ہوتا تھا اور جن کے علم و فضل کے چرچے زبان زد عام تھے لیکن آج ان کا درجہ تابان کے برابر ہو گیا تھا۔ وہ سارے ایک ہی صف میں آن کھڑے ہوئے تھے۔ اب وہ مقدونیوں کے لیے مالِ غنیمت تھے اور بہت جلد ان کے دام کھرے کیے جانے والے تھے۔ غلاموں کے اس ہجوم میں تابان کی آنکھیں شہزادی مارشا کو ڈھونڈنے لگیں لیکن وہ یہاں نہیں تھی۔ وہ ایک ہیرا تھی۔ اسے کنکروں کے ڈھیر میں کیونکر پھینکا جا سکتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کہاں تھی۔ کس حالت میں تھی۔ تابان اس کے بارے

میں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کرتا رہا۔ بندی خانے میں سات سے آٹھ روز گزرے تھے کہ چند مقدونوی سپاہی تابان کو ڈھونڈتے ہوئے بندی خانے میں آ گئے۔ بندی خانے کا داروغہ ان سپاہیوں کو تابان کے پاس لے آیا۔ تابان سے اس کا نام پوچھا گیا۔ اس کا زخم دیکھا گیا پھر اس کے ہاتھ پشت پر باندھ کر اسے بندی خانے سے باہر لایا گیا۔ یہاں ایک بند گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ اس کی کھڑکیوں میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ گاڑی میں چند قیدی اور بھی تھے۔ تابان کے بیٹھتے ہی گاڑی روانہ ہو گئی۔ ایک یا دو کوس چلنے کے بعد گاڑی ایتھنز کے شاہی محل کے سامنے رکی قیدیوں کو باہر نکالا گیا۔ تابان نے دیکھا شاہی محل کے صدر دروازے سے باہر لوگوں کا ہجوم ہے۔ ایک طرف بلندی پر تین پھانسیاں گڑی تھیں۔ پھانسیوں کے پھندے ہوا میں جھول رہے تھے اور ہر رسے کے قریب سیاہ رنگ کا جلاد بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ جیسے گوشت پوست کا انسان نہ ہو سنگی مجسمہ ہو۔ تابان کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اس کے ساتھی قیدیوں کے چہرے بھی زرد ہو گئے۔ وہ سب موت کو اپنی آنکھوں کے روبرو دیکھنے لگے مقدونی سپاہیوں نے انہیں گلے کی زنجیروں سے کھینچ کھینچ کر گھوڑا گاڑی سے نیچے اتارا۔ تماشائیوں کے دورویہ ہجوم سے گزر کر وہ ایک چبوترے کے سامنے پہنچے۔ اس قالین پوش چبوترے پر چند طلائی اور نقرئی کرسیاں رکھی تھیں۔ ان

کرسیوں پر مقدونی سالار بیٹھے تھے۔ درمیان کی بڑی کرسی پر گھونگھریالے بالوں والا ایک وجیہہ باوقار نوجوان براجمان تھا۔ تابان دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہی سکندر ہے۔ سکندر کے شانے چوڑے پیشانی روشن اور آنکھیں تیز تھیں۔ وہ اپنے سر کو تھوڑا سا ایک طرف جھکا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ دیکھنے والے کو اس کی شخصیت مرعوب کرتی تھی۔ تابان دوسرے غلاموں کے ساتھ اپنے ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتا ہوا سکندر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مسلح سپاہی اس کے عقب میں تھے۔ سکندر اپنے ایک مصاحب سے بات کر رہا تھا۔ چبوترے کے دائیں جانب ایک خوش شکل خاتون اپنے دو بچوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ خاتون کے پیچھے دو نیزہ بردار سپاہی تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ خاتون کوئی قیدی ہے۔ مصاحب سے گفتگو ختم کر کے سکندر عورت کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی بارعب آواز میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ سکندر کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہے۔ خوبرو عورت شہر کے ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ جس روز شہر فتح ہوا مقدونی فوج کا ایک کماندار "عورت" کے مکان میں گھس آیا۔ اس نے عورت کو بچوں سے جدا کر کے اس کی بے حرمتی کی' پھر اس تلاش میں لگ گیا کہ مال و دولت کہاں چھپایا ہے۔ عورت نے اس کو بتایا کہ ان کے ہیرے جواہرات باغ کے کنویں میں ہیں، وہ

عورت کو ساتھ لے کر کنویں پر پہنچا تو عورت نے اسے کنویں میں دھکیل دیا اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کی مدد کو پہنچتا' اسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا۔ عورت نے اقبالِ جرم کر لیا تھا اور اب سزا سننے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ قتل کی مجرمہ ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ مقدمے کی پوری روداد سننے کے بعد سکندر نے عورت کو بری کر دیا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیے اپنے بچوں کے سر چومتی چبوترے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

اس معاملے سے فارغ ہو کر سکندر نے تابان اور دوسرے قیدیوں کی طرف دیکھا۔ اس کی تیز چمکیلی نگاہ ہر قیدی کو اپنے جسم میں اترتی محسوس ہوئی۔ ایک کاتب نے آگے بڑھ کر ایک قیدی کا نام پکارا۔ سپاہیوں نے کھینچ کر اسے چبوترے کے عین سامنے لا کھڑا کیا۔ کاتب نے اس کے ان جرائم کی تفصیل پڑھنا شروع کی جو اس بدنصیب قیدی پر عاید کیے گئے تھے۔ تفصیل ختم ہوئی تو دوسرے قیدی کا نام پکارا گیا۔ یہ کوئی سنگتراش تھا جس نے سکندر کے مخالف یونانی رہنما کے مجسمے بنائے تھے۔ اس کے بعد ایک تاجر کا نام پکارا گیا۔ اس نے سکندر کے خلاف ہتھیار جمع کرنے کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور ہتھیاروں کے لیے خطیر رقم فراہم کی تھی۔ اس کے بعد سکندر کے خلاف شعلہ بیانی کرنے والے ایک مقرر پر

فرد جرم عائد کی گئی۔ چند ملزموں کے مقدمے پیش ہو چکے تو سکندر نے ہاتھ اٹھا کر کاتب کو روکا اور دریافت کیا۔

" وہ شخص کون ہے جس نے ٹرائس 'یرغا اور تالق کو ہلاک کیا ہے؟ "

تابان سمجھ گیا کہ یہ تینوں سکندر کی فوج کے اعلیٰ افسر ہوں گے اور انہیں کسی شخص نے زہر وغیرہ دے کر یا دھوکے سے ہلاک کر دیا ہو گا۔ اب اس شخص کو کوئی عبرت ناک سزا سنانے کے لیے طلب کیا جا رہا تھا۔ کاتب نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فہرست پر نظر دوڑائی۔ پھر اسے مطلوبہ نام مل گیا۔ وہ پکارنے والے انداز میں بولا۔

"ملزم تابان کو حاضر کیا جائے۔ "

اپنا نام دھماکے کی طرح تابان کی سماعت میں گونجا۔ وہ ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ ایک سپاہی نے زور سے اسکی زنجیر کو جھٹکا دیا اور کھینچ کر سکندر کے سامنے کھڑا کر دیا۔ تابان حیران نظروں سے اپنے ارد گرد دیکھ رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا نام کیوں پکارا گیا ہے۔ سکندر کی پاٹ دار آواز نے تابان کو چونکا دیا۔

" تو وہ تم ہو' جس نے ہمیں ہمارے تین بہادروں سے محروم کیا ہے۔"

تابان کی بجائے کاتب نے جواب دیا۔ "سالار اعظم! یہ ایرانی ہے۔ اس کا نام تابان ہے۔ اس کے گلے سے غارس زنوب کے نام کا کڑا اترا تھا۔ یہ شخص غارس زنوب کی دختر شہزادی مارشا کے ساتھ فرار ہو رہا تھا۔ شہر سے چند کوس دور ہمارے ایک دستے نے اسے دیکھ لیا۔ اسے روکنے کی کوشش کی گئی تو اس نے دھوکے سے حملہ کر دیا۔ بڑی عیاری کے ساتھ اس نے سردار تالق کو موت کے گھاٹ اتارا۔ بعد میں سردار ٹرائس بھی ہلاک ہوئے۔ سردار یرغا کو شدید زخم آئے۔ انہیں شفا خانے میں پہنچایا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔"

سکندر نے پوچھا۔ "کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی اس جرم میں شریک ہے؟ "

کاتب نے کہا۔ "سالار اعظم! یونانی شہزادی نے بھی اس لڑائی میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ "

سکندر نے گرج کر کہا۔ "ہم پوچھتے ہیں کوئی تیسرا بھی ان کے ساتھ شامل تھا؟"

کاتب لرز کر بولا۔ "نہیں سالار اعظم۔ "

سکندر کی تیز نگاہیں تابان پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں نظر آتی تھیں۔ حسبِ دستور تابان کو بھی کھینچ کر ایک طرف کھڑا کر دیا گیا۔ کاتب نے ایک اور قیدی کا نام پکارا۔ یہ سلسلہ تھوڑی دیر جاری رہا۔ سب قیدیوں کے مقدمے پیش ہو چکے تو انہیں

مشترکہ طور پر سزائے موت سنادی گئی۔ پیشتر قیدی رونے اور گڑگڑانے لگے۔ ان میں سے دو نازک مزاج بے ہوش ہو کر گر گئے۔ بے رحم سپاہیوں نے تین قیدیوں کو کھینچ کر علیحدہ کیا اور انہیں نیزوں سے دھکیلتے ہوئے پھانسی گھاٹ کی طرف لے چلے۔ یہ منظر بڑا دلدوز تھا۔ تابان کو احساس ہوا کہ کٹھن ترین سفر وہ ہوتا ہے جو پھانسی گھاٹ کی طرف جاتا ہے اور اٹھنے والے قدموں میں سے سب سے بھاری قدم تختہ دار کی طرف لے جانے والے قدم ہوتے ہیں۔ نیزوں کے چرکوں سے جسم لہولہان ہوگئے اور طوقوں نے ان کی گردنیں چھیل دیں۔ تختہ دار پر لے جا کر ان کے چہروں کو غلاف سے ڈھانپ دیا گیا۔

چند ہی لمحے بعد ان کی لاشیں اندھے کنووں میں جھول رہی تھیں۔ یہی عمل چار بار دوہرایا گیا اور بارہ بدنصیب موت کے گھاٹ اتر گئے۔ آخر تابان کی باری بھی آگئی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت اور بے حس تھا۔ جب ایک مقدونوی سپاہی نے اسے نیزے کی انی سے پھانسی گھاٹ کی طرف دھکیلا تو سکندر کی آواز گونجی۔

"نہیں۔ یہ سزا نہیں پائے گا۔ "

جہاں تک یہ آواز پہنچی وہاں تک حیرت کا شدید حملہ ہوا۔ سکندر کے پاس بیٹھے ہوئے ایک مصاحب نے اس خیال سے کہ شاید سپہ سالار کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے 'اٹھ کر نہایت ادب سے بولا۔

" اے زیوس دیوتا کے فرزند! یہ وہ قیدی ہے جس نے ہمیں تین قیمتی بازوؤں سے محروم کیا ہے۔ "

سکندر نے برجستہ کہا۔ "قیمتی بازو وہ نہیں تھے جو کٹ گئے۔ قیمتی بازو یہ ہے جس نے انہیں کاٹا ہے۔ اگر اس نے ہمارے ایک سردار کو ہلاک کیا ہوتا تو ہم یقیناً اسے موت کے گھاٹ اتارتے لیکن اس نے تین سرداروں کو ہلاک کیا ہے۔ لہٰذا یہ سزا کی بجائے انعام کا حق دار ہے۔

کسی کو بولنے کی جرات نہیں ہوئی۔ تابان اپنی جگہ گنگ کھڑا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یہ بات اس کے لیے نہایت حیران کن تھی کہ اس شب اس نے جن چار افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا ان میں سے تین مقدونوی فوج کے چوٹی کے سردار تھے۔ وہ خود اپنے کارنامے پر حیرت زدہ ہو رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ واقعی ایسی صلاحیتوں

کا مالک ہے۔ ایکاایکی اسے خود پر فخر محسوس ہونے لگا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تابان کے فولادی جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ سکندر نے کہا۔

"اس شخص کو چھاؤنی کے قید خانے میں رکھا جائے۔ ہم اسکے متعلق بعد میں فیصلہ کریں گے۔ "

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چھاؤنی کے بندی خانے میں تابان کے شب و روز بڑے تکلیف دہ تھے۔ یہ تکلیف جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کی تھی۔ جسمانی تکلیف یہ تھی کہ اس کے سینے کا زخم ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ رات پچھلے پہر جب سرد ہوا چلتی تو دائیں پہلو سے ٹیسیں اٹھنے لگتیں۔ وہ خود کو اونی کپڑے میں لپیٹ کر گم صم پڑا رہتا۔ بعض اوقات یہ تکلیف اتنی بڑھتی کہ تابان کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی۔ تاہم وہ اس تکلیف کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ ایسے درد وہ بہت سہہ چکا تھا۔ اصل درد تو وہ ذہنی کرب تھا جس سے وہ گزر رہا تھا۔ یہ دو آنکھوں کا کرب تھا۔ وہ آنکھیں جنھوں نے دشمن کے نرغے میں گھر کر مدد طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا

تھا۔ وہ منظر تابان کے تصور سے چپک کر رہ گیا تھا۔ ہر گھڑی شہزادی کی آنکھیں اس کے تعاقب میں رہتی تھیں۔ وہ سوچتا اس معصوم صورت فرشتہ سیرت لڑکی کے ساتھ مقدونوی سپاہیوں نے نہ جانے کیا سلوک کیا ہو گا۔ اگر اس کے ساتھ کوئی ظلم ہوا تو یہ کتنا بڑا ظلم ہو گا۔ تابان کو محسوس ہوتا جیسے شہزادی کی حفاظت میں ناکام رہ کر اب اسے جینے کا کوئی حق نہیں رہا۔ اسے اب مر جانا چاہیے۔ کبھی کبھی وہ سخت جذباتی ہو جاتا۔ آہنی سلاخوں پر مکے مارتا اور پہریداروں پر چیختا چلاتا۔ ان سے شہزادی کے بارے میں پوچھتا کہ وہ کہاں ہے، پہریدار اسے کیا بتا سکتے تھے۔ وہ جواباً اسے گالیاں دیتے یا مضحکہ خیز نظروں سے گھورتے رہتے۔

اس آہنی سلاخوں والی کوٹھڑی میں چند دن گزارنے کے بعد تابان کی وہ رگ پھڑکنے لگی جو اسے ہمیشہ قفس توڑنے پر اکساتی تھی اور آزاد فضاؤں کے خواب دکھاتی تھی۔ یہ کوٹھڑی اس کے لیے ایک مختصر پنجرہ تھی جس میں وہ طویل اڑانیں بھرنے والے عقاب کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کی تیز چمکیلی نگاہیں ہر گھڑی کوٹھڑی کے در و دیوار کا جائزہ لینے لگیں۔ وہ یہاں سے نکلنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر ہو رہا تھا کیونکہ فرار کی منصوبہ بندی تابان کی فطرت کا حصہ بن چکی تھی۔ وہ چاہتا بھی تو خود کو اس عمل سے باز نہیں

رکھ سکتا تھا۔ وہ کئی دن تک کوٹھڑی کی آہنی سلاخوں 'دیواروں اور روزنوں کا بغور جائزہ لیتا رہا مگر کہیں کوئی کمزوری نظر نہیں آئی، کوٹھڑی کا قفل دروازے سے باہر تھا۔ وہاں تک تابان کا ہاتھ پہنچنا مشکل تھا۔ اگر ہاتھ پہنچ بھی جاتا تو اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے قفل پر طبع آزمائی کی جاتی۔ بہر حال ہار ماننا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔۔۔۔۔۔۔ ایک شام کھانا کھاتے ہی اس نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ حسبِ توقع چند لمحے بعد پہریداروں کے بھاگتے قدموں کی صدا آئی۔ تابان فرش پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پر تھے اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔ کیوں چیخ رہے ہو؟" ایک پہریدار نے گرج کر پوچھا۔

تابان نے اندر سے اپنے منہ کا گوشت کچل کر خون نکال لیا۔ چند لمحے بعد ہی یہ خون اس کی ایک باچھ سے بہنے لگا۔ خون دیکھتے ہی پہریدار ہراساں آوازوں میں بولنے لگے، پھر کوٹھڑی کا وزنی دروازہ کھڑ کھڑانے لگا۔ پہریدار قفل کھول رہے تھے۔ تابان ہوشیار ہو گیا۔ اس کے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ نہیں تھا۔ وہ ایک بار کوٹھڑی سے باہر نکلنا چاہتا تھا پھر اسکے بعد جو

حالات ہوتے اس کے مطابق عمل کیا جا سکتا تھا۔ پہریداروں نے کوٹھڑی میں داخل ہو کر اسے تھاما۔ تابان کے قریب ہی بچا کھچا کھانا پڑا تھا۔ پہریداروں کے ذہن میں یہ بات آنا یقینی تھا کہ قیدی کو زہر دیا گیا ہے، انہوں نے تڑپتے پھڑکتے تابان کو اٹھایا اور شفاخانے کی طرف بھاگے۔ قید خانے کے وسیع احاطے میں پہنچ کر تابان نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ سر پر کھلا آسمان تھا۔ ابھی شام کا پہلا تارا نمایاں نہیں ہوا تھا۔ ساحل کی ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔ وہی نیم گرم ہوا جس کی بے کراں وسعت میں سانس لینے کی خواہش تابان کے سینے میں ہر دم جواں رہتی تھی۔ پہریدار شفاخانے سے ابھی کچھ دور تھے جب تابان نے تڑپ کر خود کو پہریداروں سے چھڑوایا۔ ایک پہریدار سے تلوار چھینی اور احاطے کی بیرونی دیوار کی طرف بھاگا۔ یہ سب کچھ ایک ساعت کے اندر اندر ہو گیا۔ تابان دروازے کے پاس پہنچ چکا تھا جب عقب سے پہریداروں نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ دروازے پر موجود قوی ہیکل پہریدار نیزہ تان کر تابان کے سامنے آیا۔ وہ تذبذب میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ تذبذب سے نکلتا تابان کی بھاری تلوار اس کا سر تن سے جدا کر چکی تھی۔ تاہم اس کام میں جو چند ساعتیں صرف ہوئیں ان میں عقب سے پہریدار تابان کے سر پر پہنچ گئے۔ مقابلے کے سوا اب چارہ نہیں تھا۔ تابان نے رخ پھیرا تین تلواریں اس کے سامنے

تھیں۔ وہ خم ٹھونک کر لڑنے لگا۔ اپنے ساتھی کا حشر دیکھنے کے بعد پہریدار کچھ گھبرائے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک تو بالکل اندھا دھند اناڑیوں کی طرح ہاتھ چلا رہا تھا۔ تابان نے سب سے پہلے اسی کو ٹھنڈا کیا۔ گردن پر ایک کاری زخم کھا کر وہ مقابلے سے خارج ہو گیا۔ تابان نے ایک زوردار حملہ کیا اور اپنے دونوں حریفوں کو دھکیلتا ہوا دیوار کے پاس لے گیا۔ عین اس وقت دائیں پہلو سے قدموں کی آوازیں آئیں۔ تابان نے لڑتے لڑتے مڑ کر دیکھا۔ کم از کم دس نیزہ بردار سپاہی خوفناک اندامیں اس پر جھپٹ رہے تھے۔ موت تابان کی آنکھوں کے سامنے ناچ گئی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں یا وہ تلوار پھینک دیتا یا اپنے آپ کو نیزوں کے سپرد کر دیتا۔۔۔۔۔۔۔ مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ نیزہ بردار تابان تک پہنچتے پہنچتے رہ گئے۔ تابان حالتِ جنگ میں تھا۔ اس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ نیزہ بردار کیوں رک گئے ہیں۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ رک گئے ہیں۔ تابان نے پوری یکسوئی سے ایک بھرپور حملہ کیا اس حملے کے نتیجے میں ایک شمشیر زن کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ وہ ہوا میں اڑتی ہوئی تلوار کو دیکھ رہا تھا جب تابان کی تلوار دو مرتبہ اس کے پیٹ میں سے ہو کر باہر آگئی۔ آخری شمشیر زن نے جب خود کو موت کے منہ میں پایا تو دلیر ہو کر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔ دو تین مرتبہ تابان زخم کھاتے کھاتے بچا۔ ایک بھرپور مقابلے

کے بعد تابان نے شمشیر زن کا ہاتھ تلوار سمیت کاٹ کر دور پھینک دیا۔ پھر اس کے سینے پر ایسی ٹانگ جمائی کہ وہ لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ تابان رخ پھیر کر بھاگنے کا ارادہ کر رہا تھا جب ایک تیر سنسناتا ہوا اس کے پاؤں کے درمیان زمین میں پیوست ہو گیا۔ تابان نے مڑ کر دیکھا ۔ نیزہ برداروں کے عقب میں تین گھڑ سوار کھڑے تھے۔ درمیان والے شاندار گھوڑے پر سکندر خود سوار تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ سر بڑے انداز میں ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ بڑے غور سے یہ مقابلہ دیکھتا رہا ہے۔ اس کے پہلو والے سالار کے ہاتھ میں کمان تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ تیر اسی سالار نے چھوڑا ہے۔ سکندر کے اشارے پر نیزہ بردار آگے بڑھے اور انہوں نے لپک کر تابان کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ اب تابان کی سمجھ میں یہ بات آرہی تھی کہ لڑائی کے دوران نیزہ بردار رک کیوں گئے تھے۔ یقیناً انہیں سکندر کی طرف سے حکم ملا تھا۔ سکندر اپنے چمکیلے گھوڑے کو دلکی چال چلاتا تابان کے قریب پہنچا۔ کچھ دیر گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر عجیب لہجے میں بولا۔

" فارسی بول سکتے ہو؟ "

یہ سوال غیر متوقع تھا۔ تابان نے گڑبڑا کر کہا۔ "میں۔۔۔۔۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔ "

"فارسی بول سکتے ہو؟" سکندر نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔

"جی ہاں۔ بول سکتا ہوں۔"

سکندر کے سرخ ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ اس نے اپنے سالار کی طرف جھک کر کوئی سرگوشی کی۔ چند لمحے دونوں نے تبادلہ خیال کیا۔ پھر سکندر اور اسکے ساتھی سوار بندی خانے سے روانہ ہو گئے۔ نیزہ برداروں نے بڑی چوکسی سے تابان کو دھکیل دھکیل کر واپس کوٹھڑی میں پہنچا دیا۔ اس کے سینے کے زخم سے دوبارہ خون رسنے لگا تھا۔ اسی وقت معالج کو بلایا گیا۔ اس نے مرہم پٹی کی اور کھانے کے لیے چند زود اثر دوائیں دیں۔ دواؤں کے زیر اثر تابان جلد ہی گہری نیند سو گیا۔

اگلے روز سہ پہر کو ایک حجام اس کی کوٹھڑی میں پہنچا۔ اس نے بڑے سلیقے سے تابان کے بال تراشے۔ اس کی داڑھی مونڈی۔ بعدازاں تابان کو غسل کرایا گیا اور نئے کپڑے پہننے کو دیے گئے۔۔ ایک عرصے بعد تابان کو کپڑے نصیب ہوئے تھے۔ وہ بڑا حیران نظر آ رہا تھا۔ کپڑے کا لمس محسوس کر کے اسے اپنے جسم پر گدگدی ہونے لگی۔ شام کے کھانے کے کچھ دیر بعد دو سپاہی اندر داخل ہوئے۔ ان کی وردیاں خوب صاف ستھری تھیں اور تابان نے

انہیں پہلے کبھی بندی خانے میں نہیں دیکھا تھا۔ تابان کے بازو پیچھے موڑ کر اسے ہتھکڑی لگائی گئی۔ پھر دونوں سپاہیوں کے ساتھ وہ کوٹھڑی سے باہر تھا۔

برباد شدہ ایتھنز کے گلی کوچے طے کرتا ہوا رتھ اس شاہی محل کے سامنے پہنچ کر رکا جہاں چند روز پہلے تابان نے سکندر کی عدالت دیکھی تھی۔ پھانسیاں اکھاڑ دی گئی تھیں اور اب وہاں چٹیل میدان نظر آ رہا تھا۔ اس میدان میں کہیں کہیں پھولوں کی کیاریاں بنائی جا رہی تھیں۔ شاید یہ کیاریاں اس بات کی علامت تھیں کہ سکندر کا غصہ اب فرو ہو چکا ہے اور وہ بچے کھچے ایتھنز کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنا چاہتا ہے۔ خوش پوش وردیوں والے سپاہی تابان کو لے کر محل میں داخل ہوئے۔ محل کی بلند چھتیں اور وسیع و عریض فرش دیکھ کر تابان حیران رہ گیا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کسی آرام دہ رتھ میں سفر کرے گا اور شاہی محل میں بچھے ہوئے دبیز قالینوں پر پاؤں رکھے گا۔ وہ کچھ ہراساں نظر آنے لگا۔ سنگ مرمر کے سفید براق زینے طے کرتے ہوئے وہ تیسری منزل پر پہنچ گئے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا وہ کہاں لے جایا جا رہا ہے اور نہ ہی وہ اس بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ اسے آئندہ کے بارے میں سوچنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ محل کی چھت پر ایک

خوبصورت چوکور کمرہ تھا۔ کمرے کی بڑی بڑی کھڑکیوں میں نیلے کمخواب کے پردے جھول رہے تھے۔ دروازے پر دو چوبدار نیزے تھامے کھڑے تھے۔ تابان کے ہمراہ آنے والے سپاہیوں کو دیکھ کر ایک چوبدار دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسی چوبدار نے آکر تابان کی جامہ تلاشی لی۔ پھر اس نے سپاہیوں سے کہا کہ ہتھکڑی کھول دی جائے۔ سپاہیوں نے چوبدار کی بات پر فوراً عمل کیا۔ چوبدار نے تابان کو ساتھ لیا اور کمرے میں چلا آیا۔

کمرے کا منظر حیران کن تھا۔ دو بڑی بڑی شفاف میزوں پر کتابیں اور نقشے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا چرمی نقشہ سامنے دیوار پر آویزاں تھا۔ اس نقشے پر سیاہ اور سرخ قلم سے جگہ جگہ نشان لگائے گئے تھے۔ کمرے میں بچھے ہوئے ایرانی قالین پر کسی قدیم مسودے کے بہت سے بوسیدہ اوراق پڑے تھے۔ ایک شخص دونوں ہاتھ سینے پر باندھے مشرق کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ تابان کی طرف اسکی پشت تھی۔ پھر بھی تابان دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ سکندر تھا۔ چوبدار تابان کو کمرے میں پہنچا کر واپس چلا گیا۔ چوبدار کے دروازہ کھولنے اور بند کرنے سے آہٹ ہوئی تھی اس کے باوجود کھڑکی میں کھڑے سکندر نے مڑ کر تابان کو نہیں دیکھا۔ تابان کمرے کے وسط میں حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا

تھا جیسے وہ شاہ مقدونیہ سکندر کے کمرے میں نہیں آیا کسی حکیم اور ریاضی کے دارالمطالعہ میں آگیا ہے۔ کہاں ایک جنگجو سپہ سالار اور کہاں یہ فلسفیانہ مصروفیات! تابان نے اپنی قید کے دوران سکندر کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس سے معلوم ہوا تھا کہ وہ مقدونیہ کے دارالخلافہ "پیلا" سے کچھ فاصلے پر ایک درس گاہ میں تعلیم پاتا رہا ہے جو پریوں کے ایک ویران مندر میں قائم ہے۔ میزا نامی اس درس گاہ میں وقت کے بڑے بڑے عالم اور فلسفی جمع رہتے تھے۔ سکندر کے باپ فیلقوس نے سکندر کو بچپن میں ہی اس درسگاہ میں بھرتی کرادیا تھا تاکہ وہ محلات کی عیش کوشی سے دور رہ کر جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو ترقی دے سکے۔ باپ کی بیماری اور پھر موت کے بعد اسے مجبوراً کاروبارِ مملکت میں کودنا پڑا تھا۔ ورنہ پہلے اسے ان کاموں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی.......۔ اس کمرے میں پہنچنے کے بعد تابان نے جو کچھ دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ سکندر کے بارے میں اسکی معلومات بہت حد تک درست ہیں۔ دفعتاً کمرے میں سکندر کی بھاری بھر کم آواز گونجی۔

" کیا نام ہے تمہارا؟ ہمیں بتایا گیا تھا مگر ہمارے ذہن سے اتر گیا ہے۔ "

" میرا نام تابان ہے شاہِ مقدونیہ!"

" ادھر ہمارے پاس آؤ کھڑکی میں۔ "سکندر کی آواز ابھری۔

تابان نے سکندر کی آواز میں خمار محسوس کیا۔ وہ دھیمے قدموں سے چلتا سکندر کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کن انکھیوں سے اس نے دیکھا سکندر کے ہاتھوں میں بلوری جام تھا۔ اس کی آنکھیں دور کہیں مشرق میں دیکھ رہی تھیں۔ پوری رات کا وہ چاند کوہ اولمپس کی فلک بوس چوٹیوں کے عقب سے برآمد ہو رہا تھا۔ اس کی روشنی جیسے براہ راست سکندر کے چہرے پر منعکس ہو رہی تھی۔ سکندر نے کہا۔

" تم جانتے ہو مشرق میں کیا ہے؟۔۔۔۔۔۔۔ تم نہیں جانتے۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔ شاید تاریخ دان ہیروڈوٹس بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے اسکی سب تحریریں پڑھی ہیں۔ اس کی تاریخ بس بحیرہ اسود کی یونانی نوآبادیوں تک پہنچتی ہے اس سے آگے افسانہ طرازیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور افسانوں کا کیا ہے وہ تو جہاز ران اور سیاح بھی سناتے ہیں۔ تم نے بھی تو ایسے افسانے سنے ہوں گے؟ "

سکندر جواب طلب نظروں سے تابان کو دیکھنے لگا۔ تابان نے کہا۔ "جی ہاں بہت سے افسانے مشہور ہیں۔ "

سکندر نے چند گھونٹ بھرے اور پھر بہکے بہکے انداز میں کہا۔

افسانوں کو میں بھی نہیں مانتا مگر افسانہ حقیقت کا سایہ ضرور ہوتا ہے۔ جیسے خواب تعبیر کا سایہ ہوتا ہے اور خوشبو پھول کا پرتو ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ یہ چاند جو تم سامنے دیکھ رہے ہو کسی نہ کسی سرزمین سے تو نکلتا ہے نا؟ کوئی جھیل ہو گی' دلدل ہو گی' سمندر جنگل یا ریگستان ہو گا اور سورج جو روز مشرق سے نکل کر مغرب میں ڈوبتا ہے اس کے ابھرنے اور غروب ہونے کا بھی کوئی مقام ہے۔ بڑے بڑے دریا جو ہمارے جنگلوں میں بہتے ہیں اور ہمارے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں کہیں سے تو شروع ہوتے ہوں گے۔ کبھی تم نے سوچا ہے کہ یہ زمین کتنی وسیع ہو سکتی ہے اور اس میں تمہاری آنکھ کے دیکھنے کے لیے کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ "تابان ان سوالوں کا بھلا کیا جواب دیتا وہ جانتا تھا کہ سکندر اپنی رو میں بہہ رہا ہے اور وہ باتیں کر رہا ہے جو اسے کسی اور سے کرنی چاہیئے تھیں۔ سکندر نے جام طلائی میز پر رکھا اور لکڑی کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹکا کر آگے کو جھک گیا۔ بحیرہ روم سے آنے والی گرم مرطوب ہوا اس کے گھونگھریالے بالوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تم نہیں جانتے مشرق میں کیا ہے لیکن کیا تم جانتے ہو کہ مغرب میں کیا ہے۔ شمال اور جنوب میں کون سی قومیں آباد ہیں؟"

تابان نے کہا۔ "نہیں شاہ مقدونیہ! میرا علم بہت کم ہے۔"

"جھوٹ مت بولو۔" سکندر نے کہا۔ "کچھ نہ کچھ تو تم جانتے ہو گے۔ صرف اس خیال سے چھپا رہے ہو کہ ہم تمہاری معلومات کا مذاق نہ اڑائیں۔"

سکندر نے تابان کے دل کی بات بوجھی تھی۔ تابان خاموش ہو گیا۔ سکندر نے کہا۔ "جو کچھ بھی تمہیں معلوم ہے سناؤ۔ ہم سننا چاہتے ہیں۔"

تابان نے صاف گوئی سے کہا۔

"شاہ مقدونیہ! میں پڑھنا لکھنا ضرور جانتا ہوں لیکن کتابیں پڑھنے کے میں نے صرف خواب ہی دیکھے ہیں۔ میری معلومات وہی ہیں جو آپ کی رعایا کے ایک عام فرد کی ہو سکتی ہیں۔ ہم بڑے بوڑھوں سے یہی سنتے آئے ہیں کہ اس زمین کے چاروں طرف ایک بہت بڑا اور ناقابل عبور دریا بہہ رہا ہے۔ اس دریا کے اندر ہی وہ مقام ہیں جہاں سے سورج نکلتا اور غروب ہوتا ہے۔ ان مقامات کے بارے میں صرف دیوتا جانتے ہیں جو کوہ اولمپس کی چوٹی پر

آسمان کی چھت تلے ایک روشن شہر میں رہتے ہیں۔ یہ ملک جہاں ہم آباد ہیں زمین کا مرکز ہے۔ ہمارے شمال کی طرف سفید بالوں والی ایک خوشحال قوم آباد ہے جسے ہائپر بورین کہتے ہیں۔ اس شمالی خطے میں ہمیشہ برفانی ہوائیں چلتی ہیں۔ جنوب میں حبشہ کے لوگ بستے ہیں جو دیوتاؤں کے محبوب ہیں۔ مغرب کی طرف مقدس جزیرے ہیں جہاں اچھے لوگ ابدی آرام اور چین کی زندگی گزارنے کے لیے بھیج دیے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔"

سکندر دلچسپی سے تابان کی باتیں سن رہا تھا۔ تابان خاموش ہوا تو اس نے کہا۔

"مشرق کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

تابان نے کہا۔ "سالار اعظم! تین برس پہلے جب میں سیر اس کے جزیرے میں تھا تو ملاحوں کی ایک محفل میں بیٹھا کرتا تھا۔ ہر ہفتے کی آخری شب یہ محفل بندرگاہ کے قریب ایک مکان میں جمتی تھی اور داستان گو اپنی اپنی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ملاحوں کی ان کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ بحیرہ اسود میں دور تک جہاز رانوں کو سمندر کی آخری حد ایک فلک بوس پہاڑی دیوار نظر آتی ہے۔ اس دیوار کو قدیم زمانے سے قفقاز کا نام دیا گیا ہے۔ اس پہاڑی دیوار میں ایک دروازہ ہے جس سے گزر کر غیر معلوم مشرقی سرزمینوں میں جاتے ہیں۔ ایشیائی

باشندوں کا عقیدہ ہے کہ اس دیوار سے آگے ایک زمین بند بحیرہ ہے جس کا نام قزوین ہے۔ یہاں دیو پیکر پرندے' جنگجو عورتیں یا دیو نیاں اور نا معلوم آسمانی اوتار پائے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔"

سکندر نے سرخ آنکھوں سے تابان کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

"جو کچھ تم ہمیں بتا رہے ہو اس پر تمہیں کس حد تک یقین ہے؟"

سکندر کا سوال الجھا دینے والا تھا۔ تابان نے محتاط لہجے میں کہا۔

"سالار اعظم! یقیناً ان کہانیوں میں جھوٹ کی آمیزش ہے۔ واقعات کو شاعری کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال حقیقت جو بھی ہے افسانے سے ربط رکھتی ہے۔"

سکندر بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم پھر بھول گئے۔ تم نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟"

"تابان۔" تابان نے جواب دیا۔

"تابان۔۔۔۔۔۔ اچھا نام ہے۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہم تمہارے خیالات سے اتفاق کرتے ہیں۔ ہمیں جو کچھ معلوم ہے یہ جھوٹ اور سچ کا امیزہ ہے۔ اس سچ کو جھوٹ سے علیٰحدہ

کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو تو قدم بڑھانا ہو گا۔ کسی کو تو آگے آنا ہو گا۔ مجھے' تمہیں یا دو ہزار سال بعد کسی تیسرے شخص کو۔ آخر ہم کب تک اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے۔ اجالا صرف کتابوں میں نہیں ملے گا۔ اجالے کی تلاش میں گھوڑے پر سوار ہونا ہو گا۔ سینے میں حوصلہ جمع کرنا ہو گا اور طویل فاصلوں کو گردِ راہ بنانا ہو گا۔ پھر روشنی ملے گی' پھر آگاہی حاصل ہو گی۔ تم۔۔۔۔۔۔۔۔ تم ہماری باتیں سمجھ رہے ہو ناں؟"

تابان کے پاس سر ہلانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سکندر ایک آرام دہ نشست پر نیم دراز ہو گیا۔ اس نے ٹانگیں اٹھا کر اس کھڑکی کی چوکھٹ میں رکھ دیں جس میں سے کچھ دیر پہلے وہ مشرق کی سمت گھور رہا تھا۔ اب اس کی نگاہیں دیوار پر آویزاں نقشے پر جمی تھیں۔ تابان نے بھی غور سے یہ نقشہ دیکھا۔ وہ یہ جان کر حیران ہوا کہ اس چرمی نقشے پر بے شمار جوڑ لگے ہوئے ہیں۔ غالباً کچھ عرصہ پہلے یہ نقشہ پھٹ گیا تھا یا پھاڑ دیا گیا تھا۔ بعد ازاں اسے پھر جوڑا گیا تھا۔ اس نقشے میں بہت سے پہاڑ دریا شہر اور راستے دکھائے گئے تھے۔ جا بجا نشان لگے تھے اور حاشئے لکھے تھے۔

سکندر نے کہا۔ "اس نقشے کو پہچانتے ہو۔ تم نہیں پہچانتے ہو گے۔ یہ نقشہ ہم نے پانچ برس پہلے میزا کی درس گاہ سے حاصل کیا تھا۔ یہ روئے زمین کا نقشہ ہے اور ایک قدیم یونانی تاریخ دان نے تیار کیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اس نقشے میں یہ خاکستری رنگ کی بلند دیوار دیکھ رہے ہو؟ یہ دیوار جو اس سمندر سے آگے شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی ہے؟ یہی دیوار ہے جس میں سے مشرق کو جانے والے راستے کھلتے ہیں۔ نقشے میں اس دیوار کا اضافہ ہم نے خود کیا تھا۔ در حقیقت اس نقشے میں نصف سے زیادہ کام ہمارا ہے۔ یہ جو مقامات کے فاصلے اور پہاڑوں کی بلندیاں درج ہیں یہ ہماری ہی تحریر کردہ ہیں۔ بہت محنت کی تھی ہم نے اس نقشے پر لیکن درس گاہ کے قنوطی فلسفیوں نے ہمارا مذاق اڑایا۔ اس لیے کہ وہ درس گاہ کے اتالیق تھے اور ہم ایک نوجوان طالب علم۔ اور تو اور انہوں نے ہمارے استاد محترم کو بھی پریشان کر دیا اور استاد محترم کو ہمیں کہنا پڑا کہ ہمیں ایسے خیالی نقشے تیار نہیں کرنے چاہیئں۔ یہ آنے والے لوگوں کو گمراہ کریں گے۔ طیش میں ہم نے اس نقشے کے ٹکڑے کر دیے تھے لیکن نقشے کے ٹکڑے کر دینے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ نقشہ تو ہمارے دل پر بن چکا ہے۔ اب اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ شاید۔۔۔۔۔۔۔ شاید استاد محترم بھی نہیں۔"

تابان خاموشی سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔ کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آ رہی تھیں اور کچھ سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں لیکن وہ بدستور اثبات میں سر ہلانے پر مجبور تھا۔ مشرق سے طلوع ہونے والا چاند اب بلند ہو کر کھڑکی کے وسط میں آ گیا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک سکندر نے گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ بالکل جیسے کچے راستے پر دوڑتا ہوا رتھ ایک دم ہموار راستے پر آ جائے۔ وہ تابان کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"جانتے ہو ہم نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟"

"نہیں سالار اعظم!"

ہم نے کل قید خانے میں پہریداروں سے تمہاری لڑائی دیکھی تھی۔ اس سے پہلے تم ہمارے تین سرداروں کو بھی جیت چکے ہو۔ ہم تمہاری دلیری سے متاثر ہیں۔"

"بہت شکریہ سالار اعظم۔" تابان نے اپنا سر جھکایا۔ زندگی میں پہلی بار بہ رضا و رغبت اس نے اپنا سر جھکایا تھا۔

سکندر نے کہا۔ "تمہیں یاد ہے ہم نے تم سے ایک سوال پوچھا تھا۔ "تابان کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔ سکندر نے کہا۔ "ہم نے تم سے فارسی زبان کے بارے میں پوچھا تھا اور تمہارا جواب تھا کہ تم فارسی جانتے ہو۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں سالار اعظم۔"

"ہم تم سے ایک کام لینا چاہتے ہیں تابان!"

"یہ میری خوش بختی ہو گی جناب! لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"سالار اعظم! معلوم نہیں میں اس کام کے اہل بھی ہوں گا یا نہیں۔"

"تمہیں ہماری مردم شناسی پر شبہ ہے؟"

"سالار اعظم میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

سکندر نے جام سے ایک گھونٹ بھر کر مشرق کی جانب دیکھا اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"ہم بہت جلد ایک عظیم سفر شروع کرنے والے ہیں۔ یہ مشرق کی دریافت اور تسخیر کا سفر ہو گا۔ ہم اکیلے نہیں ہوں گے۔ ہمارے ساتھ ایک جم غفیر ہو گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایشیا کے ساحل پر قدم رکھنے سے پیشتر ہمیں اپنے راستے کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل ہوں۔ ہم نے اس کام کے لیے چار باہمت نوجوان منتخب کیے ہیں۔ صرف ایک شخص کی کمی تھی اور ہمارا خیال ہے تم وہ کمی پوری کر سکتے ہو "ایک لمحہ رک کر اس نے تابان کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر بولا۔ "تم حوصلہ مند اور سخت جان ہو۔ ایرانی ہو اور فارسی جانتے ہو۔ انہی اوصاف کی ہمیں ضرورت ہے۔"

تابان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وقت کا بادشاہ اپنی ایک غرض کے سبب اس پر مہربان ہو رہا تھا۔ یہ کچھ مانگنے کا وقت تھا۔ تابان کی آنکھوں میں وہ پھول چہرہ کھل اٹھا جو وقت کی دھول میں گم ہو گیا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن یک بارگی مارشا 'مارشا پکار اٹھی۔ وہ سر جھکا کر چند لمحے اس حسن بیکراں کا تصور کرتا رہا پھر لرزاں آواز میں بولا۔

"اے شاہ مقدونیہ! آپ کا اقبال بلند ہو۔ میں اس عزت کے قابل تو نہیں جو آپ مجھے بخش رہے ہیں۔ صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اپنے خون کا آخری قطرہ اور اپنے سینے کی آخری سانس آپ پر نچھاور کر کے بھی اپنی نگاہ میں شرمندہ رہوں گا۔"

سکندر نے کہا۔ "یہ نہیں پوچھو گے کہ ہم تمہیں کیا ذمہ داری سونپنا چاہتے ہیں؟"

تابان نے کہا۔ "آپ ذمہ داری سونپنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو پھر مجھے پوچھنے کی ضرورت ہے اور نہ خواہش۔"

سکندر اس جواب سے متاثر ہوا۔ کچھ دیر تابان کو کھوجی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "اب تم جا سکتے ہو ہم تمہیں جلد طلب کریں گے۔"

تابان نے موقع ہاتھ سے نکلتے دیکھا تو زبان کھولنے کی ہمت پیدا کر لی۔ سر جھکا کر بولا۔ "شاہ مقدونیہ! میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔"

سکندر نے کہا۔ "کہو۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم سن رہے ہیں۔"

تابان بولا۔ "حملے کے روز مجھے گرفتار کیا گیا تو میرے ساتھ شاہی خاندان کی ایک شہزادی بھی تھی۔ اس کا نام مارشا ہے۔ میری بے ہوشی کے بعد مقدونی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔"

سکندر اس کا مدعا سمجھ کر بولا۔ "تو تم اسے واپس حاصل کرنا چاہتے ہو؟" تابان نے کہا۔ "ہاں شاہ مقدونیہ۔"

سکندر بولا۔ "تمہاری یہ خواہش پوری کی جائے گی۔ ہم ابھی بندی خانے کے داروغہ کو طلب کرتے ہیں۔ تم کچھ دیر باہر ٹھہرو۔ ہم داروغہ سے بات کر کے تمہیں دوبارہ طلب کریں گے۔"

تابان کے رگ و پے میں مسرت اور شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو پایا۔ فوجی انداز میں سکندر کو تعظیم پیش کر کے وہ الٹے قدموں کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر ایک دیوار کے ساتھ بادشاہ کے ملاقاتیوں کے لیے نشستوں کا اہتمام تھا۔ وہ ایک نشست پر بیٹھ کر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے ایک تنومند شخص کو دیکھا جو دو سپاہیوں کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا سکندر کے کمرے کی جانب آرہا تھا۔ بلاشبہ

یہی بندی خانے کا داروغہ تھا۔ تابان نے دیکھا داروغہ ہانپا ہوا ہے اور اسکے چہرے پر فکر مندی کے آثار ہیں۔ اسے شاہ مقدونیہ نے طلب کیا تھا اور شاہ کے سامنے پیشی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ داروغہ اندر چلا گیا۔ تابان دھڑکتے دل کے ساتھ اسکی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ یہ انتظار خاصا طویل ثابت ہوا۔ قریباً ڈیڑھ گھڑی بعد داروغہ باہر نکلا اور تابان پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالتا واپس لوٹ گیا۔ چند ہی لمحے بعد تابان کو کمرے میں طلب کر لیا گیا۔ تابان چوبداروں کے درمیان سے گزرتا ہوا کمرے میں پہنچا۔ سکندر اپنی نشست پر براجمان تھا۔ تابان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب سکندر نے اسے بھی ایک نشست پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ جھجکتا گھبراتا بادشاہ وقت کے روبرو بیٹھ گیا۔

سکندر کا خمار اب کچھ ٹوٹا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے کہا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ وہ دوشیزہ ابھی تک زندہ سلامت اور محفوظ ہے۔ ہم نے داروغہ سے تمام معلومات حاصل کر لی ہیں' وہ ایتھنز کے ہی ایک بندی خانے میں ہے۔ ہم نے داروغہ کو ہدایت کی ہے کہ اسے بندی خانے سے کسی آرام دہ جگہ منتقل کر دیا جائے۔ اب تمہیں اس کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں رہی۔"

تابان نے پوچھا۔ "میں اس سے کب مل سکوں گا جناب؟"

سکندر نے بے لچک لہجے میں کہا۔ "بہت جلد۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شاید دو تین ماہ میں۔ جونہی تم ایشیائی ساحل کے سفر سے واپس آؤ گے شہزادی مارشا تمہارے سپرد کر دی جائے گی۔"

تابان حیرانی سے سکندر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ تو آج یا کل صبح تک شہزادی مارشا کے دیدار کی آس لگائے بیٹھا تھا۔ سکندر اس سے مہینوں کی بات کرنے لگا تھا۔ تابان کو تذبذب میں دیکھ کر سکندر نے کہا۔ "یہ مت سمجھو کہ ہم کوئی شرط عائد کر رہے ہیں۔ ہماری منشا صرف یہ ہے کہ اگر ہم تم پر کوئی ذمے داری ڈالیں تو تم پوری دلجمعی سے اسے نبھا سکو۔ پھر جب تم کامران ہو کر لوٹو تو انعام و اکرام کے ساتھ شہزادی مارشا بھی تمہارے حوالے کر دی جائے گی۔"

تابان کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن آواز اسکے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ آخر اس نے احتجاج کا ارادہ ترک کر دیا اور مردہ لہجے میں بولا۔ "میں آپ کے حکم کی سرتابی کی جرات نہیں کر سکتا مگر کیا میں ایک نگاہ شہزادی کو دیکھ سکتا ہوں؟"

سکندر نے سرد لہجے میں کہا۔ "کیا تمہیں ہماری بات پر یقین نہیں۔ یا تم سمجھتے ہو ہم تم سے دھوکا کریں گے۔"

تابان نے گڑگڑا کر کہا۔ "نہیں شاہ مقدونیہ۔ میں ایسا سوچوں تو دوسرا سانس نہ لوں۔ میں تو صرف۔۔۔۔۔۔۔"

"تمہیں یہ بات کہنے کی جرات کیسے ہوئی؟" متلون مزاج سکندر نے بے رخی سے کہا۔

تابان نے کہا۔ شاہ مقدونیہ! میری بات سماعت پر گراں گزری ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔"

کمرے میں چند لمحے گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ پھر سکندر نے نشست سے اٹھ کر خود ہی ایک جام بھرا۔ تھوڑی دیر قالین پر ٹہلنے کے بعد اس کا مزاج بدلا نظر آنے لگا۔ چہرے پر برہمی کی جگہ ملائمت نے لے لی۔ اس نے تابان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "آئندہ احتیاط لازمی ہے۔"

تابان نے اطاعت میں سر جھکا دیا، سکندر نے چہل قدمی کے انداز میں کمرے کے چند چکر اور لگائے پھر دوبارہ کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چاندنی میں نظریں گاڑ کر فلسفیانہ لہجے میں بولا۔

"مشرق ہمیں بلا رہا ہے۔ وہاں کے حسین نظارے' وہاں کے خزانے' وہاں کی زرخیز زمینیں' وہاں کی عطر بار ہوائیں۔ دیوتاؤں کی دیوار کے اس پار ایک انوکھی دنیا ہمارے قدموں تلے آنے کو بے تاب ہے۔" وہ تیزی سے تابان کی طرف گھوما۔ اس کی آنکھوں میں ایک بچے

کا سا جوش خروش نظر آ رہا تھا۔ اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ "یہ ہمارا وعدہ ہے۔ تم سے ہمارا وعدہ ہے۔ ہم تمہیں زندگی کی حقیقی مسرتوں سے روشناس کرائیں گے۔ تمہارے گھوڑوں تلے ان دیکھے ملک سمٹیں گے۔ تم مملکت عیش و آرام کے فرمانروا بنو گے۔ ہاں ہمارا یہ وعدہ ہے۔ ضرورت صرف جرات کی ہے۔ تھوڑی سی جرات۔۔۔۔۔۔۔ تھوڑی سی۔"

جب سکندر نے دیکھا کہ اس کی جوشیلی باتوں کے باوجود تابان کے چہرے پر کوئی جذبہ نمودار نہیں ہوا وہ بدستور سکندر کے سخت لہجے کی چبھن محسوس کر رہا ہے تو اس نے تالی بجائی۔ چوبدار حاضر ہوا۔ وہ سکندر کی تالی کے آہنگ سے ہی شاہی مدعا سمجھ چکا تھا۔ سر جھکا کر واپس لوٹ گیا۔ ذرا دیر بعد کمرے کے ایک بغلی دروازے کا ریشمی پردہ سرسرایا اور دو نہایت حسین و جمیل لڑکیاں اندر داخل ہوئیں۔ ان آہو چشم لڑکیوں کے سیاہ بال گول چھلوں کی صورت میں سجے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ جسم کو چھپانے کی بجائے اور نمایاں کرتا تھا۔ وہ قدم قدم پر بجلیاں گراتی اندر آئیں تو ان کے حسن کی چکاچوند سے کمرے کی ہر شے دمک اٹھی۔ انہوں نے دلنشیں انداز میں تعظیم پیش کی اور تابان کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ سکندر نے کہا۔

"یہ حسن کی انتہا نہیں ابتدا ہے۔ ہم اپنے جانثاروں کو کبھی مایوس نہیں کرتے 'جب تک تم ایتھنز میں ہو یہ حسینائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔"

تابان نے دل میں سوچا۔ "اے شاہ مقدونیہ! تو نے میرے محبوب کا چہرہ نہیں دیکھا ورنہ اپنے بخشے ہوئے انعام پر اتنا نازاں نہیں ہوتا۔" اس کا دل نہیں چاہا کہ وہ لڑکیوں کو دیکھے بھی مگر عتاب شاہی کے خوف سے وہ نگاہیں اٹھائے رکھنے پر مجبور تھا۔ سکندر نے ایک چھوٹی ریشمی تھیلی تابان کی طرف اچھالی جسے تابان نے ہوا میں ہی دبوچ لیا۔ تھیلی کے اندر موتیوں کی سرسراہٹ محسوس کر کے تابان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اچانک دروازہ کھلا اور نیزہ بردار چوبدار اندر آ گیا۔ تعظیمات کے بعد اس نے کہا۔ شاہ مقدونیہ! استاد محترم ارسطو تشریف لا رہے ہیں۔"

تابان نے دیکھا سکندر کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا ہے۔ اس نے تابان کو حکم دیا کہ وہ دوشیزاؤں کے ساتھ بغلی دروازے سے باہر نکل جائے۔ تابان نے فوراً عمل کیا۔ جب وہ بغلی دروازے سے نکل رہا تھا اس نے دیکھا سکندر کا ایک خاص خادم جلدی جلدی دیوار پر آویزاں نقشے کو لپیٹ رہا ہے۔ جونہی تابان دروازے سے نکلا دو خوش پوش سپاہیوں نے اسے اپنے

ہمراہ لے لیا۔ یہ وہی سپاہی تھے جو اسے ہتھکڑی لگا کر یہاں تک لائے تھے۔ اب ان دونوں کے انداز میں پہلے سے کہیں زیادہ ادب و احترام نظر آ رہا تھا۔ تابان اپنی اس کایا پلٹ پر حیران ہو رہا تھا، کہاں ایک قابل نفرت غلام جو کل تک معمولی سپاہیوں کی ٹھوکروں میں تھا اور کہاں بادشاہ وقت کا نوازا ہوا معتمد 'جس کے آگے آگے ایوان خاص کا مؤدب چوبدار چل رہا تھا۔ وہ محل کے دروازے سے باہر نکلا تو ایک آرام دہ گھوڑا گاڑی اسکی سواری کے لیے تیار کھڑی تھی۔ وہ دونوں دوشیزاؤں کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گاڑی بان نے گھوڑے بڑھائے اور وہ ایک بل کھاتی ہوئی ہموار سڑک پر آگے بڑھنے لگے۔ رات اب گہری ہو چکی تھی۔ برباد شدہ ایتھنز کی کسی کسی سلامت عمارت میں مقدونوی سپاہیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ان کی جلائی ہوئی مشعلوں کی روشنی اس قبرستان کی ویرانی کو قدرے کم کرتی تھی۔ دونوں دوشیزائیں تابان کے پہلو میں بیٹھی تھیں۔ تابان نے دیکھا کہ ان میں سے ایک کچھ ہراساں اور پریشان ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اور پیشانی پر پسینے کی ننھی بوندیں گاڑی کے اندرونی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ تابان اسکی کیفیت دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ کیوں خوفزدہ تھی؟ شہر کی تباہی کے مناظر نے اسے ہراساں کیا تھا یا اجنبی مرد کے سپرد کیے جانے سے پریشان تھی۔ کیا ہوا تھا اسے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ بالکل ہشاش بشاش

تھی۔ دفعتاً تابان نے محسوس کیا کہ گھوڑا گاڑی کے دائیں پہلو پر دو تاریک سائے ان کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ یہ دو گھڑ سواروں کے سائے تھے۔ حالانکہ وہ کافی فاصلے پر تھے لیکن ان کا انداز مشکوک سا تھا۔ تابان کو یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ ترک دوشیزہ کے خوف کی وجہ یہی گھڑ سوار ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

گاڑی اپنے راستے پر چلتی رہی گھڑ سواروں نے بھی تعاقب جاری رکھا۔ چند نیم تاریک راستوں سے گزرنے کے بعد وہ لوگ ایک حویلی نما خوبصورت عمارت کے سامنے رکے۔ سپاہیوں نے نیچے اتر کر تابان کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ وہ اپنی ہمراہی دوشیزاؤں کے ساتھ نیچے اترا۔ سپاہی انہیں لے کر محل کے اندر پہنچے۔ حویلی کے بلند و بالا صدر دروازے میں داخل ہونے سے پہلے تابان نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ تعاقب میں آنے والے گھڑ سوار اسے اب کہیں دکھائی نہیں دیے۔ غالباً وہ گھوڑا گاڑی کو رکتے دیکھ کر آگے نکل گئے تھے۔ تابان حویلی میں داخل ہوا۔ سپاہیوں نے اسے بتایا کہ اب وہ یہیں رہے گا۔ حویلی خوب سجی سنوری تھی۔ نوکر چاکر اور آرام و آسائش کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ تابان ایک ایک شے کو غور سے دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اب اس کا ہے۔ نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ وہ نرم گداز مسہریوں پر اچھلے کودے۔ دبیز قالین پر لوٹیں لگائے اور چیخ چیخ کر نوکروں کو احکامات جاری کرے۔ کسی سے کہے میرے پاؤں دباؤ کسی کو حکم دے میرے سر پر مالش کرو۔ بہت سی خواہشیں اسکے ذہن میں سر اٹھا رہی تھیں۔ لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا۔ وہ خود کو سمجھانے لگا۔ مجھے اپنی اوقات نہیں بھولنی چاہیے۔ کچھ بھی ہے میں اب بھی ایک غلام ہوں۔ میرے آقا نے خوش ہو کر مجھ پر عنایتیں کی ہیں۔ ناراض ہو کر وہ یہ چھین بھی سکتا ہے۔ کیا معلوم میرا کون سا فعل اسے ناگوار گزر جائے۔

بعام گاہ میں پہنچ کر اس نے دونوں دوشیزاؤں کے ساتھ پُر تکلف کھانا کھایا۔ ابھی کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک خادم نے دست بستہ ہو کر اطلاع دی کہ دو مہمان اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ تابان نے شان بے نیازی سے کہا۔

"انہیں اندر بلایا جائے۔" خادم سر جھکا کر واپس لوٹ گیا۔ ذرا دیر بعد دو دراز قامت خوش پوش اشخاص اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے یونانی طرز کے فراک پہن رکھے تھے۔ ٹانگیں

گھٹنوں سے اوپر تک عریاں تھیں۔ دونوں کے کمر بند کامدار تھے اور کولہوں سے بیش قیمت دستوں والی تلواریں لٹک رہی تھیں۔ تابان نے اٹھ کر انہیں خوش آمدید کہا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ پہلو میں بیٹھی ہوئی دوشیزہ ایک بار پھر سخت خوفزدہ ہو گئی ہے۔ اس کا خوبصورت چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ تابان کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہی وہ دو گھڑ سوار ہیں جو سکندر کی اقامت گاہ سے اس کا پیچھا کرتے ہوئے آئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر دونوں کو غور سے دیکھا۔ ان دونوں کی انکھوں میں تابان کے لیے حقارت چھپی ہوئی تھی۔ ایک شخص جو نسبتاً زیادہ طویل اور تنومند تھا خاص طور پر تابان کو گھور رہا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر چند دن پرانا ایک زخم بھی تھا۔ ترک دوشیزہ کو خوفزدہ دیکھ کر تابان نے کہا۔

"آیئے جناب ہم نشست گاہ میں بیٹھتے ہیں۔"

وہ تینوں نشست گاہ میں پہنچ گئے۔ دونوں افراد نے اپنا تعارف کروایا۔ تنومند شخص نے کہا۔ "میرا نام شلال ہے اور یہ داراب ہے ہم دونوں سکندر کی فوج میں یک ہزاری سالار ہیں اور تمہیں تو ہر کوئی جانتا ہے سکندر کے تین اہم سرداروں کو تہ تیغ کر کے تم نے زبردست شہرت پائی ہے۔"

بظاہر وہ تابان کی تعریف کر رہے تھے لیکن ان کے لہجوں میں تابان کے لیے نفرت پوشیدہ تھی۔ تابان نے خوشدلی سے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کی آمد کا مقصد پوچھا۔ شلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مقصد کوئی خاص نہیں۔ بس ہم تمہیں مبارکباد دینے آئے تھے۔ شاہ مقدونیہ سکندر تم پہ بہت مہربان ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اتنی اچھی رہائش گاہ اور ایسی خوش جمال لڑکیاں تمہارے حصے میں آئی ہیں لیکن ایک برادرانہ مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

"جی فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔" تابان نے پوری طرح متوجہ ہو کر کہا۔

شلال بولا۔ "وہ ترک لڑکی جس کا نام کورا ہے بڑی خطرناک ہے اس کی طرف سے ہوشیار رہنا۔ لڑائی کے دوران میں نے ہی اسے ایک امیر کی حویلی سے گرفتار کیا تھا۔ یہ میری ٹھوڑی پر زخم دیکھ رہے ہو یہ اسی بدبخت کا دیا ہوا ہے۔ میں نے اسے کھینچ کر گھوڑا گاڑی پر بٹھانا چاہا تو اس نے ایک جلتی ہوئی لکڑی پورے زور سے میرے منہ پر دے ماری۔ نہ صرف ہڈی تڑخ گئی بلکہ گال کا گوشت بھی ادھڑ گیا۔ میں اسے موقع پر ہی قتل کر دینا چاہتا تھا لیکن پھر میرا دل نہیں مانا کہ اتنے خوبصورت چہرے کو ایک غلطی کی اتنی کڑی سزا دی جائے۔ میں نے اسے

معاف کر دیا۔ سوچا کہ سکندر سے اسے مانگ لوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔ کل میں اسی سلسلے میں محترم سکندر سے ملنے والا تھا مگر۔۔۔۔۔۔۔۔ خیر چلو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔"

تابان اور اسکے دونوں مہمانوں میں کافی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ گہری بھوری آنکھوں والے شلال کی باتوں سے تابان نے اندازہ لگایا کہ وہ کورا نامی اس دوشیزہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن سکندر سے بھی ڈر رہا ہے کیونکہ سکندر نے دوشیزہ تابان کے حوالے کر دی ہے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ تابان اپنی مرضی اور خوشی سے لڑکی اس کے سپرد کر دے۔ وہ اپنی خواہش کا اظہار کھلے لفظوں میں نہیں کر رہا تھا مگر گفتگو کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ تابان یہاں کسی شخص سے کسی طرح کی دشمنی پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا اور شلال تو پھر ایک اہم سردار تھا۔ اگر وہ لڑکی شلال کو پسند تھی اور تابان اس سے دستبردار ہو کر ایک اہم سردار سے اچھے تعلقات پیدا کر سکتا تھا تو اسے یہ کام کر گزرنا چاہیے تھا۔ کچھ دیر مہمانوں کے پاس بیٹھ کر تابان نے ان سے چند لمحوں کی اجازت طلب کی اور حویلی کے زنان خانے میں آ گیا۔ وہ سیدھا دونوں دوشیزاؤں کے پاس پہنچا۔ ترک دوشیزہ تابان کو دیکھتے ہی اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ تابان نے پوچھا۔

"تمہارا نام ہی کورا ہے؟" اس نے سر اوپر نیچے ہلا کر ہاں میں جواب دیا تابان نے پوچھا۔

"تم بھوری آنکھوں والے اس سردار کو جانتی ہو جو ابھی مجھ سے ملنے آیا ہے؟"

ترک دوشیزہ نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس سر گھٹنوں پر رکھ کر سسکیوں سے رونے لگی۔ اس کی آواز میں گریہ زاری تھی اور رحم کی التجائیں تھیں۔ تابان کو اسکے رونے نے متاثر کیا وہ دوشیزہ کے پاس بیٹھ گیا اور اسے دلاسہ دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی تو ہچکیوں کے درمیان کہنے لگی۔ "مالک میرا اگلا گھونٹ دو مگر اس درندے کے حوالے نہ کرو۔ وہ مجھ سے بہت بری طرح پیش آئے گا۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں مجھے اپنے پاس ہی رکھو۔"

تابان نے پوچھا۔ آخر ایسی کیا بات ہے جو تم اس سے اتنی خوفزدہ ہو؟"

وہ بولی۔ "مالک! میرے ہاتھوں اس کے چہرے پر زخم آ گیا تھا' اس نے مجھے بہت بری طرح مارا پیٹا' خوفناک دھمکیاں دیں اور گھسیٹتا ہوا گھوڑا گاڑی میں لے آیا۔ اس نے میرا لباس پھاڑ کر مجھے عریاں کر دیا میری قسمت اچھی تھی کہ اس وقت مقدونی فوج کے چند اہم سردار وہاں آ گئے ان کی وجہ سے میری جان بچ گئی۔ بعد میں مجھے شاہی محل منتقل کر دیا گیا۔ یہ شخص

میرے تعاقب میں وہاں بھی پہنچ گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ شاہ مقدونیہ سکندر سے مجھے مانگ لے لیکن اسی دوران۔۔۔۔۔۔۔ مجھے آپ کے حوالے کر دیا گیا۔۔۔۔۔۔۔"

کورا نامی دوشیزہ کی پوری روئیداد سننے کے بعد تابان نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ اسے سردار کے حوالے نہیں کرے گا اس نے کورا سے پوچھا۔

"لڑائی سے پہلے تم کس امیر کے پاس تھیں؟"

دوشیزہ نے کچھ دیر جھجکنے کے بعد کہا۔ "میں آقا غارس زنوب کی کنیز تھی میرا شمار شہزادی مارشا کی خاص خادماؤں میں ہوتا تھا۔"

تابان کی سماعت میں دھماکا سا ہوا۔ شہزادی مارشا کے نام کی گونج اس کے پورے جسم میں پھیل گئی۔ دوشیزہ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں ان تین خادماؤں میں سے تھی جو لباس بدلنے اور بناؤ سنگھار کرنے میں شہزادی مارشا کی مدد کرتی تھیں۔ میرا پورا نام کورال ویرے ہے شہزادی مجھے محبت سے کورا کہا کرتی تھیں۔" تابان آنکھیں پھاڑے کورا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ یہ دوشیزہ جو اسکے سامنے بیٹھی ہے شہزادی مارشا کی خاص خادمہ رہ چکی ہے۔ اس کا دل چاہا ان آنکھوں کو دیکھتا چلا جائے جو نہ جانے کتنے عرصے تک شہزادی مارشا کو

دیکھتی چلی آئیں ہیں۔ ان ہاتھوں کو چوم لے جو مارشا کے بال سنوارتے رہے تھے اور اس کے جسم کو چھوتے رہے تھے۔ ایک دم ہی کورا نامی یہ لڑکی تابان کے لیے نہایت اہم اور معزز ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔ اس نے پوچھا۔

"کیا آپ سچ مچ شہزادی کی خادمہ ہیں؟"

کورا نے کہا۔ "ہاں مالک میں پچھلے تین برس سے شہزادی کی خدمت پر مامور تھی مقدونیوں کے ہاتھوں گرفتاری کے وقت بھی میں غارس زنوب کے محل میں تھی۔"

ایکا ایکی تابان نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس دوشیزہ کو ہر گز ہر گز سردار شلال کے حوالے نہیں کرے گا۔ اس کا عیار ذہن کوئی تدبیر سوچنے لگا۔۔۔۔۔۔۔ کوئی ایسی تدبیر جس سے سردار شلال ناراض نہ ہو اور کورا بھی اسکے پاس رہے۔ جلد ہی یہ تدبیر اسکے ذہن میں آ گئی۔ اس نے کورا سے کہا کہ وہ سردار شلال کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جائے کورا کا رنگ ایک بار پھر زرد ہو گیا۔ تابان نے کہا۔ "گھبرائیں نہیں، میں آپکو اس کے ساتھ نہیں بھیجوں گا یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

کورا الجھن سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے تیار ہونے کا کہہ کر تابان واپس نشست گاہ میں آیا اور سردار شلال سے کہا کہ وہ کورا کو اس کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ تابان نے شلال کے دل کی بات کہی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ رسمی انکار کرنے کے بعد اس نے تابان کی یہ پیشکش قبول کر لی۔ تابان اندر گیا اور ڈری سہمی سی کورا کو لے کر واپس آ گیا۔ کورا کو دیکھ کر شلال کی آنکھوں میں نفرت و حقارت کی آگ جل اٹھی۔ ایسی ہی آگ اس کی آنکھوں میں تابان کے لیے بھی موجود تھی لیکن اس آگ کی روشنی اس نے تابان پر ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔ کچھ دیر بعد جب شلال اور داراب کورا کو لے کر رخصت ہونے لگے تو تابان نے شلال کو ایک طرف بلایا اور آہستگی سے کہا۔

"جناب! اگلے ہفتے دوپہر سے تھوڑی دیر قبل آپ اسے چند پہر کے لیے میرے پاس چھوڑ جایئے گا۔"

"وہ کیوں؟" شلال نے حیران ہو کر پوچھا۔

تابان نے کہا فتح کی شکر گزاری کے لیے بادشاہ نے ہفتے شام کو شاہی محل میں خاص عبادت کا اہتمام کیا ہے کورا کو بھی وہاں جانا ہے۔"

شلال نے کہا۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

تابان دھیمے لہجے میں بولا۔ "دراصل یہ لڑکی بڑی لمبی لمبی مناجات جانتی ہے 'بادشاہ سلامت کو بھی پتہ ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ ہفتے کی شام جب میں عبادت کے لیے آؤں تو اسے بھی ضرور ساتھ لاؤں۔ یہ زیوس دیوتا کی مورتی کے سامنے مناجات کرے گی۔"

شلال کا چہرہ اتر گیا، وہ مایوسی سے بولا۔ "یہ تو بڑا مسئلہ ہو گیا۔"

تابان نے ہوشیاری سے کہا۔ مسئلہ کیا ہو گیا۔ محل سے واپسی پر میں اسے پھر آپ کے حوالے کر دوں گا۔"

شلال نے کہا۔ "لیکن اس نے بادشاہ کے سامنے کچھ بک دیا تو میں اور تم دونوں مصیبت میں پڑ جائیں گے۔"

تابان بولا۔ "کیسے بکے گی؟ ہم اسے اس بارے میں سختی سے منع کر دیتے ہیں۔"

شلال نے کہا۔ "ہمارے منع کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ تم اس عورت ذات کو نہیں جانتے۔ اس نے وہاں ذرا بھی چونچ ہلادی تو دونوں کی گردنیں چھری کے نیچے آجائیں گیں۔"

تابان نے پُر سوچ انداز میں کہا۔ "ایک طریقہ اور ہے۔۔۔۔۔۔۔ ہفتے کے روز میں اکیلا چلا جاؤں اور بادشاہ پوچھے تو کہہ دوں گا کہ وہ بیمار تھی۔"

شلال کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "نہیں اس میں بھی اندیشہ ہے۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔۔ تم ایسا کرو کہ فی الحال اسے اپنے پاس ہی رکھو' یہ عبادت والا مرحلہ گزر جائے تو پھر سوچ لیں گے۔" تابان کے چہرے پر افسردگی ٹپکنے لگی۔ جیسے وہ شلال کی بد قسمتی میں برابر کا شریک ہو۔ شلال کورا کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتا ہوا حویلی سے واپس چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شاہ مقدونیہ کی عنایت کردہ حویلی میں تابان نے پانچ چھ روز خوب آرام میں گزارے۔ اس نے زندگی میں کبھی ایسی راحتوں کا تصور نہیں کیا تھا۔ اس کے سینے کا زخم بھی اب پہلے سے

بہتر تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک ایسی ہستی اس کے سامنے تھی جو ایک عرصے تک خلوت اور جلوت میں شہزادی مارشا کی ساتھی رہی تھی یعنی کورا۔ تابان کورا کو سامنے بٹھا کر پہروں دیکھتا رہتا۔ اسے کورا سے عجیب طرح کا انس ہو گیا تھا اور اس انس کی وجہ صرف یہ تھی کہ کورا کا تعلق شہزادی مارشا سے تھا۔ تابان کا دل چاہتا وہ ان ہونٹوں اور رخساروں پر ہزار جان سے فدا ہو جائے جن کے حسن پر مارشا کے حسن کا سایہ پڑتا تھا۔ وہ کورا سے شہزادی مارشا کی باتیں کرتا۔ شہزادی کے روز و شب کا تذکرہ سنتا اور اس کی عادات اور مصروفیات کے بارے میں جانتا۔ جب کورا یہ سب کچھ بتا رہی ہوتی تو وہ اتنی محو ہو جاتا کہ اسے اپنے آپ کی خبر نہ رہتی۔ ایک روز اس نے کورا سے ان آخری لمحوں کے بارے میں پوچھا جب مارشا اس سے جدا ہوئی تھی۔ کورا نے بتایا "اس روز شہزادی صبح سے ہی پریشان تھیں۔ وہ خطرے کو پہلے سے بھانپ لینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ انہوں نے اس روز صبح سویرے نہا دھو کر لباس تبدیل کیا اور کہا کہ آج وہ خیرات کرنا چاہتی ہیں وہ محل سے باہر آ گئیں اور سہ پہر تک مسلسل اپنے ہاتھوں سے خیرات بانٹتی رہیں۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ سہ پہر کے وقت وہ خواب گاہ میں آرام کرنے چلی گئیں۔ اس دوران خبر پہنچی کہ سکندر کی فوج نے فصیل توڑ دی ہے۔ شہزادی مارشا نے مجھے آقا غارس زنوب کی طرف دوڑایا۔ وہ انکی زبانی اس

خبر کی تصدیق چاہتی تھیں۔ میں آقا کو ڈھونڈتی ہوئی محل کے مردانے حصے میں پہنچی تو مقدونی فوج کا ایک دستہ محل پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس کے بعد قیامت کی گھڑیاں آئیں۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے آقا غارس اور مالکن نورا کو کاری زخم کھا کر گرتے دیکھا۔ میں شہزادی مارشا کی طرف واپس بھاگی لیکن راستے میں ہی مجھے اس دراز قد سردار نے دبوچ لیا۔۔۔۔۔۔۔"

اس ہولناک دن کی کہانی سن کر تابان کا غم بھی تازہ ہو گیا اس کے تصور میں وہ لمحے اجاگر ہوئے جب اخروٹ کے جنگل میں شہزادی مارشا اس سے جدا ہوئی تھی۔ اسکی فریادی آنکھیں تابان کی سوچوں کو جھلسانے لگیں۔ اس کا دل چاہا وہ اڑ کر مارشا کے پاس چلا جائے لیکن پھر سکندر کا جاہ و جلال اس کے سامنے آ گیا۔ سکندر کی مرضی کے بغیر وہ شہزادی تک کیسے پہنچ سکتا تھا۔ نہ جانے سکندر نے اسے کہاں رکھا ہوا تھا۔ وہ کن لوگوا ان کی تحویل میں تھی۔ خوش تھی یا غمگیں' زخمی تھی یا صحیح سلامت' مطمئن تھی یا بے قرار؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ ایک شام جب تابان کھانا کھا کر اپنی حویلی میں لیٹا ہوا تھا ملازم نے بتایا کہ بندی خانے کا داروغہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ تابان اس تنومند داروغہ کو پہلے سے جانتا تھا۔ چند

روز پہلے تابان کی موجودگی میں سکندر نے اسکو طلب کیا تھا داروغہ نے کہا کہ اسے بندی خانے جا کر کچھ مجرموں کی شناخت کرنی ہے۔

تابان نے پوچھا۔ "کیسے مجرم؟"

داروغہ نے کہا کہ فی الحال وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔

تابان خاموشی سے داروغہ کے ساتھ چل دیا۔ داروغہ جس رازداری سے آیا تھا اسی رازداری سے تابان کے ساتھ واپس روانہ ہو گیا۔ بندی خانے سے تقریباً دو میل کا فاصلہ انہوں نے گھوڑا گاڑی کے ذریعے طے کیا تھا۔ تابان بندی خانے کی عمارت کو اچھی طرح جانتا تھا' یہاں اس نے نہایت اذیت کے شب و روز گزارے تھے۔ بندی خانے کے اندر ایک کشادہ کمرے میں چند مقدونی سردار موجود تھے اور ایک طرف دو درجن کے قریب مجرم قطار باندھے کھڑے تھے۔ شکل و صورت اور حلیے سے یہ سب مقدونی فوج کے سپاہی نظر آتے تھے۔ تابان سے پوچھا گیا کہ وہ ان میں سے کسی کو جانتا ہے۔ تابان نے غور سے ایک ایک کا چہرہ دیکھا لیکن کسی کو شناخت نہ کر سکا۔ اس موقع پر اس نے ایک بار پھر داروغہ سے پوچھا کہ ان لوگوں کو کیوں شناخت کرایا جا رہا ہے۔ داروغہ نے حسبِ سابق اسے ٹال دیا۔ کچھ ہی دیر

بعد وہ ایک بار پھر گھوڑا گاڑی پر سوار تھے۔ راستے میں بھی تابان نے داروغہ سے اس کاروائی کے متعلق پوچھنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ داروغہ نے صرف اتنا بتایا کہ حکام بالا کی طرف سے حکم ملا تھا جو انہوں نے پورا کیا۔

تابان یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں اس کاروائی کا تعلق شہزادی مارشا سے تو نہیں۔۔۔۔۔۔۔ لیکن شہزادی تو سکندر کی حفاظت میں تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ نہ جانے کیوں تابان کو شہزادی کے معاملے میں الجھن محسوس ہونے لگی تھی۔ چند روز پہلے بھی مقدونی فوج کا ایک سردار اس کے پاس آیا تھا اور عجیب و غریب سوالات کرتا آیا تھا۔ ان سوالوں سے تابان کو اندازہ ہوا تھا کہ یہ شخص شہزادی مارشا کے عزیز و اقرباء کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو باتیں وہ تابان سے پوچھ رہا تھا وہ ساری باتیں مارشا سے بھی پوچھی جا سکتی تھیں بلکہ بہتر تھا کہ اس سے پوچھی جاتیں۔ اسی ادھیڑ بن میں گرفتار تابان حویلی پہنچا۔ شاید وہ رات بھر اسی معاملے پر سوچتا رہتا لیکن وہاں ایک دوسرے واقعے کی وجہ سے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ حویلی میں سردار شلال آیا بیٹھا تھا۔ آج سردار داراب اس کے ساتھ

نہیں تھا۔ تابان نے دیکھا شلال کے چہرے پر برہمی کے آثار ہیں۔ بظاہر وہ تابان کے ساتھ اخلاق کے ساتھ ہی پیش آیا۔

کہنے لگا۔ "تابان! تم نے کہا تھا کورا ہفتے کو شاہی محل میں دعا پڑھے گی لیکن میرے علم میں یہ بات نہیں آئی۔ مذہبی رسوم میں کل چار لڑکیاں شرکت کریں گی اور ان میں کورا کا نام نہیں ہے۔"

تابان نے اطمینان سے کہا۔ "کورا کی شرکت کے بارے میں بادشاہ نے مجھ سے زبانی کہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور ہفتہ کون سا دور ہے آپ خود دیکھ لیجیے گا شاید آپ شک کر رہے ہیں۔"

شلال نے جلدی سے کہا۔ "نہیں شک کی کوئی بات نہیں لیکن اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا نہیں شاید۔۔۔۔۔۔۔"

تابان نے کہا۔ "آپ بے فکر رہیں میں جو کہہ چکا ہوں وہی ہو گا ہفتے کی شب کورا آپ کے پاس ہو گی۔"

شلال کچھ دیر تابان کے پاس رکنے کے بعد واپس چلا گیا۔ وہ کوئی بچہ نہیں تھا۔ مقدونی فوج کا اہم سردار تھا۔ تابان کو صاف محسوس ہوا کہ وہ شک میں پڑ گیا ہے۔ اب تابان کو کورا کی فکر

لاحق ہوئی۔ وہ جلد از جلد اسے منظر سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ اس کام کے لیے وہ منصوبہ تو پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ اب صرف بہتر موقعے کی تلاش تھی۔

اگلی شب تابان نے کورا کو تیار ہونے کی ہدایت کی۔ اس نے ریشم کا زرق برق لباس پہنا اور سنگھار کر کے آ گئی۔ تابان نے رتھ بان کو حکم دیا کہ وہ رتھ حویلی کے صدر دروازے پر لے آئے۔ حویلی کے دروازے سے تابان کورا کے ساتھ رتھ پر سوار ہوا اور سیر کے لیے نکل گیا۔ یہ پورے چاند کی رات تھی۔ زرد چاندنی بال کھولے ایتھنز کے برباد شدہ در و دیوار پر رو رہی تھی۔ راکھ کے ڈھیر' سنگ مرمر کے ٹکڑے اور بدبو۔ یہ تھی اس شہر کی کل متاع۔ رتھ شہر سے نکل کر مضافاتی علاقے میں آ گیا۔ یہاں فضا قدرے صاف اور زندگی معمول پر تھی۔ قابض مقدونی فوج کے کئی افسر ہوا خوری کے لیے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ان کی گھوڑا گاڑیاں اور رتھ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ تابان کے حکم پر تابان کا رتھ بان ایک عجیب وضع کا باجا بجانے لگا تھا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں اس باجے سے ہم آہنگ ہو گئیں۔ یوں لگا جیسے چاند بھی اس دھن سے متاثر ہوا ہے اور موسیقی کی کشش اسے ساتھ ساتھ لیے آ رہی ہے۔ تابان نے نشہ آور مشروب کے کئی گھونٹ بھرے اور باجے کے نغمے کو پاؤں کی تھاپ

دینے لگا۔ شہر سے چند کوس دور جب رتھ ندی کے ساتھ ساتھ چلتا ایک سنسان سڑک پر مڑ رہا تھا' اور رتھ بان مست ہو کر پورے جوش سے باجا بجا رہا تھا' تابان بہ آہستگی اٹھا اور اپنی تلوار کا دستہ پورے زور سے رتھ بان کے کھوپڑے پر دے مارا۔ وہ باجے سمیت لڑھک کر رتھ سے نیچے جا گرا۔ تابان نے چابک دستی سے رتھ سنبھال لیا۔

رتھ رکتے ہی تابان نے اپنے لبادے کے اندر سے ایک میلی سی چادر نکال کر کورا کے سر پر ڈال دی۔ پھر اسے رتھ سے نیچے اتارا اور کھیتوں کے درمیان سے گزار کر ایک راستے پر لا کھڑا کیا۔ اس نے کورا سے کہا کہ وہ اس راستے پر سیدھی چلتی جائے تو تھوڑی ہی دیر میں ایک گاؤں تک پہنچ جائے گی۔ یہ گاؤں مقدونی فوجیوں سے بالکل محفوظ ہے اور وہاں اسے باآسانی پناہ مل سکے گی۔ کورا نے اشک بار نظروں سے تابان کی طرف دیکھا۔ چاندنی میں نہائے ہوئے وہ دونوں تھوڑی دیر گم صم کھڑے رہے پھر کورا نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"مالک! میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ انسان نہیں دیوتا ہیں۔"

تابان بے ڈھنگے پن سے مسکرایا۔ "یہ صرف آپ کا خیال ہے ورنہ میں آقاؤں کی ٹھوکروں میں رہنے والا بھگوڑا غلام ہوں۔ مجھ جیسا کمتر شخص یونان میں شاید ہی آپ کو کوئی ملے گا۔"

کورا نے سسکی لے کر کہا۔ "مالک! آپ شہزادی حضور کو تلاش کریں نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ اگر آپ جیسا ڈھونڈنے والا ہو تو وہ ضرور مل جائیں گی۔

تابان نے اسے تسلی دی۔ ذرا ہی دیر بعد کورا بل کھاتے ہوئے راستے پر چلتی تابان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ کچھ دیر اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ پھر اس نے جبڑے بھینچے اور ایک زوردار ٹکر رتھ کے آہنی پائیدان پر ماری۔ پورا رتھ جھنجھنا اٹھا اور گھوڑوں نے کان کھڑے کر لیے۔ ٹکر کے سبب تابان کا سر پھٹ گیا اور خون پیشانی سے بہہ نکلا۔ اس نے اطمینان کے ساتھ رتھ بان کو اٹھا کر رتھ میں لادا اور گھوڑوں کی راسیں سنبھال کر واپس روانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے روز سب کو پتہ چل گیا کہ بادشاہ کی طرف سے تابان کو بخشی جانے والی دوشیزہ اسے زخمی کر کے بھاگ گئی ہے۔ دوپہر کو یہ خبر شاہی محل تک بھی پہنچ گئی۔ تابان کو نہیں معلوم تھا کہ سکندر کا ردِ عمل کیا ہو گا اور ہو گا بھی یا نہیں۔ ظاہر ہے دوشیزہ تابان کو بخشی جا چکی تھی۔ اب اگر وہ بھاگ نکلی تھی تو یہ تابان کا ہی نقصان تھا۔ سکندر کو یا کسی دوسرے کو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ شام کے وقت تابان دوسری دوشیزہ کے ساتھ شاہی محل میں پہنچا آج عبادت کا دن تھا۔ شاہی محل میں اور بہت سے مہمان جمع تھے۔ ان مہمانوں میں تابان کو وہ عمر رسیدہ' دبلا پتلا شخص بھی نظر آیا جس کے چہرے پر جھریاں تھیں اور آنکھوں سے بے پناہ ذہانت جھانکتی تھی۔ تابان کو بتایا گیا تھا کہ اس کا نام ارسطو ہے اور یہ سکندر کا استاد ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ رات دیر تک جاری رہا۔ پھر مذہبی رسومات کی ادائیگی شروع ہوئی۔ رقص و موسیقی نے دیر تک ہنگامہ کئے رکھا۔ تب ایک خوبرو دوشیزہ کو زیوس دیوتا کے قدموں میں قربان کرنے کی سنگین رسم ادا ہوئی۔ اس کے بعد دیر تک مناجاتیں پڑھی جاتی رہیں۔ جب یہ سارے مرحلے طے ہو گئے اور مقدس شراب کے نشے میں ڈولتے ہوئے مہمان شاہی محل سے واپس جانے لگے تو سکندر کے خادم خاص نے تابان کو بتایا کہ اسے محل کے بالائی کمرے میں شاہ مقدونیہ سکندر کے حضور طلب کیا گیا ہے۔ تابان ٹھٹک گیا اسکے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ اس سے کورا کی گمشدگی کے بارے میں بازپرس کی جائے گی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ زینے طے کرتا بالائی منزل پر پہنچا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں اس سے پہلے سکندر اور تابان میں طویل گفتگو ہوئی تھی۔ اس کی آمد پر چوبداروں نے پیچھے ہٹ کر آبنوسی دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں سکندر کے علاوہ تین اور

افراد بھی موجود تھے۔ یہ سب اس دیوار گیر نقشے کے ساتھ بیٹھے تھے جس کے بارے سکندر نے اسے بتایا تھا کہ یہ روئے زمین کا نقشہ ہے۔ سکندر کے ہاتھ میں ایک موٹی کتاب تھی اور وہ اس کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ تابان اندر داخل ہوا اور تعظیم پیش کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ سکندر نے اسے مہربان نظروں سے دیکھا اور اپنے سرداروں کے برابر بیٹھنے کے لئے نشست دی۔ تابان ہچکچاتا ہوا اس نشست پر بیٹھ گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب تابان پر انکشاف ہوا کہ سردار شلال بھی وہیں موجود ہے۔ وہ خشمگیں نظروں سے تابان کو دیکھ رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اسے بھی کورا کے فرار کی خبر مل چکی ہے۔۔ اسی اثنا میں ایک اور لمبا تڑنگا سردار اندر داخل ہوا اور بادشاہ کو تعظیم پیش کر کے آخری خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ اب سکندر کے علاوہ وہ کل پانچ افراد تھے۔ تابان کو احساس ہوا کہ بات وہ نہیں جو وہ سمجھ رہا ہے۔ بادشاہ نے ان سب کو کسی اور معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے بلایا ہے۔ وہ کچھ مطمئن سا ہو گیا۔ سکندر نے کتاب بند کی اور ان پانچوں کو مخاطب کر کے بولا۔

"عزیز ساتھیو! ہم نے آپ کو ایک اہم سفر کے لیے منتخب کیا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ پر ہی اس عظیم سفر کی کامیابی کا دار و مدار ہے جو اہل یونان و مقدونیہ ہماری قیادت میں

شروع کریں گے۔۔۔۔۔۔۔ یوں تو اس مہم میں پانچوں برابر کے ذمہ دار ہیں تاہم نظم و ضبط کے لیے ہم نے شلال کو آپکا سردار مقرر کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ باہمی صلاح مشورے سے آپ سفر کو زیادہ سے زیادہ سود مند بنائیں گے۔"

مختصر تمہید کے بعد سکندر نے اس سفر کے اغراض و مقاصد تفصیل سے بیان کرنے شروع کئے۔ کتابوں، نقشوں اور قلمی مسودوں کی مدد سے اس نے پانچوں کے سامنے ہدایتوں کے انبار لگا دیے۔ کسی اور کا تو پتہ نہیں لیکن تابان دل ہی دل میں نوجوان بادشاہ کی قابلیت اور ذہانت کا معترف ہو رہا تھا۔ سکندر نے انہیں بتایا کہ وہ اس معلوماتی سفر کے لیے یونان کے مشرقی ساحل سے روانہ ہوں گے۔ بحیرہ ایجیئن میں اتر کر وہ درہ دانیال کا مشہور آبی راستہ اختیار کریں گے اور ٹرائے پہنچ جائیں گے۔ ٹرائے سے ایرانی علاقے میں داخل ہونا ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔۔۔۔۔۔۔ سفر کے لیے تمام ضروری انتظامات کئی روز پہلے ہی کیے جا چکے ہیں۔

شاہی محل کے خاص کمرے میں یہ اہم نشست رات گئے ختم ہوئی۔ سکندر کو تعظیمات پیش کرنے کے بعد وہ پانچوں کمرے سے نکل آئے۔ اس ملاقات کے دوران سکندر نے تابان

سے کورا کا بالکل ذکر نہیں کیا تھا۔ نہ ہی پیشانی پر بندھی پٹی کے بارے میں پوچھا تھا۔ انداز سے لگتا تھا کہ اسے اس بارے میں سب کچھ معلوم ہے تاہم شلال مسلسل تابان کو گھورتا رہا تھا۔ کمرے سے باہر آنے کے بعد اس کی آنکھوں میں غضب کی کیفیت اور شدت پکڑ گئی۔ تابان نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"سردار! آپ کا کہنا درست تھا۔ وہ لڑکی واقعی خطرناک نکلی۔ قسمت اچھی تھی جو جان بچ گئی ورنہ اس بدبخت نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔"

شلال نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "جب کسی کو اس کی اوقات سے بڑھ کر نواز دیا جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے بادشاہ کو سوچنا چاہیے تھا کہ تم اس لڑکی کو سنبھال بھی سکتے ہو یا نہیں۔"

ایک دوسرے سردار نے مسکرا کر کہا۔ "جس نے ساری عمر غلامی میں گزاری ہو اسے آقائی کا سلیقہ اتنی جلدی کیسے آسکتا ہے۔"

دوسرے سرداروں کی موجودگی میں شلال کھل کر بات نہیں کر رہا تھا ورنہ اسکی چمکدار بھوری آنکھوں سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ تابان پر شک کر رہا ہے۔ اسے خدشہ ہے کہ لڑکی بھاگی نہیں بھگائی گئی ہے۔ کچھ دیر تابان سے طنزیہ گفتگو کرنے کے بعد سردار شلال اور

دوسرے سردار گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ تابان بھی ایک دوسری گھوڑا گاڑی کے ذریعے اپنی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ٹھیک دو روز بعد تابان اپنے چاروں ساتھیوں کے ساتھ ایشیائی ساحل کی مہم پر روانہ ہو رہا تھا۔ وہ ایتھنز سے ماہی گیروں کے روپ میں روانہ ہوئے تھے۔ میلے کچیلے لباس۔ ناتراشیدہ داڑھیاں ایک بڑی کشتی میں ان کے جال اور دیگر ساز و سامان رکھا تھا۔ روانگی سے پہلے سردار شلال نے زیوس دیوتا کی مورتی کے سامنے شراب کے جام بہائے اور عبادت کی۔ زیوس دیوتا کو مسافروں کا محافظ سمجھا جاتا تھا اور سفر سے پیشتر اس کی خوشنودی حاصل کی جاتی تھی۔ تابان یہ ساری کاروائی خاموشی سے دیکھتا رہا۔ دل ہی دل میں وہ اپنے ہمراہیوں پر ہنس رہا تھا۔ اسے دیوی دیوتاؤں کے سامنے ادا کی جانے مذہبی رسومات سے ہمیشہ چڑ رہی تھی۔ ایسے موقعوں پر نہ جانے کیوں اس کا جی کسی مزیدار گستاخی کو چاہنے لگتا تھا۔

آخر رسومات ختم ہوئیں اور ان کی بادبانی کشتی دھیرے دھیرے یونانی ساحل سے دور ہونے لگی۔ تابان کی نگاہیں خود بخود خشکی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ دور ایتھنز کے در و دیوار دیکھنے

لگا۔ وہ در و دیوار جو بد نصیبی کی چادر میں چھپے ہوئے تھے۔ ایتھنز سے دور جاتے ہوئے نہ جانے کیوں تابان کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ اسے اس شہر سے عجیب وابستگی پیدا ہو گئی تھی یہ حسن و جمال کی دیوی شہزادی مارشا کا شہر تھا۔۔۔۔۔۔۔ کاش وہ رخصت ہونے سے پہلے ایک بار مارشا کو دیکھ سکتا۔ وہ مارشا کو انجانے خطروں میں چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ مارشا کے معاملے میں کوئی الجھن موجود ہے۔ کوئی بات جو اس سے چھپائی گئی ہے اور یہ بات چھپانے والا خود سکندر ہے۔ تابان نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ ایک بار مارشا کو دیکھنا چاہتا ہے۔ جواب میں سکندر نے اسے بری طرح جھڑک دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ وہ سفر سے واپسی پر مارشا کو تابان کے حوالے کر دے گا۔ یہ ایک بادشاہ کا وعدہ تھا۔ تابان کے لیے اس وعدے پر اعتبار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا' لیکن وہ دلی طور پر مطمئن نہیں تھا۔

شمال مشرق کی طرف چلنے والی مدھم ہوا سے بادبان پھڑپھڑا رہے تھے، یہ بجرہ نما کشتی دھیمی رفتار سے سمندر میں محو سفر تھی۔ یکایک تابان کو اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ کشتی کے اندرونی حصے سے تابان کا ایک ہمراہی اسے آوازیں دے رہا تھا۔ تابان اندر پہنچا چاروں سردار دبیز ایرانی قالین پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سردار شلال نے تابان سے کہا کہ

قہوہ پینے کو طبیعت چاہ رہی ہے۔ وہ کشتی کے مطبخ میں جا کر قہوہ بنا لائے لیکن اس سے پہلے بادبانوں کو ایک دفعہ اچھی طرح دیکھ لے۔ تابان نے سر جھکا کر سردار کی اطاعت کا اظہار کیا۔ باہر جا کر دونوں بادبانوں کے رسے وغیرہ درست کیے پھر کشتی کے عقب میں واقعہ ایک چوبی کوٹھڑی میں جا کر قہوہ تیار کرنے لگا۔ قہوہ بنا کر وہ واپس کمرے میں پہنچا اور پیالیاں میز پر سجا دیں۔ چاروں سرداروں نے میز پر نشستیں سنبھال لیں لیکن تابان کی پیالی نیچے زمین پر رکھ دی گئی۔ اس حرکت کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ تابان کو نیچے بیٹھ کر قہوہ پینا ہو گا۔ وہ کچھ دیر گم صم کھڑا رہا۔ پھر پیالی اٹھائی اور سر جھکا کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس پر پوری طرح واضح ہو گیا تھا کہ وہ اس مہم میں ایک ساتھی سے زیادہ ایک خادم کی حیثیت سے شامل ہے۔ سردار شلال اور دوسرے مقدونی سردار اسے وہ درجہ دینے پر ہرگز تیار نہیں تھے جو اسے سکندر نے دیا تھا۔ تابان کو اس انکشاف پر کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی وہ اپنی اوقات اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک غلام ہے اور مقدونی سرداروں کی نظر میں ایک غلام ہی رہے گا۔

اگلے تین چار روز میں اس کے اندازے بالکل درست ثابت ہوئے۔ سردار شلال اور دوسرے مقدونی سرداروں کا حقارت آمیز رویہ کھل کر سامنے آگیا۔ وہ سارا دن اس سے گدھے کی طرح کام لیتے 'بچا کھچا کھانا دیتے اور ان کی زہریلی نگاہیں ہر وقت اس کا تعاقب کرتیں۔ تابان نے بڑی سرعت سے ان حالات کے ساتھ سمجھوتا کرلیا تھا۔ وہ بڑی خوشدلی کے ساتھ مقدونی سرداروں کی خدمت میں مصروف رہتا۔ ان کے لیے کھانا بناتا۔ ان کے بستر درست کرتا' ان کے لیے مچھلیاں پکڑتا اور بادبانوں سے دست و گریبان ہو کر کشتی کا رخ درست رکھتا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جوں جوں ایتھنز کے ساحل سے دور آرہے ہیں مقدونی سرداروں کا رویہ سخت ہوتا جارہا ہے۔ ان میں سے صرف ایک یرغانامی سردار کبھی کبھی رحم کی نظروں سے دیکھ لیتا تھا لیکن دلجوئی کی بات کبھی اس نے بھی نہیں کی تھی۔

یوں تو ایتھنز سے ٹرائے تک کا سفر زیادہ طویل نہیں تھا لیکن وہ راستے کے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر رکتے ہوئے جارہے تھے۔ یہ تمام جزیرے نہایت خوشنما اور آباد تھے۔ ان میں زیادہ تر یونانی آباد تھے لیکن یہ یونانی آزادانہ طور پر رہ رہے تھے۔ انہیں ایران اور یونان کی چپقلش سے کوئی واسطہ نہیں تھا وہ صرف اپنی خوشحالی برقرار رکھنے کی فکر میں رہتے

تھے۔ سکندر اور اس کے مصاحبین کا خیال تھا ان میں سے بعض جزیروں کے حکمرانوں کی ہمدردیاں یونان کے ساتھ ہیں۔ سردار شلال اور اسکے ساتھی چونکہ ماہی گیروں کے روپ میں تھے اس لیے پچھلے تین روز سے انہوں نے کھلے سمندر میں جو مچھلیاں پکڑی تھیں وہ انہی جزیروں پر فروخت کردی تھیں۔ اس سے نہ صرف انہیں جزیرے کے لوگوں کو ایک نظر دیکھنے کا موقع ملا تھا بلکہ مچھلیوں کے عوض ضرورت کی اشیاء بھی حاصل ہوئی تھیں۔ ابھی تک اپنے سفر میں کہیں بھی انہیں ایرانی بحری بیڑے کے جہاز نظر نہیں آئے تھے۔

یہ سفر کے چوتھے روز کا واقعہ ہے۔ ان کی کشتی جزیروں سے دور کھلے سنسان سمندر میں رواں دواں تھی۔ شام سے تھوڑی ہی دیر بعد مطلع ابر آلود ہونے لگا۔ سمندر کے پانی میں ہلکی ہلکی موجیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ پانچوں کھانا وغیرہ کھا کر لیٹ گئے۔ رات کسی پہر یکے بعد دیگرے ان کی آنکھ کھلی۔ موسم شدت اختیار کرچکا تھا۔ سمندر میں تلاطم تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ بادبان گرانے کی ضرورت تھی تاکہ ہوا کی شدت سے کشتی غلط رخ نہ نکل جائے مگر اس صورت حال میں باہر جانے کی ہمت کون کرتا۔ ظاہر ہے یہ کام تابان کو ہی کرنا تھا۔ سردار شلال کا اشارہ پا کر وہ اٹھا اور بادبان گرانے میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران بارش

اور تیز ہو گئی۔ سرد ہوا تابان کے جسم کو چھیدنے لگی۔ جس وقت وہ بادبان گرا کر فارغ ہوا کشتی میں بارش کا پانی جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پانی باہر نکالنے کی ضرورت تھی۔ یقینی بات تھی کہ یہ کام بھی تابان کو ہی انجام دینا تھا' لہٰذا سردار شلال کے حکم سے پہلے ہی اس نے پانی کھینچنے والا برتن اٹھایا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ جتنا پانی وہ نکال رہا تھا اس سے زیادہ ہی جمع ہو رہا تھا۔ تابان کا خیال تھا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی اس کا ہاتھ بٹانے ضرور آئے گا لیکن یہ خیال بھی خام ہی ثابت ہوا۔

بارش برستی رہی اور تابان اپنے کام میں لگا رہا۔ کسی وقت جب بارش ہلکی ہو جاتی تو وہ چند گھڑیاں سانس لے لیتا۔ رات تیسرے پہر بارش کا زور ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ تابان کی مشقت بھی کم ہو گئی۔ دفعتاً کشتی کے تہہ خانے سے مدھم آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی زور زور سے لکڑے کے تختے پر ہاتھ مار رہا ہو۔ یہ آوازیں پچھلے چار روز میں تابان نے کئی بار سنی تھیں۔ پہلے پہل تو وہ اسے پانی کے ٹکرانے کی صدا سمجھا تھا لیکن اب اس کا خیال بدلتا جا رہا تھا۔ خیال بدلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تہہ خانے میں اترنے والا ہر دروازہ تقریباً ہر وقت بند رہتا تھا۔ صرف سردار شلال دو تین دفعہ تہہ خانے میں اترا تھا اور وہ بھی بڑی احتیاط

سے جیسے کوئی چوری کر رہا ہو۔ تہہ خانے کے دروازے پر ایک موٹا قفل لگا ہوا تھا اور اس کی چابی سردار شلال کے پاس تھی۔

قفل کھولنا تابان کے لیے کچھ مشکل کام نہیں تھا لیکن وہ شش و پنج میں تھا کہ ایسا کرنا ٹھیک رہے گا یا نہیں، مقدونی سرداروں کا رویہ تو پہلے ہی ٹھیک نہیں تھا کوئی اور بدمزگی ہو جاتی تو پورا سفر ہی خطرے میں پڑ جاتا۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ لکڑی پر ضربوں کی صدا پھر آنے لگی۔ رات کے سناٹے میں یہ صدا نسبتاً واضح تھی، صاف محسوس ہو رہا تھا کہ تہہ خانے میں کوئی جاندار موجود ہے۔ تابان نے دبے پاؤں جا کر کشتی کے اندرونی حصے میں جھانکا۔ اس کے ہمراہی سو رہے تھے۔ وہ خاموشی سے واپس آیا۔ کشتی میں سے تھوڑا سا پانی کھینچا پھر بلی کی چال چلتا تہہ خانے کے دروازے کی طرف آ گیا۔ یہ دروازہ ایک تختے کی صورت میں تھا جس نے تہہ خانے میں اترنے والے راستے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ دروازہ بند ہو کر فرش کا حصہ بن جاتا تھا۔ تابان نے گھٹنوں کے بل جھک کر دروازے کی درز سے کان لگا دیے۔ کچھ دیر سن گن لیتا رہا کوئی آواز نہیں آئی۔ اس نے آہنی قفل کی مدھم ضربوں سے دروازے پر دستک دی یکایک اندر سے وہی کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ صدا کے آہنگ سے ظاہر تھا کہ اندر جو

کوئی بھی ہے انسان ہے 'لیکن اگر انسان ہے تو پھر چیختا چلاتا کیوں نہیں۔۔۔۔۔۔۔؟ شاید اسکا منہ بند کر دیا گیا تھا۔

تھوڑی دیر اندر کی آوازیں سننے کے بعد تابان دوزانو بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے بھیگے بالوں سے ایک آہنی چمٹی نکالی یہ چمٹی ویسی ہی تھی جیسی غارس زنوب نے اس سے چھینی تھی۔ ابھی وہ چمٹی کو قفل کی طرف بڑھا ہی رہا تھا کہ عقب سے کھٹ پٹ کی صدا آئی۔ اس نے جلدی سے چمٹی لباس میں رکھ لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ مڑ کر دیکھا تو سردار شلال سامنے کھڑا تھا اس کی جلتی نگاہیں تابان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"یہاں کیا کر رہے تھے؟"

تابان نے اطمینان سے کہا۔ 'جناب نیچے سے آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے کوئی لکڑی کے تختے پر ضربیں لگا رہا ہو۔"

"ہوں۔۔۔۔۔۔۔بہت ہوشیار ہو تم 'لومڑی کی طرح عیار ہو۔"

تابان نے سر جھکا لیا جیسے جو کچھ سردار نے کہا اسے صدقِ دل سے تسلیم کر رہا ہو۔ اس کے انداز سے سردار کو اور تاؤ آ گیا۔ پھنکار کر کہنے لگا۔ "بڑا شوق ہے تمہیں تہہ خانے میں دیکھنے کا؟ دکھا دیں گے ذرا ایک دو دن ٹھہر جاؤ۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" تابان نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

اب جاؤ جو کام تمہارے ذمے تھا وہ کرو۔"

تابان خاموشی سے گھوم کر باہر آ گیا اور پانی کھینچنے والے برتن کے ذریعے پانی کھینچنے لگا۔

تابان ایک سخت جان شخص تھا لیکن گوشت پوست کا تھا۔ تمام رات سردی میں بھیگنے کی وجہ سے اگلے روز اسے تیز بخار ہو گیا۔ بخار ہی کی حالت میں وہ سارا دن کام میں جتا رہا۔ شام کو اسکی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ اس کا تمتمایا ہوا چہرہ اور سرخ آنکھیں دیکھ کر سردار یرغا کو اس پر ترس آ گیا۔ اس نے سردار شلال سے اسے آرام کرنے کی اجازت لے دی۔ فراغت پاتے ہی تابان نڈھال ہو کر بستر پر گر گیا۔ اس کا سارا جسم درد سے پھٹ رہا تھا اور سینے میں آگ سی روشن تھی۔ بخار کی وجہ سے اس پر غنودگی طاری ہو گئی اور وہ عجیب بے سروپا خواب دیکھنے لگا۔ کبھی وہ خود کو گھوڑوں اور خونخوار کتوں کے آگے بھاگتے ہوئے پاتا۔ کبھی خود کو

آہنی شکنجوں میں جکڑا ہوا دیکھتا اور یونانی آقاؤں کے کوڑے تابڑ توڑ اس کے جسم پر برستے۔ وہ چیختا لیکن اس کے گلے سے اپنی آواز کی بجائے کسی نامعلوم جانور کی آواز نکلتی۔ پھر اس نے شہزادی مارشا کو دیکھا وہ شراب سے بھرے ایک بہت بڑے بلوریں جام میں تیر رہی تھی۔ اس کا سانس پھول چکا تھا۔ وہ ڈوب رہی تھی اور تابان کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ یہ جام ایک بہت بڑے ہاتھ میں تھا۔ تابان سوچنے لگا' بالوں سے بھرا ہوا یہ مضبوط ہاتھ کس کا ہے۔۔۔۔۔۔ شاید کسی مقدونی سردار کا۔۔۔۔۔۔۔ شاید خود شاہِ مقدونیہ کا۔

اسکا دل غم سے پھٹنے لگا۔ وہ پاگلوں کی طرح اس جام کے گرد چکرانے لگا۔ یکایک ایک خوشنما آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ اس آواز کی طرف کھنچا چلا گیا۔ کھیتوں سے گھرے ایک طویل راستے سے گزر کر وہ ایک گاؤں میں پہنچ گیا۔ یہاں اس نے کورا کو دیکھا وہ ایک محفوظ چار دیواری میں ہمدرد لوگوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر تابان تھوڑی دیر کے لیے مارشا کا بے پناہ غم بھول گیا۔ باتیں کرتے کرتے اچانک کورا کے گلے سے سردار شلال کی آواز نکلنے لگی۔۔۔۔۔۔۔ تابان پریشان ہو گیا اور اس وقت اسے اندازہ ہوا کہ وہ خواب سے بیدار ہو چکا ہے اور کشتی میں اپنے بستر کے اوپر لیٹا ہوا ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر

سردار شلال اپنے ساتھیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ کشتی کھلے سمندر میں محو سفر تھی۔ غالباً رات کا دوسرا پہر ختم ہونے والا تھا۔ سردار شلال دوسرے پہر کے آغاز پر شراب نوشی شروع کرتا تھا اور پہر ختم ہونے تک مدہوش ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ مدہوش ہو رہا تھا۔ تینوں مقدونی سرداروں کی آوازیں بھی لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ ابھی تک تابان کو محو خواب سمجھ رہے تھے اس لیے کھل کر باتیں کر رہے تھے۔

سردار شلال کہہ رہا تھا۔

"میرا تو خیال ہے کل ٹھیک رہے گا۔ کل ہم بالکل محفوظ علاقے میں ہوں گے۔"

ایک سردار نے اختلاف کیا۔ "یہ کون سا غیر محفوظ علاقہ ہے۔ ایتھنز سے ہم دور نکل آئے ہیں کھلا سمندر ہے۔ کوئی جزیرہ بھی قریب نہیں میری رائے میں تو آج تماشا ہو جانا چاہیے۔"

سردار شلال نے کہا۔ "بادشاہ کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں اور اس کی نگاہیں بہت فاصلے تک دیکھ سکتی ہیں۔ ہم ایتھنز سے دور ہیں لیکن اتنے بھی دور نہیں۔ جہاں اتنے دن انتظار کیا ہے ایک دن اور کر لو۔"

تیسرے سردار نے کہا ہو سکتا ہے کل تک ہم ٹرائے کے نزدیک پہنچ جائیں۔ منزل قریب آ جائے تو سفر کا مزا ختم ہو جاتا ہے اس کھلے سمندر میں تفریح کا جو لطف ہے ایشیائی ساحل کے قریب نہیں ہو گا۔"

سردار شلال تذبذب میں دکھائی دے رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ کچھ دیر یہ گفتگو مزید جاری رہی۔ آخر سردار شلال ساتھیوں کا ہم خیال نظر آنے لگا۔ اس نے مقدونی سرداروں سے کہا۔

"لیکن یہ نہ ہو ہم اپنے حال میں مگن ہو کر ارد گرد کو بھول جائیں۔ ہوا کافی تیز ہے۔ بہتر ہے کہ ہم میں سے ایک باہر رہے اور کشتی کو درست سمت میں چلاتا رہے۔۔۔۔۔۔۔ اور ہاں اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔ ہمیں اسکے بارے میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔"

یکایک تابان کے جسم میں برق سی دوڑ گئی۔ اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ ہاتھ پاؤں باندھنے کی جو بات کی جا رہی ہے وہ خود اسی کے بارے میں ہے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ یہ کس تفریح کی بات ہو رہی ہے اور اس تفریح کے لیے تابان کے ہاتھ پاؤں باندھنا کیوں ضروری ہیں رہ رہ کر اس کا دھیان تہہ خانے کی طرف جا رہا تھا اور

اسکی چھٹی حس گواہی دے رہی تھی کہ اس ساری گفتگو کا تعلق تہہ خانے کے اسرار سے ہے۔

ایک دوسرے سردار کی آواز آئی وہ سردار شلال سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

"جناب ہاتھ پاؤں باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس غیر مسلح کر دیتے ہیں۔"

سردار شلال نے غصیلی سرگوشی میں کہا۔ "تم زیادہ ہرکولیس بننے کی کوشش نہ کرو۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔"

چند لمحوں بعد تابان کو اپنے بالکل قریب قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی بالکل پاس کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک ہاتھ حرکت میں آیا اور پیش قبض اسکی کمر سے جدا ہو گئی۔ تابان آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں زبردست کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ ظاہر تھا اب اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے جائیں گے۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ خاموشی سے اپنے ہاتھ پاؤں بندھوا لے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ کچھ دیر بعد اس کشتی میں کیا ہونے والا ہے۔ ممکن تھا کوئی اہم واقعہ ہو اور ممکن تھا کہ ایسا نہ ہو۔ تابان اسی ادھیڑبن میں تھا کہ

ایک سردار نے اسکے پاؤں باندھنے شروع کر دیے۔ اب سوچنے کا وقت نہیں رہا تھا تابان نے فیصلہ کر لیا کہ وہ فی الحال مزاحمت نہیں کرے گا۔

پاؤں بندھ گئے تو ایک سردار نے بے دردی سے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری۔ وہ کراہ کر اٹھ بیٹھا۔ سردار شلال نے جھپٹ کر اسکے دونوں بازو پشت کی طرف موڑ دیے اور یرغا جلدی جلدی کلائیوں کو رسی سے جکڑنے لگا۔ تابان حیرت سے اپنے ہمراہیوں کو دیکھ رہا تھا۔

"جناب! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے سردار شلال سے پوچھا۔

"جو کچھ ہو رہا ہے وہ تمہارے علم میں آجائے گا۔" زہریلے لہجے میں جواب ملا۔

"لیکن جناب میرا قصور؟"

"قصور تمہارا نہیں تمہارے گندے خون کا ہے جس میں اپنے آقاؤں سے بے وفائی اور دغا بازی رچ بس چکی ہے۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا مالک۔"

"ہم ابھی پوری وضاحت سے سمجھا دیتے ہیں۔" شلال نے زہر خند لہجے میں کہا۔

تہہ خانے کا دروازہ کھلا تھا اور اندر اکھاڑ پچھاڑ کی آوازیں آرہی تھیں۔ تابان کی نگاہیں تہہ خانے کے خلا پر مرکوز ہو گئیں۔ چند لمحے اور بیت گئے۔۔۔۔۔۔ اور پھر تابان کی آنکھوں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ اسے لگا جیسے سینے میں دل کی دھڑکن تھم گئی ہے۔ تہہ خانے کے دروازے سے کورا برآمد ہو رہی تھی۔ وہ ننگے سر تھی۔ تابان کی طرح اسکے ہاتھ بھی پشت پر بندھے تھے۔ اسکے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر سے پٹی باندھ دی گئی تھی۔ وہ اسی لباس میں تھی جس میں تابان نے ایک ہفتہ پہلے اسے ایتھنز کے نواحی گاؤں میں چھوڑا تھا۔ کورا کے پیچھے ہی پیچھے ایک مقدونی سردار نمودار ہوا اس کے ہاتھ میں ایک عریاں تلوار تھی جس کی نوک وہ بار بار کورا کے جسم سے لگا دیتا تھا۔ سردار شلال نے تابان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کیا خیال ہے اب تو تمہارا قصور بتانے کی ضرورت نہیں؟"

تابان خشک لبوں پر زبان پھیر کر رہ گیا کہنے سننے کے لیے اب کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ معلوم نہیں سردار شلال نے کورا کا کھوج کیسے لگایا تھا اور کیونکر اسے یہاں تک لانے میں کامیاب ہوا تھا۔ بہر حال اب وہ اسکے سامنے تھی۔ کورا کی بدنصیبی کا سوچ کر تابان کا دل غم سے لبریز

ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دینا چاہی لیکن اپنے جسم پر اس کا اختیار بہت کم رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا کاش چند گھڑیاں پہلے اسے اس قیامت کا علم ہو جاتا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسا کچھ ہو سکتا ہے۔ اب وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے کورا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بے بسی کی تصویر بنی اس کے سامنے تھی اور بے رحم شکاری سفاک نظروں سے اس کا نشانہ لے رہے تھے۔

تابان نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سردار شلال جو کچھ تم کرو گے یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔"

سردار شلال نے بدمست قہقہہ لگایا۔ "اور جو کچھ تم نے کیا وہ ٹھیک تھا؟ پہلے مجھے دھوکے میں رکھا کہ یہ لڑکی شاہی محل میں ہونے والی عبادت میں حصہ لے گی جب عبادت کا دن نزدیک آیا تو اسے رتھ میں بٹھا کر شہر سے باہر لے گئے۔ رتھ بان کو بے ہوش کیا اور لڑکی کو بھگا کر خود کو بھی زخم لگا لیا۔ لگتا ہے ایتھنز کے کسی تھیٹر میں اداکاری کرتے رہے ہو تم۔ مگر حقیقت اور اداکاری میں بہت فرق ہوتا ہے۔ حقیقی زندگی میں مہم جو بننے والے کو کبھی کبھی کتے کی موت بھی مرنا پڑتا ہے۔

سردار شلال کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ لوگ ڈرا دھمکا کر کورا سے سب کچھ پوچھ چکے ہیں۔ کورا کے ہاتھوں کی رسی اب تلوار سے کاٹ دی گئی تھی اور اسکے منہ سے کپڑا بھی نکال لیا گیا تھا۔ آزادی ملنے کے باوجود وہ قطعی بے بس تھی۔ چار ہٹے کٹے افراد کے نرغے میں وہ کیا کر سکتی تھی۔ ایک مقدونی سردار کی تلوار نے اسکے سر پر سایہ کر رکھا تھا۔ وہ لرز رہی تھی۔ بے چارگی کے عالم میں کبھی تابان اور کبھی مقدونی سرداروں کی طرف دیکھتی تھی۔

تابان نے خود کو لاچار پا کر کہا۔ "سردار شلال میں تم سے رحم کی درخواست کرتا ہوں۔"

سردار ڈھٹائی سے مسکرایا۔ "کس کے لیے۔ لڑکی کیے لیے یا تم دونوں کے لیے؟"

تابان نے کہا۔ "کیا مطلب؟ کیا میرے خون سے ہاتھ رنگنے کا فیصلہ بھی ہو چکا ہے؟"

"بالکل! سردار شلال نے اطمینان سے کہا۔ "یہ فیصلہ اسی روز ہو گیا تھا جب تم نے پہلا قدم اس کشتی پر رکھا تھا۔"

تابان کی ذہین نگاہیں اپنے ہمراہیوں کے چہرے ٹٹول رہی تھیں۔ ان چہروں پر اسے اپنے اور کورا کے خون کے چھینٹوں کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تھوک نگل کر بولا۔

"مجھے مار دو گے تو شاہ مقدونیہ کو کیا جواب دو گے؟"

شلال نے شراب کا نیا جام بھرتے ہوئے کہا۔ "یہ تم نے قطعی غیر اہم سوال کیا ہے۔ ایسی خطرناک مہم میں کام آجانے والے کے لئے سکندر ہم سے کیوں سوال کرے گا۔ بہر حال ہم اسکی نگاہوں میں تمہارا مقام بلند نہیں ہونے دیں گے۔ کوئی ایسی کہانی سنائیں گے جس سے ظاہر ہو کہ تم اپنی جلد بازی اور بے وقوفی سے موت کے منہ میں گئے تھے۔"

تابان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اگر میں کہوں کہ مقدونیہ جاکر میں شاہِ مقدونیہ سے کورا کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا اور باقی کے راستے میں تمہارا اطاعت گزار رہوں گا تو۔۔۔۔۔۔۔؟"

سردار شلال نے ایک نظر تابان کے چہرے پر ڈالی پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کے قہقہے سمندر کی بیکراں وسعت میں دور تک تیرتے چلے گئے۔ اس کے ماتحتوں نے بھی حتی المقدور اس کا ساتھ دیا۔ بصد مشکل اپنے قہقہوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے تابان کی طرف انگلی اٹھائی اور ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

"دیکھ رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ فرق ہوتا ہے اعلیٰ اور ادنی خون میں۔ موت کو سامنے دیکھا ہے تو ساری جوانمردی بھول گئی ہے۔ کہتا ہے لڑکی کے ساتھ جو کچھ بھی کرو' مجھے چھوڑ دو۔ ہاہاہا۔۔۔۔۔۔۔۔ دیکھی ہے یہ جوانمردی۔" اس نے آگے بڑھ کر ایک زبردست ٹھوکر تابان کے سر میں ماری اور غصے سے چیخ کر بولا۔

"بدبخت تیرا انجام اس لڑکی سے زیادہ برا ہو گا۔ ہم تجھے تھوڑا تھوڑا کاٹ کے سمندر میں پھینکیں گے۔ تیرا جسم تیری آنکھوں کے سامنے گوشت کی آخری بوٹی سے محروم ہو گا۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔ تم نے قتل کا ایسا فنکارانہ طریقہ اپنی زندگی میں نہیں دیکھا ہو گا۔۔۔۔۔۔ تم نے کیا سمجھا تھا۔ سردار شلال کو دھوکا دے لو گے؟ شیر کے منہ سے نوالہ چھین لو گے؟ سیلاب کے تند ریلے سے ایک حقیر تنکے کو بچا لو گے؟ اپنی طرز کے بے مثال بیوقوف ہو تم۔ تمہاری سزا بھی نوعیت میں بے مثال ہو گی۔"

سردار شلال کی خوفناک باتیں سن کر کورا رونے لگی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں خوف کا سمندر موجزن تھا۔ "خاموش ہو جا۔" سردار شلال نے اسے بری طرح جھڑکا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ہونٹ ڈھانپ کر اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ تابان کو کچھ سجھائی

نہیں دے رہا تھا وہ کیا کرے۔ در حقیقت وہ دونوں لوہے کے جال میں پھنس چکے تھے۔ اس تاریک آسمان کے نیچے اور بیکراں سمندر کے اوپر وہ چار وحشیوں کے رحم و کرم پر تھے کوئی اس کشتی میں ان کی مدد کو آنے والا نہیں تھا۔ تابان کو اپنی جان کی پرواہ نہیں تھی۔ ایسی پرواہ اس نے کبھی کی ہی نہیں تھی۔ لیکن کورا کی مصیبت کا سوچ کر اس کا دل خون ہو رہا تھا وہ کسی قیمت پر کورا کو بچا لینا چاہتا تھا۔ کورا جو شہزادی مارشا کی خاص خادمہ تھی اور جس کے چہرے پر تابان کو شہزادی مارشا کے حسن کا سایہ نظر آتا تھا۔ تابان نے بے پناہ قوت کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو جنبش دینا چاہی۔ بان کی مضبوط رسی اسکے گوشت میں دھنسنے لگی۔ باندھنے والوں نے اسے بڑی احتیاط سے باندھا تھا۔ وہ اپنی یا کورا کی مدد کرنے سے بالکل معذور تھا۔ یکا یک اسکے کانوں میں سازوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا دو مقدونی سردار کانسی کے بنے ہوئے لمبے لمبے باجے بجا رہے تھے۔ سردار یرغا مطبخ سے ایک خالی دیگچہ اٹھا لایا اور ڈھولک کی تھاپ دینے لگا۔ سردار شلال لکڑی کے فرش کو پاؤں سے بجا بجا کر بے ڈھنگے پن سے ناچنے لگا۔ اس کی آنکھیں نشے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ناچتے ناچتے اس نے کورا کو تھام لیا اور اپنے ساتھ رقص پر مجبور کرنے لگا۔ کورا رو رہی تھی فریادی نظروں سے تابان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد تابان کی نگاہوں کو دیکھنے کی تاب نہ رہی۔ اس نے آنکھیں

بند کر لیں۔ کشتی میں کورا کی چیخیں گونجنے لگیں۔ سردار شلال اسے نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ تابان نے سانس روک کر اپنے جسم کی پوری قوت صرف کی اور اسکی کلائیوں پر لپٹی ہوئی رسیوں میں سے ایک رسی تڑاخ سے ٹوٹ گئی۔ رسی ٹوٹنے کی آواز خطرناک ہو سکتی تھی لیکن بے ہنگم موسیقی کے شور نے اس آواز کو دبا لیا۔ اب تھوڑی سی مزید کوشش کر کے تابان اپنے ہاتھ آزاد کرا سکتا تھا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب ابھی بھی اندھیرے میں تھا۔ تابان کے پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے اور وہ ہتھیار سے بھی محروم تھا۔ بے بسی نے اپنے پنجے اس طرح گاڑے رکھے تھے کہ رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ ایکا ایکی ایک نامانوس شور نے سب کو ٹھٹکا دیا۔ باجے خاموش ہو گئے، رقص تھم گیا اور کورا کی چیخیں مزید بلند ہو گئیں۔

تابان نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سردار شلال اور اس کا ایک ساتھی بھاگتے ہوئے کشتی کے اگلے حصے کی طرف جا رہے تھے تابان نے لیٹے لیٹے سر اٹھا کر دیکھا اور اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ کشتی سے بیس تیس گز کی دوری پر دو کشتیاں تیزی سے ان کی طرف آ رہی تھیں۔ ان پر موجود ملاح چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ تابان نے الفاظ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ان کو

رکنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ اس ہدایت پر عمل کرنے کی بجائے یرغا نے سردار شلال کی کشتی پر تیسرا بادبان بھی کھول دیا تھا اور کشتی کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں کشتیوں نے بھی اپنی رفتار تیز کر لی اور بائیں پہلو سے کشتی کے ساتھ آن لگیں۔ تابان حیران ہو رہا تھا کہ یہ دونوں کشتیاں اندھیرے میں کیسے نمودار ہو گئیں ہیں۔ ان کشتیوں پر تقریباً آٹھ افراد سوار تھے۔ ان سب کے لباس ایک جیسے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کسی جزیرے کے سپاہی ہیں۔ ان سپاہیوں نے کود کود کر تابان والی کشتی پر آنا شروع کیا تو سردار شلال اور اسکے ساتھیوں نے تلواریں سونت لیں اور حملہ آوروں سے بھڑنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کشتی پر گھمسان کی لڑائی ہونے لگی۔ کورا چلاتی ہوئی بھاگی اور تابان کے قریب آ کر سمٹ گئی۔ وہ تابان کے ہاتھ کھولنے میں مصروف تھی جب دو آتشیں تیر سنسناتے ہوئے تابان کے سر پر سے گزرے اور کشتی کے بادبانوں میں جا لگے۔ چند ساعتوں میں بادبانوں نے آگ پکڑ لی۔ اسی دوران جلتی ہوئی چند مشعلیں کشتی کے عقبی حصے پر بھی گریں اور شعلے بھڑک اٹھے۔ سردار شلال اور اسکے ساتھی بے جگری سے مقابلہ کر رہے تھے اور انہوں نے حملہ آوروں میں سے چند کو ہلاک بھی کر دیا تھا لیکن ان کا اپنا جانی نقصان بھی ہوا تھا۔ لڑائی کی شدت کے سبب کشتی بری طرح ڈول رہی تھی اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت الٹ جائے گی۔

دفعتاً تابان کی نگاہ اپنے عقب میں اٹھ گئی وہ سناٹے میں رہ گیا کم از کم تین کشتیاں اور ان کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ ان پر کئی درجن مسلح افراد موجود تھے۔ درحقیقت سب کشتیوں نے اپنی روشنیاں گل کر رکھی تھیں۔ اب قریب آ کر انہوں نے اپنی روشنیاں جلائی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے سمندر میں ابھی ابھی نمودار ہوئی ہوں۔ چند ہی لمحوں میں یہ کشتیاں بھی قریب پہنچ گئیں اور ان کے سوار کود کود کر اپنے ساتھیوں کی مدد کو آ گئے۔ سردار شلال کے دو ساتھی ہلاک ہو گئے تھے جب کہ وہ خود بھی زخمی ہوا تھا۔ پلک جھپکنے میں ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں کورا اور تابان بھی شامل تھے۔ کشتی اب ساز و سامان سمیت دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ اس میں رکنا خطرناک تھا۔ وہ بڑی سرعت کے ساتھ دوسری کشتیوں میں منتقل ہو گئے۔ سردار شلال گرفتا ہونے کے باوجود مزاحمت کر رہا تھا وہ چیخ رہا تھا۔ دو سپاہیوں نے اسے اوندھا گرا کر اسکی مشکیں کس دیں اور اسکے منہ میں کپڑا اٹھونس دیا۔۔۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر پہلے جو حالت سردار شلال نے کورا کی کر رکھی تھی اب خود اس

کی ہو گئی تھی۔ یکایک جلتی ہوئی کشتی بحیرہ ایجیئن کے سرد پانی میں ڈوبنا شروع ہو گئی۔ گاڑھا سفید دھواں فضا میں بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی کی سطح پر سوائے بلبلوں کے اور کچھ نہ رہ گیا۔ وہ کشتی جس پر تھوڑی دیر پہلے شیطان نے جشن برپا کر رکھا تھا سردار یرغا اور سردار نارنگ سمیت تاریک پانیوں میں اتر چکی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سردار شلال اور اس کے ساتھی کو تابان اور کورا کے ساتھ ہی جزیرے پر لایا گیا۔ ان چاروں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ جزیرہ گھنے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ جگہ جگہ آبادی کی روشنیاں نظر آتی تھیں۔ آثار سے لگتا تھا کہ یہ خاصا بڑا جزیرہ ہے۔ جوں جوں وہ ساحل سے ہٹتے گئے، سڑکیں کشادہ اور آبادی گنجان ہوتی گئی۔ انہیں دھکیل دھکیل کر ایک گھوڑا گاڑی میں سوار کر دیا گیا۔ گاڑی میں صاف ستھرے لباسوں والے سپاہی موجود تھے۔ انہیں تابان وغیرہ کے غلیظ جسموں سے بُو آ رہی تھی اور وہ بُری طرح ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ راستے میں تابان نے اندازہ لگایا کہ کورا سپاہیوں کو اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہے۔ تابان نے آنکھوں کے اشارے سے اسے منع کر دیا کہ فی الحال وہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ جس

وقت کشتی پر قبضہ ہوا، تابان اور کورا کی حالت سردار شلال کے قیدیوں کی سی تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن جزیرے کے سپاہی ان سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہے تھے جہاں انہوں نے سردار شلال کو مار اپیٹا تھا، وہاں تابان اور کورا کو بھی سخت رویے کا نشانہ بنایا تھا۔

گھوڑا گاڑی جزیرے کے مختلف راستوں سے گزرنے کے بعد ایک بہت بڑی عمارت کے سامنے رکی۔ یہ عمارت ساحل سے زیادہ دور نہیں تھی اور سرسبز درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یہاں تابان کو بے شمار چھکڑے کھڑے نظر آئے۔ ان چھکڑوں کے آگے لمبی ایال والے چھوٹے قد کے گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ عمارت کے اندر سے عجیب طرح کی بدبو پھوٹ رہی تھی اور اس بُو نے ارد گرد کی فضا کو متعفن کر رکھا تھا۔ یہ مچھلیوں کی بو تھی۔ تابان نے اندازہ لگایا کہ یہ ایک کارخانہ ہے جہاں مچھلی کی چربی سے تیل وغیرہ بنایا جاتا ہے۔ عمارت کے اوپر ایک بہت بڑی پون چکی نظر آ رہی تھی۔ اس چکی سے غالبا تیل نکالنے والے کسی آلے کو حرکت دی جاتی تھی۔ سردار شلال، تابان، کورا اور ان کے ساتھی سردار گونسل کو اس عمارت کے ایک وسیع و عریض کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ آہنی سلاخوں والے اس کمرے کے فرش پر غلیظ لباسوں والے بے شمار قیدی پھیلے ہوئے تھے، وہ سو رہے تھے۔

کمرے میں جلنے والی مشعلوں کی روشنی میں ان کے چہرے مدقوق اور زرد نظر آتے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مسلح سپاہیوں نے چاروں کے ہاتھ کھول دیے اور انہیں ایک کونے میں دھکیل دیا۔

تابان کا یہ اندازہ درست تھا کہ عمارت تیل نکالنے کا کارخانہ ہے۔ اگلی صبح اس نے بے شمار مزدوروں کو اس کام پر جتے ہوئے دیکھا۔ جدھر نگاہ اٹھتی تھی، لکڑی کے کولہو نما آلے اور بڑی بڑی بھٹیاں نظر آتی تھیں جن پر جہازی کڑاؤ چڑھے ہوئے تھے۔ بدبو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ مزدوروں کی نگرانی کرنے والے نہایت سخت چہرہ لوگ تھے۔ وہ ہاتھوں میں کوڑے لہراتے ادھر سے اُدھر دندناتے پھرتے تھے۔ ایسے ہی ایک نگران نے سردار، تابان اور کورا وغیرہ کو بھی کام پر لگا دیا۔ وہ بدبودار چربی کے بڑے بڑے لوتھڑے قصاب خانے سے اٹھا کر ہتھ گاڑیوں پر لادنے لگے۔ یہ ہتھ گاڑیاں ان لوتھڑوں کو بھٹیوں کی جانب لے جاتی تھیں۔

تابان کو زیادہ فکر کورا کی تھی۔ وہ اس غلیظ ماحول میں شبنم میں نہائے ہوئے پھول کی طرح تھی۔ یہاں کسی بھی وقت کوئی بے رحم ہاتھ اس کی نوشگفتہ پتیاں بکھیر سکتا تھا۔ ہر کوئی اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ قیدیوں کی آنکھوں میں نگرانوں سے بڑھ کر ہوس

تھی اور نگران تو پھر نگران تھے۔ وہ کورا کو اپنے لیے لقمہ تر سمجھ رہے تھے۔ تابان سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ اس چار دیواری میں کوئی قانون قاعدہ بھی ہو گا یا نہیں۔ وہ کورا کی طرف سے پوری طرح باخبر تھا اور ہر گھڑی اسے نگاہ میں رکھ رہا تھا۔ وہ بیچاری ایک تو رات کے خونی واقعات سے سہمی ہوئی تھی اوپر سے اس قید خانے کی مشقت گلے پڑ گئی تھی۔ اس کا رنگ زرد تھا اور پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ چربی کے لوتھڑے اٹھاتے ہوئے اسے بار بار ابکائی آ رہی تھی اور تابان دیکھ رہا تھا کہ اس نے خود پر بڑی مشکل سے قابو پا رکھا ہے۔ سردار شلال چونکہ رات کی لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا لہٰذا اسے کام پر نہیں لگایا گیا تھا۔ وہ اپنا زخمی بازو گردن میں لٹکائے ایک کونے میں بیٹھا تھا اور تابان کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے یہ سارا کیا دھرا اسی کا ہو۔

دوپہر تک تابان وغیرہ کام پر لگے رہے۔ اس دوران تابان نے یہاں کے ماحول کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ اس عمارت میں زیادہ تر قیدی مرد تھے، تاہم چند فیصد عورتیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ سب قیدی ہڈیوں کے ڈھانچے ہو رہے تھے۔ ان کے جسموں پر مار پیٹ کی نشانیاں بھی کثرت سے نظر آتی تھیں۔ ہر قیدی کی گردن میں ایک آہنی کڑا تھا جس پر اس

کے کوائف کندہ کیے گئے تھے، تاہم تابان اور اس کے ساتھیوں کی گردنیں ابھی ان آہنی کڑوں سے آزاد تھیں۔۔۔۔۔۔۔۔ دوپہر کے وقت جب سب قیدیوں نے کھانا حاصل کرنے کے لیے طویل قطاریں بنانا شروع کیں، چند مسلح محافظ آئے اور ان چاروں کو دھکیلتے ہوئے ایک طرف لے چلے۔ وہ چند طویل اور تاریک برآمدوں سے گزرتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں پہنچے۔ اس کمرے کی سنگی دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں کندہ تھیں۔ دو مزین کرسیوں پر مقامی فوج کے اعلیٰ عہدیدار بیٹھے تھے ان میں فربہ گردن والا شخص اس قید خانے کا منتظم اعلیٰ تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی ایک خونی جلاد کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ اس نے ان چاروں کو سر تا پا گھورا پھر محافظوں کو حکم دیا کہ وہ سردار شلال اور سردار گونسل کو دوسرے کمرے میں لے جائیں۔ جب وہ دونوں چلے گئے اور منتظم کے سامنے تابان اور کورا ہی رہ گئے تو منتظم نے تابان سے پوچھا۔

"تم کون ہو اور ان لوگوں نے تمہیں کہاں سے گرفتار کیا؟"

ان لوگوں، سے منتظم کی مراد سردار شلال اور گونسل سے تھی۔

تابان نے کہا۔ "محترم! میری ساتھی لڑکی ایتھنز کے ایک سوداگر کی بیٹی ہے اور میں ان لوگوں کے ہاں نوکر تھا۔ تین روز پہلے میں جزیرہ ایوبویا کے قریب اپنے مالک کے ساتھ کھلے سمندر میں مچھلیاں پکڑ رہا تھا کہ ان ماہی گیروں سے ہمارا جھگڑا ہو گیا۔ یہ خطرناک لوگ ہیں، انہوں نے میرے مالک کو تو زخمی کر دیا اور مجھے اور مالک کی بیٹی کو زبردستی اپنی کشتی پر سوار کر لیا۔ انہوں نے تین روز سے ہمیں باندھ کر رکھا ہوا تھا اور دانیال کے کسی جزیرے میں فروخت کر دینا چاہتے تھے۔"

قید خانے کا منتظم ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سجا کر بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، ہم تمہاری اس کہانی پر یقین کر لیں گے؟" اس نے اپنی گود سے سنگِ یشب کی ایک خوبصورت زنجیر اٹھائی اور زور سے تابان کے سینے پر دے ماری۔ فرش پر گر کر قیمتی زنجیر کے کئی مہرے ٹوٹ گئے۔ منتظم غرا کر بولا۔ "یہ زنجیر تمہاری ساتھی لڑکی کی گردن سے اتاری گئی تھی۔ یہ ان دوشیزاؤں کے گلے میں پائی جاتی ہے جو شاہِ مقدونیہ کے محل میں کام کرتی ہیں۔ یہ لڑکی کسی سوداگر کی بیٹی نہیں، شاہی محل کی خادمہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ بہتر ہے کہ تم لوگ اپنے

بارے میں خود ہی سب کچھ بتا دو، ورنہ یہ نازک اندام لڑکی زیادہ سختیاں برداشت نہیں کر سکے گی۔"

تابان تیزی سے اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اب چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ منتظم سو فیصد درست کہہ رہا تھا۔ کورا کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی اصلیت چھپا سکتی۔ سردار شلال نے نہ صرف یہ غلطی کی تھی کہ کورا کو ساتھ لے آیا تھا بلکہ اس کی بیوقوفی کے سبب کورا اس مہم کے بارے میں بھی بہت کچھ جان چکی تھی غالباً شلال وغیرہ کورا کے سامنے ہی اپنے سفر کے بارے بات چیت کرتے رہے تھے۔ اب تابان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ منتظم اعلیٰ کو اپنے اور اپنے مقاصد کے بارے اختصار سے بتا ڈالے۔

تابان کی زبانی اصل کہانی سن کر منتظم کی پیشانی پر فکر کی گہری لکیریں ابھر آئیں بحیرہ ایجیئن کے یہ تمام جزائر یونان اور ایران کے درمیان غیر جانبدار تھے لیکن ان کی خوشحالی ایران کی سرزمین سے وابستہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ نسلاً یونانی ہونے کے باوجود ایران سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اگر سکندر ایشیائی ساحل کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں دلچسپی لے رہا تھا تو یہ مقامی افسروں کے لیے فکر مندی کی بات تھی۔ حالانکہ تابان نے اس عظیم الشان لشکر

کشی کا ذکر تک نہیں کیا تھا، جس کی تیاری یونان اور مقدونیہ میں ہو رہی تھی پھر بھی سردار شلال کی مہم کے متعلق جان کر مقامی افسروں کے ماتھے ٹھٹک گئے۔

تابان اور کورا سے تادیر پوچھ گچھ ہوتی تہی۔ پھر ان سے علیٰحدہ علیٰحدہ سوالات کیے گئے۔ یہی عمل سردار شلال اور گونسل کے ساتھ بھی دہرایا گیا۔ سردار شلال سے منتظم کا رویہ خاص طور پر بہت سخت تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ مہم کا نگران تھا، دوسرے کشتی میں لڑائی کے دوران اس کے ہاتھوں میں مقامی سپاہی بھی قتل ہو چکے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔ طویل پوچھ گچھ کے بعد انہیں محافظوں کی کڑی نگرانی میں ایک دوسری عمارت میں پہنچا دیا گیا۔ یہ عمارت اسی بدبودار قید خانے کا ایک حصہ تھی، لیکن یہاں حفاظتی انتظامات زیادہ سخت نظر آتے تھے۔ اونچی چار دیواری پر نوکدار آہنی سلاخیں لگی تھیں اور محافظوں کے لیے برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس عمارت میں داخل ہوتے ہی کورا کو اس سے جدا کر دیا گیا۔ سردار شلال، گونسل اور تابان کو ایک نیم تاریک تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ اس تہہ خانے میں پہلے سے دو قیدی بند تھے۔ ان قیدیوں کے سر اور چہرے کے بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے اور جسم

مشتِ استخواں دکھائی دیتے تھے۔ تاہم اس قید خانے میں صفائی کا انتظام بیرونی تہہ خانے سے بہتر تھا۔ بدبو زیادہ نہیں آتی تھی اور قیدیوں کے لیے بستر بھی موجود تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دو ہی روز میں تابان قید خانے کے اجنبی قیدیوں سے بے تکلف ہو گیا۔ ان میں سے ایک قیدی گونگا اور بہرہ تھا۔ اس کا نام کسی کو معلوم نہیں تھا۔ دوسرا قیدی ایتھنز سے تعلق رکھتا تھا، اس نے تابان کو اپنا نام نورین بتایا۔ نورین کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ تھی۔ اسے اس قید خانے میں ایک برس ہونے کو آیا تھا۔ اس تاریک تہہ خانے میں اسے نہ جانے کون سا مرض لاحق ہو گیا تھا، گاہے گاہے اسے پیٹ میں شدید قسم کا درد اٹھتا تھا اور وہ نیم جان ہو جاتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس جزیرے کا نام سکوپے لاس ہے۔ ایک روز علی الصبح نورین نے اچانک اٹھ کر سردار شلال کی قدم بوسی کی اور یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ وہ سردار شلال کو اچھی طرح جانتا ہے۔ تابان اور شلال وغیرہ حیران رہ گئے۔ نورین نے انہیں یہ بتا کر مزید حیران کر دیا کہ اس سے پہلے اس نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا وہ غلط تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہ

دس برس تک سکندر کی فوج میں دستہ سالار رہا ہے اور اس حیثیت میں وہ ایک موقع پر سردار شلال کی کمان میں لڑ بھی چکا ہے۔

اس نے سردار شلال سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "جناب میں آپ کی پہلی جھلک دیکھنے کے ساتھ ہی پہچان گیا تھا لیکن آپ کے دونوں ساتھی میرے لیے اجنبی تھے، اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آپ کس حیثیت سے اور کیوں یہاں آئے ہیں۔ آپ پر اپنا آپ ظاہر کرنے سے پہلے میں پورا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔ امید ہے اس گستاخی کے لیے آپ تینوں مجھے معاف فرمائیں گے۔"

سردار شلال نے کہا۔ "تم نے ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ اس موقع پر تمہیں ایسی ہی احتیاط کرنی چاہیے تھی۔"

اس روز نورین اور وہ تینوں بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ نورین نے سردار شلال کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس نے انہیں یہ اطلاع دے کر مخمصے میں ڈال دیا کہ ایک برس پہلے وہ بھی اسی مقصد کے تحت بحیرہ ایجیئن کے سفر پر روانہ ہوا تھا، جس مقصد سے وہ تینوں آئے ہیں۔

سردار شلال نے کہا۔ "میں تمہاری بات سمجھا نہیں"

نورین نے تہہ خانے کے اکلوتے روزن میں سے آتی ہوئی دھوپ کی لکیر پر نظریں جمائیں اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جناب! یہ کہانی آج سے دو برس پہلے شروع ہوئی تھی۔ سکندر کے والد شام مقدونیہ فیلقوس نے ایک جری نوجوان زرناب کو جاسوسی کی غرض سے ایشیائی ساحل کی طرف روانہ کیا تھا۔ زرناب ایک بڑا ہوشیار اور بیدار مغز شخص تھا۔ شاہِ فیلقوس کو امید تھی کہ وہ ایشیائی ساحل کے بارے میں جو معلومات حاصل کر کے آئے گا وہ جنگی نقطہ نگاہ سے نہایت گراں قدر ہوں گی۔ اس کے علاوہ ان معلومات سے تجارتی فوائد بھی حاصل ہوں گے۔ زرناب کی مہم کو زیادہ سے زیادہ چھ ماہ میں مکمل ہو جانا تھا لیکن ایک سال گزرنے کے باوجود وہ واپس نہیں آیا۔ اسی دوران شاہِ فیلقوس نے وفات پائی اور سکندر نے تاج شاہی اپنے سر پر سجایا۔ شاہ سکندر کو شروع ہی سے مشرق اور مشرقی زمینوں سے والہانہ دلچسپی تھی۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ایک جاسوس پچھلے ایک برس سے مشرقی سواحل کی طرف کیا ہوا ہے اور ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تو وہ بہت فکر مند ہوئے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ زرناب نامی اس نوجوان کا کھوج لگایا جائے۔ یہ پچھلے برس موسم سرما کی بات

ہے، شاہ سکندر نے مجھے طلب کیا اور بتایا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ سکندر کو معلوم تھا کہ میں اس سے پہلے بھی اسی طرح کی ایک مہم کامیابی سے سر کر چکا ہوں اور ایشیائی علاقے کے متعلق مجھے کافی معلومات حاصل ہیں۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ میں کسی طرح زرناب کا سراغ لگاؤں اور اگر وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہے تو اس کی مدد کروں۔۔۔۔۔۔ سکندر کے حکم پر میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ زرناب کی تلاش میں روانہ ہوا۔ وہ موسم بڑا سخت تھا۔ سمندر میں سفر کے حالات اتنے اچھے نہیں تھے۔ نہایت دشواری کے ساتھ ہم ایشیائی ساحل پر ٹرائے کے قریب اترے اور ساحل کے ساتھ ساتھ تلاش کا آغاز کیا۔ خوش قسمتی سے ہمیں زیادہ دیر نہیں بھٹکنا پڑا۔ قدرت ہم پر مہربان تھی۔ ہمیں کچھ نہایت اہم اطلاعات مل گئیں اور ان کے ذریعے ہم دو ہی ہفتے میں ایران کے اس ساحلی جزیرے پر جا پہنچے جہاں زرناب دنیا و مافیہا سے بے خبر حسن و عشق کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ جزیرہ جس کا نام ساموتھریس ہے، بالکل الگ تھلگ اور پُر سکون ہے۔ زمین زرخیز ہے اور اس زرخیزی سے فائدہ اٹھانے والے بھی زیادہ نہیں ہیں۔ پھولوں اور باغات کی بہتات ہے۔ یہاں زرناب نے سفید چونے کا ایک خوبصورت مکان بنا رکھا ہے۔ چند غلام رکھے ہوئے ہیں جو اس کے مویشیوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور وہ خود حسین چہروں میں گھرا رہتا ہے۔ میں جس مشکل سے اس تک پہنچا تھا

میں ہی جانتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری زبانی سکندر کا پیغام سنے گا تو فوراً ساتھ چلنے پر آمادہ ہو جائے گا لیکن صورتِ حال اس کے برعکس نکلی۔ زرناب نے اپنے عیش و آرام کی دنیا چھوڑنے سے بالکل انکار کر دیا، بلکہ اس نے مجھے بھی وطن اور بادشاہ سے بے وفائی کی ترغیب دی۔ اس نے کہا، یونان میں کیا رکھا ہے، یہ جزیرہ جنت ارضی ہے، یہاں رہو اور چار روزہ زندگی سے مسرتیں کشید کرو۔ بہرحال جب اس نے محسوس کیا کہ میں اس کے بہکاوؤں میں نہیں آؤں گا تو اس نے آنکھیں بدل لیں۔ ایک رات ہم تینوں پر بے خبری میں حملہ کیا گیا۔ میرے دونوں ساتھی اس لڑائی میں کام آئے اور میں گرفتار ہوا۔ زرناب نے مجھے اپنے ایک خاص آدمی کے حوالے کر دیا۔ یہ سفاک شخص میری مشکیں کس کے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس جزیرے پر لے آیا۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم میں کس طرح اور کیونکر اس منحوس قید خانے میں پہنچ گیا۔ اب پچھلے ایک برس سے یہ منحوس تہہ خانہ میرا مسکن ہے اور آثار سے یہی لگتا ہے کہ زندگی بھر کھلا آسمان دیکھنا نصیب نہیں ہو گا۔"

نورین کی کہانی متاثر کن تھی۔ سردار شلال، گونسل اور تابان نے نورین کی باتوں میں گہری دلچسپی لی۔ سردار شلال، نورین سے کرید کرید کر سوال پوچھتا رہا۔ اس کے چہرے پر شدید

برہمی تھی۔ ظاہر تھا یہ برہمی اسی شخص کے لیے تھی جس نے سکندر اور سکندر کے باپ کو دھوکا کیا تھا اور بعد میں جو افراد اس کی مدد کے لیے بھیجے گئے تھے انہیں بھی اذیت ناک انجام سے دوچار کر دیا تھا۔ تابان بھی قیدی نورین سے ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ یہ ایک زبردست اتفاق تھا کہ وہ نورین کے پاس اس تہہ خانے میں پہنچ گئے تھے ورنہ بارشادہ سے غداری اور وطن سے بے وفائی کی یہ کہانی ہمیشہ پردہ راز میں رہتی۔ نہ کسی کو یہ پتہ چلتا کہ زرناب نامی وہ شخص کہاں ہے اور نہ یہ خبر ہو پاتی کہ اس کی مدد کو جانے والے کیا ہوئے؟

تہہ خانے میں چند دن گزار کر تابان کو یہاں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ یہ معلومات زیادہ تر نورین ہی کے ذریعے حاصل ہوئی تھیں۔ اس نے تابان کو تسلی دی کہ کورا قید خانے کے اس حصے میں بالکل محفوظ رہے گی۔ اس نے کہا کہ یہاں قیدی عورتوں کے لیے علیٰحدہ حصہ ہے اور وہاں کی نگران بھی عورتیں ہی ہیں۔ تاہم یہاں سے نکلنا نہ کورا کے لیے ممکن ہے اور نہ ان کے لیے۔ قید خانے کے اس حصے میں بے شمار تہہ خانے تھے اور ان تہہ خانوں میں صرف ان قیدیوں کو رکھا جاتا تھا جن کی انتہائی نگہداشت مقصود ہوتی تھی۔ نورین نے بتایا کہ پچھلے ایک برس کے عرصے میں صرف تین قیدیوں نے ان تہہ خانوں

سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے ایک عورت تھی اور دو مرد۔ وہ تینوں عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے۔ انہیں پکڑ لیا گیا اور دوسرے قیدیوں کے سامنے شدید اذیتیں دے دے کر مار دیا گیا۔ تابان گاہے گاہے زرناب کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ اس نے ساموتھریس جزیرے کا محل وقوع پوچھا تھا اور یہ معلوم کیا تھا کہ زرناب جزیرے کے کس حصے میں مقیم ہے۔ وہ راستے کی دشواریوں کے بارے میں سوالات کرتا رہا تھا۔ اس کی باتوں سے سردار شلال اور گونسل اندازہ لگا رہے تھے کہ شاید وہ زرناب تک پہنچنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ تابان کی اس سوچ پر وہ بے دلی سے مسکرانے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔ وہ جس پنجرے میں آ پھنسے تھے یہاں سے صیاد کی مرضی کے بغیر نکلنا دیوانے کا خواب تھا اور ان میں سے کوئی ایسا خواب دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ درحقیقت وہ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ چکے تھے، انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کا مستقبل کیا ہے۔ انہیں قید کرنے والوں نے ان کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے کے اسباب کیا ہیں لیکن تابان کا حال مختلف تھا۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے اندر ایک بے چین و بے قرار روح کا بسیرا تھا۔ وہ روح جو آہنی سلاخوں سے الجھتی تھی، تاریک جنگلوں میں بھاگتی تھی، گردابوں سے لڑتی تھی اور طوفانوں

سے بغلگیر ہوتی تھی۔۔۔۔۔۔ قدرت نے اسے آزاد پیدا کیا تھا اور وہ ہر دم آزاد رہنا چاہتا تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ جب تک اس کے سینے میں آزادی کی شمع روشن ہے کوئی دیوار اسے روک نہیں سکتی، لہٰذا اس نے حالات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ وہ اس قید خانے کے در و دیوار کو سونگھ رہا تھا اور یہاں سے نکلنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔

ایک رات جب نورین درد کے شدید دورے کے بعد تڑپ تڑپ کر سو چکا تھا اور سردار شلال اور گونسل دو کونوں میں گم صم بیٹھے تھے، تابان اٹھ کر ان کے پاس آ گیا۔ اداسیوں اور مایوسیوں سے بھری اس رات میں تابان کا چہرہ ہشاش بشاش تھا اور اس کی آنکھوں میں مسرت آمیز چمک تھی۔ وہ سردار شلال سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سردار! تم نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ کسی طور تمہارے شایانِ شان نہ تھا۔ بہرحال اب ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ یہ تاریک قید خانہ ہمارا مقدر بنا دیا گیا ہے۔ ہمیں اس مقدر کو منانا ہو گا یا سسک سسک کر دم توڑ دینا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"کیسا وعدہ؟" شلال نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں۔

"یہ وعدہ کہ اگر ہم اس جزیرے کی قید سے آزاد ہو گئے تو تم کورا کی اس خطا کو بھول جاؤ گے جس کے بدلے تم اس کی زندگی اور عزت سے کھیلنے جا رہے تھے۔ میری مراد تمہارے چہرے کے زخم سے ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔"

سردار شلال مسکرانے لگا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ تابان کو اول درجے کا احمق سمجھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "تمہارا کیا خیال ہے تمہاری کسی کوشش کے سبب ہم اس قید سے چھوٹ جائیں گے۔؟"

تابان بولا۔ "یہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔"

شلال نے کہا۔ "پھر تم بیوقوفوں کی جنت میں رہتے ہو۔ غالباً تمہیں پوری طرح احساس نہیں ہوا کہ یہ دیواریں کتنی اونچی ہیں۔"

تابان بولا۔ "ان دیواروں کی اونچائی آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ صرف مجھ سے وعدہ کریں۔ اس وعدے میں آپ کا کچھ نہیں جا رہا ہے کیونکہ اس وقت آپ کے پاس کچھ نہیں۔"

سردار شلال اور گونسل ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جیسے سوچ رہے ہوں کہ اس گدھے کو اس بات کا کیا جواب دیں۔ آخر سردار گونسل نے غیر سنجیدگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے تابان، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جو تم کہہ رہے ہو، وہی کریں گے لیکن تم نے سوچ کیا رکھا ہے؟"

تابان نے کہا۔ "کچھ نہیں سوچا، صرف ارادہ کیا ہے کہ یہاں سے نکلنا ہے اور امید ہے کہ ایسا ضرور ہو گا اگر آپ میں سے کوئی میرا ساتھ دینا چاہے تو بہتر ورنہ میں اکیلا کوشش کروں گا۔"

"نہیں، ہم خودکشی کا ارادہ نہیں رکھتے۔" شلال نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔ "تم جو کرنا چاہتے ہو، خود کرو۔"

تابان بولا۔ "لیکن آپ نے ابھی تک وعدہ نہیں کیا"

"کیسا وعدہ؟"

"کورا سے دشمنی بھولنے کا وعدہ۔"

شلال نے اپنی جھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "جو گونسل نے کہہ دیا وہی کافی ہے۔"

تابان نے عاجزانہ لہجہ اختیار کیا۔ "آپ سردار ہیں، آپ اپنی زبان سے کہہ دیں گے تو مجھے تسلی رہے گی۔"

تابان کے انداز پر شلال اور گونسل مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے خیال میں وہ طفلانہ باتیں کر رہا تھا اور ان باتوں کا انجام قبل از وقت موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ آخر شلال نے کہا۔ "ٹھیک ہے ایرانی! اگر ہم اس قید خانے سے نکل پائے تو میرے اور اس لڑکی کے درمیان کوئی تنازعہ باقی نہیں رہے گا۔"

تابان نے مزید تصدیق چاہی۔ "اور اگر اس مہم کے دوران مجھے کچھ ہو جائے تو کورا کو بحفاظت ایتھنز پہنچانے کی ذمے داری آپ پر ہو گی۔"

"ہاں۔۔۔۔۔۔۔ہاں ہو گی۔" سردار شلال نے جان چھڑانے کے لیے یہ اقرار بھی کر لیا۔

تابان نے ایک گہری سانس لی جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو، وہ عجیب وجدانی لہجے میں بولا۔ "ہم یہاں سے ضرور نکلیں گے سردار!"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ ایک تاریک رات تھی۔ تہہ خانے کے روزن میں سے ان کے لیے کھانا پھینکا جا چکا تھا اور تھوڑی دیر بعد پہرہ بھی بدلنے والا تھا۔ تابان کو پہرہ بدلنے کا انتظار تھا۔ وہ اپنی جگہ بے حرکت بیٹھا تھا۔ تہہ خانے کی چھت پر بھاری قدموں کی چاپ سنتا رہا اس کا انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ چاپ معدوم ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔۔تابان نے اپنے ساتھیوں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور اٹھ کر دبے پاؤں چلتا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ان سیڑھیوں کے آخر میں ایک آہنی دروازہ تھا۔ اس دروازے سے باہر ایک موٹا قفل لگا رہتا تھا اور پہریدار گشت میں رہتے تھے۔ اس وقت پہریدار موجود نہیں تھے۔ تابان قفل پر طبع آزمائی کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے بالوں کے اندر سے مخصوص چمٹی نکالی اور دروازے کی سلاخوں سے ہاتھ گزار کر باہر سے قفل کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ ایک کٹھن کوشش تھی۔ اسے نئے پہریداروں کے آنے سے پہلے پہلے قفل کھولنا تھا، اس کی پیشانی پسینے سے تر

ہو گئی۔ آخر یہ محنتِ شاقہ رنگ لائی اور قفل کھل گیا۔ تابان نے تیزی سے کھٹکا ہٹایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دروازے کو دوبارہ بند کر کے اور قفل چڑھا کر وہ ننگے پاؤں چلتا طویل راہداری میں پہنچا۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں نتھنے پھولے ہوئے تھے اور وہ کسی شکاری جانور کی طرح چوکس نظر آتا تھا۔

طویل راہداری پار کر کے ایک کشادہ برآمدے میں پہنچا تو بو کے شدید بھبکے نتھنوں سے ٹکرانے لگے ساتھ ہی اسے وہ بلند و بالا دیوار نظر آئی جس کی منڈیر پر نوکدار سلاخیں لگی تھیں اور برجیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ عمارت کی چار دیواری کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس برآمدے کے پہلو میں بھی آہنی دروازوں کی ایک قطار دکھائی دے رہی تھی۔ یہ وہ تہہ خانے تھے جہاں خواتین قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ کورا بھی انہی میں سے کسی تہہ خانے میں بند تھی۔ وہ کورا سے کتنا قریب ہو کر بھی کتنا دور تھا۔ کورا کا خوبصورت معصوم چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا۔ ایکا ایکی تابان کو اپنی بائیں جانب آہٹ محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھاری زنانہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ "کون ہے؟"

تابان تڑپ کر ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند ساعت بعد اسے ایک لحیم شحیم سیاہ فام عورت دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں مشعل اور دوسرے میں عریاں تلوار تھی۔ مشعل کی روشنی تابان پر پڑی۔ اس سے پہلے کہ سیاہ فام عورت رخ پھیر کر اس کی طرف دیکھتی وہ اپنی جگہ سے ہلا اور بلائے ناگہانی کی طرح اس سے لپٹ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ عورت کے بھدے ہونٹوں پر آیا اور دوسرے نے اس کا تلوار والا بازو جکڑ لیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ عورت کے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہ نکل سکی۔ تابان اسے گھسیٹتا ہوا ایک تاریک کونے میں لے گیا۔ چند لمحے اپنی سانسیں درست کرنے کے بعد اس نے عورت کو دوبارہ گھسیٹا اور برآمدہ طے کر کے ایک باغیچہ نما جگہ پر آ گیا۔ عورت کے جسم میں مست ہاتھی کی سی قوت تھی۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی اور وہ مسلسل مزاحمت کر رہی تھی۔ اس کی شکل اچھی طرح دیکھے بغیر ہی تابان سمجھ سکتا تھا کہ وہ ایک خوفناک عورت رہی ہو گی۔ باغیچے میں پہنچ کر تابان نے عورت کے ہاتھ سے تلوار چھینی اور نہایت سفاکی سے اس کی گردن پر رکھ دی۔

"آواز نکالی تو سر جدا کر دوں گا۔" اس نے نہایت سنگین لہجے میں دھمکی دی اور پھر بڑے اعتماد کے ساتھ عورت کے منہ سے ہاتھ اٹھالیا۔ تابان کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ عورت نے واقعی کسی کو مدد کے لیے نہیں پکارا۔ اس کی بڑی بڑی دہشت زدہ آنکھیں تابان کے چہرے پر جمی تھیں۔ تابان اسے گھسیٹ کر درختوں میں کچھ اور آگے لے گیا۔

کوئی ایک گھڑی بعد تابان عورت کو قتل کرنے کے بعد درختوں کے اس جھنڈ سے باہر نکل رہا تھا۔ عورت کو قیدِ زندگی سے چھٹکارا دلانے سے پہلے اس نے اس سے بہت کچھ پوچھ لیا تھا۔ تابان سوچ رہا تھا کہ وہ اس عورت تک نہ پہنچتا تو اس قید خانے سے نکلنا کس قدر دشوار ہوتا۔ اب نہ صرف وہ اس عمارت کے ایک چور راستے سے واقف ہو چکا تھا بلکہ پہریدار عورت کی تلوار بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ پودوں کی آڑ لیتا ہوا دوبارہ تہہ خانوں کی طرف نکل گیا۔ یہ وہی تہہ خانے تھے جہاں خواتین قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر تہہ خانے اس وقت خالی پڑے تھے۔ ان خالی تہہ خانوں کے سامنے پہرہ بھی نہیں تھا۔ تابان نے اپنی بائیں جانب والی قطار میں چار تہہ خانے چھوڑے اور پانچویں کے دروازے پر آگیا۔ دروازہ کھلا تھا، وہ بڑے اعتماد سے اندر گھس گیا۔ اس تہہ خانے کی ایک دیوار سے وہ خفیہ راستہ نکلتا

تھا جو تابان کو بیرونی احاطے تک پہنچا سکتا تھا۔ معمولی کوشش سے وہ یہ راستہ ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ یہ ایک تاریک سرنگ تھی جس میں دراز قد تابان کو جھک کر چلنا پڑا۔ پچاس ساٹھ گز کے پُر خطر سفر کے بعد اس نے خود کو اس احاطے میں پایا، جہاں دو ہفتے پہلے انہیں رفتار کر کے لایا گیا تھا۔ اس احاطے میں وہ اور کورا چربی کے بڑے بڑے لوتھڑے ڈھوتے رہے تھے۔ احاطے میں ہر طرف کریہہ بو پھیلی ہوئی تھی۔ قید خانے کی بلند و بالا پون چکی گھرر گھرر کی آواز سے بے مقصد چل رہی تھی۔ ایک طرف بحیرہ ایجیئن سے پکڑی جانے والی چند دیوہیکل مچھلیاں پڑی تھیں۔ تاریکی میں ان مچھلیوں کے ہیولے بڑے خوفناک لگ رہے تھے۔ تابان ان ہیولوں کی آڑ لیتا ہوا اس جانب آگیا جہاں بہت سے چھکڑے قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ انہی چھکڑوں میں چربی اور مچھلیاں قید خانے میں لائی جاتی تھیں اور بعد ازاں تیل اور خشک کیا ہوا گوشت باہر لے جایا جاتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اس وقت تمام قیدی کوٹھڑیوں میں بند تھے لہٰذا پہریدار بھی اطمینان سے کونوں کھدروں میں دبکے ہوئے تھے۔ تابان کے لیے یہ اچھا موقع تھا کہ وہ کسی چھکڑے میں گھس کر بیٹھ جائے۔ پہریداروں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے تابان زمین پر اوندھا لیٹ گیا اور رینگتا ہوا چھکڑوں کی طرف بڑھا۔ بیس تیس گز کا یہ فاصلہ بہت خطرناک تھا۔ پہریدار چونکہ بلندی پر تھا وہ کسی بھی وقت اسے

دیکھ سکتے تھے۔ سانپ کی طرح بل کھاتا وہ چھکڑوں سے دس گز کی دوری پر پہنچ چکا تھا، جب اچانک اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ دو پہریدار ایک چھکڑے کی اوٹ سے نکلے اور گشت کرنے والے انداز میں اس کی طرف بڑھنے لگے۔ اپنی جگہ پڑے پڑے تابان نے سانس روک لی۔ تلوار اس کے داہنے ہاتھ میں تھی۔ وہ ایک ہی جست میں دونوں پہریداروں کی گردنیں ناپنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ پہریدار دندناتے ہوئے آئے اور اس سے صرف چند قدم کے فاصلے سے گزر گئے۔ تاریکی کے سبب وہ اسے دیکھ نہیں پائے تھے۔ تابان نے اطمینان کا سانس لیا اور آخری دس گز کا فاصلہ تیزی سے طے کر کے ایک چھکڑے میں گھس گیا۔ تاہم چھکڑے میں پہنچ کر ایکا ایکی اس کا اطمینان رخصت ہو گیا۔ چھکڑا بان اندر ہی سو رہا تھا۔ تاریکی میں تابان کو اپنے اوپر پا کر وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پھر چیخ کر اس سے لپٹ گیا۔ تابان نے اس کی چیخ مکمل ہونے سے پہلے اس کا منہ ڈھانپا اور تلوار گردن پر رکھ دی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چھکڑوں کی طویل قطار میں تابان سب سے پیچھے تھا۔ وہ لوگ قید خانے سے قریباً ایک میل دور آ چکے تھے۔ تابان چھکڑا بان کے لباس میں تھا اور چھکڑا بان فطری لباس پہنے لاش کی

صورت میں چھکڑے کے اندر پڑا تھا۔ تابان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ جزیرہ سکوپے لاس کے اس منحوس قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ رات کی ساری باتیں اسے خواب لگ رہی تھیں۔ اب سپیدہ سحر نمودار ہونے والا تھا۔ دور مغربی افق پر اندھیرا چھٹتا جا رہا تھا اور ساحل کی نم ہوا نے رخ بدلنا شروع کر دیا تھا۔ تابان نے جان بوجھ کر چھکڑے کو پیچھے رکھا تھا۔ وہ موقع ملتے ہی چھکڑے میں سے کود جانا چاہتا تھا۔ جوں جوں روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ اس کے پہچانے جانے کے امکانات بڑھ رہے تھے۔ آخر تابان کو دور سمندر کا پانی ہلکورے لیتا دکھائی دینے لگا۔ اب اس کارواں کے ساتھ رہنا خطرناک تھا۔ جونہی چھکڑوں کی قطار ایک موڑ سے مڑی۔ تابان نے گھوڑے کی رفتار دھیمی کی اور کود گیا۔ گھوڑا قطار کے پیچھے بھاگتا چلا گیا اور تابان تیزی سے گھنے درختوں میں روپوش ہو گیا۔

علاقے کے دوسرے جزائر کی طرح یہ جزیرہ بھی خوبصورت تھا۔ جگہ جگہ سرسبز ڈھلوانیں نظر آتی تھیں جن پر آلو بخارے کے وسیع باغات تھے۔ کئی مقامات پر اونچے برجوں والے سرخ معبد تھے۔ ان معبدوں کے گرد خوبصورت آبادیاں پائی جاتی تھیں۔ تابان کو خوبصورت چرواہے اور چرواہیاں نظر آئیں اور ان کے جلو میں بکریوں کے صحت مند ریوڑ

دکھائی دیے۔ چمکیلی دھوپ نے جزیرے کے خدوخال کو کسی حسینہ کے منور چہرے کا روپ دے رکھا تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ سہ پہر تک جزیرے کے نشیب و فراز میں گھومتا رہا۔ کئی جگہ لوگوں سے اس کی مڈبھیڑ بھی ہوئی لیکن اس نے اس پر توجہ نہیں دی۔ سہ پہر کے وقت اسے جزیرے کی اصل آبادی دکھائی دی۔ یہ عظیم الشان بستی ایک پہاڑی کے دامن میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دیکھنے سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں متمول اور خوشحال لوگ رہتے ہیں۔ راستے صاف ستھرے اور عمارتیں خوشنما تھیں۔ تابان کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت جزیرے کی کھاڑی پر جانا خطرناک ہے۔ یقینی بات تھی کہ چھکڑا بان کے علاوہ پہریدار عورت کی لاش بھی برآمد ہو چکی ہو گی اور اس کے فرار کا راز فاش ہوتے ہی کھاڑی پر پہرہ سخت کر دیا گیا ہو گا ابھی وہ اسی کشمکش میں تھا کہ شہر میں داخل ہو یا نہیں کہ اچانک اسے دیکھ لیا گیا۔ دیکھنے والے دو سپاہی تھے۔ تابان نے اپنا جسم ایک کمبل نما چادر میں چھپا رکھا تھا لیکن پاؤں ننگے تھے۔ سپاہی اس کے پاؤں دیکھ کر چونکے اور پیچھے لگ گئے۔ خود کو خطرے میں دیکھ کر تابان بھاگ کھڑا ہوا۔ کمبل کے نیچے تلوار کے دستے پر اس کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ سپاہیوں نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ شہر کے گلی کوچوں میں کچھ دیر تابان اور سپاہیوں میں زبردست آنکھ مچولی ہوئی۔ پھر تابان کو ایک چوراہے میں وسیع مجمع دکھائی دیا۔ یہ مجمع تابان کے لیے غنیمت تھا۔ وہ تیزی سے اندر گھس گیا اور انسانوں کے جنگل میں گم ہو گیا۔ ذرا حواس بحال ہوئے تو اس نے گردوپیش پر نظر ڈالی اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ کہاں کھڑا ہے اور یہ ہجوم کیا کر رہا ہے تب تابان کی نگاہ ایک اونچے چبوترے پر پڑی۔ لوگ اس چبوترے کی طرف دیکھ رہے تھے، یہاں چند زرنگار کرسیاں رکھی تھیں۔ ان کرسیوں پر خوش پوش افراد بیٹھے تھے اور عقب میں چاق و چوبند محافظ برچھیاں لیے کھڑے تھے۔ چبوترے پر تابان کو ایک کالی کرسی بھی دکھائی دی۔ یہ کرسی سب سے بڑی اور قیمتی تھی لیکن حیرت کی بات تھی کہ اس پر کوئی بیٹھا نہیں تھا۔ کرسی کی خالی نشست پر ایک گلدان رکھا تھا اور گلدان میں زرد رنگ کا ایک بڑا سا گلاب کا پھول تھا۔ ایک ادھیڑ عمر شخص جس نے ٹخنوں تک زرد چغہ پہن رکھا تھا چبوترے کے درمیان کھڑا جوشیلے انداز میں تقریر کر رہا تھا، اس کی تقریر جزیرے کے حالات اور علاقے کی سیاسی صورت حال کے بارے میں تھی۔ وہ جزائر کی ترقی کے لیے تجارت کی ضرورت پر زور دے رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ تجارت کی ترقی کا انحصار شہنشاہ ایران کی مہربانیوں پر ہے۔۔۔۔۔۔۔ تابان کو ان معاملات سے قطعاً دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو جان بچانے کی فکر میں تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ بھیڑ میں گم ہو کر بھیڑ کا حصہ بن جائے۔ وہ لوگوں کے درمیان رستہ بناتا غیر محسوس طور پر آگے کو کھسکتا جا رہا تھا،

آخر ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس سے آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ چند لمحے گزرے تھے کہ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ چھوٹی چھوٹی بھوری داڑھی، اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں اور سر پر یونانی ٹوپی۔ آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی۔ تابان نے اس صورت پر غور کیا اور ایک دم اس کا جسم سنسنا اٹھا۔۔۔۔۔۔۔ اس کے سامنے ہوشمند کھڑا تھا۔ داڑھی اور مونچھوں کی وجہ سے اس کا حلیہ بہت حد تک بدل چکا تھا لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ تابان اسے نہ پہچانتا۔ غارس زنوب کے محل میں وہ کئی ماہ اکٹھے کام کرتے رہے تھے اور ہوشمند سے تابان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ تابان نے ہوشمند کو آخری بار سکندر کے حملے کے وقت شہر کی فصیل پر پتھر ڈھوتے دیکھا تھا اور اس بات کو اب تین چار ماہ ہونے کو آئے تھے۔ وہ دونوں چند لمحے یک ٹک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ہوشمند نے بڑے جوش سے تابان کا بازو دبایا اور آنکھوں آنکھوں میں اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں بھیڑ میں رستہ بناتے ایک طرف چل دیئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ مجمعے سے باہر تھے۔ ہوشمند لنگڑاتا ہوا ایک گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھا۔ گاڑی بان سے کرایہ طے کیا اور تابان کو لے کر اندر آ بیٹھا۔ تنہائی ملتے ہی دونوں ایک

دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ ہوشمند نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم ہی وہ قیدی ہو جو آج صبح ہاون کے قید خانے سے بھاگا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن۔۔۔۔۔۔ تم یہاں کیسے؟"

ہوشمند نے تیزی سے کہا۔ "یہ سب تمہیں بعد میں بتاؤں گا ابھی صرف اپنے بارے میں بتاؤ۔ کوئی تمہارے تعاقب میں تو نہیں تھا؟"

"دو آدمی تھے لیکن میں انہیں چکمہ دے کر جلسہ گاہ میں گھس گیا تھا۔"

"قید خانے سے بھاگتے ہوئے تم نے ایک مرد اور عورت کو بھی قتل کیا ہے؟"

"ہاں، کیا ہے مگر تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے؟"

"غضب کی بات کرتے ہو تم۔۔۔۔۔۔۔ غضب کے بیوقوف ہو۔"

تابان کو یاد آیا کہ "غضب کا" ہوشمند کا تکیہ کلام ہے۔ وہ کان کھجا کر بولا۔ "میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔"

ہوشمند نے کہا۔ "قریباً ہر شخص کو تمہارا کارنامہ معلوم ہو چکا ہے۔ یہ جزیرہ بہت بڑا نہیں ہے یہاں ایسی خبریں غضب کی جلدی سے پھیل جاتی ہیں۔ تمہاری قسمت غضب کی ہے کہ کسی نے تمہاری طرف توجہ نہیں دی ورنہ شہر میں کئی جگہ منادی ہوئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہاون کے قید خانے سے فلاں رنگ کے لباس اور حلیئے والا ایک قیدی فرار ہوا ہے۔ میں نے بھی یہ منادی سنی تھی۔ اس وقت میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یہ تمہارا ذکرِ خیر ہو رہا ہے۔"

اسی طرح کی باتیں کرتے وہ لوگ ایک بھرے پُرے بازار سے گزرے اور ایک رہائشی عمارت کے سامنے جا کر رک گئے۔ ہوشمند نے گاڑی عین دروازے کے سامنے رکوائی تھی۔ گاڑی سے اترتے ہی وہ تابان کو لے کر گھر میں گھس گیا۔ یہ ایک کافی کشادہ مکان تھا۔ یہاں گھستے ہی تابان کو لگا جیسے وہ کسی پھلدار باغ میں چلا آیا ہے۔ انواع واقسام کے پھلوں کی خوشبوئیں پورے گھر میں بھری ہوئی تھیں۔ کئی جگہ لکڑی کی بڑی بڑی ادھ کھلی پیٹیاں نظر آئیں۔ ان میں کشمش، بہی، سنگترے، مالٹے، کیلے اور انگور بند تھے۔ ہوشمند، تابان کو لے کر مکان کی نشست گاہ میں پہنچا۔ گھر میں چند ملازم بھی موجود تھے تاہم ہوشمند اس احتیاط سے

نشست گاہ تک پہنچا کہ کسی ملازم کی نگاہ تابان پر نہیں پڑ سکی۔ نشست گاہ کا دروازہ بند کر کے اس نے ایک طویل سانس لی۔ جیسے بڑا بوجھ سر سے اتر گیا ہو۔ وہ بولا۔

"تمہارے لیے سب سے بڑا خطرہ تمہارے لمبے بال ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ بال تراشو۔ داڑھی وغیرہ بھی صاف کر لو۔ اس کے بعد اس منحوس لباس سے چھٹکارا حاصل کرو اور تروتازہ ہو کر میرے پاس آ جاؤ۔" پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "حمام اس طرف ہے۔"

ہوشمند کے اس مکان میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ حمام صاف ستھرا اور ہر سہولت سے مزین تھا۔ ہوشمند کی ہدایت کے مطابق تابان نے اپنے بال تراشے، سر کے بال صاف کیے اور نہا کر لباس بدل لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اور ہوشمند کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور موی شمعوں کی روشنی میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ ہوشمند نے تابان کو بتایا کہ اسے کم از کم ایک ہفتے تک اس مکان سے باہر نہیں نکلنا چاہیے کیونکہ جزیرے میں ہر جگہ اس کی تلاشی ہو رہی ہے۔ اس کے بعد اس نے تابان کو اپنی طویل اور دلچسپ کہانی سنائی۔ اس کہانی کا خلاصہ یہ تھا کہ لڑائی کے روز ہی ہوشمند ایتھنز سے فرار ہو گیا تھا۔ فرار ہوتے وقت اس نے ایک

دولتمند یونانی گھرانے کی مدد کی اور انہیں بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ وہ لوگ کسی نہ کسی طرح ساحل تک پہنچے اور ایک لاوارث کشتی کے ذریعے مشرقی رخ پر نکل گئے۔ ہوشمند دو روز تک کشتی کھیلتا رہا اور آخر یونانی گھرانے کو جزیرہ "ایوبویا" کے ساحل تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ ان لوگوں نے اس خدمت کے عوض ہوشمند کو ایک چھوٹا سا قیمتی ہار دے کر مالا مال کر دیا۔ ہوشمند اپنی کشتی کھیلتا ہوا جزیرہ سکوپے لاس پہنچ گیا۔ یہاں اس نے وہ ہار فروخت کر کے رہائش کے لیے مکان خریدا اور باقی رقم سے کاروبار شروع کر دیا۔ پہلے اس نے زیتون کے تیل کا کام شروع کیا مگر پھر ارادہ بدل کر پھلوں کی فروخت کرنے لگا۔ اس کاروبار میں اسے خاصی کامیابی ہو رہی تھی۔ وہ مختلف جزیروں سے تازہ پھل لا کر اپنی دکان پر فروخت کرتا تھا۔ یہ دکان شہر کے ایک معروف بازار میں تھی اور تیزی سے ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی۔

جواب میں تابان نے بھی ہوشمند کو اپنی بیشتر کہانی سنا دی۔ تین اہم سرداروں کے قتل سے لے کر اپنے گرفتار ہونے تک اور شاہی محل میں طلبی سے لے کر اپنی مہم کی شروعات تک اس نے سب کچھ ہوشمند کے گوش گزار کر دیا۔ اس روئیداد میں اس نے شہزادی مارشا کا ذکر

بھی کیا اور بتایا کہ سکندر سے شہزادی مارشا کے بارے میں اس کی کیا گفتگو ہوئی تھی۔ ہوشمند کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ اس بات پر حیران نظر آنے لگا کہ تابان براہ راست سکندر سے ملاقات کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ شہزادی مارشا کے ذکر نے بھی اسے متاثر کیا تھا۔ وہ تابان کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"شہزادی مارشا کے بارے میں کوئی چکر نظر آ رہا ہے۔ کہیں دیوتا کیوپڈ کا محبت بھرا تیر تو نہیں کھا لیا میرے شہزادے نے؟"

تابان نے کہا۔ "نہیں ہوشمند، وہ چہرہ تو پوجنے کے لائق ہے تم نے اس کے لیے "محبت" لفظ استعمال کیا ہے تو لگتا ہے اس کی توہین کی ہے۔"

ہوشمند بولا۔ "محسوس ہوتا ہے تم نہیں بول رہے، تمہارے دل کے زخم بول رہے ہیں۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا، یہ آسمانوں پر رہنے والی چیزیں ہیں، ہم جیسے خاک نشینوں کو حق نہیں پہنچتا کہ ان کا تصور بھی کریں۔۔۔۔۔۔۔"

تابان نے کہا۔ "کاش تم نے وہ چہرہ دیکھا ہوتا تو پھر میں پوچھتا اس کا تصور کرنا تمہارے اختیار میں ہے یا نہیں۔"

"بہت خوب۔" ہوشمند نے اپنا گھڑے جیسا سر ہلایا۔ "غالباً پانی سر سے گزر چکا ہے۔ ویسے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے شہزادی "غضب کے "پردے میں رہتی تھی۔ تم نے وہ رُخ روشن کیونکر دیکھ لیا۔"

تابان وہ واقعہ سنانے لگا جب ایک شب ایک حسن اتفاق نے اسے آفتابِ نیم روز کے روبرو کر دیا تھا اور اس کی بصارت جاتی رہی تھی۔ کافی دیر اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی پھر تابان کی کوشش سے بات چیت کا رخ جزیرے کے حالات کی طرف مڑ گیا۔ تابان کی نگاہوں میں رہ رہ کر وہ خالی کرسی گھوم رہی تھی جو اس جلسہ گاہ کے چبوترے پر دیکھی تھی اور جس پر زرد گلاب کا پھول رکھا ہوا تھا۔ اس نے اس بارے میں ہوشمند سے پوچھا تو وہ بولا۔

"زرد پھول اس جزیرے میں انتظار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ شاہی نشست پر زرد پھول رکھنے کے مطلب یہ ہے کہ جزیرے کا حکمران جزیرے پر موجود نہیں اور رعایا کو اس کا انتظار ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" تابان نے وضاحت چاہی۔

ہوشمند نے کہا۔ "اس جزیرے کی حکمران ایک خوبرو ملکہ زنوبیا ہے۔ وہ شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ یہ ایک غضب کی کہانی ہے پھر کسی وقت تمہیں سناؤں گا۔ کچھ عرصہ پہلے زنوبیا نے ایک شخص سے محبت کی شادی کی اور جزیرہ چھوڑ کر چلی گئی۔ جزیرے کے لوگ زنوبیا سے غضب کی محبت کرتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ اور اب بھی کرتے ہیں۔ ان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ ملکہ کی نشست پر کسی اور کو براجمان کریں۔ وہ شاہی نشست پر زرد پھول رکھتے ہیں اور اس امید میں ہیں کہ وہ کسی دن لوٹ آئے گی۔ وہ شخص جسے تم نے چبوترے پر تقریر کرتے دیکھا تھا، جزیرے کی فوج کا سپہ سالار ہے۔ ملکہ کے بعد وہ عارضی طور پر سربراہ حکومت کے فرائض انجام دے رہا ہے۔"

تابان نے اس جزیرے کے بارے ہوشمند سے اور بھی بہت سی معلومات حاصل کیں۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ جزیرے کے لوگ مقدونیہ اور شاہِ مقدونیہ کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ جاننا تابان اور اس کے ساتھیوں کی مہم کا حصہ تھا۔

ہوشمند نے کہا۔ "تابو! میں نے تمہاری باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ تمہاری مہم کا مقصد اس راستے کے بارے میں معلومات کا حصول ہے جس پر سکندر کو پیش قدمی کرنی ہے ـــــــ"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" تابان نے کہا۔

ہوشمند بولا۔ "ایک ناچیز رائے پیش کرنا چاہتا ہوں اگر تمہیں ناگوار نہ گزرے تو۔" تابان سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ہوشمند نے کہا۔

"تم نے ابھی زرناب نامی شخص کا ذکر کیا ہے جو دو برس پہلے مقدونیہ کی ہدایت پر بحیرہ ایجیئن میں آیا تھا اور واپس نہیں گیا۔۔۔۔۔۔۔ یقینی بات ہے کہ اس شخص کے پاس غضب کی معلومات ہوں گی جو اس کی حکم عدولی کے سبب بے کار چلی گئی ہیں۔ بجائے اس کے کہ تم خود در بدر بھٹک کر یہ معلومات اکٹھی کرو اگر تم کسی طرح اس شخص کو واپس لے جانے میں کامیاب ہو جاؤ تو یہ زیادہ بہتر اور سہل کام ہو گا۔"

تابان نے مسکرا کر کہا۔ "ہوشمند! تم نے میرے منہ کی بات چھینی ہے۔ میں خود اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔ قید خانے میں میں نے نورین نامی اس قیدی سے زرناب کا اتہ پتہ

دریافت کیا ہے اور اگر وہ شخص اپنی قیام گاہ چھوڑ نہیں گیا تو مجھے وہاں پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہو گی۔"

ہوشمند جوش سے بولا۔ "اس کا مطلب ہے تم وہاں جانا چاہتے ہو۔"

"بالکل!" تابان نے جواب دیا۔

"تم نے اس جزیرے کا نام ساموتھریس ہی بتایا ہے نا؟" تابان نے اثبات میں جواب دیا۔ ہوشمند خوش ہو کر بولا۔ "یہ بہت آسان کام ہے۔ میں پھلوں کے لیے ساموتھریس کے جزیرے پر جاتا رہتا ہوں۔ ساموتھریس کا جزیرہ وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ہوا موافق ہو تو مشکل سے دو گھڑی کا سفر ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں میرے پاس اپنی کشتی ہے، بالکل نئی اور اس کے بادبان بھی غضب کے ہیں۔"

تابان نے کہا۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔۔۔۔۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے ہم کب تک ساموتھریس کی طرف روانہ ہو سکتے ہیں؟"

ہوشمند کا تمتمایا ہوا چہرہ زرد پھیکا پڑ گیا، وہ بولا۔ "یوں تو تم اپنا حلیہ کافی حد تک بدل چکے ہو پھر بھی میرے خیال میں ابھی پانچ چھ روز تک تمہیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ میں کھاڑی پر نگاہ رکھتا ہوں، جونہی حالات درست ہوئے ہم نکل چلیں گے۔"

تابان نے کہا۔ "ہوشمند! یہ کام اتنا سہل نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ میں یہ جزیرہ چھوڑنے سے پہلے اپنے ساتھیوں کو بھی رہا کرانا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ انہیں انتظار میں رکھ کر میں کسی دوسرے معاملے میں الجھ جاؤں۔"

ہوشمند نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تابان! میں اس جزیرے پر چار مہینے سے ہوں۔ جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جان سکتے۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ اپنی کوشش سے سردار شلال وغیرہ کو رہا کرا لوگے تو یہ سراسر خام خیالی ہے۔ انہونی صرف ایک بار ہوتی ہے اور وہ ہو چکی ہے۔ تمہاون کا قید خانہ توڑ چکے ہو۔ اب کوئی ایسا خیال دل میں مت لاؤ۔"

تابان نے کہا۔ "تو پھر ان کا مستقبل کیا ہوگا؟"

ہوشمند بولا۔ "تمہاری مہم کامیاب ہوگئی تو ان کا مستقبل خود بخود سنور جائے گا۔ تم زرناب کو لے کر واپس مقدونیہ پہنچ گئے اور سکندر اپنا لشکر لے کر روانہ ہوا تو راستے کے یہ سارے

جزیرے خود بخود اس کے مطیع ہو جائیں گے۔ پھر ہاون کا قید خانہ بھی تمہاری آنکھ کے ایک اشارے سے کھل جائے گا اور یہ کوئی بہت دور کی بات نہیں۔ جیسے حالات تم بتا رہے ہو ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سکندر کی لشکر کشی میں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

تابان نے کہا۔ "لیکن یہ تو صرف ایک اندازہ ہے، ہو سکتا ہے اتنی بڑی فوج کی تیاری میں تاخیر ہو جائے۔۔۔۔۔۔ اور اس کام میں کئی مہینے یا ایک دو سال لگ جائیں۔ اتنی دیر میں تو وہ تاریک تہہ خانے نہ جانے کورا جیسی کتنی لڑکیوں کو نگل جائیں گے۔"

ہوشمند نے کہا۔ "اگر تاخیر کی صورت ہوئی تو تم سکندر سے مشورہ کر کے کوئی حل نکال سکتے ہو۔ یہ صرف کورا کا معاملہ نہیں، سردار شلال اور گونسل جیسے اہم سرداروں کا مسئلہ بھی ہے۔ سکندر تمہاری تشویش کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔"

ہوشمند کی باتوں میں خاصا وزن تھا۔ یوں تو اس کی شخصیت مضحکہ خیز تھی مگر جب وہ سوچ میں ڈوب کر بات کرتا تھا تو بہت دور کی کوڑی لاتا تھا۔ تابان خود بھی سوچ رہا تھا کہ اسے کوئی جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ طویل گفت و شنید کے بعد وہ دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ قیدیوں

کی رہائی کا مسئلہ فی الحال موخر کر دیا جائے اور اس شخص کو ڈھونڈا جائے جو پچھلے دو برس سے شاہ مقدونیہ کے لیے معمہ بنا ہوا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک ہفتے تک تابان نے ہوشمند کے گھر میں مکمل آرام کیا۔ ہوشمند کو کھانے پینے سے شغف تھا شاید اس لیے اس نے زیتون کا کام چھوڑ کر پھلوں کی تجارت شروع کی تھی۔ وہ ہر وقت کھاتا پیتا رہتا اور تابان کو بھی اس طرف راغب کرتا۔ "دیکھو تابو! کیا غضب کا آلو بخارا ہے۔ ایسا آلو بخارا پورے یونان میں نہیں ملے گا اور یہ سنگترہ دیکھو۔ کیسی غضب کی رنگت پائی ہے۔ جزیرہ رہوڈس کا ہے۔ اس جزیرے کے انگور تو بس غضب ہی ڈھا دیتے ہیں لیکن افسوس اس وقت میرے ذخیرے میں نہیں۔ خیر تم یہ کشمش چکھو یہ بھی انہی انگوروں کی بنی ہوئی ہے۔" وہ سارا دن تابان کو مصروف بعام رکھتا اور دنیا جہان کی باتیں کرتا۔ اس کے علاوہ وہ گاہے گاہے کھاڑی کی خبر بھی لے لیتا تھا۔

ایک روز وہ شام کو گھر آیا تو کہنے لگا۔ "تابو! کل یہاں سے نکلنے کا بہت اچھا موقع ہے۔ ایک قریبی جزیرے سے کچھ شاہی مہمان آ رہے ہیں۔ کل ان کے اعزاز میں ایک بڑی ضیافت دی

جائے گی۔ اس ضیافت کے لیے پھولوں کا ایک بہت بڑا فرش تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ کام جزیرے کے سپاہی کر رہے ہیں۔ میں نے آج دیکھا ہے کھاڑی پر برائے نام محافظ تھے میرا خیال ہے کل علی الصبح یہاں سے نکل چلیں۔"

تابان تو پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ ایک بے چینی سی ہر وقت اس کے دل کو گھیرے رکھتی تھی۔ وہ چاہتا تھا سکندر کی شرط جلد از جلد پوری ہو اور وہ شہزادی مارشا کی صورت دیکھ سکے۔ کسی وقت اس کے دل میں عجیب وسوسے جاگ اٹھتے۔ وہ سوچتا، کیا سکندر اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ کہیں وہ اس سے فریب تو نہیں کر جائے گا۔ تابان کو معلوم تھا خوبصورتی اپنی دشمن آپ ہوتی ہے، اور مارشا خوبصورتی کی انتہا کا نام ہے۔ کیا نوجوان بادشاہ اس حسن مجسم کو دیکھ کر اپنے دل پر قابو رکھ سکے گا۔ وہ ایک بادشاہ تھا اور بادشاہ کی درازدستی ہر شک و شبے سے بالا تھی۔ اسے اپنی مملکت کی ہر چیز پر تصرف حاصل تھا۔ وہ چاہتا تو تابان کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک سکتا تھا۔ تابان کو بادشاہ وقت سے عجیب طرح کی رقابت محسوس ہونے لگتی۔ اس کا بدگمان تصور خوبرو بادشاہ کے سامنے مارشا کو لا کھڑا کرتا۔ مارشا جس کے نوخیز بدن میں قیامتیں سمٹی تھیں، رسیلے ہونٹوں سے شہد ٹپکتا تھا اور آنکھوں میں دنیا کے خوبصورت ترین

موتی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ تابان کا سینہ دہک اٹھتا۔ اسے لگتا کہ اس کے دل کے معبد میں زلزلہ برپا ہو گیا ہے اور وہاں سجی ہوئی ایک خوبصورت مورتی میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ اس کا دل چاہتا یہ مہم فوراً پایہ تکمیل کو پہنچے اور وہ اُڑ کر واپس ایتھنز چلا جائے ۔۔۔۔۔۔۔ اس وقت بھی ہوشمند کی بات سن کر اس کا جی خوش ہو گیا، وہ بولا۔

"پیارے ہوشمند! کیوں نہ صبح کی بجائے آج رات ہی نکل جائیں"

ہوشمند نے کہا۔ "اب اتنی جلدی بھی اچھی نہیں، اس سے پہلے میں کبھی رات کے وقت کشتی لے کر نہیں نکلا اس لیے کسی کو شبہ ہو سکتا ہے۔"

وہ رات تابان نے جیسے تیسے کاٹی۔ اگلے روز علی الصبح دونوں جزیرے کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اپنے حلیے اور لباس سے وہ دونوں ہی پھل فروش نظر آتے تھے۔ کشتی میں ہوشمند نے آلو بخارے کے بہت سے ٹوکرے لاد رکھے تھے۔ آلو بخارا جزیرہ سکوپے لاس کی خاص پیداوار تھا اور یہاں کا پھل دور دور تک جاتا تھا۔ ہوشمند کو یہ پھل جزیرہ تھاسوس کی کھاڑی پر پہنچانا تھا اور وہاں سے کوئی دوسرا پھل کشتی پر بار کرنا تھا۔

کھاڑی سے نکلنے میں انہیں کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہوشمند کھاڑی پر ایک جانا پہچانا شخص تھا۔ لٰہذا تابان پر بھی کسی نے خصوصی توجہ نہیں دی۔ ہوشمند ملاحوں اور ماہی گیروں سے نوک جھونک کرتا تابان کو کشتی تک لے آیا۔ کھاڑی میں کھڑی ہوئی کئی کشتیوں پر تابان نے ایک تصویر لگی دیکھی۔ شوخ رنگوں سے بنی ہوئی یہ تصویر ایک خوبصورت عورت کی تھی۔ اس کے سر پر تاج نظر آرہا تھا۔ ایسی ہی تصویر تابان نے کھاڑی کے راستے میں بھی کئی دکانوں پر آویزاں دیکھی تھی۔ مختلف تصویروں میں خدوخال مختلف نظر آتے تھے لیکن یقینی بات تھی کہ مصور نے ایک ہی عورت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ عورت وہی ملکہ تھی جو اپنے محبوب عوام کو چھوڑ کر اپنے محبوب کے سنگ جزیرے سے رخصت ہو چکی تھی۔ ایک ملکہ کا سارا حسن، وقار اور غرور ایک عاشق کے قدموں میں بکھر گیا تھا اور وہ کچے دھاگے سے بندھ کر ان لوگوں سے دور چلی گئی تھی، جو اب بھی اسے یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتے تھے۔۔۔۔۔۔ کھاڑی پر موجود ایک سرکاری محافظ نے تابان کے بارے میں ہوشمند سے چند سوال کیے جن کے ہوشمند نے مناسب جواب دیے اور یوں وہ کھاڑی سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔۔۔۔۔۔ کھلے سمندر میں پہنچتے ہی ہوشمند نے کشتی کی رفتار تیز کر دی۔ ہوا موافق تھی وہ دوپہر تک تھاسوس پہنچ گئے، وہاں کچھ وقت پھل

اتارنے چڑھانے میں صرف ہوا۔ اس دوران تابان اور ہوشمند بھی کھا پی کر تازہ دم ہو چکے تھے۔ اب انہوں نے اپنی کشتی کا رخ جزیرہ ساموتھریس کی طرف کر دیا۔

وہ شام سے کچھ دیر قبل ساموتھریس پہنچے۔ یہ جزیرہ دور تک گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ آسمان گہرا نیلا تھا اور ڈوبتے سورج کی روشنی میں خوش رنگ آبی پرندے محو پرواز نظر آتے تھے۔ انہوں نے کشتی کھاڑی میں ہی ایک پہریدار کی نگرانی میں چھوڑ دی اور جزیرے پر آ گئے۔ تابان نے قید خانے میں نورین سے جو معلومات حاصل کی تھی ان کے مطابق جزیرے کے انتہائی جنوب میں جزیرے کی سب سے بڑی عبادت گاہ تھی۔ اس عبادت گاہ سے کچھ فاصلے پر ایک سرسبز ٹیلا تھا جہاں سفید چونے سے بنا ہوا ایک دیدہ زیب مکان زرناب کی قیام گاہ تھا۔ ہوشمند اور تابان ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس عبادت گاہ اور پھر اس مکان تک جا پہنچے لیکن یہ جان کر ان کے جذبوں پر اوس پڑ گئی کہ مکان میں زرناب کی جگہ "ٹرائے" کا کوئی سوداگر مقیم ہے۔ یہ سوداگر زرناب کے بارے کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا، تاہم سوداگر کی باتوں سے معلوم ہوا کہ یہ مکان اور ٹیلا اس نے زرناب سے چند ماہ قبل ایک ہزار ٹیلنٹ میں خریدا تھا۔

تابان کے اندازے درست نکلے تھے۔ وہ مکار شخص اپنی ممکنہ گرفتاری سے بچنے کے لیے ٹھکانہ بدل چکا تھا۔ اب وہ نہ جانے کہاں گیا تھا؟ کس شناخت سے کہاں ٹھہرا ہوا تھا؟ تابان اور ہوشمند تو اس کی صورت تک نہیں پہچانتے تھے۔ وہ ان کے سامنے سے بھی گزر جاتا تو وہ دیکھتے رہ جاتے۔ تابان کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ بہتر تھا کہ وہ قید خانے سے نکلتے وقت نورین سے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کرتا۔۔۔۔۔۔۔ شام پل پل گہری ہو رہی تھی۔ وہ دونوں چونے کے سپید مکان کے سامنے مایوس کھڑے تھے جب ایک ادھیڑ عمر چرواہا بکریاں ہانکتا ہوا ان کے قریب سے گزرا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ ایک لحیم شحیم شخص تھا۔ اس نے رنگ دار لباس پہن رکھا تھا اور عام چرواہوں کی طرح ہاتھ میں ایک طویل لاٹھی تھی۔ وہ قریب آ کر بولا۔ "اس مکان کے سامنے کیا کر رہے ہو۔ کیا کسی سے ملنا چاہتے ہو؟"

ہوشمند نے کہا۔ "ہاں، لیکن جس سے ملنا تھا وہ مکان چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

چرواہے نے کہا۔ "اچھا۔۔۔۔۔۔۔ تو اس مقدونی زرناب کے مہمان ہو؟" ہوشمند نے ہاں میں جواب دیا۔ چرواہے نے بُرا سا منہ بنایا اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ

زرناب کو کوئی اچھا آدمی نہیں سمجھتا۔ حتیٰ کہ اس کے مہمانوں کے منہ لگنا بھی نہیں چاہتا۔ ہوشمند اور تابان چرواہے کے پیچھے لپکے۔ ہوشمند نے کہا۔

"عزیزی! ہم بڑی دور سے آئے ہیں، جزیرہ سکوپے لاس سے۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمارا زرناب سے ملنا بے حد ضروری ہے، اگر آپ ان کے بارے میں کچھ جانتے ہیں تو مہربانی فرمائیں۔"

چرواہے کے چہرے کی بیزاری کچھ اور بڑھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا ایک اور شخص اپنا ریوڑ ہانکتے ہوئے وہاں پہنچ گیا۔ لحیم شحیم چرواہے نے اسے مخاطب کیا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔ "یہ دیکھ بانکن، یہ مہمان ہیں اس مقدونی کتے کے۔" یہ بات کہتے ہوئے لحیم شحیم چرواہے نے سفید مکان کی طرف بھی اشارہ کیا۔ دوسرا چرواہا اس کی بات سمجھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں بھی تابان اور ہوشمند کے لیے تحقیر کے جذبات نظر آنے لگے۔ معلوم نہیں زرناب میں ایسی کیا بات تھی جو یہ دونوں چرواہے انہیں ایسی غیر مہربان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

لحیم شحیم چرواہے نے پوچھا۔ "کیا کام ہے تمہیں اس سے؟"

تابان نے اس موقع پر معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہم زرناب کے قرض خواہ ہیں۔ اس کے ذمہ ہماری رقم ہے۔"

چرواہے نے اپنی شک آمیز نظروں سے گھورا۔ "لگتا تو نہیں کہ تم زرناب کے قرض خواہ ہو۔"

تابان نے کہا۔ "اس کے ذمے ہماری چھ ماہ کی خدمت کا معاوضہ ہے۔ ہم فیصلہ کر کے آئے ہیں کہ اس سے اپنا حق خدمت وصول کریں گے یا اس کی چوکھٹ پر سر پٹخ پٹخ کر جان دے دیں گے۔"

تابان کے جواب نے دونوں چرواہوں کو مطمئن کر دیا۔ ان کے چہروں سے بے رخی کافور ہونے لگی۔ دراز قد چرواہا انہیں سرتا پا دیکھ کر بولا۔

"تو تم اس بد بخت کی ملازمت کرتے رہے ہو؟"

"جی ہاں۔" تابان نے کہا۔ "یہ گناہ سرزد ہو چکا ہے ہم سے۔"

اس دوران دو تین اور چرواہے بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ سب آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ وہ اب تابان اور ہوشمند کی طرف دوستانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دراز قد چرواہا ان کا سردار دکھائی دیتا تھا۔ وہ اسے بار بار جاگال کہہ کر پکار رہے تھے غالباً یہ مقامی زبان میں کوئی عزت و مرتبے والا لفظ تھا۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد جاگال نے ان دونوں سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ بستی میں چلیں باقی باتیں وہاں ہوں گی۔ تابان اور ہوشمند کو تو زرناب کا پتہ چاہیے تھا۔ اس کی خاطر وہ دنیا کی آخری سرحد تک جانے کو تیار تھے۔

وہ جاگال اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ ہو لیے۔ یہ ٹیلا دراصل ایک شاندار چراگاہ تھا۔ شاید کچھ عرصہ پہلے یہ چراگاہ عام تھی لیکن اب اس کی حصار بندی کی جا چکی تھی۔ چرواہے اس حصار کے ساتھ ساتھ چلتے انہیں نشیب میں لے گئے۔ یہاں دیودار اور صنوبر کے سرسبز درختوں کے درمیان ان کی چھوٹی سی خیمہ بستی کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ بستی کے گرد چھوٹے چھوٹے احاطوں میں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ بند تھے اور خاکستری رنگ کے کتے زور و شور سے بھونک رہے تھے۔

وہ رات تابان اور ہوشمند نے جاگال کے کشادہ خیمے میں بسر کی۔ اس خیمے میں جاگال کے علاوہ بستی کے دو تین اہم افراد بھی موجود تھے۔ انگیٹھی میں دیودار کی لکڑی جل رہی تھی اور خیمے میں قہوے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا اس بستی کے مکینوں کو ماضی میں زرناب کی طرف سے کوئی زبردست زک پہنچ چکی ہے اور وہ اس سے اپنا حساب چکتا کرنا چاہتے ہیں۔

جاگال نے ہمدردانہ لہجے میں ان دونوں کو بتایا۔ "آج سے سات آٹھ ماہ پہلے وہ خبیث یہیں رہتا تھا لیکن اب جا چکا ہے۔۔۔۔۔۔ بہرحال تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اسی جزیرے میں ہے ہم اس کا پتہ جانتے ہیں۔" اس کے بعد جاگال نے انہیں تفصیل سے زرناب کا حدود اربعہ سمجھایا۔ ان باتوں سے پتہ چلا کہ زرناب نے اپنے تمام ریوڑ بیچ ڈالے ہیں۔ اس نے جزیرے کے شمالی ساحل پر گنجان آبادی میں ایک مکان خرید رکھا ہے اور وہاں بڑے ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ اس کا میل جول عیاش لوگوں سے ہے اور وہ خود بھی بڑے رنگین شب و روز گزارتا ہے۔ حال ہی میں اس نے اپنی حفاظت کے لیے چند خطرناک غنڈے پالے ہیں۔ یہ غنڈے لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔

جاگال نے انہیں مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم زرناب سے اپنا حق خدمت وصول کرنا چاہتے ہو تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جزیرے کی عدالت سے رجوع کرو۔ منصف بہت انصاف پسند شخص ہے وہ زرناب جیسے سرکشوں کو ناکوں چنے چبوا دیتا ہے۔"

تابان نے کہا۔ "محترم! آپ ہمیں کمزور نہ سمجھیں۔ ہم اپنا حق بزور بازو بھی حاصل کر لیں گے۔ زرناب نے ابھی تک ہمارا جھکا ہوا سر دیکھا ہے۔ ہمارے اٹھے ہوئے ہاتھ نہیں دیکھے۔ ہماری رگوں میں اصل ایرانی خون ہے۔ ہم اسے بتا دیں گے کہ مزدور کی اجرت کیسے غصب کی جاتی ہے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔"

ہوشمند نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ "یہ ہمارا معاملہ ہے جناب! آپ ہم پر چھوڑ دیں۔ آپ کی بے حد عنایت کہ آپ نے ہمیں اس کا ٹھکانہ بتا دیا، بس اتنا ہی کافی ہے۔"

چرواہے کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ دونوں جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل بھی کر پائیں گے۔ تابان کے ڈیل ڈول اور دراز قامت نے انہیں متاثر ضرور کیا تھا لیکن وہ ان کی نگاہ میں ایک گھریلو خدمتگار ہی تھا۔ ایک گھریلو خدمتگار زرناب کے خونخوار غنڈوں سے کہاں تک نبرد آزما ہو سکتا تھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس گھریلو خدمتگار کے بھیس میں وہ خوفناک جنگجو چھپا ہوا

ہے جس نے ایک ہی جھڑپ میں سکندر کے تین چوٹی کے سردار ہلاک کیے تھے اور جس کا نام مقدونیہ و یونان کے ہر سپاہی کو معلوم ہو چکا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ کافی دیر تابان کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے زرناب کے خونخوار پہریدار سے بچ کر کرے۔

رات کسی وقت مطلع ابر آلود اور اگلے روز علی الصبح موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ان جزیروں پر ہونے والی بارش عموماً طوفانی ہوتی تھی اور تھوڑی دیر جاری رہتی تھی، لیکن اس روز جو بارش شروع ہوئی وہ مختلف قسم کی تھی۔ جزیرے کا نیلا آسمان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا۔ طوفانی جھکڑوں کے ساتھ زوردار بوچھاڑیں پڑنے لگیں اور یہ سلسلہ سارا دن جاری رہا۔ تابان اور ہوشمند بستی میں محصور ہو کر رہ گئے۔ جاگال اور اس کے ساتھیوں نے مہمانوں کی طرح ان کی خاطر مدارت جاری رکھی۔ وہ شراب کے رسیا تھے۔ انہوں نے تابان اور ہوشمند کو بھی بے تحاشا پلائی۔ یہ ایک پُر لطف تجربہ تھا۔ چمڑے کے خیمے پر متواتر پانی برس رہا تھا۔ بستی کے چرواہے دیودار کے الاؤ کے گرد بیٹھے بربط اور بانسریاں بجا رہے تھے۔ ایک معصوم چہرہ دوشیزہ رقص کر رہی تھی اور کوئی قدیم گیت گا رہی تھی۔ اس گیت

میں ان خوبصورت مسافروں کا ذکر تھا جنہیں مشرق سے چلنے والی ہوا جزیرے کے ساحل پر لاتی تھی۔ وہ سمندر پار کے سنہری دیس کی کہانیاں سنا کر کنواری چرواہیوں کا دل موہ لیتے تھے اور پھر لوٹ جاتے تھے۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔۔۔۔۔۔۔۔ انگور کی گھریلو شراب کے جام لنڈھاتے ہوئے چرواہے بڑی محویت سے یہ گیت سن رہے تھے۔ یہ محفل شام کے بعد دیر تک جاری رہی۔ پھر تابان اور ہوشمند الاؤ کے قریب ہی پڑ کر سو رہے۔۔۔۔۔۔

رات کسی وقت تابان کی آنکھ کھلی۔ بھنے ہوئے گوشت اور شراب کی تلخی نے پیاس بھڑکا رکھی تھی۔ اس نے پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں اور اس وقت اسے معلوم ہوا کہ ہوشمند خیمے میں موجود نہیں ہے۔ ایک طرف جاگال پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ شراب کا پیالہ اس کے نزدیک ہی لڑھکا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک ریشمی اوڑھنی پڑی تھی۔ معلوم نہیں یہ کس کی اوڑھنی تھی۔ سردار کی دو بیویاں تھیں پھر اس لڑکی کے سر پر بھی تو ایسی ہی اوڑھنی تھی جو شروع رات میں گیت گا رہی تھی۔ یہ اوڑھنی یوں ہی تو یہاں نہیں پڑی تھی۔ یقیناً یہاں کسی کے حسین جسم سے کھیلا گیا تھا۔ تابان نے اس منظر کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ ان لوگوں کے اپنے ہی رسم و رواج تھے اور جب انگور کی بیٹی بھی درمیان میں آجائے تو جو ہو وہ کم ہوتا ہے۔ تابان دبے پاؤں خیمے سے باہر نکلا۔ بارش تھم چکی تھی۔ تیسرے عشرے کا چاند بادلوں کے درمیان بھاگتا دکھائی دیتا تھا۔ خیمہ بستی کے ایک پہلو پر رکھوالی کے کتے زور شور سے بھونک رہے تھے۔ تابان کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ ہوشمند کہاں چلا گیا ہے۔ چاند کے رخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ شب کا دوسرا پہر ختم ہونے والا ہے۔ اس وقت ہوشمند کا پڑاؤ سے باہر ہونا کیا معنی رکھتا تھا۔ تابان کے دل میں کئی وسوسے سر اٹھانے لگے۔ دفعتاً اسے اپنے پہلو کی طرف سے آہٹ سنائی دی۔ اس نے نیام سے تلوار کھینچی اور چوکنا ہو گیا۔ "کون ہے؟" اس نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ تابان دبے قدموں آواز کی سمت بڑھا۔ اسے یوں چلتے دیکھ کر کسی شکاری جانور کا گمان ہوتا تھا۔ جونہی وہ ایک خیمے کی اوٹ میں پہنچا تاریکی سے سہمی ہوئی آواز آئی۔

"تابو یہ میں ہوں۔" آواز یقیناً ہوشمند کی تھی۔

تابان نے غور سے دیکھا وہ ایک چادر میں لپٹا خیمے کے سائے میں کھڑا تھا۔ "تم کہاں سے آ رہے ہو؟" تابان نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اندر تو چلو۔" ہوشمند نے جواب دیا۔ ہوشمند خیمے کی طرف بڑھا تو تابان نے اندازہ لگایا کہ وہ ہمیشہ سے زیادہ لنگڑا رہا ہے شاید کوئی چوٹ وغیرہ آگئی تھی۔ وہ دونوں خیمے میں پہنچے۔

جاگال کے خراٹے زور و شور سے گونج رہے تھے۔ تابان نے ایک شمع جلائی۔ روشنی میں اس نے دیکھا ہوشمند زخمی تھا۔ اس کی ایک آنکھ سوج رہی تھی اور ناک سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ کر ہونٹوں تک آ گئی تھی۔ "یہ کیا ہوا؟" تابان نے گھبرا کر پوچھا۔

ہوشمند نے کانپتے لہجے میں کہا۔ "دیوتاؤں کا شکر ادا کرو بچ کر آ گیا ہوں ورنہ میری لاش بھی نہ ملتی۔ بڑے ظالم لوگ ہیں وہ۔۔۔۔۔۔۔۔"

"کون لوگ؟"

"وہی اس بدبخت کے بدذات محافظ راہ چلتوں کو پکڑ کر پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔"

تابان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کہیں تم۔۔۔۔۔۔۔۔ زرناب کی طرف تو نہیں چلے گئے تھے؟"

"ہاں یہی غلطی ہوئی ہے مجھ سے، میں نے سوچا تمہاری طبیعت میں گرمی ذرا زیادہ ہے۔ خواہ مخواہ خون ریزی ہو جائے گی، کیوں نہ میں پہلے جا کر حالات کا جائزہ لے لوں۔ مجھے کیا پتہ تھا وہ بلاوجہ گلے پڑ جائیں گے۔"

"تم نے اس کے گھر میں گھسنے کی کوشش کی ہو گی؟"

"دیوتاؤں کی قسم نہیں میں تو صرف آس پاس گھوم کر جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کوئی ایسی سنسان جگہ نہیں ہے، بازار سے اکادکا اور لوگ بھی موجود تھے۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھ پر شبہ کیا جائے گا۔ اتنے میں ایک لمبا تڑنگا شخص آیا۔ اس کے ہاتھ میں مشعل تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگا، یہاں کیا کر رہے ہو۔ میں نے کہہ دیا، کیا یہاں کھڑے ہونا منع ہے۔ بس اسی بات پر وہ ملعون شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ تاک کر ایسا غضب کا مکا میری ناک پر مارا کہ میں چکرا کر رہ گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا کچھ نہ پوچھو۔ اس کے دو ساتھی بھی بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ انھوں نے بیچ بازار کے مجھے وہ غضب کی مار ماری کہ انجر پنجر ہل گیا۔ پھر مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک چھت کے نیچے لے گئے۔ یہاں تین چار مشعلیں روشن تھیں اور گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ غالباً وہ زرناب کی حویلی کا اصطبل تھا۔ مجھے مارنے والے ظاہر ہے زرناب کے پالتو غنڈے تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی کہ میں کون ہوں اور یہاں کیوں گھوم رہا تھا۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ اپنے ساتھی کے ساتھ پھل فروخت کرنے کے لئے جزیرے پر آیا تھا۔ ساتھی گم ہو گیا ہے اور اسے

ڈھونڈتا پھر رہا ہوں لیکن وہ میری بات پر کسی صورت یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں کسی بری نیت سے ان کے آقا کی رہائش گاہ میں گھسنا چاہتا تھا اور بار بار کسی ریچھ کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ سخت پوچھ تاچھ اور چھان بین کے بعد وہ مجھے چھوڑنے پر آمادہ ہوئے لیکن اس سے پہلے انھوں نے مجھ سے دست بستہ معافی منگوائی اور حکم دیا کہ میں منہ سے بلی کی طرح میاؤں میاؤں کی آواز نکال کر تسلیم کروں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو تابو، میں لڑنے پر آجاتا تو غضب ہو جاتا۔ مرنے سے پہلے میں تین چار کی موت تو غضب ناک کر ہی دیتا لیکن میں معاملہ بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اس میں ہمارا ہی نقصان تھا لہذا شرافت سے میاؤں میاؤں کی آواز نکال کر اپنی جان چھڑائی، اور گرتا پڑتا یہاں پہنچا ہوں۔"

ہوشمند کی حالت زار دیکھ کر تابان کے سینے میں آگ سی روشن ہو گئی اس کا دل چاہا ابھی پڑاؤ سے نکلے اور زرناب کی گردن ناپنے کے لئے اس کی حویلی میں پہنچ جائے۔ شاید رات اتنی زیادہ نہ بیتی ہوتی تو وہ نکل بھی پڑتا لیکن اب ممکن نہیں تھا، اور پھر ہوشمند بھی اس کے سامنے

موجود تھا۔ وہ کسی طور پر اسے تنہا خطرے میں کودنے کی اجازت نہ دیتا۔ تابان نے اپنے دلی جذبات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور خشک لہجے میں بولا۔

"تمہیں اس طرح بغیر مشورے کے وہاں نہیں جانا چاہئیے تھا معاملہ بگڑ جاتا تو کئے کرائے پر پانی پھر جانا تھا۔

ہوشمند نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "تو تم چاہتے ہو اب میں تمہارے سامنے بھی میاؤں میاؤں کی آواز نکالوں"

تابان بولا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اب جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئیے ہم کامیابی کے بالکل قریب پہنچ چکے ہیں۔ بہتر ہے کہ ایک دو روز اچھی طرح سوچ بچار کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھائیں۔"

"کیسا قدم؟" ہوشمند نے منہ پھلائے پھلائے پوچھا۔

"یہی کہ زرناب کو یہاں سے کس طرح لے جانا ہے۔ یہ بات تو ثابت ہو چکی ہے کہ وہ اپنی خوشی سے ہمارے ساتھ روانہ نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ زبردستی کرنا پڑے گی۔ دوسرے لفظوں میں ہم اسے گرفتار کر کے یہاں سے لے جائیں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

ہوشمند خوب غور سے تابان کی بات سن رہا تھا، یکایک اسے احساس ہوا کہ تابان باتوں میں لگا کر اس کی خفگی دور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ ایک بار پھر ہتھے سے اکھڑ گیا۔ بیزاری سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے جو تمہاری سمجھ میں آئے کرو۔ دنیا جہاں کی عقل تمہارے ہی دماغ میں تو گھسی ہوئی ہے۔" اس کے بعد اس نے روٹھی ہوئی بیوی کی طرح منہ پھیرا اور ادھ بجھی انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر اپنی غضب کی سوجی ہوئی آنکھ پر ٹکور کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات تاریک اور خنک تھی جب خیمے میں جاگال اور ہوشمند کے خراٹے گونجنے لگے تو تابان بہ آہستگی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ آج وہ وہی کام کرنے جا رہا تھا جو کل رات ہوشمند نے کیا تھا۔ کل ہوشمند کی مہم جوئی سے تابان بے خبر تھا، آج رات تابان کے منصوبے کی ہوشمند کو خبر نہیں تھی۔ تابان نے سردار جاگال کا خم دار خنجر اپنی کمر سے اڑسا اور دبے پاؤں اس احاطے میں پہنچ گیا جہاں چرواہوں کے گھوڑے بندھے رہتے تھے۔ اس اصطبل نما جگہ سے اس نے کچھ راسیں سمیٹ کر کمند کی شکل میں جوڑ لیں۔ پھر ایک تندرست گھوڑا لیا اور اس کے ساتھ

پیدل چلتا ہوا پڑاؤ سے نکل آیا۔ رکھوالی کے کتوں سے کافی فاصلے پر جا کر اس نے گھوڑے کی پیٹھ سنبھالی اور جزیرے کے شمالی ساحل کی طرف روانہ ہو گیا۔

تاریک راستوں پر تقریباً دو کوس کا فاصلہ طے کر کے وہ جزیرے کے انتہائی شمال میں پہنچ گیا۔ اس جگہ جزیرے کی آبادی بہت گنجان تھی۔ جگہ جگہ مخروطی میناروں والی عبادت گاہیں اور پون چکیاں نظر آ رہی تھیں۔ راستے سیدھے تھے اور ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر قطع کرتے تھے۔ ان راستوں کی دونوں اطراف خوبصورت مکانات اور بازار تھے۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ مشعل بردار پہریداروں کے علاوہ اکا دکا افراد ہی نظر آ رہے تھے۔ ہوشمند کی فراہم کردہ معلومات کے ذریعے تابان اس شاندار مکان کے سامنے پہنچ گیا جو دور دراز جزیرے میں زرناب مقدونی کا مسکن تھا، تابان مکان کے سامنے رکنے کی بجائے آگے بڑھتا چلا گیا اور طویل چکر کاٹ کر عقب کی ایک اندھیری گلی میں پہنچ گیا۔ اس طرف روشنی تھی اور نہ پہرہ۔ وجہ یقیناً یہی تھی کہ اس طرف سے مکان کے اندر داخل ہونا ناممکن تھا۔ ایک سیدھی سپاٹ دیوار بالائی منزل کی چھت تک چلی گئی تھی۔

اس تاریک گلی میں پہنچ کر تابان نے گھوڑا ایک طرف باندھ دیا۔ پہلے جوتے اتار کر خرجین میں رکھے پھر فراک بھی اتار دیا۔ اب اس کے جسم پر ایک لنگوٹی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ خنجر لنگوٹی میں اڑس کر اس نے خود ساختہ کمند تھامی اور عمل کے لئے تیار ہو گیا۔ چند ہی لمحے بعد وہ مکان کی چھت پر پہنچ چکا تھا اور نیچے جانے والے زینوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بلا کی پھرتی تھی۔ مکان کے مکینوں سے اس کی پہلی ملاقات زینوں نے درمیان ہوئی۔ یہ ایک تنومند خادم تھا جو غالباً چھت پر ہونے والی آہٹ سن کر اوپر آ رہا تھا۔ یکایک تابان اندھیرے سے نکلا اور موت بن کر اس سے لپٹ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ مدمقابل کے منہ پر آیا اور دوسرے نے اتنی صفائی سے اس کی شہ رگ کاٹ ڈالی کہ دیر تک مقتول کو بھی اس سانحے کی خبر نہ ہوئی ہو گی۔ گرم خون ایک دھار کی طرح تابان کے پاؤں پر گرا، مرنے والے کے جسم نے چند جھٹکے کھائے اور تابان کے آہنی بازوؤں میں جھول گیا۔ تابان نے اسے گھسیٹ کر زینوں کے تاریک ترین کونے میں سمیٹ دیا اور خون آلود خنجر کو صاف کرتا ہوا بالائی منزل پر آ گیا۔ ایک شخص سے نبرد آزما ہونے کے بعد اس کے جسم میں جیسے پارہ بھر گیا تھا۔ وہ کسی آسیب کی طرح چند ہی لمحوں میں پوری منزل پر گھوم گیا۔ اس چھت کے نیچے اب کل دو خادم تھے ایک مرد اور ایک عورت۔ عورت جو باورچن تھی مطبخ کے

اندر ہی ایک بوسیدہ قالین بچھا کر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ یا تو جاگ رہی تھی یا بہت کچی نیند میں تھی۔ جونہی تابان نے مطبخ میں قدم رکھا وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں چند ساعت کے لئے تابان پر مرکوز رہیں پھر دہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔ آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا منہ بھی کھلنا شروع ہوا۔ یقیناً وہ ایک لرزہ خیز چیخ بلند کرنے کے لئے پھیپھڑوں میں سانس بھر رہی تھی۔ یہ سب کچھ تابان نے ساعت کے ایک لمحے میں دیکھا۔ پھر وہ بجلی کی طرح تڑپ کر عورت پر آیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے عورت کا منہ ڈھانپا، دوسرے ہاتھ نے خم دار خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ وہ دیوانہ وار مزاحمت کر رہی تھی۔ چند لمحوں کے لئے تابان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ اس عورت کا کیا کرے۔ پھر اس نے جھنجھلا کر اپنے بازو کو حرکت دی اور عورت کا سر پوری قوت کے ساتھ فرش سے ٹکرا دیا۔ یہ ایک غیر معمولی ضرب تھی۔ عورت کا سر پھٹ گیا اور اس کے ناک منہ سے خون کے فوارے جاری ہو گئے وہ تھوڑی دیر اینٹھتی رہی پھر یکبارگی تڑپ کر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ فرش سے سر ٹکرانے کی صدا تابان کے کے تیسرے شکار کو بھی مطبخ میں کھینچ لائی۔ قدموں کی آہٹ سن کر تابان ایک تاریک گوشے میں سمٹ گیا۔ اب کی بار تابان کے سامنے آنے والا ایک چوڑا چکلا شخص تھا۔ لباس اور حلیے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ زرناب کے مشہور و معروف پالتو غنڈوں میں سے ہے۔ مطبخ میں

داخل ہونے سے پیشتر ہی وہ اپنی آب دار تلوار ہاتھ میں لے چکا تھا۔ جس وقت وہ مطبخ میں داخل ہوا اس کی حیرت زدہ نگاہیں فرش پر جمی تھیں جہاں تابان کے خون آلودہ نقش پا دکھائی دے رہے تھے۔ تب اس کی نگاہ باورچن کی خونچکاں لاش پر پڑی۔ وہ بے انتہا پھرتی سے بائیں جانب گھوما لیکن وہاں اس سے کہیں زیادہ پھرتیلا شخص موجود تھا، پہریدار کو خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب تلوار اس کے ہاتھ سے نکلی اور کب ایک فولادی بازو نے اس کی گردن کو جکڑ لیا۔

تابان کی گرفت اتنی سخت تھی کہ منہ کھلا ہونے کے باوجود پہریدار چیخ نہیں سکا تھا۔ اس کا پورا جسم جیسے کسی شکنجے میں کسا گیا تھا۔ اس کے حلق سے خرخر کی جو آواز نکل رہی تھی وہ اتنی دھیمی تھی کہ تابان کو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ پہریدار نے کن اکھیوں سے تابان کا چہرہ دیکھا۔ وہاں اسے کوئی ایسی بات نظر آئی کہ پلک جھپکنے میں اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اب اس کی آنکھوں میں فریاد کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ موت کو روبرو پا کر یہ پہلوان نما شخص دفعتاً سراپا التجا بن گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کی گرفت میں ہے جس نے رحم کرنا سیکھا ہی نہیں۔ زندگی بھر نہ اس پر کسی نے ترس کھایا ہے اور نہ وہ کسی پر ترس کھاتا ہے۔ وہ موت کے آگے بھاگ رہا ہے اور خود موت بھی ہے۔ ایکا ایکی تابان کا دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا اور گرانڈیل پہریدار کا پیٹ سینے سے ناف تک چاک ہو گیا۔

تینوں خونچکاں لاشوں کو محفوظ کونوں میں سمیٹنے کے بعد تابان عمارت کے اندرونی کمروں کی طرف بڑھا۔ یہاں کسی دروازے کے پیچھے سے جلترنگ کی مدھم صدا آ رہی تھی۔ وہ راستے میں آنے والے دروازوں کو بے آواز دھکیلتا ہوا ایک چھوٹی سی راہداری میں پہنچا اور وہاں سے ایک کھڑکی کے سامنے آ گیا۔ کھڑکی میں روشنی ہو رہی تھی۔ سرخ ریشمی پردہ تھوڑا سا سرکا ہوا تھا اور اس جھری سے کمرے کا کچھ حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک شاندار خوابگاہ تھی۔ شاندار اور وسیع و عریض۔ در و دیوار سے شان و شوکت ٹپکتی تھی۔ دبیز قالین، قیمتی فانوس، زرتار پردے اور غالیچے جن پر ساغر و مینا اور پھول پتوں کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ خواب گاہ کے فانوس اور خوشبودار شمعیں جل رہی تھیں ان کی روشنی میں ایک وجیہہ شخص آرام دہ کرسی پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے گھونگھریالے بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر تھی۔ گریبان کھلا تھا اور کرتے کے اندر سے سینے کے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔ مرد کے پاؤں کی طرف ایک خوبصورت عورت قالین پر بیٹھی جلترنگ بجا رہی تھی۔ اس کی نازک انگلیاں تیزی سے ساز پر حرکت کر رہی تھیں اور خوبگاہ کی فضا مدھر موسیقی سے معمور ہو رہی تھیں۔

ان لوگوں کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ خوابگاہ سے باہر کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ وہ اپنے حال میں مست تھے۔ عورت کی جھکی جھکی نظریں ساز پر تھیں اور مرد نشیلی نظروں سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ عورت کے بیٹھنے کا انداز ایسا دلربا تھا کہ جسم تصویر بن گیا تھا اور لگتا تھا کہ ایک خوبصورت تصویر سے نغمہ پھوٹ رہا ہے۔ تابان کے لئے یہ سمجھنا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ مسہری پر پھیلا ہوا شخص ہی زرناب ہے۔ زرناب کو دیکھ کر اس کی حِسیں شکاری جانور کی مانند بیدار ہو گئیں۔ اس نے خنجر ہاتھ میں تولا اور پوری طرح چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ دفعتاً ایک بچے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ یہ بچہ کمرے کے اس حصے میں رویا تھا جو تابان کی نظروں سے اوجھل تھا۔ ساز بجاتی عورت نے جلدی سے اپنے ہاتھ روکے اور بائیں طرف لپکی۔ ذرا دیر بعد وہ ایک بچے کو لے کر دوبارہ مسہری کے پاس آگئی۔ بچہ قریباً ایک سال کا تھا۔ غالباً وہ سوتے میں ڈر گیا تھا۔ خوبصورت عورت نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور ہلکورے دے دے کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ مرد بھی مسہری سے اٹھ بیٹھا اور بچے کو پچکارنے لگا۔ ان دونوں کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بچے کے ماں باپ ہیں۔ بات کچھ تابان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس کا ہاتھ خنجر پر تھا اور آنکھیں اندر کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ عورت توتلی زبان میں بچے سے کہہ رہی تھی۔

"کیا ہوا ہمارے لاڈلے کو کیوں رو رہا ہے، کوئی سپنا دیکھا ہے؟ چپ کر میری جان یہ دیکھ تیرے بابا، بابا کے پاس جاؤ گے؟ میرا منا اپنے بابا کے پاس جائے گا بابا سے لوری سنے گا؟ چندا کی کہانی سنے گا؟"

معصوم بچہ روتے روتے مسکرانے لگا۔ جیسے بادلوں کی اوٹ سے چمکتا سورج نکل آئے۔ اس نے اپنے ننھے منھے ہاتھ زرناب کی طرف بڑھا دئے۔ زرناب نے اسے گود میں اٹھا لیا اور اس کی پیشانی اور رخسار پر بوسے دینے لگا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے گدگدانے لگا۔ بچہ تڑپ کر بستر پر جا گرا اور قلقاریاں مارنے لگا۔ وہ دونوں اسے گدگدانے لگے۔ وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ تھوڑی دیر یہ شغل جاری رہا پھر بچہ تھک گیا اور وہ دونوں بھی تھک گئے۔ زرناب بچے کو اپنے ساتھ لے کر لیٹ گیا اس نے بچے کا سر اپنے سینے میں چھپایا اور پیٹھ تھپکنے لگا۔ عورت نے پائنتی کی طرف سے اپنی ریشمی چادر اٹھائی اور باپ بیٹے کے اوپر کھینچ دی۔ تابان کو الجھن سی محسوس ہونے لگی۔ نا جانے کیوں اس کے تنے ہوئے رگ پٹھے ڈھیلے پڑ گئے تھے لیکن ایسا تھوڑی دیر کے لئے ہوا چند ہی لمحے بعد وہ جبڑے بھینچ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کے راستے دندناتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب سے پہلے اسے عورت نے

دیکھا وہ ایک قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹ گئیں اور وہ سکتے کی کیفیت میں اسے دیکھتی چلی گئی۔ اس سے پیشتر کہ وہ اس کیفیت سے نکلتی، تابان اس کی شہ رگ تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا خون آلودہ خنجر عورت کی نازک گردن پر آیا اور دوسرے ہاتھ نے اس کے ریشمی بال ہاتھوں میں جکڑ لئے۔

"زرناب!" عورت کی چیخ کمرے میں گونجی۔

زرناب یوں اچھلا جیسے بیسیوں سانپوں نے بیک وقت اسے کاٹ کھایا ہو۔ پہلے اس نے تابان کو دیکھا، پھر تابان کے شکنجے میں کسی ہوئی عورت کو تب اس کی نگاہ دیوار کی طرف گئی۔ جہاں ایک خوبصورت نیام میں تلوار لٹک رہی تھی وہ تلوار کی طرف لپکا۔

"خبردار۔" تابان کی سفاک آواز کمرے میں گونجی، ایک قدم بھی بڑھایا تو اس عورت کا سر تن پر نہیں رہے گا۔"

تابان کے خوفناک لہجے نے زرناب کو چند لمحوں کے لئے مبہوت کر دیا۔ مگر پھر اس نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر تلوار اتار لی۔ تابان نے خنجر کی دھار عین عورت کے نرخرے پر رکھ دی

اور پر غضب لہجے میں پھر اپنی دھمکی دہرائی۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر ایک بار پھر زرناب نے دلیری دکھانے کی کوشش کی تو کمرے میں عورت کی لاش گر جائے گی۔

زرناب نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

"ابھی بتا دیتا ہوں۔ پہلے اس سامنے والے پردے سے ڈوری کھینچ کر لاؤ تاکہ میں تمہاری اس عزیزہ کی مشکیں کس لوں۔"

زرناب آگ بگولا ہو کر بولا۔ "جانتے ہو تم کس کے گھر میں کھڑے ہو۔ میری ایک آواز پر محافظ تمہاری تکہ بوٹی کر ڈالیں گے۔"

تابان نے کہا۔ "جن محافظوں پر تم کو ناز تھا ان کی لاشیں اس خواب گاہ سے باہر بکھری پڑی ہیں۔ اس خنجر پر جو خون چمک رہا ہے وہ تمہارے ہی پالتو کتوں کا ہے۔"

یکایک زرناب کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ تابان کی بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ عورت کی زبردست چیخ سن کر بھی اگر کوئی خوابگاہ تک نہیں پہنچا تو اس کا یہی مطلب تھا کہ تابان ٹھیک کہہ رہا ہے۔

وہ بجھی ہوئی آواز میں بولا۔ "کس مقصد سے گھسے ہو میرے گھر میں؟"

تابان نے کہا۔ "میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ سب کچھ تمہیں بتاؤں گا۔ پہلے تم وہ ڈوری لے کر آؤ تاکہ میں اس عورت کے ہاتھ باندھ سکوں۔"

"عورت پر ہاتھ اٹھانا مردانگی نہیں ہے۔ میری بیوی سے علیحدہ ہو جاؤ۔"

"مجھے اس کے نزدیک رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ تم وہ ڈوری لاؤ تاکہ میں اس کے ہاتھ باندھ سکوں۔ اس کے بعد تمہیں مردانگی آزمانے کا شوق ہے تو وہ بھی پورا کر لینا۔"

خون آلود خنجر بدستور عورت کی شہ رگ پر تھا۔ تابان کی شعلہ فشاں آنکھوں میں ایک بار جھانکنے کے بعد زرناب نے اس کی ہدایت پر عمل کرنا ہی بہتر سمجھا۔ وہ ڈوری لینے کے لئے کھڑکی کی طرف بڑھا، مگر اس سے پہلے ہی عورت ڈوری کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئی۔ اوپر تلے شدید صدموں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے ایک طویل آہ کھینچی اور بے ہوش ہو کر تابان کی بانہوں میں جھول گئی۔ بیوی کو یوں گرتے دیکھ کر زرناب بھوکے شیر کی طرح تابان پر جھپٹا۔ اس کی تلوار کا وار انتہائی شدید اور اچانک تھا۔ تابان جھکا اور موت اس کے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ عورت کو مسہری پر پھینک کر اس نے زرناب کا دوسرا وار

بچایا اور خنجر سے اس کے بائیں پہلو پر حملہ کیا۔ زرناب پھرتی سے ایک طرف ہٹا اور خنجر اس کی ریشمی قمیض پھاڑتا ہوا نکل گیا۔ اسی دوران تابان نے ہاتھ بڑھا کر دیوار سے تانبے کی منقش ڈھال اتار لی۔ اسے اب زرناب کی تلوار سے فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس نے زرناب کے چند شدید وار ڈھال پر روکے اور موقع ملتے ہی اس کے سینے پر ایسی ٹانگ جمائی کہ وہ قالین پر سربسجود ہو گیا۔ تابان کی دوسری شدید ٹھوکر نے اس کے کئی دانت توڑ دئے۔ اس کے بعد تابان نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ تلوار زرناب کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ تابان نے وحشت کے عالم میں اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ وہ شخص جو تھوڑی دیر پہلے بڑی شان سے مسہری پر دراز موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا، قابل رحم حالت میں قالین پر پڑا سسک رہا تھا۔ اس کا لباس تار تار تھا اور صورت پہچاننا مشکل ہو رہی تھی۔ کچھ یہی حالت خوابگاہ کی بھی تھی۔ اکثر آرائشی چیزیں ٹوٹ چکی تھیں اور بے داغ دیواروں پر زرناب کے لہو کے چھینٹے تھے۔

خوابگاہ میں ہونے والی لڑائی کے بعد بچہ بیدار ہو چکا تھا۔ اب وہ مسہری پر بیٹھا پورے جوش و خروش سے رو رہا تھا۔ تابان نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے نیچے جھک کر زرناب کا بازو پکڑا

اور پھر اس کے نڈھال جسم کو بے دردی سے کھینچ کر کندھے پر لاد لیا۔ جب وہ فاتحانہ انداز میں خوابگاہ کے دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا یکایک کوئی چیز اس کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ اس نے جھک کر دیکھا۔ یہ وہی عورت تھی جسے زرناب نے بیوی کہا تھا۔ اس کے لمبے بال تابان کے خون آلودہ پیروں پر بکھرے ہوئے تھے اور ہاتھوں نے مضبوطی سے اس کی پنڈلیاں تھام رکھی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں اور فریادوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

"نہیں نہیں۔" وہ بلک کر بولی۔ "دیوتاؤں کے لئے ایسا نہ کرو۔ ہمیں یوں برباد کر کے نہ جاؤ۔"

تابان نے پاؤں جھٹک کر آگے بڑھنا چاہا لیکن وہ پوری جان کے ساتھ اس کی عریاں پنڈلیوں سے لپٹ گئی۔ "نہیں، ہم پر رحم کرو۔ اس معصوم بچے پر رحم کرو۔ انہیں چھوڑ دو۔"

تابان نے گھوم کر روتے بچے اور سسکتی عورت کو دیکھا۔ ایکاایکی اس کے سنگلاخ سینے میں کوئی ننھا سا دھارا بہہ نکلا۔ ایک دھندلا سا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آیا یہ منظر اکثر اس کے تصور میں آتا تھا۔ ایک روتی ہوئی عورت، چند بلکتے ہوئے بچے، کئی مضبوط ہاتھ جو بچوں کو کھینچ کھینچ کر عورت سے دور کرتے تھے اور بچے جو بھاگ بھاگ کر عورت کے آنچل میں چھپنا

چاہتے تھے۔ اس منظر نے یکایک تابان کے قہر و غضب پر پہرے بٹھا دئے۔ اسے اپنے جسم میں ایک ناتوانی سی اترتی محسوس ہوئی۔ وہ کچھ دیر عورت اور بچے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے پر الجھن پھیلتی چلی گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات جو کسی قدیم داستان کی طرح طویل تھی، پل پل آگے سرک رہی تھی۔ زرناب کی خوابگاہ سے باہر دور نیلگوں تاریکی میں کہیں کسی گھڑیال نے اعلان کیا کہ رات کا تیسرا پہر ختم ہو چکا ہے۔ خوبرو عورت نے اپنے بچے کو سینے سے لگائے لگائے سر اٹھا کر تابان کی طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ نہ جانے اس عورت کو دیکھ کر تابان کو کیوں احساس ہوتا تھا کہ وہ اسے پہلے سے جانتا ہے۔ یہ چہرہ اس نے دیکھا ہوا ہے۔

زرناب اپنی مسہری پر نیم دراز تھا۔ چوٹوں کی وجہ سے اس کا چہرہ متورم اور ہونٹ خون آلود تھے۔ تاہم وہ بول سکتا تھا۔ تابان کے کچھ بتانے سے پہلے ہی وہ جان چکا تھا کہ وہ کوئی چور لٹیرا نہیں جو رات کی تنہائی میں اس کے گھر آ دھمکا ہے بلکہ شاید مقدونیہ سکندر کا بھیجا ہوا وہ اہلکار ہے جو اسے یہاں سے لے جانے آیا ہے لہذا اس سے کچھ بھی چھپانا فضول تھا۔ زرناب نے

اعتراف کر لیا کہ وہی وہ جاسوس ہے جسے سکندر کے والد عزت مآب شاہ فیلقوس نے دو برس پہلے ایشیا کی مہم پر بھیجا تھا اور اس کے ذمے کچھ اہم کام لگائے تھے۔ وہ یہ بھی مان گیا کہ ایک برس پہلے مقدونی سالار نورین اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ اسے واپس لے جانے آیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ ہاون کے تاریک تہہ خانوں میں پہنچ گیا ہے۔

تابان نے زرناب سے پوچھا۔ "تم نے یہ سب کیوں کیا۔ آخر کیا وجہ تھی کہ تم بادشاہ سے غداری کر کے اس دور دراز جزیرے میں آ بیٹھے اور تمہیں واپس لانے کے لئے جو آدمی بھیجے گئے انھیں بھی المناک انجام سے درچار کیا؟"

زرناب نے کراہ کر کہا۔ "میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ معلوم نہیں نورین نے تمہیں کیا بتایا ہے۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ مجھے زبردستی یہاں سے لے جانا چاہتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے دھوکے سے زہریلی شراب پلا دی۔ وہ مجھے بے ہوشی کی حالت میں جزیرے سے نکال لینا چاہتا تھا لیکن میرے ملازمین کو پتا چل گیا۔ نورین کے ساتھ ان کی جھڑپ ہو گئی۔ اس جھڑپ میں نورین کے دونوں ساتھی ہلاک ہوئے اور وہ خود پکڑا گیا، میں چاہتا تو اسے قتل کرا سکتا تھا۔ کوئی میرا ہاتھ روکنے والا نہیں تھا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے اسے

اپنے ایک شناسا جہاز راں کے سپرد کر دیا اور کہا کہ وہ اسے کسی ایسی جگہ لے جائے جہاں سے وہ دوبارہ یونان نہ پہنچ سکے۔ اگر وہ ہاون کے تہہ خانوں میں پہنچ گیا ہے تو مجھے اس سلسلے میں کچھ علم نہیں۔"

تابان نے کہا۔ "اگر تمہاری بات مان بھی لی جائے تو میرا اصل سوال اپنی جگہ رہتا ہے تم نے واپس جانے سے انکار کیوں کیا؟ کیوں شاہ مقدونیہ سے غداری کی کیوں اس جزیرے میں آ چھپے اور خونخوار محافظ رکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ تمہیں بادشاہ کی پکڑ سے بچا لیں گے؟"

زرناب نے کہا۔ "غالباً تم ان محافظوں کی بات کر رہے ہو جو میرے مکان پر پہرہ دیتے ہیں!" تابان نے اثبات میں جواب دیا۔ "تم بالکل غلط رخ پر سوچ رہے ہو۔ اس دور دراز جزیرے میں مجھے شاہِ مقدونیہ کی طرف سے ایسا کیا خطرہ ہو سکتا تھا اور اگر خطرہ پیدا ہو ہی جاتا تو پھر یہ محافظ مجھے کہاں تک بچا سکتے تھے کیا آج یہ محافظ مجھے بچا سکے ہیں؟"

تابان نے پوچھا۔ "تو پھر کیوں پال رکھا تھا انھیں؟"

"یہ سرخ ریچھ کے لئے تھے۔ شاید تمہارے لئے یہ نام اجنبی ہوں۔ سرخ ریچھ اس علاقے کا بہت بڑا غنڈہ ہے۔"

تابان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کل ہوشمند کی باتوں سے بھی پتا چلا تھا کہ زرناب کے محافظ کسی ریچھ کی بات کر رہے تھے۔ زرناب نے اسے سوچ میں گم پا کر کہا۔ "نورین نے تمہیں بتایا ہی ہوگا، میں پہلے جزیرے کے جنوبی ساحل پر مقیم تھا۔ وہاں میں نے ایک چراگاہ خرید رکھی تھی اور بھیڑ بکریاں پال رکھی تھیں۔ وہاں کچھ چرواہوں سے میرا تنازعہ چل نکلا۔ وہ چرواہے زبردستی میری چراگاہ میں گھس آتے تھے۔ میں نے اپنے قطعہ اراضی کے گرد حصار بندی کر دی۔ انھوں نے یہ حصار بندی توڑنی شروع کر دی۔ بات بڑھتی گئی۔ کئی بار جھگڑا ہوا جس میں دونوں طرف کے کئی آدمی ہلاک وزخمی ہوئے۔ زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔ لہذا میں نے مکان سمیت وہ چراگاہ بیچ ڈالی اور اس آبادی میں آ گیا۔ یہاں میں نے جو محافظ رکھے ہیں وہ اسی دشمنی کی وجہ سے ہیں۔ ان چرواہوں کا سرغنہ ایک لحیم شحیم خطرناک شخص ہے، بالکل ریچھ کی مانند چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا۔ لوگ اسے بلا تکلف سرخ ریچھ کہتے ہیں۔"

تابان کے ذہن میں کوئی نئی بات آئی وہ چونک کر بولا۔ "کیا اسے جاگال بھی کہا جاتا ہے؟"

زرناب نے حیرت سے کہا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" پھر خود ہی بولا۔ "اس کا مطلب ہے تم اس سے بھی مل چکے ہو۔"

تابان نے "ہاں" میں جواب دیا اور بتایا کہ اسی کی مدد سے وہ یہاں تک پہنچا ہے۔ زرناب کے زخمی ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ کھیل گئی۔ "اتفاق ہے کہ تم اب تک جن دو افراد سے ملے ہو وہ دونوں ہی میرے شدید مخالف ہیں۔ میرا مطلب نورین اور جاگال سے ہے۔ شاید اسی لئے تم مجھے بار بار عیاش اور ظالم گردان رہے ہو۔ حقیقت اس سے بہت مختلف ہے دوست۔ میں ظالم ہوں اور نہ بدکار۔ گناہ گار ضرور ہوں مگر سرکش نہیں ہوں اور گناہ بھی یہ ہے کہ میں نے محبت کی ہے۔ کسی کو چاہا ہے اور اس کا ساتھ نبھانے کی کوشش کی ہے۔"

"تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"اپنی بیوی کی۔ اس کا نام زنوبیا ہے۔"

یکایک تابان کے ذہن میں پھل جھڑیاں سی پھوٹ گئیں۔ وہ تصویر جو بڑی دیر سے اس کے تصور میں مکمل نہیں ہو پا رہی تھی، اچانک مکمل ہو گئی۔ زنوبیا سکوپے لاس کی ملکہ کا نام تھا۔ وہی ملکہ جو پیار میں سب کچھ ہار کر اپنے محبوب کے ساتھ چلی گئی تھی۔ تابان اس کی تصویریں

دیکھ چکا تھا۔ وہی ملکہ، زرناب کی بیوی تھی۔ تابان نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وسیع خوابگاہ کے ایک گوشے میں ملکہ اپنے لخت جگر کو سینے سے لگائے دم سادھے بیٹھی تھی۔ ایکا ایکی تابان کو احساس ہوا کہ وہ ایک سخت امتحان سے دوچار ہونے والا ہے۔ اسے ہر صورت میں زرناب کو واپس لے کر جانا تھا اور اگر زرناب واپس چلا جاتا تو محبت کی ایک یادگار کہانی دردناک انجام کا شکار ہو جاتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تابان کی حیرت زدہ نگاہیں عورت پر جمی تھیں۔ وہ سہمی نظروں سے تابان کو دیکھ رہی تھی ننھے بچے کا ننھا ہاتھ خوراک کی تلاش میں ماں کے جسم پر گردش کر رہا تھا۔ تابان کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"کیا یہ سکوپے لاس کی ملکہ ہے؟"

زرناب نے اپنے ورم زدہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "ہاں۔ تمہاری معلومات درست ہیں۔"

تابان نے پوچھا۔ "تم دونوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تم کسی سہل طریقے سے ایک دوسرے کو حاصل نہ کر سکتے تھے۔"

زرناب بولا۔ "ایسا ہو سکتا تو ہم اپنے اپنے وطن کو خیر آباد کہہ کر اس جزیرے کو مسکن کیوں بناتے۔ ہماررے لئے یہ ناممکن تھا کہ ایک دوسرے کو پا سکیں۔ سکوپے لاس کے رواج کے مطابق ملکہ شاہی خاندان سے باہر شادی نہیں کر سکتی تھی۔ دوسری طرف میں بھی اس شادی کے بعد شاہِ مقدونیہ کا معتوب ٹھہرتا۔ ہم دونوں کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا کہ ایک دوسرے کو اپنا کر اس جزیرے میں روپوش ہو جائیں۔"

تابان نے کہا۔ "تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ شاہ مقدونیہ تمہاری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ انھوں نے تم پر بھروسہ کیا تھا۔ تمہاری مہم کے لئے شاہی خزانے سے رقوم خرچ کی تھیں اور تم سے ان گنت امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔"

زرناب کی نگاہیں جھک گئیں۔ "ہاں دوست! مجھے اپنی اس بھول کا اعتراف ہے۔ لیکن تم یہ بات تسلیم کرو گے کہ کبھی کبھی حالات انسان کو جکڑ کر بے بس کر دیتے ہیں۔ جب مجھ سے ایک قدم غلط اٹھ گیا تو پھر میرے لئے واپس لوٹنا مشکل ہو گیا۔ گزرنے والے ہر دن کے

ساتھ اپنی فرض شناسی اور شاہ کے خوف کا احساس مجھ پر غالب آتا تھا اور میں مدرسے سے بھاگے ہوئے بچے کی طرح اپنے آپ میں چھپتا چلا گیا۔"

زرناب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے گلوگیر آواز میں اپنی بات جاری رکھی۔

"آج میں اعتراف کرتا ہوں دوست کہ میں گناہ گار ہوں۔ میں شاہ کا مجرم ہوں۔ میں نے شاہی خزانے پر بوجھ ڈال کر خشکی اور تری کے طویل سفر کئے۔ شاہ کے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے اہم معلومات تک رسائی حاصل کی اور جب میرے پاس اپنے ہم وطنوں کے لئے گراں قدر معلومات جمع ہو گئیں اور میں اس قابل ہو گیا کہ مشرقی سواحل کی جانب پیش قدمی کے مقدونوی منصوبے میں نئی روح پھونک سکوں تو میں سب کچھ بھول بھال کر اپنی نجی زندگی میں گم ہو گیا اور دن بدن سب کچھ بھولتا چلا گیا۔ پھر میرے پاؤں میں بیوی اور بچے کی بیڑیاں پڑ گئیں۔ میں جانتا تھا اور اب بھی جانتا ہوں کہ واپس لوٹا تو شاہی عتاب میری جان لے لے گا اور میں اپنی جان کھو کر اپنے بیوی بچے کو دنیا میں بے سہارا کرنا نہیں چاہتا۔ اس سنگ دل دنیا میں کہاں پناہ ملے گی انھیں؟ کہاں جائیں گے وہ؟"

تابان بہت دیر تک زرناب کی روئیداد سنتا رہا۔ اس کی باتوں سے سچائی کی خوشبو آتی تھی۔ وہ اپنی غلطیوں کا برملا اعتراف کر رہا تھا اور یہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ تابان نے کہا۔ "تم نے مجھے دوست کہا ہے تو دل سے بھی دوست سمجھو۔ تم میرے ساتھ مقدونیہ چلو میں وعدہ کرتا ہوں کہ شاہِ سکندر سے تمہاری جان بخشی کرا دوں گا۔"

زرناب بے دلی سے مسکرایا۔ "دوست! محسوس ہوتا ہے تمہیں شاہی صحبت میں زیادہ وقت نہیں گزرا بادشاہوں کے فیصلے ہمیشہ ناقابل گماں ہوتے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا حکم صادر ہو جائے۔ میں گناہ گار ہوں، میری تو بات ہی چھوڑ دو۔ میرا نومولود بچہ بھی دربار شاہی سے سزا کا مستحق قرار پا سکتا ہے۔"

تابان نے کاہ۔ "دوست! تم اپنے جرائم کو سنگین تر کرتے چلے جا رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ واپس چلنے کے لئے اب بھی وقت موجود ہے۔"

زرناب بولا۔ "میں تمہارے خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا۔"

تابان نے کہا۔ "پھر میں بھی مجبور ہوں۔ مجھے ہر حال میں تمہیں مقدونیہ لے جانے کا حکم ہے۔"

عورت کی سسکیاں بلند ہو گئیں۔ وہ بھیگی ہوئی فریادی نگاہوں سے تابان کی طرف دیکھنے لگی۔ تابان نے نظر چرا لی۔ وہ ان آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس ہنستے بستے گھرانے کو اجڑنے نہیں دے گا۔ زرناب کو واپس لے جانے کی باتیں وہ صرف اس لئے کر رہا تھا کہ زرناب کچھ لو کچھ دو کے اصول پر عمل کرے یعنی وہ معلومات اور راستوں کے نقشہ جات جو زرناب کے پاس موجود تھے اور جن کی موجودگی کا وہ اعتراف بھی کر چکا تھا، تابان کی ضرورت تھے جبکہ "اپنی آزادی" زرناب کی ضرورت تھی۔ ان کی گفتگو کچھ دیر مزید جاری رہی آخر زرناب نے وہ سب کچھ کہہ دیا جس کی تابان خواہش کر رہا تھا، زرناب نے پیشکش کی کہ وہ اپنی مہم سے حاصل ہونے والی تمام معلومات تابان کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کے بدلے وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلا جائے۔

تابان نے کہا "لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ معلومات مکمل ہوں گی اور تم کچھ چھپا کر نہیں رکھ سکو گے۔ تمہاری شادی جزیرہ سکوپے لاس کی ملکہ سے ہوئی ہے اور سکوپے لاس کبھی یونان کا ہمنوا خیال نہیں کیا گیا۔ یہ سارے جزیرے ہم سے زیادہ ایرانیوں کے قریب ہیں۔ عین ممکن ہے کہ تم اس ناتے سے اہم باتیں چھپا لو۔"

ملکہ زنوبیا نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔ "میں اپنے بچے کی قسم کھا سکتی ہوں کہ میرا شوہر ایسا نہیں کرے گا۔"

زرناب بولا۔ "دوست! میری بیوی اب سکوپے لاس کی ملکہ نہیں ہے اور نہ اسے ایران و یونان کے سیاسی معاملات سے سروکار ہے۔ ہم نے تو بس اپنی الگ چھوٹی سی دنیا بسا رکھی ہے، جسے آباد رکھنا ہماری پہلی اور آخری آرزو ہے۔ میرا وعدہ ہے کہ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ٹھیک دم یوم بعد تابان شام کے وقت زرناب کے خوبصورت مکان سے رخصت ہو رہا تھا۔

ان دو یوم میں وہ زرناب اور زنوبیا کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں آیا تھا۔ نہ ہی کسی کو معلوم ہوا تھا کہ گھر میں قتل و غارت کرنے والا شخص بطور مہمان گھر کے اندر ہی موجود ہے۔ تابان کو رخصت کرتے وقت زرناب کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک تھی۔ زنوبیا بھی بچے کو سینے سے لگائے رو رہی تھی۔ تابان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چرمی تھیلا تھا۔ اس تھیلے میں وہ تمام دستاویزات موجود تھیں جن کی تمنا شاہِ فیلقوس نے کی تھی اور اب جن کی سکندر کو اشد

ضرورت تھی۔ یہ دستاویزات مقدونوی سپاہ کے لئے ایک قیمتی اثاثے سے کم نہیں تھیں ان میں راستوں کے نقشے تھے۔ ایران کی سرحدی علاقوں کی تفصیلات تھیں اور اہم قلعہ جات کے حالات درج تھے۔

زرناب نے الوداعی انداز میں کہا۔ "تابان! میری بات یاد ہے ناں؟"

تابان بولا۔ "بے فکر رہو دوست، خدا تمہیں ہزاروں برس سلامت رکھے لیکن شاہِ سکندر کی نگاہ میں اب تم مردہ قرار پاؤ گے۔ اب کبھی کوئی متلاشی دستہ تمہاری تلاش میں نہیں نکلے گا اور نہ ہی شاہی ایوانوں میں تمہاری روپوشی کا ذکر ہو گا۔"

زرناب احسان مندی کی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ تابان نے ایک نظر ملکہ زنوبیا پر ڈالی اور مسکرا کر بولا۔ "میں آپ کو ایک اور فکر سے بھی آزاد کر کے جا رہا ہوں۔ امید ہے اب آپ کی شامیں اور صبحیں مزید خوبصورت ہو جائیں گی۔"

"میں سمجھا نہیں۔" زرناب نے پوچھا۔

"کل تک سمجھ جائیں گے۔" تابان نے جواب دیا۔

میاں بیوی کے چہرے پر الجھن نظر آ رہی تھی۔ تابان نے ان کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے الوداعی کلمات کہے اور خادم کے ساتھ باہر نکل آیا۔ مکان کی ڈیوڑھی کے سامنے ایک صحت مند گھوڑا کھڑا تھا۔ یہ وہی گھوڑا تھا جو دو روز پہلے تابان نے چرواہوں کے اصطبل سے لیا تھا اور مکان میں داخل ہونے سے پیشتر آزاد چھوڑ دیا تھا۔ زرناب کے ملازمین نے یہ گھوڑا پکڑ لیا تھا اور اب ایک بار پھر تابان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا تھا، تابان نے گھوڑا سنبھالا اور چرمی تھیلے کے ساتھ واپس چرواہوں کی بستی روانہ ہو گیا۔

تابان واپس بستی پہنچا تو ہوشمند کو سخت پریشان پایا۔ بات تھی بھی پریشانی کی۔ تابان پورے دو روز بستی سے غائب رہا۔ ہوشمند پہلے تو اسے قرب و جوار میں تلاش کرتا رہا تھا اور پھر وہ اور جاگال اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ تابان کسی کو بغیر بتائے زرناب کی طرف چلا گیا ہے اور زرناب کے درندہ صفت محافظوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ اس خدشے کی تصدیق کے لئے جاگال نے اپنا ایک خاص مخبر زرناب کی رہائش گاہ کی طرف بھیجا تھا۔ اس مخبر نے کھوج لگایا کہ کل رات زرناب کے محافظوں نے ایک خالی گھوڑا پکڑا ہے۔ خیال ہے کہ یہ گھوڑا تابان ہی وہاں لے کر گیا تھا۔ اس کے علاوہ مکان کے اندر کچھ پراسرار سرگرمیاں جاری ہیں۔ لگتا ہے کچھ

لوگ ہلاک یا زخمی ہو گئے ہیں۔ منجر کی اس اطلاع کے بعد ہوشمند کی بے قراری نقطہ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اپنے چہیتے دوست کی جان بچانے کے لئے وہ سب کچھ کرنے پر تیار ہو گیا۔ وہ اسی وقت واپس اپنے جزیرے پہنچا۔ یہاں ایک ایسا سیاہ فام شخص اس کا واقف تھا جو معاوضہ لے کر ہر بڑے سے بڑا جرم کر گزرتا تھا۔ اغواء، آبروریزی، قتل۔ یہ سب اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی چاہے تو معاوضہ دے کر اس سے بادشاہ کو بھی قتل کروا سکتا ہے لیکن اس کا طلب کردہ معاوضہ دینا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ بیسیوں نہیں سینکڑوں ٹیلنٹ میں بات کرتا تھا۔ ثامن نام کے اس دہشت گرد سے ہوشمند کا رابطہ ہو چکا تو ہوشمند نے اپنا مکان بمعہ دوکان فروخت کر دیا۔ گاہک پہلے سے موجود تھا۔ ہوشمند کو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ ایک دن کے اندر اندر نقد رقم اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے ثامن کو دو تہائی معاوضہ پیشگی دیا اور ایک تہائی بعد میں دینے کا وعدہ کیا۔ کام یہ تھا کہ ثامن کو زرناب کا سر لانا تھا، اور تابان کو اس کی قید سے رہائی دلانی تھی۔ سب معاملات طے ہو چکے تھے۔ ثامن اپنی خونی مہم پر روانہ ہونے کے لئے تیار تھا کہ تابان واپس آ گیا۔ تابان کو زندہ سلامت اپنے سامنے پا کر ہوشمند کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ چند لمحے مبہوت رہا پھر بھاگ کر تابان سے لپٹ گیا۔

"تابو! کہاں چلے گئے تھے تم۔ بہت غضب کیا تم نے اس طرح جا کر۔ معلوم ہے کتنا پریشان رہے ہیں ہم۔"

لحیم شحیم چرواہا جاگال اور اس کے ساتھی بھی تابان کے قریب آ گئے۔ حبشی ثامن سمیت سب سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تابان نے کہا۔ "دوستو! ذرا سانس تو لینے دو' پھر بتاتا ہوں سب کچھ۔"

ہوشمند تابان کے لے کر علیحدہ خیمے میں آ گیا۔ خیمے میں پہنچ کر تابان نے ہوشمند سے پہلا سوال ثامن کے متعلق ہی کیا۔ پوچھنے لگا۔

"وہ خونخوار حبشی کون ہے؟"

ہوشمند نے کہا۔ "وہ خونخوار تو ہے مگر اس کے لئے جو اس کے نشانے پر ہو۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں اس شخص کو تمہاری تلاش میں بھیج رہا تھا۔ زرناب کی طرف۔"

"تو تمہیں معلوم تھا کہ میں وہاں ہوں۔"

"غضب کے بیوقوف ہو۔" ہوشمند نے کہا۔ "یہ تو سامنے کی بات تھی۔ یہاں ہماری آمد کا مقصد زرناب کے علاوہ اور کیا تھا۔"

تابان نے گہری سانس لی اور گود میں رکھے چرمی تھیلے کو گھور کر بولا۔ "یہ مقصد پورا ہو چکا پیارے۔ اب واپس چلنے کی تیاری کرو۔"

ہوشمند نے حیرت سے تھیلے کو دیکھا۔ "تو کیا زرناب کو اس میں بند کر کے لائے ہو؟"

"ایسا ہی سمجھو۔" تابان نے جواب دیا۔ "جیسے حکیم اور طبیب جڑی بوٹیوں سے کشتہ نکال لیتے ہیں، سمجھو یہ زرناب کا کشتہ ہے۔"

ہوشمند کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس حیرت کو کم کرنے کے لئے تابان نے مختصر الفاظ میں اپنی روئیداد بیان کی اور زرناب کے محل نما مکان میں پیش آنے والے واقعات بتائے۔ زرناب کے کردار کا یہ مثبت پہلو ہوشمند کے لئے بھی انکشاف انگیز تھا۔ اب تک وہ زرناب کو ایک بے اصول اور ظالم شخص سمجھ رہے تھے جو اپنے فرائض کو پس پشت ڈال کر اس دور دراز جزیرے میں داد عیش دینے میں مصروف تھا۔ مگر اب اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ محبت کا مارا ایک مجبور و محصور شخص ہے۔ وہ اپنی چھوٹی سی دنیا بچانے کے لئے اس جزیرے میں چھپتا پھرتا ہے

اور اپنی کوتاہیوں پر قرار واقعی نادم ہے۔ ہوشمند کی نگاہیں چرمی تھیلے پر مرکوز تھیں۔ اب اسے اس معمولی تھیلے کی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس تھیلے کی موجودگی کا مطلب تھا کہ تابان وہ سب کچھ حاصل کر چکا ہے جو اسے اپنی طویل مہم سے بھی شاید ہی حاصل ہوتا۔ ان دستاویزات کا حصول کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی۔

اچانک خیمے کے دروازے پر جاگال کی صورت دکھائی دی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوڑ ہانکنے والی طویل لاٹھی تھی۔ اس لاٹھی کے ایک سرے پر تیز کلہاڑی کا پھل چمک رہا تھا۔ وہ اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولا۔

"کیا ہمارا اندازہ درست تھا؟"

"کون سا اندازہ؟" ہوشمند نے پوچھا۔

"یہی کہ تمہارا ساتھی زرناب کی قید میں ہے۔"

"ہاں میں اسی کے پاس تھا۔" ہوشمند کی بجائے تابان نے جواب دیا۔

"پھر رہائی کیسے ملی؟"

"رہائی ملتی نہیں رہائی حاصل کی جاتی ہے سردار۔ سزا کاٹ کر یا سلاخیں کاٹ کر۔ سمجھو میں بھی سلاخیں کاٹ کر آیا ہوں۔"

"یعنی نکل بھاگے ہو؟"

"ہاں ان کے چار محافظ مارنے کے بعد۔" تابان بڑی روانی سے جھوٹ بولا رہا تھا۔

"بہت خوب۔ تم نے جوانمردی کا ثبوت دیا ہے۔ ویسے میں تم دونوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

"کھلے دل سے کہو۔" ہوشمند نے پوری طرح متوجہ ہو کر کہا۔

جاگال بولا۔ "یہ جو حبشی تم سکوپے لاس سے لے کر آئے ہو۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"ثامن" ہوشمند نے لقمہ دیا۔

"ہاں۔ یہ بڑا پہنچا ہوا شخص لگتا ہے۔ شاید کسی معرکے میں اسے دیکھا بھی ہوا ہے میں نے۔ اسے کرائے پر لائے ہو یا دوست ہے تمہارا؟"

ہوشمند نے ہوشیاری سے کہا۔ "کرائے پر کہاں سے لاتے۔ پیشہ مزدور ہیں سوداگر نہیں ہیں۔"

"یعنی دوست ہے تمہارا؟"

ہوشمند نے "ہاں" میں جواب دیا۔ تو اس دوست کو کام میں لاؤ اور زرناب کا قصہ پاک کرا دو اس سے۔"

ہوشمند نے کہا۔ "مگر تابان تو اب واپس آگیا ہے۔"

"تابان واپس آگیا تو کیا ہوا۔ تمہاری دشمنی تو زرناب سے پختہ ہو گئی ہے۔ تم نے زرناب کے چار محافظ مارے ہیں۔ وہ تمہارے چالیس آدمی مار کر بھی آرام سے نہ بیٹھے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ سراپا انتقام بن کر تمہارا پیچھا کرے 'تم اسے فنا کے گھاٹ اتار دو۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تمہارا یہ حبشی دوست یہ کام انجام دے سکتا ہے۔"

ہوشمند کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن تابان نے آنکھ کے اشارے سے اسے خاموش کر دیا۔ دوستانہ انداز میں سر کو جنبش دے کر بولا۔ "سردار 'تمہارا مشورہ غور طلب ہے۔ واقعی ہمیں زرناب

کو کوئی ڈھیل نہیں دینی چاہیئے۔ داناؤں کا قول ہے کہ سانپ کو سر اٹھانے سے پہلے کچل دینا بہتر ہے۔"

سردار جاگال کافی دیر تابان اور ہوشمند سے مصروف گفتگو رہا' اس کا سارا زور بیان اس بات پر صرف ہو رہا تھا کہ وہ دونوں اپنے سیاہ فام ساتھی کو حرکت میں لائیں اور زرناب کی زندگی کا چراغ گل کر دیں۔ موقع ملے تو اس کی حسین و جمیل بیوی کو اٹھا لیا جائے اور گھر کا ساز و سامان لوٹ لیا جائے۔ جاگال کا سینہ زرناب کے خلاف کدورت سے بھرا پڑا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی کے ہاتھوں ہو لیکن زرناب کا گھر تاراج ہو جائے۔

رات گئے تک یہ محفل بپا رہی۔ خیمے کی نیم گرم فضا میں مے کا دور چلتا رہا اور خیمے سے باہر چراہے الاؤ کے گرد بیٹھے بے سُرے راگ الاپتے رہے۔ وہ فحش شعر بھی بڑی روانی سے پڑھ جاتے تھے۔ ان کی آوازوں میں کرختگی تھی جیسے وہ گا نہ رہے ہوں اپنے نادیدہ دشمنوں سے تکرار کر رہے ہوں۔ دوسرے پہر جاگال اور اس کے ساتھی خیمے سے اٹھ کر چلے گئے۔
تابان اور ہوشمند نے تنہائی پائی تو اپنے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ چرمی تھیلا تابان کے سینے پر تھا۔ اس کی انگلیاں بے خیالی میں تھیلے پر سرسرا رہی تھیں۔ جیسے یہ بے جان چمڑا نہ ہو کسی کی

نرم ریشمی جلد ہو۔ اس گل بدن کی جلد جو اس کی وحشی دھڑکنوں میں سما کر اس کی حواس خمسہ کا حصہ بن چکی تھی۔ اس کی آنکھیں کہیں بہت دور دیکھ رہی تھیں۔ شاید ایتھنز کے در و دیوار اس کی نگاہوں میں تھے۔ وہ ایتھنز جہاں ایک شب اس کی آوارہ آنکھوں نے ایک سپنا دیکھا تھا ایک دوشیزہ دیکھی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ روئے زمین پر موجود دلکش ترین چہرہ دیکھنے کا اعزاز حاصل کر چکا ہے۔

"تابو!" ہوشمند کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکا دیا۔

"کیا بات ہے؟" تابان نے تھیلا تکیے کے نیچے سرکاتے ہوئے کہا۔

"اب کیا ارادے ہیں؟"

"کل کسی وقت یہاں سے نکل چلیں گے اور ہوا مؤافق ہوئی تو کل کی رات ہمیں سکوپے لاس میں آئے گی۔"

"اور یہ جاگال جو سمجھے بیٹھا ہے کہ ہم زرناب سے نبرد آزما ہونے کی تیاری کر رہے ہیں۔"

"وہ جو جی چاہے سمجھتا رہے۔ ہم اس کی سوچ پر پہرے تو نہیں بٹھا سکتے۔"

"ویسے دوست 'ایک مسئلہ ہے۔" ہوشمند نے متفکر لہجے میں کہا۔

"کیا مسئلہ ؟"

"ثامن نے زرناب کے سر کی قیمت دو ہزار ٹیلنٹ لگائی تھی۔ میں نے ساری جمع پونجی اس کے مطالبے کی نذر کر دی۔ اب ہمیں ثامن سے کام تو لینا نہیں مگر اس سے معاوضہ واپس لینا سانپ کے منہ سے نوالہ چھیننے کے مترادف ہے۔ اس کم بخت کا یہ اصول ہے کہ معاوضہ واپس نہیں کرتا۔"

"تو نہ لو معاوضہ واپس۔" تابان نے لاپرواہی سے کہا۔

"دوست 'تمہیں کوئی ہمدردی نہیں میرے ساتھ ؟ میں غریب آدمی بے وجہ مارا گیا ہوں۔"

"اچھا 'تمہارے مارے جانے کی کوئی وجہ پیدا کر لیں گے۔ اب تو خوش ہو؟"

"کیا مطلب ؟"

"مطلب تمہیں کل بتاؤں گا جب جزیرے سے روانہ ہوں گے۔" تابان نے مسکرا کر کہا۔

ہوشمند منہ لٹکا کر رہ گیا۔ وہ اب کسی حد تک تابان کا مزاج سمجھنے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کتنا بھی سر پٹخے تابان اب کچھ نہیں بتائے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جزیرہ ساموتھریس کے نیلگوں آسمان پر سفید بادلوں کی ٹکڑیاں تیر رہی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ چمکیلی مگر نرم تھی۔ تابان اور ہوشمند جزیرے کی سرسبز گھاٹیوں بارونق گلیوں اور لدے پھندے باغوں سے ہوتے ہوئے کھاڑی پر پہنچ چکے تھے۔ یہاں ہوشمند کی کشتی موجود تھی۔ ہوشمند کشتی پر سوار ہونے کے لئے بے قرار نظر آتا تھا۔ وہ چرواہوں کی بستی سے چوری چھپے نکلے تھے اور جتنی جلدی وہ اس جزیرے کو الوداع کہہ دیتے اتنا ہی بہتر تھا۔ تاہم تابان کھاڑی پر کھڑا بدستور مشرق کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اسے کسی کا انتظار تھا۔

ہوشمند کا پیمانہ صبر لبریز ہونے لگا مگر اس سے پہلے کہ وہ تابان سے تاخیر کی وجہ دریافت کرتا دور سے ایک گھڑ سوار آتا دکھائی دیا۔ ایک تنومند شخص تھا۔ اس نے اپنا نصف چہرہ ایک رومال نما کپڑے میں چھپا رکھا تھا۔ وہ قریب پہنچا تو ہوشمند نے اسے پہچان لیا۔ وہ حبشی ثامن

تھا۔ حبشی تابان کے سامنے رکا اور گھوڑے کی ایک خرجین اتار کر تابان کی طرف بڑھا دی ۔ خرجین (تھیلی) میں کوئی گول مٹول تربوز نما شے تھی۔

"یہ کیا ہے؟" ہوشمند نے حیران ہو کر تابان سے پوچھا۔

"جاگال کا سر!" تابان نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا؟" ہوشمند تقریباً چیخ پڑا۔

"ہاں تمہاری صرف کی ہوئی رقم بیکار نہیں گئی۔ اس کے عوض ہم نے ثامن سے جاگال کا سر کٹوالیا ہے 'سرخ ریچھ اب ایک بے سر کے جسم کے سوا اور کچھ نہیں۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" ہوشمند کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

"پیارے ہوشمند! سیدھی سادی بات ہے تم نے ثامن کو سر کا معاوضہ دیا تھا اور ثامن سر لے آیا ہے۔ اب جلدی سے باقی رقم اس کے حوالے کرو۔"

ہوشمند کے جواب دینے سے پہلے ہی تابان نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر رقم والی تھیلی نکال لی۔ پھر ایک نظر خرجین کے اندر ڈالی اور مطمئن ہو کر تھیلی حبشی ثامن کی طرف اچھال دی۔ حبشی نے تھیلی کو ہوا میں دبوچا اور اپنے لباس میں رکھ لیا۔ ہوشمند ہکا بکا کھڑا تھا۔ تابان نے اپنی جیب سے چمڑے کا ایک باریک ٹکڑا نکالا اور اس پر اپنے ہاتھ سے تحریر لکھنا شروع کی۔

"پیارے و محترم دوست زرناب! میں نے کہا تھا ناں کے جانے سے پہلے تمہیں ایک بڑی فکر سے آزاد کر جاوں گا۔ تمہارے بدخواہ جاگال کا سر پیشِ خدمت ہے۔ میں ایک بار پھر سے معذرت چاہتا ہوں کہ میرے ہاتھوں تمہارے چند قیمتی محافظ ہلاک ہوئے۔ میری طرف سے اپنے بچے کی پیشانی پر بوسہ دینا۔ قدرت تم سب کو اپنی حفاظت میں رکھے۔"

یہ تحریر اس نے خرجین میں ڈالی اور خرجین دوبارہ ثامن کے حوالے کر دی۔ "یہ دونوں چیزیں زرناب تک پہنچا دو" تابان نے کہا۔ حبشی نے اقرار میں سر ہلایا اور گھوڑا موڑ کر واپس روانہ ہو گیا۔ ہوشمند اب بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ ہونٹ سکوڑ کر بولا۔

"غضب کے چکر باز ہو تم۔"

"یہ چکر بازی نہیں۔ ہاں تم عقلمندی کہہ سکتے ہو تم۔ ہماری رقم ڈوبنے سے بچ گئی۔"

"ہماری یا میری؟" ہوشمند اعتراض کیا۔

"چلو تمہاری سہی۔ کوئی نیکی تو تمہارے حساب میں جمع ہوئی۔" وہ دونوں کشتی میں آن بیٹھے ۔ پاسبان کو خدمت کا معاوضہ دیا اور بادبان کھول کر جزیرہ سکوپے لاس روانہ ہو گئے۔

چھ پہر کے طویل اور کٹھن سفر کے بعد وہ واپس سکوپے لاس پہنچے۔ اس وقت صبح ہو رہی تھی جزیرے کی سر سبز ڈھلوانوں اور آلو بخارے کے خوبصورت باغات پر سورج کی روپہلی کرنیں دمک رہی تھیں۔ کھاڑی کے ارد گرد ماہی گیروں، ملاحوں اور تاجروں کا شور و غل تھا۔ اس ہنگامہ ء محشر میں کسی محافظ نے تابان اور ہوشمند پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ ساحل پر اتر کر وہ جزیرے میں داخل ہو گئے۔ یہ وہی جزیرہ تھا جہاں دو ہفتے پہلے جب تابان نے ایک مرد اور ایک عورت کو ہلاک کرنے کے بعد ہاون کے منحوس قید خانے سے رہائی حاصل کی تھی اور پھر دوبارہ گرفتاری سے بچنے کے لئے گلی کوچوں میں بھاگتا پھرا تھا۔ اب اس کا حلیہ کافی حد تک بدل چکا تھا۔ وہ ہر طرح سے پھل فروش ہوشمند کا ساتھی نظر آ رہا تھا۔

دکان اور مکان تو ہوشمند دو روز پہلے ہی فروخت کر چکا تھا' اور نئے مالکان ان جگہوں پر قابض بھی ہو چکے تھے' اب اس جزیرے میں کوئی ایسی چھت نہیں تھی جس کے نیچے لیٹ کر وہ دونوں سفر کی تھکان اتار سکتے۔ "اب کہاں کا ارادہ ہے؟" ہوشمند نے تابان سے پوچھا۔

"بتاتا ہوں۔" تابان نے چلتے چلتے مختصر جواب دیا۔

"کسی مسافر سرائے میں جانا ہے؟"

"ذرا زبان منہ میں رکھو ابھی پتہ چل جاتا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد وہ کھاڑی سے کچھ فاصلے پر واقع ایک شاہی عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ جب تابان نے عمارت کے صدر دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو ہوشمند نے بوکھلا کر اسے بازو سے تھام لیا۔

"تابو' کیا کرتے ہو' مرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"مرنے کا نہیں رات بسر کرنے کا ارادہ ہے۔" تابان نے جواب دیا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ بے وقوف تم مفرور قاتل ہو سرکاری محافظ تمہیں دیکھتے ہی پھانسی پر چڑھا دیں گے۔"

"میرا خیال تم سے مختلف ہے۔" تابان نے کہا اور ہوشمند کا بازو تھام کر صدر دروزے کی طرف بڑھنے لگا۔ ہوشمند کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ تابان کی گرفت مضبوط تھی ورنہ شاید وہ بازو چھڑا کر بھاگ جاتا۔ صدر دروازے پر چوکس محافظ گہری نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"تابو یہ کیا کر رہے ہو؟ اپنے ساتھ مجھے بھی مرواؤ گے 'میں کہتا ہوں رک جاؤ۔" ہوشمند مسلسل ڈری ہوئی سرگوشیاں کر رہا تھا۔ وہ دونوں صدر دروازے پر پہنچ گئے۔ نیزہ بردار محافظوں نے انہیں روکا۔ تابان نے اپنے چرمی تھیلے میں سے ایک تحریر نکال کر محافظوں کو دکھائی وہ ایکاایکی مؤدب نظر آنے لگے۔ انہیں مؤدب دیکھ کر ہوشمند کی جان میں جان آئی۔ ایک محافظ نے پوچھا۔ "تو آپ سپہ سالار سے ملنا چاہتے ہیں؟"

تابان نے اثبات میں جواب دیا۔ باوردی محافظ انہیں ساتھ لے کر اس محل نما عمارت کے اندر چلے آئے۔ یہاں ایک سبزہ زار میں فوارے چھوٹ رہے تھے اور پھولوں کے رنگ دار

تختوں پر جابجا تتلیاں منڈلا رہی تھیں۔ ان تتلیوں کے علاوہ بھی یہاں کچھ تتلیاں موجود تھیں۔ یہ محل کی خوش اندام اور خوبرو خادمائیں تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو پھول مار رہی تھیں اور آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ ہوشمند اور تابان کو دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لئے ٹھٹکیں۔ ان کی نگاہیں خود بخود تابان کے سراپا پر مرکوز ہو گئیں۔ چوڑے شانوں والا دراز قد تابان صنفِ مخالف کے لئے بے پناہ کشش رکھتا تھا اور وہ اپنی اس خوبی سے آگاہ بھی تھا۔ بے شمار موقعوں پر وہ اپنی اس مردانہ کشش کے سبب اپنے آقاؤں کی قید سے بھاگنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اہل خانہ میں سے کوئی خاتون یا کنیز اس پر مر مٹی تھی اور وہ اس کی مدد سے اپنے آقا کو غچہ دے گیا تھا۔ لڑکیوں کو دیکھ کر ہوشمند نے بھی تن کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن اس میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ خوشنما تتلیاں شوخی سے مسکرائیں اور ایک بار پھر اپنے کھیل میں مصروف ہو گئیں۔ محافظ نے تابان اور ہوشمند کو ایک تخت کے قریب آرام دہ نشستوں پر بٹھا دیا۔ سنگ مرمر کے اس تخت پر دبیز گدیلے بچھے تھے اور گاؤ تکیہ رکھا تھا۔ تابان اور ہوشمند کو بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ کھیلتی کودتی دوشیزائیں ٹھٹک کر رک گئیں۔ باغیچے کے دروازے کی جانب سے " باادب باملاحظہ " کی بھاری بھر کم صدا آئی۔ پھر ایک بارعب شخص برآمد ہوا۔ اس نے باغیچے پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ دوشیزاؤں اور خادماؤں کو

ترتیب سے کھڑا کیا۔ چند ہی لمحے بعد ایک ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے ٹخنوں تک لمبا زرد چغہ پہن رکھا تھا۔ آگے اور پیچھے مسلح محافظ تھے۔ تابان نے اسے پہچان لیا یہ وہی شخص تھا جس کے بارے میں ہوشمند نے بتایا تھا کہ یہ جزیرے کی فوج کا سپہ سالار ہے اور ملکہ کے بعد عارضی حکمران کے طور پر کام کر رہا ہے۔ دو ہفتے پہلے تابان نے اس شخص کو جلسہ گاہ میں تقریر کرتے دیکھا تھا۔ جلسہ گاہ کی طرح زرد پھول یہاں بھی سپہ سالار کے پاس تھا۔ ایک خادمہ زرد پھول والا طلائی گلدان اٹھائے سپہ سالار کے آگے آگے چلی آ رہی تھی۔

گلدان کو مرمریں تخت پر گاؤ تکیے کے سامنے سجا دیا گیا اور سپہ سالار خود ایک عام نشست پر بیٹھ گیا۔ وہ سب سے پہلے تابان اور ہوشمند کی جانب ہی متوجہ ہوا۔ وہ دونوں اپنی نشستوں پر باادب کھڑے تھے۔ محافظ نے جھک کر سرگوشی کے انداز میں سپہ سالار سے کوئی بات کہی۔ غالباً ان دونوں کا تعارف کرایا گیا تھا۔ سپہ سالار کی آنکھوں میں حیرت آمیز دلچسپی نظر آنے لگی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے تابان کی طرف دیکھا تو تابان نے لباس کے اندر سے ایک سربمہر تحریر نکال کر سپہ سالار کے حوالے کر دی۔

سپہ سالار پوری توجہ سے اس تحریر کو دیکھنے لگا۔ بعدازاں اس نے اپنے ذاتی محافظ کو ہدایت کی کہ وہ ان دونوں کو پورے احترام کے ساتھ مہمان خانے میں لے جائے۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں شاہی مہمان خانے کے شاندار حماموں میں غسل کرنے کے بعد فارغ ہو چکے تھے اور کہیں قریب ہی اشتہا انگیز کھانوں کی خوشبو سونگھ رہے تھے۔ اس خوشبو نے ہوشمند کو بے قرار کر دیا تھا۔ باوجودیکہ اس کے ذہن میں سینکڑوں سوال کلبلا رہے تھے۔ اس نے دسترخوان بچھنے اور پھر اٹھنے تک کوئی بات نہیں کی۔ پیٹ بھر گیا تو اس کے خدشے پھر سر اٹھانے لگے۔ یعنی عقل دوبارہ کام کرنے لگی۔ ایک طویل تر ڈکار لے کر بولا۔ "تابو! مجھے وہ بکرے یاد آ رہے ہیں جنھیں ذبح کرنے سے پہلے خوب کھلایا پلایا جاتا ہے۔"

تابان نے اطمینان سے کہا۔ "یہاں ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ تم دیکھنا سپہ سالار ایک دو روز ہمیں خوب کھلائے پلائے گا پھر ایک اچھی کشتی دے کر بڑے احترام سے رخصت کر دے گا۔"

"اگلے جہاں۔" ہوشمند نے لقمہ دیا۔

"نہیں۔ واپس مقدونیہ۔"

"آخر ایسی کیا کرامات آگئی ہے تمہارے ہاتھ؟ ہاں یاد آیا وہ تحریر کس کی تھی؟"

"تھی ایک خیر خواہ کی۔"

"خوش فہمی ہے تمہیں۔ اگر وہ خیر خواہ ہوتا تو تمہیں اس جال میں نہ پھنساتا۔ تابو پیارے، میری بات مانو اب بھی وقت ہے نکل چلو۔"

"نکل چلیں گے دوست مگر تم ایک بات بھول رہے ہو میرے کچھ رفیق یہاں ہاون کے قید خانے میں ہیں۔ میں انہیں رہا کرائے بغیر کیسے جا سکتا ہوں۔"

ہوشمند کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ "تو کیا اب تم انہیں رہا کراؤ گے؟"

"ہاں اور یہ کام ابھی تھوڑی دیر میں ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے دوپہر کا کھانا وہ لوگ ہمارے ساتھ کھائیں۔"

تابان اب ہوشمند کی جھنجھلاہٹ سے کافی لطف اندوز ہو چکا تھا۔ اس نے تابان کو حقیقت حال بتاتے ہوئے کہا۔ "پیارے! یہ سب ملکہ زنوبیا کی مہربانی ہے۔ اس نے مجھے اپنے سپہ سالار کے نام تحریر دی تھی۔ اس تحریر میں سپہ سالار سے درخواست کی گئی ہے کہ اگر قیدیوں پر

کوئی سنگین مقدمہ نہیں تو انہیں رہا کر دیا جائے۔ یہ لوگ زنوبیا کو اب بھی اپنی ملکہ ہی سمجھتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس کی درخواست رد کریں۔ وہ تو انہیں حکم بھی دے سکتی ہے۔"

ہوشمند نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تو کیا شاہی خاندان کو معلوم ہے کہ ملکہ جزیرہ ساموتھریس میں ہے؟"

"نہیں، صرف سپہ سالار اور اس کے چند قریبی ساتھیوں کو معلوم ہے۔"

تابان کی باتیں سننے کے بعد ہوشمند کے چہرے پر اطمینان کی بارش ہونے لگی۔ وہ اپنے کھائے ہوئے کھانے سے اب پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا اور بار بار پیٹ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جیسے دائقوں اور خوشبوں کو پھر سے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اسی دوران ایک نقیب نے آکر تعظیم پیش کی اور تابان کو اطلاع دی کہ ان کے ساتھی رہائی پانے کے بعد ہاون کے قید خانے سے روانہ ہو چکے ہیں اور تھوڑی دیر میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔ تابان کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ چاہتا تو ہوشمند کے ساتھ براہ راست مقدونیہ روانہ ہو سکتا تھا اور سکندر کو اپنی کارکردگی سے آگاہ کر کے اس کی نوازشات اور توجہ کا مستحق ٹھہر سکتا تھا۔ لیکن اس کی جمعیت اور مردانگی نے گوارہ نہ کیا کہ اپنے ہمراہیوں کو قید میں چھوڑ کے خود

واپسی کا سفر اختیار کرے۔ بلاشبہ سردار شلال نے اس سے جانوروں سا سلوک کیا تھا، مگر وہ خود کو انسان ثابت کرنا چاہتا تھا۔ زرناب اور زنوبیا کو الوداع کہنے سے پہلے اس نے زنوبیا سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کے ساتھیوں کی رہائی کا پروانہ لکھ دے۔ زنوبیا رضامند ہو گئی تھی لیکن زرناب نے شرط رکھی تھی کہ نورین دوسرے قیدیوں کے ساتھ رہا نہیں ہوگا۔ زرناب کی یہ شرط قابل فہم تھی۔ نورین، زرناب کا دشمن تھا اور یقینی بات تھی کہ وہ واپس مقدونیہ پہنچ کر سکندر کو زرناب کے بارے بتائے گا اور زرناب کے لئے مشکلات پیدا کر دے گا تاہم تابان نے یہ الجھن بھی اپنی خداداد فراست سے حل کر لی تھی اور اپنی طرف سے زرناب کو یہ ضمانت فراہم کر دی تھی کہ رہا ہونے کے بعد نورین اپنی زبان بند رکھے گا اور کبھی کسی کے سامنے زرناب و زنوبیا کا تذکرہ نہیں کرے گا لہٰذا اب نورین بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ رہا ہو رہا تھا۔

حسبِ اطلاع تھوڑی دیر بعد قیدی، سپہ سالار کے محل میں پہنچ گئے۔ تابان اور ہوشمند ان کے استقبال کے لئے صدر دروازے پر موجود تھے۔ انہیں شاہی اصطبل کی ایک بند گھوڑا گاڑی میں یہاں تک لایا گیا تھا۔ ایک ایک کر کے وہ نیچے اترے۔ وہ سب ابھی تک قیدیوں کے لباس میں تھے۔ کورا سب سے آخر میں نظر آئی۔ اپنے ساتھیوں کی طرح وہ بھی قدرے حیران نظر آتی تھی۔ لگتا تھا انہیں ابھی تک بھروسہ نہیں کہ وہ واقعی آزاد کئے جا رہے ہیں۔ سردار شلال، گونسل اور نورین نے تعجب سے تابان کی طرف دیکھا۔ تابان تیزی سے آگے بڑھا اور گرم جوشی سے ایک ایک کو گلے لگایا پھر وہ کورا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ سادہ لباس میں حزن و ملال کی تصویر نظر آتی تھی اور اس کیفیت نے اسے کچھ اور جاذبِ نظر بنا دیا تھا۔ وہ بے ساختہ بھاگ کر تابان سے چمٹ گئی اور رونے لگی۔ ان آنسوؤں میں ہاون کے اس بدبودار قید خانے کے دکھ پروئے ہوئے تھے اور تشکر کا وہ جذبہ بھی تھا جس کے اظہار کے لئے کورا سمیت کسی کے پاس الفاظ موجود نہیں تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ کافوری شمعوں کی روشنی میں تابان اور ہوشمند مصروف گفتگو تھے۔ یہ سپہ سالار کے محل ہی کا ایک کمرہ تھا۔ ایک ایسے ہی کمرے میں سردار شلال، گونسل اور نورین سوئے ہوئے تھے۔ تابان اور ہوشمند کے درمیان جاری گفتگو کا موضوع دراصل سردار شلال تھا۔ وہ دونوں اس بات پر سوچ بچار کر رہے تھے کہ سردار

شلال کو چرمی تھیلے کے بارے بتایا جائے یا نہیں۔ شلال اس مہم کا سردار تھا۔ اسے ان تمام مقاصد کا علم تھا تو سکندر اس مہم سے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ چرمی تھیلے کی دستاویزات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا اور فیصلہ کر سکتا تھا کہ یہ معلومات کافی ہیں یا نہیں۔ بحثیت سردار بھی اس کا حق تھا کہ اسے حالات سے باخبر رکھا جائے لیکن دوسری طرف سردار شلال کا سابقہ کردار ان کے سامنے تھا۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ شلال احسان فراموشی نہیں کرے گا اور اس کی نیت فتور سے پاک رہے گی۔ یوں تو تابان قید خانے میں سردار شلال سے عہد لے چکا تھا۔ اگر وہ انہیں رہائی دلانے میں کامیاب ہوا تو وہ اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور سردار شلال اب کسی حد تک "دوست" نظر بھی آ رہا تھا۔ تاہم اس مرحلے میں حتمی رائے قائم نہیں کی جا سکتی تھی۔

ہوشمند کو گفتگو کے ساتھ اب جمائیاں بھی آ رہی تھیں۔ لہذا تابان نے اس معاملے پر غور و فکر صبح تک ملتوی کر دیا۔ شہد ملے دودھ کا ایک ایک پیالہ نوش کر کے وہ بستر پر دراز ہونے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی اور کورا اندر آ گئی۔ وہ شب خوابی

کے لباس میں تھی۔ آنکھوں میں خوف سمٹا ہوا تھا۔ وہ کسی دہشت زدہ ہرنی کی مانند دکھائی دیتی تھی۔

"کیا بات ہے کورا؟" تابان نے نرمی سے پوچھا۔

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ "کچھ نہیں کچھ بھی نہیں۔ بس مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

تابان نے اسے ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ "سردار شلال سے خوفزدہ ہو؟"

اس نے اقرار میں سر جھکا لیا پھر چہرہ ہاتھوں میں ڈھانپ کر رونے لگی۔ "وہ انسان نہیں درندہ ہے۔ میں اس کے قریب بھی نہیں رہنا چاہتی۔ ایسی آزادی سے تو ہاون کا قید خانہ اچھا تھا۔ وہاں ایسے حیوان کا خوف تو نہیں تھا۔"

تابان نے محبت سے اس کا شانہ سہلایا۔ "کورا تم بے وجہ گھبرا رہی ہو۔ شلال اب تم سے اتنی ہی دور ہے جتنا مشرق سے مغرب اور ویسے بھی اب وہ بہت بدل چکا ہے۔ تم نے محسوس نہیں کیا اس کے لہجے میں تمہارے لئے پہلے جیسی سختی نہیں تھی۔ میں اس سے وعدہ لے چکا ہوں وہ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچائے گا اور نہ تم سے عداوت رکھے گا۔"

ہوشمند نے تابان کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "میں سردار شلال کو عرصے سے جانتا ہوں مجھے وہ بہت بدلا ہوا نظر آرہا ہے۔ لگتا ہے ہاون کے قید خانے میں اس کے دل کی سیاہی کافی حد تک ڈھل گئی ہے پھر بھی اگر آپ کوئی خدشہ محسوس کر رہی ہیں تو اس کمرے میں سو جایئے میں آپ کے کمرے میں لیٹ جاؤں گا۔"

معمولی تذبذب کے بعد کورا نے یہ تجویز مان لی۔ "ہوشمند "شب بخیر" کہہ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ تابان دروازے کے قریب قالین پر دراز ہو گیا اور کورا مسہری پر لیٹ گئی۔ کمرے میں اب صرف دو مومی شمعیں جل رہی تھیں۔ ان کی خوابیدہ روشنی میں کمرے کے فانوس دور افتادہ کہکشاؤں کی طرح دمک رہے تھے۔ اس کمرے میں کورا کی موجودگی گدگدی کی طرح تابان کے حواس کو چھو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ کتنا بدل گیا ہے وہ بھی۔ کس قدر بے لحاظ اور اجڈ تھا وہ۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ایک خوبصورت جسم اس کے اس قدر نزدیک موجود ہو گا اور وہ لاتعلق پڑا رہے گا۔ وہ تو آنکھوں سے کاجل اور زلفوں سے خوشبو لے اڑتا تھا۔ اس میں صنفِ مخالف کے لئے کشش تھی اور اس کشش کو اس نے کبھی رائیگاں نہیں جانے دیا۔ جہاں اور جب موقع ملا اس نے عورت کو ہتھیار بنا کر اپنے آقاؤں پر

کاری وار کیا۔ مگر اب اس کے اندر ایک اور ہی طرح کی تڑپ جاگ چکی تھی۔ شاید وہ محبت کرنے لگا تھا اور محبت اسے حیوانیت سے دور لے آئی تھی معلوم نہیں سوچتے سوچتے کب تابان کو اونگھ آگئی۔ نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں وہ محسوس کرتا رہا کہ اس کے حلق میں کانٹے سے چھبے ہوئے ہیں اور وہ پیاس کی شدت سے ہانپ رہا ہے۔ دفعتاً اس کی آنکھ کھل گئی۔ در و دیوار ایک نامانوس شور سے گونج رہے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مسہری پر کورا بھی جاگ چکی تھی۔ ایک ملازم ہانپتا کانپتا ہوا اندر داخل ہوا اور اس نے یہ روح فرسا اطلاع دی کہ کسی نے ہوشمند کو خنجر گھونپ دیا ہے۔ تابان خادم کے پیچھے بھاگتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا جو آج کی رات ہوشمند کا مسکن تھا۔ اس کی آنکھوں نے ایک دلدوز منظر دیکھا۔ ایک خنجر کا نصف سے زائد پھل ہوشمند کے سینے میں اترا ہوا تھا۔ ہوشمند کا جسم بے حس و حرکت تھا اور خون نے چادر رنگین کر رکھی تھی۔ تابان کے ہونٹوں سے کراہ نکلی۔ وہ لپک کر ہوشمند کے قریب آیا۔ پھر اسے سردار شلال کا خیال آیا۔ اس نے قریبی کمرے میں جھانکا وہ خالی تھا۔ "سردار شلال کہاں ہے؟" اس نے گرج کر خادمین سے پوچھا۔

"وہ تو اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ چلے گئے۔"

"کہاں گئے ہیں؟"

"معلوم نہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے نکلے تھے۔" خادم مزید تفصیل بھی بتا رہا تھا لیکن تابان کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے کانوں میں سماعت شکن دھماکے گونج رہے تھے۔ پلک جھپکنے میں وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ کورا کے خدشات درست نکلے تھے۔ تاریکی اور تنہائی سے فائدہ اٹھا کر سردار شلال کورا کے کمرے میں گھسا تھا۔ وہاں اس کی مڈبھیڑ بے دست و پا کورا کی بجائے ہوشمند سے ہو گئی تھی۔ غالباً ہوشمند نے مزاحمت کی تھی اور شلال نے اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا تھا۔ چونکہ تابان کی طرف سے کسی محافظ کو ایسی کوئی ہدایت نہیں کی گئی تھی کہ سردار شلال یا دیگر مہمان کہیں آنا جانا چاہیں تو انہیں روکا جائے۔ سردار شلال ہوشمند کو خنجر گھونپ کر باآسانی محل سے نکل گیا تھا۔ گونسل اور نورین بھی اس کے ساتھ تھے۔ دفعتاً تابان کا دھیان اپنے چرمی تھیلے کی طرف چلا گیا تھا۔ یہ تھیلا حفاظت کے پیش نظر اس نے کل کورا کے کمرے میں رکھوایا تھا۔ وہ بھاگا ہوا دوبارہ کورا کے کمرے میں آیا۔

شاید مسہری کے پاس ایک منقش آبنوسی الماری تھی۔ الماری کا قفل ٹوٹا پڑا تھا۔ تابان کے دل پر دوسرا شدید گھونسہ پڑا۔ اس نے جلدی سے پٹ کھول کر اندرونی خانے میں جھانکا۔ تابان کا تن بدن جل اٹھا۔ ایسے میں وہ ڈھیٹ، لاپرواہ اور بے رعب تابان کہیں دور جا چھپا جیسے سب

جانتے تھے۔ اس کی جگہ ایک ضدی، خودسر اور خطرناک شخص نے لے لی تھی۔ ایک عجیب سی آگ تابان کی آنکھوں میں روشن ہوئی۔ وہ بھاگتا ہوا محل سے نکلا اور اصطبل کی طرف لپکا۔ چند لمحوں بعد وہ ایک مشکی گھوڑے پر سوار تیزی سے جزیرے کی بندرگاہ کی طرف جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کا گلا بالکل خشک ہو رہا تھا اور سانس بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔

سکوپے لاس خاصا بڑا جزیرہ تھا لیکن ایسا وسیع و عریض بھی نہیں تھا کہ سردار شلال اور اس کے ساتھی یہاں تادیر چھپ سکتے۔ یقینی بات تھی کہ وہ اس چرمی تھیلے کے ساتھ جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔ یہی وجہ تھی کہ تابان کا رخ ساحل کی طرف تھا۔

کھاڑی زیادہ دور نہیں تھی وہ تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گیا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ کھاڑی پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ چند ایک مچھیرے اپنی کشتیون کے بادبان درست کر رہے تھے۔ بہت سویرے کام پر نکلنے والے سبزی فروش اور شیر فروش بھی کہیں کہیں دکھائی دے رہے تھے۔ تابان نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سردار شلال وغیرہ کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ یہ بھی بعید از قیاس تھا کہ وہ اس مختصر وقت میں کشتی ڈھونڈ کر یہاں سے نکل گئے ہوں۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ وہ ابھی تک جزیرے میں ہی کہیں چھپے ہوئے ہوں۔ تابان کو پریشان پا کر ایک

بربری ملاح اس کے نزدیک آیا۔ تابان نے اس سے سردار وغیرہ کے بارے پوچھا ملاح کا جواب غور طلب تھا۔ اس نے کہا

"ابھی تھوڑی دیر پہلے تین گھڑ سوار یہاں پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک لحیم شحیم تھا۔ اس کے چہرے پر بد نما زخم تھا۔ وہ تینوں بہت جلدی میں لگتے تھے۔ انہیں فوری طور پر ایک بڑی کشتی درکار تھی۔ مگر کوئی کشتی اس وقت تیار نہیں تھی۔ وہ مایوس ہو کر پرانی کھاڑی کی طرف چلے گئے۔"

پرانی کھاڑی وہاں سے کم از کم پانچ کوس کے فاصلے پر تھی۔ راستہ بھی ویران اور ان دیکھا تھا لیکن تابان مزید تاخیر کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیری گھوڑے کو ایڑ لگائی اور حتی الامکان رفتار سے پرانی کھاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔ معلوم نہیں کیوں لمحہ بہ لمحہ اس کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ حلق سوکھ گیا تھا اور پیٹ میں درد کی لہر سی اٹھ رہی تھی۔ جیسے کوئی جانور تیز نوکیلے پنجوں سے اس کی آنتیں کھود رہا ہو۔ بے حد سخت جان تھا تابان ورنہ درد جس تیزی سے بڑھ رہا تھا وہ اب تک گھوڑے سے لڑھک کر زمین پر آ گیا ہوتا۔ اپنی بے پناہ قوت مدافعت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے سفر جاری رکھا۔

دونوں اطراف اونچی نیچی گھاٹیاں تھیں۔ جھاڑ جھنکاڑ تھا اور مہیب خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں صرف گھوڑے کی ٹاپیں گونج رہی تھیں یا کبھی کبھار سمندر کی جانب سے لہروں کا مدھم شور سنائی دے دیا جاتا تھا۔ تابان نے قریباً ایک کوس فاصلہ طے کیا تھا کہ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ دفعتاً اسے زوردار ابکائی آئی۔ اس کے ساتھ ہی گردوپیش اس کی نگاہوں میں چکراتے چلے گئے۔

"یہ کیا ماجرا ہے؟-------یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ سوال بار بار اس کے ذہن میں کوند رہا تھا۔" کہیں-------کہیں اسے کچھ دے تو نہیں دیا گیا؟" اسے وہ دودھ یاد آیا جو اس نے سونے سے تھوڑی دیر قبل پیا تھا۔ کیا اس دودھ میں کچھ ملا دیا گیا تھا؟ یہ سوچتے ہوئے تابان کو احساس ہوا کہ وہ توازن کھو کر گھوڑے سے گر رہا ہے۔ اس نے بے پناہ برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر خود کو سنبھالا دیا۔ اب ایک جہنم اس کے پیٹ میں دہک رہا تھا۔ اس کے ذہن نے فیصلہ دیا کہ اسے واپس لوٹ جانا چاہئیے۔ وہ گھوڑے کا رخ بدلنے کی کوشش کر رہا تھا جب اچانک سب کچھ اس کے بس سے باہر ہو گیا۔ اوپر تلے اس نے کئی بار

قے کی اور حواس کھو کر گھوڑے کی پشت سے زمین پر آ گرا۔ عین اس وقت ایک بحری مرغابی بھی اس کے پاس گری اور بری طرح تڑپنے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ ایک اونچی چھت کا کمرہ تھا۔ چھت پر نقش و نگار کندہ تھے اور دو دیدہ زیب فانوس لٹک رہے۔ دیواروں پر غالیچے تھے اور مختلف جانوروں کے حنوط شدہ سر۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ تابان نے محسوس کیا کہ وہ کسی آرام دہ مسہری پر دراز ہے۔ اس کے نزدیک ہی کہیں بدبودار کسیلی دوائیں رکھی تھیں۔ تابان کو ایک بار پھر متلی ہونے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ ایک زمانے سے اس بستر پر دراز ہے اور ان منحوس دواؤں کی بیزار کن بو سونگھ رہا ہے۔ ایکا ایکی بیتے ہوئے لمحات قطار اندر قطار سرپٹ گھوڑوں کی طرح آئے اور اس کے تصور میں دندنانے لگے۔ اسے یاد آیا کہ وہ ہوشمند کا خونچکاں جسم اور خالی الماری دیکھنے کے بعد نیم دیوانہ ہو گیا تھا اور اندھا دھند سردار شلال کے تعاقب میں روانہ ہوا تھا۔ راستے میں اس کی طبیعت بگڑتی چلی گئی تھی اور وہ کھاڑی سے تقریباً ایک کوس دور ایک ویران گھاٹی میں اوندھے منہ گھوڑے سے گرا تھا۔ یہ سب کچھ یاد آتے ہی اس نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن دو

نسوانی ہاتھ اس کے برہنہ سینے پر آئے اور اسے سر اٹھانے سے روک دیا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک نقاب پوش عورت اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ نقاب میں سے صرف اس کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں لیکن تابان ان آنکھوں سے ہی عورت کے متعلق بہت سے اندازے لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ پچیس چھبیس برس کی جواں سال عورت تھی۔ قبول صورت تھی ایرانی تھی اور اس گھر کی ملازمہ یا کنیز تھی۔

"میں کہاں ہوں؟" تابان نے کراہ کر پوچھا۔

"تم جزیرے کے ایک متمتول زمیندار کی امان میں ہو۔ ہمارے آقا کا نام گونیش ہے۔"

گونیش کا نام تابان کو کچھ جانا پہچانا لگا۔ اس نے ذہن پر زور دیا لیکن بیمار جسم کے ساتھ ذہن بھی ماؤف ہو رہا تھا۔ اسے فوراً کوئی بات یاد نہیں آئی۔ جواں سال عورت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آقا علی الصبح اپنے چند مہمانوں کے ساتھ مرغابی کے شکار پر نکلے ہوئے تھے ایک گھاٹی میں انہوں نے تمہیں بے ہوش پڑا پایا۔ یہ دیوتاؤں کا کام ہے کہ تمہاری زندگی بچ گئی ورنہ تمہاری حالت ایسی نہیں تھی۔"

"کک۔۔۔۔۔۔۔ کیا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔ مجھے؟"

"یہ تو تم ہی بہتر بتا سکتے ہو۔ تمہاری حالت سے ظاہر تھا کہ تم نے زہر کھالیا ہے یا کسی نے تمہیں دیا ہے۔ حکیم رسطاب کا کہنا ہے کہ اگر چند لمحوں کی تاخیر مزید ہو جاتی تو تمہارا بچنا ناممکن تھا۔"

"یہ حکیم رسطاب کون ہے؟"

"سکوپے لاس کا سب سے قابل معالج۔" شاہی خاندان کے افراد اور تمام بڑے بڑے امرا و روسا اسی کے دستِ شفا کے قدردان ہیں۔ تمہاری زندگی تھی جو تمہیں آقا گوینش جیسا مددگار اور حکیم رسطاب جیسا معالج ملا۔"

تابان نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی اور عورت کے خوبصورت ہاتھوں نے اسے دوبارہ روک دیا۔ "نہیں۔" اس نے تنبیہ کی۔ "تمہیں ابھی مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ آقا کا حکم ہے کہ تمہیں بستر سے اٹھنے نہ دیا جائے۔"

"لیکن میرا جانا ضروری ہے۔ میں سپہ سالار کا مہمان ہوں اور کچھ لوگ سپہ سالار کے محل میں ایک شخص کو قتل کر کے فرار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے کچھ قیمتی دستاویزات بھی چرائی ہیں۔"

"تم کب کی بات کر رہے ہو؟" عورت نے پوچھا۔

"یہ کل رات ہی کی بات ہے۔" تابان نے جواب دیا۔

عورت نے ایک چادر تابان کے سینے تک کھینچی اور اطمینان سے بولی۔ "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ پچھلے تین روز سے تم اس بستر پر موجود ہو اور ہم تمہاری تیماداری کر رہے ہیں۔"

عورت کے لہجے میں سچائی جھلک رہی تھی۔ تابان سناٹے میں رہ گیا۔ تین روز گزر جانے کا مطلب تھا شلال مسروقہ دستاویزات کے ساتھ ایتھنز کے قرب و جوار میں پہنچ چکا ہو گا۔ ہوشمند کی آخری رسوم ادا ہوئے دو یوم بیت چکے ہوں گے۔ اور کورا۔۔۔۔۔۔۔۔ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی پھرتی ہو گی۔ اس دفعہ عورت کے روکنے کے باوجود وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انداز باغیانہ ہی تھا۔ عورت نے آواز دے کر دو سیاہ فام غلاموں کو اندر بلا لیا۔ انہوں نے نرمی سے مگر فیصلہ کن انداز میں تابان کو دوبارہ بستر پر بٹھا دیا۔ تابان نے کراہ کر کہا۔

"میں تمہارے آقا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"عورت بولی۔ "بس وہ تشریف لاتے ہی ہوں گے۔ تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

عورت نے درست کہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کی جانب سے بھاری قدموں کی صدا آئی اور دہلیز پر کھڑا مسلح غلام مؤدب ہو گیا۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ آنے والا اس گھر کا آقا ہے۔ اب تک کے حالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک مہربان اور نیک خو شخص ہے۔ ایک لاوارث انسانی جان کو بچانے کے لئے اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ جزیرے کا بہترین معالج فراہم کیا تھا اور تیماردار کے لئے کئی ملازمین کو وقف کر رکھا تھا۔ تابان یہ توقع رکھنے میں حق بجانب تھا کہ وہ شخص اس کی بات ہمدردی سے سنے گا اور اس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔۔۔۔۔۔۔ آخر وہ شخص تابان کے کمرے میں داخل ہوا۔ مقامی امراء کی طرح اس نے نصف آستین کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس قمیض کے اوپر اس نے ایک بڑی سی ریشمی چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ چہرے گردن اور بائیں کندھے سے سوا سب کچھ اس میں ڈھک گیا تھا۔ تابان کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑی اور ٹھٹک کر رہ گئی۔ ایک ہی ساعت میں اسے اپنے جسم کا سارا خون آنکھوں میں سمٹتا محسوس ہوا۔ وہ مجسم حیرت نو وارد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اسے پتہ چل گیا تھا کہ "گونیش" کا نام اسے جانا پہچانا کیوں محسوس ہوا تھا۔ درحقیقت تابان نے خود کو زندگی دینے والے محسن اور فرشتہ اجل کا چہرہ ایک ساتھ دیکھ لیا تھا۔ گونیش اس کے ایک سابق آقا کا نام تھا۔ ٹرائے کے ایک قصبے میں تابان پورے

دو برس گونیش کی غلامی میں رہا تھا۔ گونیش کی سب سے بڑی بیٹی جو بیوہ تھی اس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ اس کا نام مارسیلہ تھا۔ مارسیلہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کا شوہر مقامی فوج میں عہدیدار تھا۔ دو برس پہلے وہ یونانیوں کے ساتھ ایک بحری لڑائی میں ہلاک ہو گیا تھا۔ شوہر کی موت کے بعد مارسیلہ باپ کے گھر آ گئی تھی۔ یہاں دھیرے دھیرے اور غیر محسوس طور پر وہ تابان میں دلچسپی لینے لگی۔ تابان کو دیکھ کر مارسیلہ کی آنکھوں میں ایک بے نام جذبے کی جوت جل اٹھی۔ وہ حیلے بہانوں سے اسے اپنے پاس بلاتی۔ اس کی باتیں سنتی اور اپنے دکھ درد بیان کرتی لیکن اظہارِ تمنا کا موقع کبھی نہیں آیا۔ مارسیلہ کے گرد رسم و رواج کے پہرے تھے اور وہ حسب نسب اور محترم رشتوں کی اونچی دیواروں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ دریا کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔۔۔۔۔۔۔ بہت ہی دور۔ مارسیلہ جانتی تھی اس جذباتی تعلق کو ایک حد میں رہنا چاہئیے ورنہ ان دونوں پر عذاب نازل ہو گا اور وہ ذلت و رسوائی کی آگ میں جل کر بھسم ہو جائیں گے۔ قریباً دو برس اسی طرح بیت گئے۔ پھر ایک شب تیرگی کی چادر میں لپٹی ہوئی مارسیلہ اس سنگلاخ کوٹھری میں پہنچی جہاں تابان کو مقید کیا جاتا تھا۔ تابان اسے اپنے سامنے پا کر ششدر رہ گیا۔ مارسیلہ نے اسے بتایا کہ اس کی دوسری شادی کی جا رہی ہے۔ اس شادی کے انتظامات کے لئے اس کے والد نے اپنی

کچھ کشتیاں اور غلام ایک یونانی جہازراں کو بیچنے کا فیصلہ کیا ہے۔ فروخت ہونے والے غلاموں میں تابان کا نام بھی شامل ہے۔ تابان نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے تو غلامی ہی کرنا ہے۔ یہاں نہ سہی کہیں اور سہی، مارسیلہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ تمہیں معلوم نہیں وہ جہازراں تمہیں گیلی کا غلام بنائے گا۔ جہاز کے تنگ وتاریک تہہ خانے میں پابہ زنجیر کیا جائے گا اور پھر تمہاری ساری زندگی اسی تہہ خانے میں چپو چلاتے اور کوڑے کھاتے بیت جائے گی۔"

اس رات مارسیلہ نے کوٹھری کا دروازہ کھول کر اسے آزاد کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں نے پہلی اور آخری بار تابان کے ہاتھوں کو چھوا تھا اور وہ بولی تھی۔ "یہاں سے نکل جاؤ تابو۔۔۔۔۔۔۔۔ دور چلے جاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ کہیں بہت دور۔" اس کے لرزاں لہجے میں التجائیں تھیں اور اس خاموش محبت کے واسطے تھے جواب تک جو وہ اب تک اپنے باپ کے غلام سے کرتی رہی تھی۔

تابان نے کہا۔ "لیکن آپ یہ سب کیوں کر رہی ہیں۔ آقا بہت سخت مزاج ہیں، وہ آپ کو اس جرم میں قتل بھی کر سکتے ہیں۔"

مارسیلہ نے بھیگی پلکیں اٹھا کر عجیب نظروں سے تابان کو دیکھا اور بولی۔ "تمہارے لئے مجھے یہ سزا قبول ہے۔" تابان نے اپنی کوٹھری چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس لئے نہیں کہ اس کے نکل بھاگنے سے مارسیلہ کو سزا مل سکتی تھی بلکہ اس لئے کہ گوینش کی زد سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ اس کے گھڑ سوار کارندے اور خونخوار شکاری کتے ساری رات گشت پر رہتے تھے اور بھاگنے والے غلام یا کھیت مزدور کو موقع پر ہی چیر پھاڑ دیتے تھے۔ تابان نے بھاگنے سے انکار کیا تو مارسیلہ غصے سے بولی۔ "تمہیں معلوم نہیں یہ موقع گنوا کر تم کتنی بڑی حماقت کرو گے۔ میں تمہیں یہ موقع گنوانے نہیں دوں گی۔ اگر تم بھاگو گے نہیں تو میں یہیں کھڑی رہوں گی اور تھوڑی دیر بعد پہریدار تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی گرفتار کر رہے ہوں گے۔" مجبوراً تابان کو خطرہ مول لینا پڑا تھا۔ اس نے کوشش کی تھی اور آقا گوینش کی قید سے نکل بھاگا تھا۔۔۔۔۔۔۔ ان واقعات کو دو سال گزر چکے تھے اور آج آقا گوینش اچانک پھر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ تابان بستر پر اکڑوں بیٹھا یک ٹک گوینش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گوینش دھیمے قدموں سے چلتا اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ وہ بے حد کم گو لیکن بے حد زہریلا شخص تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ رہتی تھی لیکن آنکھوں میں سفاکی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ تابان کے لئے سراپا قہر نظر آتا تھا۔ اب تابان کو خبر ہو رہی تھی کہ اس کی

جان بچانے کے لئے اتنی تگ ودو کیوں کی گئی تھی اور خوشحال طبقے کا ایک فرد ایک لاوارث جان بلب مریض پر اتنا مہربان کیوں ہو گیا تھا؟ کرم کے اس پردے میں ستم کے خوفناک عزائم چھپے ہوئے تھے۔ گوینش کو دیکھ کر تابان نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی اور پہلی بار اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا بایاں پاؤں ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کے پاؤں سے زنجیر کا رشتہ بہت پرانا تھا اور یہ رشتہ ایک بار پھر استوار ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سکوپے لاس کی وہ رات حبس زدہ اور تاریک تھی ان جزائر میں ایسی راتیں طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ تابان بستر پر نیم مدراز تھا اور گوینش ایک نشست پر پاؤں رکھے بڑی رعونت سے تابان کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کے گلے میں سنگِ یشب کا بیش قیمت ہار فانوسوں کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ وہ عجیب جذباتی لہجے میں گویا ہوا۔

"ان دو برسوں میں میں تیری صورت چند لمحوں کے لئے بھی نہیں بھولا اور جسے یاد رکھا جائے وہ زیست کے کسی نہ کسی موڑ پر ملتا ضرور ہے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ناں!"

گوینش کے بظاہر نرم لہجے میں زہر کا دریا بہہ رہا تھا۔

تابان نے کہا۔ "سردار گوینش! تم شب و روز دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہو۔ میں انہی دیوتاؤں کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میرا ارادہ تمہارے گھر سے بھاگنے کا ہرگز نہیں تھا۔ میں تو تمہارے پاس ہر طرح خوش تھا پھر بھاگنے کا خیال دل میں کیوں لاتا؟"

"تم جھوٹ بول رہے ہو تابو۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں پتہ چل گیا تھا کہ میں تمہیں جہاز راں پاشا کے ہاتھ فروخت کر رہا ہوں۔ لہذا تم فرار ہو گئے تھے۔"

"میں فرار نہیں ہوا۔ مجھے فرار ہونے پر مجبور کیا گیا تھا۔"

"کس نے کیا تھا ایسا؟"

تابان نے چند لمحے توقف کیا۔ "میں۔۔۔۔۔۔۔ اس کا نام نہیں بتا سکتا۔"

گوینش نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ تابان کے منہ پر مارا۔ چٹاخ کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا۔ گوینش غرایا۔ "تم نہ بتاؤ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن میں جانتا ہوں۔ اس کا نام مارسیلہ تھا۔ یہ تم دونوں کی ملی بھگت تھی۔ تم دونوں میرے گھر میں، میری آنکھوں میں دھول جھونک کر عشق و محبت کا کھیل کھیلتے رہے۔ میری عزت تار تار کرنے کے منصوبے بناتے رہے اور جب

موقع ملا تو بھاگ نکلے۔ یہ تو دیوتاؤں کا کرم تھا کہ تم اپنے ناپاک ارادے پورے نہ کر سکے اور مارسیلہ میرے محافظوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئی۔"

تابان نے کہا۔ "سردار! آپ کو اپنی پاک دامن بیٹی پر ایسے بہتان باندھتے شرم آنی چاہیئے۔"

گوینش کا دوسرا تھپڑ تابان کے منہ پر پڑا۔ اس دفعہ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون رخسار پر بہنے لگا۔ پاؤں میں وزنی زنجیر تھی اور وہ گوینش کے سامنے قطعی بے بس تھا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ "تم اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو کہ فرار کی شب تمہیں کوٹھری میں ملنے والی مارسیلہ نہیں تھی۔"

تابان نے اعتراف کیا۔ "وہ مارسیلہ تھی لیکن یہ غلط ہے کہ اس کا میرے ساتھ کوئی ناطہ تھا یا وہ میرے ساتھ فرار ہو رہی تھی۔ غالباً آپ نے اسے صفائی پیش کرنے کی مہلت ہی نہیں دی ورنہ اس کی باتوں میں آپ کو سچائی جھلکتی نظر آتی اور آپ جان جاتے کہ وہ کتنی گناہ گار ہے۔"

"تو تم چاہتے ہو کہ میں اسے صفائی کی دلیلیں پیش کرنے کا موقع دوں؟"

"بالکل آپ کو ایسا کرنا چاہیئے تھا۔"

گوینش بولا۔ "زیوس دیوتا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس شرمندگی سے محفوظ رکھا ہے۔ مارسیلہ اب اس دنیا میں نہیں۔ وہ اسی روز اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی جس روز گرفتار ہوئی تھی۔"

چند لمحوں کے لئے تابان سناٹے میں رہ گیا۔ "تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔۔۔ نے اسے قتل کر دیا تھا؟"

"نہیں اس میں ابھی غیرت کی رمق باقی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں خود کو ہلاک کر لیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے صورت دکھانے سے پہلے ہی وہ اپنی جان دے چکی تھی۔"

یہ اطلاع تابان کے لئے غم انگیز تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "سردار! اگر واقعی وہ خودکشی کر چکی ہے تو یہ مت سمجھنا کہ وہ گناہ گار تھی۔ وہ شبنم کے قطروں کی مانند صاف و شفاف تھی۔ ممکن ہے اس کے دل میں میرے لئے چاہت ہو لیکن اس کا ذکر کبھی اس کی زبان پر نہیں آیا اور جہاں تک میری بات ہے، میں نے کبھی اسے اس نظر سے دیکھا ہی نہ تھا۔"

گوینش کمینگی سے مسکرایا اور خطرناک لہجے میں بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، میں تمہارے جھوٹ پر یقین کر لوں گا۔ ہر گز نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ ہر گز نہیں۔ تم نے کسی معمولی آدمی کی عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ تم نے گوینش کی بیٹی کو اس سے جدا کیا ہے میں تمہیں بڑی یادگار موت دوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ وعدہ ہے میرا تمہاری موت بے مثال ہو گی۔"

گوینش کے لہجے میں عجب دیوانگی تھی۔ زمیندار ہونے کے باوجود وہ پڑھا لکھا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بے حد ذہین اور باتدبیر شخص بھی تھا۔ تابان کو اس کی ذہانت کا اعتراف تھا۔ گوینش کی دو سالہ غلامی کے دوران تابان نے کبھی خیال نہیں کیا کہ وہ گوینش کو آسانی سے چکمہ دے کر نکل سکتا ہے اور نہ ہی اب وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا لیکن گوینش کی باتیں اسے بے حد بری لگ رہی تھیں اور اس کے اندر وہ حس بیدار ہو رہی تھی جو اسے انہونے کاموں پر اکساتی تھی اور وہ اپنے ارد گرد چنی ہوئی دیواروں کو توڑنے کے لئے بے قرار ہو جاتا تھا۔

در حقیقت تابان کی زندگی کا محور ہی یہی تھا۔ پکڑے جانا اور فرار ہونا۔ شروع شروع میں وہ آزاد رہنے اور اپنی جان بچانے کے لئے بھاگتا تھا۔ مگر اب یہ اس کا مشغلہ بن چکا تھا۔ زنجیریں پہنانے والے آقاؤں کو اذیت ناک صورت حال سے دوچار کرنا اور ان کی تمام تر فراست کو ناکام کر کے نکل بھاگنا۔ یہ عمل وہ ان گنت مرتبہ دہرا چکا تھا اور اب بھی دہرانے کو تیار رہتا تھا۔ ایک عجیب لذت ملتی تھی اسے اس کام میں۔ کئی بار تو اسے یوں لگتا تھا جیسے نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ وہ جان بوجھ کر خود کو کسی آقا کے جال میں پھینک دیتا تھا اور پھر جال کاٹنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں یہ بات ہے کہ اس مرتبہ سردار گوینش کے جال میں پھنسنا اسے کچھ بھلا نہیں لگا تھا۔ ایک تو یہ جال "لوہے" کا تھا اور اسے کاٹنے میں اسے خاصی محنت درکار تھی۔ دوسرے وہ جلد از جلد سردار شلال اور اس کے ساتھیوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔ پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیر سیاہ ناگ کی مانند اس کے ٹخنے کو ڈسنے لگی۔

اسی رات تابان کو عمارت کے ایک سیلن زدہ نیم تاریک تہہ خانے میں پھینک دیا گیا۔ تہہ خانے میں سیڑھیاں نہیں تھیں لہذا اسے ایک روزن نما جگہ سے اندر دھکیل دیا گیا۔ وہ پختہ فرش پر پیٹھ کے بل گرا۔ اس کے بعد دو سیاہ فام ملازم روزن سے لٹک کر اندر آئے اور انھوں نے تابان کی گردن ایک آہنی کڑے میں کسنے کے بعد اس کے دونوں ہاتھ کھول دئے۔ یہ

آہنی کڑا ایک زنجیر کے ذریعے تہہ خانے کے فرش سے منسلک تھا۔ زنجیر کی لمبائی صرف اتنی تھی کہ تابان سر جھکا کر بمشکل بیٹھ سکتا تھا۔ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کڑا دو تین دن پہلے خاص طور پر تابان کے لئے ہی نصب کیا گیا ہے۔ تہہ خانے میں آنے جانے کا واحد راستہ یعنی چھت کا روزن اس آہنی کڑے کے عین اوپر واقع تھا۔ روزن کو موٹی سلاخوں کے ایک جنگلے کے ذریعے بند کر دیا گیا تھا۔ روزن بند ہو چکا تو بلندی پر گونیش کی صورت نظر آئی۔ وہ مضحکہ خیز نظروں سے تابان کے نیم برہنہ جسم کو گھور رہا تھا۔ مسکرا کر بولا۔

"نکل بھاگنے میں تمہاری بہت شہرت سنی ہے۔ اگر ماں کا دودھ پیا ہے تو یہاں سے بھاگنا۔"

ایسے فقرے سن کر تابان کے تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھتی تھی اور وہ کچھ کر دکھانے کے لئے بے قرار ہو جاتا تھا۔ اس نے تاؤ دلانے والی لاپرواہی سے گونیش کو دیکھا اور سر کے نیچے بازو کا تکیہ بنا کر دراز ہو گیا۔ گونیش کچھ دیر اسے گھورنے کے بعد روزن سے ہٹ گیا۔ تابان نے چاروں طرف دیکھا۔ گونیش کا دعویٰ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ یہ تہہ خانہ ہر لحاظ سے ایک پختہ قبر تھا جس میں انسان کی ہڈیاں تو گل سکتی تھیں وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ تابان نے سر جھٹک کر اپنے خیالات کا رخ بدلا اور ان حالات کے بارے میں سوچنے لگا جو

اسے پیش آ چکے تھے۔ یقینی بات تھی کہ زہر اس دودھ میں ملایا گیا تھا جو تابان اور ہوشمند نے رات سونے سے قبل پیا تھا، اور یہ زہر ملانے والا شلال تھا یا اس کا کوئی ساتھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ کسی طرح چرمی تھیلے اور اس میں موجود دستاویزات سے آگاہ ہو چکے تھے۔ دستاویزات دیکھنے کے بعد شلال کی نیت میں فتور آ گیا تھا۔ وہ اس مہم کی ساری کارکردگی اپنے کھاتے میں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے چرمی تھیلہ اڑا لیا تھا اور واپس مقدونیہ روانہ ہونے سے پہلے ہوشمند اور تابان کی موت کا انتظام بھی کر دیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ عین ممکن تھا کہ وہ اب تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقدونیہ پہنچ چکا ہو اور سکندر کی بارگاہ میں کھڑا اپنی کامیابی کی جھوٹی سچی کہانی سنا رہا ہو۔

تابان کو شلال کی فریب دہی کا دکھ تو تھا لیکن اسے زیادہ فکر کورا کی تھی۔ ہوشمند کی موت اور تابان کی روپوشی کے بعد وہ سکوپے لاس میں تنہا رہ گئی تھی۔ درست ہے کہ وہ سپہ سالار کی پناہ میں تھی۔ مگر بے سہارا خوبرو لڑکی کے ساتھ کہیں بھی کوئی سانحہ پیش آ سکتا تھا اور اگر شلال وغیرہ کے بارے میں تابان کا اندازہ غلط تھا اور وہ مقدونیہ روانہ ہونے کی بجائے ابھی تک سکوپے لاس میں ہی تھے تو کورا کے لئے مزید خطرات موجود تھے۔ شلال جیسے بدباطن

سے کوئی بھی بری توقع رکھی جا سکتی تھی۔ اس کے چہرے کا داغ اس کے دل کا داغ بن چکا تھا اور وہ اس داغ کی قیمت ہر صورت کورا کے جسم سے وصول کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ تابان تادیر اپنے خیالوں میں غرق رہا۔ دفعتاً اسے چھت کے روزن میں ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ کسی خوبصورت کنیز کا چہرہ تھا۔ وہ چند لمحے تابان کو شرارت سے دیکھتی رہی، پھر اس نے گردن لمبی کی اور روزن میں سے تابان پر تھوک دیا۔ تھوک تابان کے چہرے پر پڑا اور وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ کنیز آگے چلی گئی تو ایک دوسرا چہرہ نظر آیا یہ بھی ایک نوجوان خادمہ تھی۔ اس نے مسکرا کر تابان کو دیکھا اور تھوک کر آگے بڑھ گئی۔ اب ایک اور خوبصورت نسوانی چہرہ دکھائی دیا۔ تابان پر انکشاف ہوا کہ روزن سے باہر عورتوں و لڑکیوں کی قطار لگی ہے اور ان میں سے ہر ایک اس روزن میں سے تابان پر تھوکنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس نے نگاہوں میں سردار گوینش کا غصیلا چہرہ گھومنے لگا۔ وہ کینہ پرور شخص انتقام کی شدت میں نیم پاگل ہو رہا تھا۔ یہ اوچھی حرکت اسی پاگل پن کی غماز تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تابان اسی تہہ خانے میں بے بسی کی تصویر بن کر رہ گیا۔ قید کرنے والوں نے اس کا خوب انتقام کیا تھا۔ گلے میں پڑا ہوا طوق نما کڑا ناقابل شکست تھا۔ اس قسم کے کڑے تابان نے صرف ایک دفعہ آقا غارس زنوب کے محل میں دیکھے تھے۔ وہاں یہ کڑے سزائے موت پانے والے قیدیوں کو پہنائے جاتے تھے۔ قیدی کی گردن کے گرد ایک دفعہ یہ کڑا بند ہو جاتا تھا تو پھر اسے کھولنا ناممکن تھا۔ اسے صرف کاٹا جا سکتا تھا۔ بفرض محال وہ کسی طرح اس طوق نما کڑے سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو جاتا تو کوئی ہاتھ اونچے دروازے تک پہنچنا اور اسے کھولنے کی کوشش کرنا ناممکن تھا۔ دروازے میں سے اس کے لئے باقاعدگی سے کھانا پھینکا جاتا تھا اور اسی باقاعدگی سے تھوک بھی۔ ہر روز ایک مقررہ وقت پر تہہ خانے کی چھت پر عورتوں کی ایک طویل قطار لگ جاتی وہ باری باری روزن نما دروازے کے سامنے سے گزرتیں اور تابان پر تھوکتیں۔ ان عورتوں میں اب خادماؤں اور کنیزوں کے علاوہ گھر کی خواتین بھی شامل ہونے لگی تھیں۔ سردار گوینش کی دو بیویاں اور ایک بڑی بہن باقاعدگی سے اس "نیک کام" میں حصہ لیتی تھیں۔ غالباً انہیں بھیجا جاتا تھا۔ ظاہر ہے بھیجنے والا سردار گوینش ہی رہا ہو گا۔ یہ سب کچھ اسی کی ایما پر ہو رہا تھا۔ تابان کو گوینش کی اس عجیب و غریب حرکت پر کچھ زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ گوینش ایک غصیلا شخص تھا اور بعض اوقات اس

کا غیض وغضب جنون کی حد تک پہنچ جاتا تھا۔ اس حالت غضب میں اس نے ایک دفعہ ایک سفید ریش کے سر پر اس زور سے مکا مارا تھا کہ پلک جھپکتے میں جان بحق ہو گیا۔ اس واقعہ کا المناک ترین پہلو یہ تھا کہ مرنے والا گوینش کا سگا باپ تھا۔ ایک عرصہ گزرنے کے باوجود یہ واقعہ ابھی تک تابان کو بھولا نہیں تھا اور یہ کوئی ایک واقعہ نہیں تھا۔ ایسے بے شمار واقعات تابان کے ذہن میں محفوظ تھے۔

ایک روز جب بہت سے حسین چہرے تابان پر تھوک کر جا چکے تھے اور وہ ہوشمند و کورا کی یاد میں گم صم پڑا تھا، روزن میں گوینش کی صورت نظر آئی۔ گوینش کی آواز سن کر تابان نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔ گوینش اس کی آنکھوں میں جھانک کر حقارت سے مسکرانے لگا۔ اس کی بھاری بھر کم آواز تہہ خانے میں گونجی۔

"ایک روز میں تجھ پر تھوکنے کے لئے اتنی عورتیں جمع کروں گا کہ تو غرق ہو جائے گا۔ میری اس بات کو مذاق نہ سمجھنا۔ جو میں نے کہا ہے ویسا ہی ہو گا۔"

"میرا کیا قصور ہے؟" تابان نے پوچھا۔

گوینش بولا۔ "قصور تیری اس صورت کا ہے جس کے فریب سے تو نے میری بیٹی کو ورغلایا تھا اور اب تک نہ جانے کتنی عورتوں کو ورغلا چکا ہے۔ میں اس صورت کو دیکھنے والوں کے لئے عبرت ناک بنا دوں گا۔"

"سردار! میں تمہیں بتا چکا ہوں' میں نے تمہاری بیٹی کو نہیں ورغلایا' مجھے اس کی موت کا افسوس ہے لیکن اس موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔"

جواب میں گوینش نے تابان کو ایک غلیظ گالی دی اور نفرت سے اس پر تھوک دیا۔ ایک جوابی گالی تابان کے ہونٹوں پر بھی مچلی لیکن اس نے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ آدابِ غلامی سے واقف ہونے کے بعد اسے اپنا رنج و غم چھپانا آ گیا تھا۔ وہ اس وقت صورت حال مزید کشیدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ تہہ خانہ واقعی لوہے کا جال تھا۔ اسے کاٹنے کے لئے تابان کو وقت درکار تھا اور بے پناہ کوشش کی ضرورت تھی۔ جبکہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ جلد نکلنے کی ایک ہی صورت تھی۔ وہ گوینش سے کسی طرح کی مفاہمت کر لے ان کے مابین کوئی ایسا معاہدہ ہو جائے جس کی رو سے گوینش اسے رہا کر دے۔ تابان نے اپنے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے کہا۔ "سردار' میں تمہاری قید میں ہوں تم جو چاہو سلوک مجھ سے کر سکتے ہو' لیکن

جس جرم میں تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو وہ میں نے نہیں کیا۔ اگر تم آنکھیں بند کر کے بیٹی پر الزام نہ لگاؤ اور تھوڑی سی تحقیق گوارا کر لو تو تمہیں ضرور پتہ چل جائے گا کہ مارسیلہ میرے ساتھ فرار نہیں ہو رہی تھی اور نہ اس نے کبھی اس انداز میں سوچا تھا۔"

گوینش غرایا۔ "مجھے کسی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری شیطانیت کے ہر رخ سے آگاہ ہوں۔"

گوینش کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ اگر تابان سالہا سال کوشش کرتا رہے تو بھی وہ گوینش کو اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلا سکے گا۔ اس نے ایک گہری سانس بھری اور لہجہ بدل کر بولا۔ "سردار! تمہاری بیٹی کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو میں تمہیں "خون بہا" دے سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ میری آزادی کی بھی جو مناسب قیمت تم چاہو لگا سکتے ہو۔"

گوینش کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے حیرت نظر آئی۔ پھر اس حیرت کی جگہ گوناں گوں دلچسپی نے لے لی۔ اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھری اور وہ روزن کے قریب بیٹھے ہوئے بولا۔ "تو تم میری بیٹی کا خون بہا دو گے مجھے؟"

"ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ خون بہا نا کردہ قتل کا ہو گا۔"

"تمہارے خیال میں کیا خون بہا ہونا چاہئیے؟"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے سردار۔"

"ہوں۔۔۔۔۔۔۔ پانچ ہزار ٹیلنٹ دے سکو گے؟"

تابان نے ایک لمحے کے لئے گوینش کی آنکھوں میں جھانکا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے میں دے سکتا ہوں۔"

"ہوں" گوینش کی دلچسپی اس معاملے میں اور بڑھ گئی۔ "کہاں سے لاؤ گے اتنی دولت؟"

تابان نے کہا۔ "میرا خیال ہے تم میری باتوں کو مذاق سمجھ رہے ہو لیکن میں تمہیں یہ رقم فراہم کر سکتا ہوں۔ اگر تم میری آزادی کے لئے مناسب قیمت مانگو تو میں وہ بھی ادا کر دوں گا۔۔۔۔۔۔۔ میں تم سے صاف سیدھی بات کہہ رہا ہوں میں اب کوئی عام آدمی نہیں ہوں۔ مقدونوی ریاست کی فوج کا اہم سردار ہوں اور میری یہاں آمد بھی ایک اہم مہم کا حصہ تھی۔ ہم کچھ دستاویزات کے لئے یہاں آئے تھے۔ میں نے ان دستاویزات تک رسائی

حاصل کرلی۔ میرے ساتھیوں نے مجھ سے دھوکا کیا اور ہم دو دوستوں کو زہر دے کر وہ دستاویزات لے اڑے۔ اگر تم مجھے صرف ایک خط لکھنے کا موقع دو تو میں نہ صرف تمہاری منہ مانگی رقم یہاں منگوا سکتا ہوں بلکہ والئی ریاست سے تمہیں انعام و مرتبہ بھی دلا سکتا ہوں۔"

گوینش نے اسے مضحکہ خیز نظروں سے دیکھا۔ "بہت خوب محترم سردار۔ آپ کی باتیں سن سن کو تو میرے پسینے چھوٹ رہے ہیں۔ یہ میں آپ کے ساتھ کیا کر بیٹھا ہوں۔ اب تو میں آپ کو بالکل ہی نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ مصاحب لوگ ہیں۔ آپ کا کیا پتا رہا ہو کر آپ کی نیت بدل جائے۔ انعام و اکرم چھین کر آپ ہمارے پورے خاندان کی کھالیں کھنچوالیں۔ نہیں حضور۔۔۔۔۔۔۔ نہیں میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

تابان نے کہا۔ "سردار! تم میری باتوں پر یقین نہیں کر رہے۔ اس بے یقینی کے سبب ہم دونوں گھاٹے میں رہیں گے۔"

گوینش کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ اس نے تابان کو ایک کریہہ گالی سے نوازا اور زور سے تھوک کر بولا۔ "بدبخت! تو مجھے دودھ پیتا بچہ سمجھتا ہے۔ میں نے تیرے جیسے بڑے فریب کار

دیکھے ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ تجھ سا خاندانی رذیل کسی شاہی دربار میں مرتبہ پا سکتا ہے اور اگر کسی انہونی کے سبب ایسا ہو بھی چکا ہے تو میں ایک لاکھ مرتبہ لعنت بھیجتا ہوں تیری پیشکش پر۔ میرے پاس سونے چاندنی کی کمی نہیں ہے۔ اگر تجھے ایک رات اس قید خانے سے نکلنے کے عوض مجھے دولت کا انبار بھی ملے تو میں ٹھوکر سے اڑا دوں گا۔ یاد رکھ۔۔۔۔۔۔۔ یاد رکھ تیری موت اس تہہ خانے میں ہو گی اور نفرت کے سیلاب میں ڈوب کر ہو گی۔"

وہ تابان کو شعلہ بار نظروں سے دیکھتا ہوا اٹھا اور پاؤں پٹختا روزن سے دور چلا گیا۔ اس زمین دوز کوٹھری میں تابان سے نفرت و ہزیمت کا سلوک جاری رہا۔ کئی کئی روز اسے بھوکا پیاسا رکھا جاتا۔ کئی روز تہہ خانے کی صفائی نہ کی جاتی۔ بعض اوقات اس کے سامنے گھوڑوں کا راتب ڈال دیا جاتا اور کسی وقت روزن سے پتھر مار مار کے اسے لہولہان کر دیا جاتا۔ وہ یہ سب کچھ خاموشی سے سہتا رہا۔ سہنا اس کی عادت بن چکا تھا۔ ستمگری کے بہت تماشے دیکھے تھے اس نے۔ کبھی کبھی تو وہ جان بوجھ کر خود کو کٹھن حالات کے سپرد کر دیتا تھا۔ حالات کے جبر سے اس کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ اور روشن ہو جاتی۔ آقاؤں کے خلاف اس کے باغیانہ جذبات اور بھڑکتے تھے اور وہ ستمگر طبقے کو آٹھ آٹھ آنسو رلانے کے جذبے سے سرشار ہو

جاتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اس تہہ خانے میں بھی دھیرے دھیرے تابان کے اندر کوئی دھماکہ خیز مواد بھرا جاتا رہا۔ کوئی لاوا سا اس کے اندر اچھلتا رہا۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس کی بے قراری میں اضافہ ہو رہا تھا۔

وہ یہاں سے نکلنا چاہتا تھا لیکن کیسے؟ یہ سوال جتنا اہم تھا اتنا ہی مشکل بھی۔ روزمرہ کے معمولات جاری تھے۔ کبھی کبھی تابان کو احساس ہوتا کہ کوئی اس کو چھپ کر دیکھتا ہے۔ کسی وقت کوئی سایہ سا تہہ خانے کے روزن پر لہرا جاتا۔ شروع شروع میں تابان نے سمجھا کہ شاید گوینش کا کوئی پہریدار ہے۔ مگر پھر اسے یہ خیال بدلنا پڑا۔ یہ سایہ مرد کا نہیں عورت کا تھا۔ کبھی تابان کو پائل کی چھنکار سنائی دے جاتی اور کسی وقت فراک کا اڑتا ہوا رنگین کونا اس کی نگاہ میں چمکتا۔ گوینش کے گھر کا ماحول بے حد مذہبی تھا۔ جگہ جگہ دیوی دیوتاؤں کی تصاویر آویزاں تھیں اور صبح و شام عبادت کی گھنٹیاں گونجتی تھیں۔ گوینش گھرانے کی عورتیں سخت پردے میں رہتی تھیں اور گوینش کی موجودگی میں کسی کو یہ جرات نہ ہوتی تھی کے اونچی آواز میں بات بھی کر سکتے۔ پھر یہ کون ایسی کنیز یا خاتون خانہ تھی جو چھپ چھپ کر اسے دیکھتی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ روز آتی ہو لیکن ہفتے میں دو تین بار اس کی موجودگی کا احساس

ضرور ہوتا تھا۔ خاص طور پر ہر ہفتے کی شام جب عمارت کے کسی ایوان میں زور شور سے گھنٹیاں بجتی تھیں اور آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ خاص عبادت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ایک ایسی ہی شام کو تابان نے اس پردہ نشین کو دیکھ لیا۔ روزن کے قریب جلنے والی مشعل میں اس کے نقوش نمایاں تھے وہ دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ وہ ایک نوعمر خوبصورت لڑکی تھی۔ بمشکل پندرہ سولہ کا سن رہا ہو گا۔ تاہم وہ اپنی عمر سے بڑی نظر آتی تھی۔ وہ روزن پر جھکی ہوئی تابان کو دیکھ رہی تھی جو نہی تابان کی نگاہ اس سے ملی وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ "سنو!" تابان نے فریادی لہجے میں کہا لیکن وہ دوبارہ نمودار نہیں ہوئی۔ تابان کو اگلے ہفتے تک اس کی جھلک کا انتظار کرنا پڑا۔ اس مرتبہ بھی وہ صورت دکھا کر اوجھل ہونے لگی تھی مگر تابان کی آواز پر رک گئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے سامنے آئے بغیر پوچھا۔ آواز میں دلنشین لوچ تھا۔

"تت۔۔۔۔۔۔۔۔ تمہارا نام فیلانہ تو نہیں؟"

"ہاں!" مختصر جواب ملا۔

تابان دنگ رہ گیا۔۔ فیلانہ، مارسیلہ کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ تابان نے آخری مرتبہ اسے تین سال پہلے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایک چھوٹی بچی نظر آتی تھی۔ جو گھر کے خادمین پر خواہ مخواہ چیختی تھی اور زر خرید غلاموں و لونڈیوں کو زچ کرنے میں مصروف رہتی تھی، گھونگھریالے بالوں سے فیلانہ کو بہت چڑ تھی۔ گھونگھریالے بال دیکھتے ہی وہ ان پر جھپٹتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک کنیز کے خوبصورت گھونگھریالے بالوں سے زور آزمائی کرتے ہوئے ننھی فیلانہ کی کلائی اتر گئی تھی۔ اس ناکردہ گناہ کی پاداش میں گھر کی مالکن نے گھونگھریالے بالوں والے تمام غلاموں اور کنیزوں کے سر استرے سے منڈوا دئے تھے۔ تابان بھی ان میں شامل تھا۔۔۔۔۔۔۔ آج وہی فیلانہ تابان کے قریب موجود تھی اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ فیلانہ ہے۔ پچھلے تین برس میں وہ لڑکپن کی منزل پیچھے چھوڑ آئی تھی اور شباب اس پر ٹوٹ کر برس پڑا تھا۔

"فیلانہ، تم چھپ کیوں رہی ہو؟" تابان نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"چھپ تو نہیں رہی ہوں تمہارے تہہ خانے کی بدبو مجھے پیچھے دھکیل رہی ہے؟"

"اتنی بدبو ہے تو کیوں آتی ہو یہاں؟"

"تمہیں دیکھنے کے لئے۔۔۔۔۔۔۔ تم نے کیا کیا تھا جس کی یہ سزا تمہیں ملی ہے؟"

"میرا جرم تمہارے ابا جان ہی بتا سکتے ہیں۔"

"بڑے بیوقوف ہو تم۔۔۔۔۔۔۔ ابا جان بتا دیتے تو تم سے پوچھنے کیوں آتی۔"

"تمہارا کیا قیاس ہے میں نے کیا جرم کیا ہوگا؟"

"جہاں تک میرا اندازہ ہے تم پر میری بڑی بہن کو بدنام کرنے کا الزام ہے۔ اسی بدنامی کے سبب انہوں نے موت کو گلے لگایا تھا۔"

تابان نے کہا۔ "یہ تم سنی سنائی بات کہہ رہی ہو۔ تمہارا اپنا کیا خیال ہے کیا مجھ پر لگایا جانے والا یہ الزام درست ہے؟"

روزن سے باہر چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ایک فیصلہ کن آواز آئی۔ "نہیں۔۔۔۔۔۔۔ میں ایسا نہیں سمجھتی۔"

یہ مختصر جواب بے حد حوصلہ افزاء تھا۔ تابان نے پوچھا۔ "پھر تم کیا سمجھتی ہو؟"

"میں سمجھتی ہوں تم بھلے آدمی ہو۔ تم پر ظلم ہو رہا ہے۔"

دفعتاً فیلانہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی ایک پہریدار کی آواز آئی۔

"چھوٹی مالکن، آقا ہمیں قتل کر دیں گے۔ آپ ادھر نہ آیا کریں۔"

ایک دوسرا پہریدار بولا۔ "چھوٹی مالکن، میں افسوس سے کہتا ہوں کہ آپ پھر آئیں تو ہمیں شکایت کرنا پڑے گی۔"

اس کے ساتھ ہی تمام آوازیں معدوم ہو گئیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تابان نے سمجھ لیا کہ اب فیلانہ ادھر کا رخ نہیں کرے گی۔ مگر چند ہی روز بعد وہ پھر کسی طرح تہہ خانے کے روزن تک پہنچ گئی۔ یہ دو منزلہ تہہ خانہ تھا۔ بالائی منزل پر ہمہ وقت کوئی نہ کوئی پہریدار موجود رہتا تھا اس کی نگاہوں سے بچ کر تہہ خانے تک پہنچنا آسان کام نہیں تھا۔ تابان یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ گھٹنے موڑ کر بڑے اطمینان سے روزن کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس نے پنڈلیوں تک اونچا فراک پہن رکھا تھا۔ فراک کے اوپر بغیر آستین کا ایک چست لبادہ تھا۔ گلے میں موتیوں کا ہار دمک رہا تھا اور سنہرے بال سلیقے سے جوڑے کی

صورت بندھے تھے۔ وہ خاصی بنی سنوری نظر آتی تھی' اس کے نقوش کی ملاحت میں بڑی بہن کی جھلکیاں تھیں لیکن وہ مارسیلہ سے زیادہ تیز و طرار اور بے باک دکھائی دیتی تھی۔ وہ جس اطمینان سے یہاں آ بیٹھی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پہریدار کسی وجہ سے آج یہاں موجود نہیں ہیں۔ وہ کچھ دیر گردن جھکا کر محویت سے تابان کی حالت دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں افسردگی اور ناپسندیدگی تھی۔ آہستگی سے بولی۔

"مجھے افسوس ہے ابا جان کی وجہ سے تمہیں یہ ساری تکلیفیں سہنا پڑ رہی ہیں۔ کاش میرے بس میں ہو اور میں تمہیں یہاں سے نکال سکوں۔"

تابان نے گھبرا کر پوچھا۔ "پہریدار آج کہاں ہیں؟"

وہ بولی۔ "آج ان کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ شاید تم بے خبر ہو کہ آج پوسیڈن کا تہوار ہے۔ زیادہ تر پہریدار رخصت پر ہیں۔ گھر میں بھی میری والدہ اور ایک کنیز کے سوا کوئی موجود نہیں۔ سب لوگ ساحل پر کشتی رانی کے لئے گئے ہیں۔ میں ۔۔۔۔۔۔۔۔ تمہاری خاطر بہانہ بنا کر یہاں رہ گئی ہوں۔"

"میری خاطر کیوں؟"

"بس یونہی۔" وہ آگے کو جھک کر بولی۔ اس کے جسمانی نشیب وفراز بے حد نمایاں تھے۔ "لیکن۔۔۔۔۔۔۔ تم اس سے کوئی غلط مطلب نہ لینا۔۔۔۔۔۔۔۔ میں اپنا اور تمہارا فرق اچھی طرح سمجھتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ اور میرے دل میں کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے۔ صرف ہمدردی کا جذبہ ہے جو مجھے تمہارے پاس لے آیا ہے۔"

تابان نے کہا۔ "اس ہمدردی کے لئے بہت شکریہ۔" اور خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ روزن میں سے فیلانہ کچھ دیر گہری نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر ذرا شوخی سے بولی۔ "اداس ہو گئے ہو۔ یہ دیکھو میں تمہارے لئے کیا لائی ہوں۔"

تابان نے سر اٹھا کر دیکھا۔ فیلانہ کے ہاتھ میں ایک چابی نظر آ رہی تھی۔ یقیناً یہ اسی روزن کی تھی۔ تابان کے دیکھتے ہی دیکھتے فیلانہ نے چابی قفل میں گھمائی اور معمولی کوشش سے روزن کا آہنی جنگلہ اوپر اٹھا دیا۔ پچھلے تین ماہ میں پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ صفائی کرنے والوں کے علاوہ کسی اور نے اس جنگلے کو ہٹایا تھا۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ "تو کیا یہ لڑکی اسے اس سنگلاخ قبر سے نکالنے آئی ہے؟" لیکن اگلے ہی لمحے یہ سوچ مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی۔ اس کی گردن میں ایک ناقابل شکست طوق بھی تھا۔ بعید از قیاس تھا کہ فیلانہ کے پاس

اس طوق سے چھٹکارا پانے کی تدبیر ہو گی۔ روزن کا آہنی جنگلہ اوپر اٹھانے کے بعد فیلانہ نے رسی کی چھوٹی سی سیڑھی اندر گرا دی۔ خاکروب وغیرہ اسی سیڑھی سے نیچے اترتے تھے۔ فیلانہ سیڑھی کے حلقوں میں پاؤں رکھتی اندر آ گئی۔ اس کی حرکات میں چستی اور توانائی تھی۔ وہ بے حد دلیر بھی نظر آتی تھی۔ یوں بلاخوف اس تہہ خانے میں چلے آنا اس کی جرات مندی کا کھلا ثبوت تھا۔ تابان اسے یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ فیلانہ نے اپنے لباس کے اندر سے کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکالی۔ یہ مقدس شراب کی چھوٹی سی بلوری بوتل تھی۔ اس کے علاوہ خمیر کئے ہوئے میدے کی میٹھی روٹی تھی۔ اس روٹی میں کشمش، بادام اور مربہ جات کی آمیزش کی گئی تھی۔ روٹی کی خوشبو سے تہہ خانہ مہک اٹھا۔ فیلانہ ادا سے بولی۔ "یہ پوسیڈن کے تہوار کا خاص پکوان ہے تمہارے لئے لائی ہوں۔"

تابان اس قید میں ایسی تواضع کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہاں اسے جانوروں سے بدتر خوراک دی جاتی تھی۔ وہ ندیدوں کی طرح روٹی کھانے میں مصروف ہو گیا۔ چند لقمے لینے کے بعد اس کے ذہن میں خدشات جاگ اٹھے۔ نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں شہد ملے دودھ کا وہ گلاس آ گیا تھا جسے پینے کے بعد وہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہوا تھا۔ اس کربناک رات کا

تصور ابھی تک اس کے لئے سوہان روح تھا۔ کہیں اس خوش ذائقہ پکوان میں بھی تو ویسی ہی جان لیوا اذیت نہیں گوندھ دی گئی تھی؟ اس نے ہاتھ روک لیا اور کھوجی نظروں سے فیلانہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ با اطمینان اس سے چند بالشت کی دوری پر بیٹھی تھی۔ روٹی کی خوشبو میں اس کے جوان جسم کی مہک یوں گھل مل گئی تھی کہ ایک تیسری اشتہا انگیز خوشبو تہہ خانے میں پھیل گئی تھی۔ تابان نے مضطرب انداز میں پوچھا۔

"کس لئے آئی ہو یہاں؟"

"بتایا تو ہے تمہاری خاطر۔"

"میری خاطر تم نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لے لیا۔ اگر کوئی اس طرف نکل آیا تو کیا ہو گا؟"

"مجھے معلوم ہے کوئی نہیں آئے گا اور آ بھی گیا تو میں کسی سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔"

تابان اس کا خود سر لہجہ سن کر حیران رہ گیا۔ اسے احساس ہوا کہ فیلانہ کا یہ باغیانہ انداز اس بے پناہ گھٹن اور ناروا جبر کا نتیجہ ہے جس کا ذمہ دار خود گوینش ہے۔ اپنے اہل و عیال سمیت گھر کے ہر فرد پر اس کا بے پناہ دبدبہ تھا۔ کوئی اس کی منشاء کے بغیر پلک نہیں جھپک سکتا تھا۔ خاص طور پر اپنی پانچوں بیٹیوں کے لئے تو وہ بے حد سخت گیر تھا۔ اس سخت گیری کے کئی

مظاہرے تابان نے دو برس پہلے دیکھے تھے۔ تابان کو یقین تھا کہ بڑی بیٹی مارسیلہ کی موت کا سبب بھی گوینش ہی تھا۔ اگر گوینش نے اسے اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا تھا تو اپنے بے پناہ دبدبے کی بھینٹ ضرور چڑھایا تھا۔ گرفتاری کے بعد مارسیلہ نے اس خوف سے موت کو گلے لگایا تھا کہ اسے جھکے سر کے ساتھ باپ کا سامنا کرنا پڑے گا۔

تابان نے بغور فیلانہ کا سراپا دیکھا۔ روزن سے آنے والی مدھم روشنی میں وہ ایتھنز کے قدیم معبد میں سجی ہوئی کوئی خوش رنگ مورتی دکھائی دیتی تھی اس کے چہرے اور جسم کا ایک رخ روشن تھا۔ جیسے کسی رومانی مصور نے دلکش نسوانی پیکر کو دھوپ سائے میں قید کر دیا ہو۔

تابان نے اس سے پوچھا۔ "تہہ خانے کی چابی تمہیں کہاں سے ملی؟"

"داروغہ صفائی کی جیب سے۔ وہ تہوار کی خوشی میں ایک پوری صراحی شراب کی چڑھانے کے بعد مدہوش پڑا ہے۔"

"تمہیں اس تہہ خانے میں اترتے ہوئے ڈر نہیں لگا؟"

"مجھے چھوٹی موٹی باتوں سے خوف نہیں آتا۔"

تابان نے کہا۔ "میرے اس قدر قریب ہونا تمہارے لئے چھوٹی موٹی بات ہے؟"

"کیا مطلب؟" اس نے اطمینان سے پوچھا۔

وہ بولا۔ "تم مجھ سے محفوظ فاصلے پر نہیں ہو۔ میری زنجیر اتنی لمبی ضرور ہے کہ میں تمہیں دبوچ سکتا ہوں۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ایک قدم چل کر فیلانہ کے قریب پہنچ گیا۔ تابان کی گزارش پر پچھلے ماہ گوینش نے اس کی زنجیر میں دو ہاتھ کا اضافہ کر دیا تھا۔ اب وہ اٹھ کر کھڑا ہو سکتا تھا اور ایک مختصر دائرے میں گھوم بھی سکتا تھا۔

تابان کی قربت کا فیلانہ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اطمینان سے بولی۔ "تم مجھے کیوں نقصان پہنچاؤ گے۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں خیر خواہ ہوں۔ تمہیں تہوار کی مسرت میں شریک کرنے کے لئے یہاں آئی ہوں۔"

تابان نے مایوسی سے کہا۔ "ایسی قبر میں کوئی کسی خوشی میں شریک کیسے ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر کیا کروں میں تمہارے لئے؟" وہ سادگی سے بولی۔

تابان نے گہری سانس لی۔ "تم نے کہا تھا ناں کہ مجھے یہاں سے آزاد کرانا چاہتی ہو؟"

"ہاں میں نے کہا تھا لیکن۔۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ ناممکن ہے۔"

"کوئی کام ناممکن نہیں ہوتا فیلانہ۔۔۔۔۔۔۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں بھی تمہاری طرح کھلا آسمان دیکھ سکتا ہوں اور آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہوں۔" فیلانہ پوری طرح متوجہ ہو کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ تابان نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہو گا ملکہ زنوبیا جزیرے سے باہر ہے۔ قائم مقام فرمانروا کی ذمہ داریاں سپہ سالار انجام دے رہا ہے۔ جس وقت تمہارے والد نے مجھے گرفتار کیا میں سپہ سالار کا خاص مہمان تھا۔ سپہ سالار میری اچانک گمشدگی سے پریشان ہوں گے۔ اگر انہیں میرے بارے میں اطلاع مل جائے تو وہ تمہارے والد کو معقول معاوضہ دے کر مجھے آزاد کرا سکتے ہیں۔"

فیلانہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "تو تم۔۔۔۔۔۔۔ شاہی مہمان تھے۔۔۔۔۔۔۔ تم شاہی محل تک کیسے پہنچ گئے؟"

یکایک تابان کو احساس ہوا کہ وہ ایک سنگین غلطی کر چکا ہے۔ فیلانہ کا رویہ اس لئے ہمدردانہ تھا کہ وہ اسے ایک بے کس ولاچار غلام سمجھ رہی تھی۔ یہ جان کر کہ اس کا تعلق جزیرے کے فرمانروا سے ہے وہ ایک دم اپنے خول میں سمٹ گئی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ تابان نے بات بنانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ فیلانہ ایک عقلمند لڑکی تھی۔ اس کی

سوچ بہت دور چلی گئی تھی۔ اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ تابان کی رہائی کی کوشش کرے یا اس کا کوئی پیغام تہہ خانے سے باہر پہنچائے۔ اگر اس پیغام پر شاہی ہرکارے یہاں پہنچ جاتے اور وہ اثرورسوخ کے ذریعے یا معاوضہ دے کر تابان کو چھڑانے کی کوشش کرتے تو صورتحال سنگین ہو سکتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ فیلانہ کا باپ تابان کو چھوڑنے سے انکار کر دیتا۔ تابان اس کا غلام تھا اور جزیرے کے قانون کی رُو سے وہ حق رکھتا تھا کہ زر خرید غلام یا لونڈی کو فروخت کرنے سے انکار کر دے، چاہے خریدار بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ ایسی صورت میں گوینش اور اس کے اہل خانہ پر مصیبت آ سکتی تھی۔ فیلانہ نے تابان سے دور ہٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے تابو، میں اپنے اہل خانہ کے لئے کوئی مصیبت کھڑی کرنا نہیں چاہتی۔ بلکہ اب تو میں یہ دعا بھی نہیں کر سکتی کہ تم آزاد ہو جاؤ۔ کیا معلوم تمہاری آزادی ہمارے گھر کے لئے کتنی بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہو۔"

تابان نے خلوص دل سے کہا۔ "نہیں فیلانہ، ایسا نہیں ہو گا۔ مجھے سردار گوینش کی ذہنی حالت کا اندازہ ہے مارسیلہ کے صدمے نے انہیں مجھ سے متنفر کر رکھا ہے۔ کوئی باپ بھی

ہوتا ان حالات میں ایسا ہی سوچتا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، مجھے رہائی نصیب ہو گئی تو تمہارے گھرانے پر آنچ تک نہ آنے دوں گا۔"

فیلانہ نے ان فقرات سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ اب وہ جلد از جلد یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ دفعتاً تہہ خانے سے باہر کوئی دروازہ دھماکے سے کھلا۔ فیلانہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ تابان نے دیکھا ایک ہی لمحے میں اس کا رنگ اڑ گیا ہے وہ سر اٹھائے روزن سے باہر دیکھ رہی تھی۔ بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یوں لگا جیسے کوئی لڑکھڑاتا ہوا روزن کی جانب آ رہا ہے۔ ممکن تھا کہ داروغہ صفائی ہی ہو۔ چند لمحے بعد ایک کرخت آواز سنائی دی۔ اس آواز نے تابان اور فیلانہ کو سمجھا دیا کہ آنے والا داروغہ ہی ہے۔ فیلانہ گھبراہٹ میں الٹے قدموں چلتی تابان کے بالکل پاس پہنچ چکی تھی۔ مجسم گداز و خوشبو، تابان نے اس کے نوخیز بدن میں کوندتی برق کو محسوس کیا اور اس مخدوش ترین لمحات میں بھی متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ داروغہ تہہ خانے کی چھت پر چکرا رہا تھا۔ ان کے بچنے کی واحد امید یہی تھی کہ داروغہ کی نگاہ کھلے ہوئے روزن پر نہ پڑتی لیکن ایسا ہونا قرین قیاس نہیں تھا۔ داروغہ "تابقش" نامی خاکروب کو آوازیں دیتا تہہ خانے کے روزن تک پہنچا اس نے جنگلا کھلا ہوا دیکھا اور اندر جھانکنے لگا۔ نیم تیرگی

میں اس واضح طور پر دکھائی نہیں دیا۔ ویسے بھی وہ مقدس شراب کے نشے میں تھا۔ اندر جھانکنے کے بعد اس نے "تابقش" کو چند غلیظ گالیاں دیں اور اسے ڈانٹ پلائی کہ وہ ابھی تک صفائی ختم نہیں کر سکا۔ داروغہ کی باتیں سن کر فیلانہ اور تابان کی جان میں جان آئی۔ داروغہ نے یہی گمان کیا تھا کہ اس کا ماتحت صفائی کے لئے نیچے اترا ہوا ہے۔ وہ ڈگمگاتا ہوا واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد تابان اور فیلانہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ فیلانہ سٹپٹا کر رہ گئی۔ بے خبری میں وہ تابان کے بے حد قریب آچکی تھی۔ اس نے جلدی سے خود کو علیحدہ کیا اور ایک طرف ہٹنا چاہا مگر کسی شے نے اسے روک لیا۔ "اف!" وہ سسکاری لے کر رہ گئی۔ اس کا ایک آویزہ تابان کے بوسیدہ کرتے کے تسمے میں الجھ گیا تھا۔ آویزہ الجھنے سے کان بری طرح کھچ رہا تھا۔ اس نے پریشان نگاہوں سے تابان کی طرف دیکھا۔ تابان کے ہونٹوں پر مدھم مسکراہٹ ابھری۔ اس نے تسمے میں سے آویزہ نکالنا چاہا مگر یہ پیچ دار آویزہ اس بری طرح الجھا تھا کہ نکلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ فیلانہ مسلسل سسکاریاں لے رہی تھی۔ اس کا نازک چہرہ تکلیف کے سبب لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ تابان کے اس قدر نزدیک تھی کہ وہ اپنی قسمت پر ناز کر سکتا تھا اور اگر ایسا واقعہ کچھ عرصہ پہلے ہوا ہوتا تو یقیناً تابان ناز کرتا بھی لیکن اب تو اس کا دل دماغ آنکھیں، احساسات، سب کسی اور کی امانت ہو چکے تھے۔ حسن کی رعنائی اور

اداؤں کی دلکشی اب بھی اس پر اثر تو کرتی تھی لیکن اب اس کیفیت میں وہ پہلے سی شدت نہیں رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔ نیک نیتی سے کوشش کرنے کے باوجود تابان یہ آویزہ اپنے گریبان کے تسمے سے جدا نہیں کر پایا تھا۔ فیلانہ کا گذار جسم بار بار تابان سے چھو رہا تھا اور اس کے رگ و پے میں برق جگا رہا تھا۔ دفعتاً تہہ خانے کی چھت پر پھر آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ لگتا تھا داروغہ ابھی گیا نہیں وہیں منڈلا رہا ہے۔ یہ صورت حال تشویشناک تھی۔ کسی بھی لمحے وہ پھر تہہ خانے کی جانب آسکتا تھا۔ فیلانہ کا اب ہاں سے فوراً نکلنا ضروری تھا۔ تابان نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فیلانہ کا آویزہ کان کی جانب سے اتار لیا۔ اب وہ ایک تمغے کی طرح تابان کے سینے پر سجا ہوا تھا۔ فیلانہ نے غور سے تابان کی طرف دیکھا جیسے سوچ رہی ہو کہ شکل سے تو سکہ بند غلام لگتا ہے لیکن سمجھ بوجھ غلاموں والی نہیں۔ آویزے کی مصیبت سے چھوٹتے ہی فیلانہ نے شراب کی ننھی بوتل دوبارہ اپنے لباس میں رکھی اور سیڑھی چڑھ کر احتیاط سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ روزن کا آہنی دروازہ بند کر رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فیلانہ کا قرب تابان کے دل و دماغ میں ہلچل مچا چکا تھا۔ اس کے نوخیز بدن کی مہک اس کی شیریں کلامی، اس کا بے باک انداز، وہ لمحے تابان کے حواس میں جامد ہو گئے تھے جب فیلانہ کا سر اس کے سینے پر تھا اور تابان کے کھردرے ہاتھ اس کے نازک کان سے الجھ رہے تھے۔ وہ کان۔۔۔۔۔۔۔ سرخ پڑتا ہوا نازک ریشمی کان اس کا لمس تابان کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ جگمگاتا آویزہ اب تابان کی تحویل میں تھا جس نے اس تاریک سنگلاخ تہہ خانے میں تابان کے لئے کچھ دل گداز لمحات کی داغ بیل ڈالی تھی۔ حسن و محبت کے معاملات تابان کے لئے نئے نہیں تھے۔ وہ ایسے بہت سے مرحلے سر کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا فیلانہ کے دل میں اس کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو چکا ہے، وہ پھر اس تہہ خانے کی طرف آئے گی۔ وہ انتظار کرتا رہا یہ انتظار طویل ثابت ہوا لیکن رائیگاں نہیں گیا۔ ایک روز پھر فیلانہ کا رنگین سراپا روزن کے قرب و جوار میں نظر آیا۔ یہ وہی دن تھا جب محل میں ہفت روزہ عبادت ہوتی تھی۔ اس موقع پر فیلانہ کے لئے یہاں آنا آسان ہو جاتا تھا۔ وہ روزن کے پاس بیٹھ گئی۔

تابان نے کہا۔ "فیلانہ میں تم سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ کیا کسی روز پھر۔۔۔۔۔۔۔"

"نہیں تابو!" فیلانہ نے اس کی بات کاٹی۔ "اب میرے لئے نیچے اترنا ممکن نہیں۔ تمہارا منشا میں جانتی ہوں۔ میں وہ نہیں کر سکتی۔"

تابان بولا۔ "فیلانہ میں زیوس دیوتا کی قسم کھاتا ہوں، میری رہائی سے تمہارے اہل خانہ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

وہ بے دلی سے بولی۔ "مجھے معلوم ہے تم دیوتاؤں پر کتنا یقین رکھتے ہو۔ جس چیز پر یقین ہی نہ ہو اس کی قسم کھانے سے فائدہ؟"

تابان کافی دیر فیلانہ کو قائل کرنے کی سعی کرتا رہا آخر جھنجلا گیا۔ "اگر تم کچھ سننا نہیں چاہتی تو کیا لینے آئی ہو۔ جاؤ یہاں سے۔" وہ کروٹ بدل کر اور آنکھیں بند کر کے دراز ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے بغیر سر ہلائے کن اکھیوں سے روزن کی طرف دیکھا۔ فیلانہ ابھی تک موجود تھی۔ وہ گم صم بیٹھی تھی جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو کہ گفتگو کیسے جاری رکھے۔ کچھ دیر بعد وہ بوجھل دل کے ساتھ اٹھ کر چلی گئی۔

اس تہہ خانے میں تابان کے تاریک اور خاموش شب و روز گزرتے رہے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا، جزیرے کے حالات کیا ہیں۔ بحیرہ ایجیئن

میں ایران و یونان کی آویزش کہاں تک پہنچی ہے۔ مقدونیہ میں حالات کیا ہیں۔ سکندر کب مشرقی زمینوں کا رخ کر رہا ہے۔۔۔۔۔۔ اس کی کل کائنات تہہ خانے کی چار دیواریں تھیں اور وہ روزن تھا جہاں سے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے اسے خوراک فراہم کی جاتی تھی۔ درحقیقت وہ ایک ایسے چوہے دان میں آ پھنسا تھا جو ہر طرح اس کے شایانِ شان تھا۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود تابان اس پنجرے کو توڑنے میں ناکام تھا۔۔۔۔۔۔ فیلانہ گاہے گاہے روزن پر دکھائی دے جاتی تھی لیکن تابان اسے دیکھتے ہی رخ پھیر لیتا تھا یا آنکھیں بند کر کے لیٹا رہتا تھا۔ وہ کسی وقت آواز بھی دیتی تو تابان کان بند رکھتا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے سچ مچ فیلانہ پر غصہ آ جاتا تھا۔ عجب مزاج کی لڑکی تھی۔ صاف سیدھی بات تھی، اگر وہ اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی، اس کا دکھ نہیں بانٹ سکتی تھی تو پھر روزن میں ٹنگے رہنے سے کیا فائدہ تھا۔ وہ ایک ایسے شغل میں مصروف تھی جو بیکار ہونے کے باوجود خطرناک تھا۔ تابان کی واضح بے رخی کے باوجود فیلانہ کی لگاوٹ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی وہ ہفتے عشرے میں ایک بار روزن پر ضرور دکھائی دیتی تھی۔ کوئی کشش جیسے اسے خود بخود تابان کی طرف کھینچ لاتی تھی۔ تابان انجان نہیں تھا کہ اس جذبے کو نہ سمجھتا۔ فیلانہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ وہ گرفتارِ بلا تھی۔ شاید قدرت کی طرف سے گوینش کو

اس کی من مانیوں کی سزا ملی تھی۔ اس نے تابان کو پابند سلاسل کر کے اپنی پناہ نفرت کا نشانہ بنایا تھا۔ وہ خود اس پر تھوکتا تھا اور دوسروں کو ایسا کرنے کا حکم دیتا تھا۔ وہ اسے ذلالت کے عمیق ترین گڑھوں میں گرانا چاہتا تھا۔ تابان کی منت سماجت کے باوجود وہ اپنے ارادوں سے باز نہیں آیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس کے گھر میں ایک اور مارسیلہ پیدا ہو گئی تھی۔ ایک اور لڑکی نے تابان کو اپنے دل میں جگہ دے دی تھی۔ اس نے حقارت سے ٹھکرائے اور دھتکارے ہوئے تابان کو اس کی تمام تر بے چارگی اور بے قدری کے باوجود سر آنکھوں پر بٹھا لیا تھا اور اس مرتبہ جس لڑکی نے ایسا کیا تھا وہ مارسیلہ سے کہیں زیادہ دلیر اور بے باک تھی۔ وہ سینے میں حوصلہ رکھتی تھی اور منہ میں زبان بھی۔

دو تین ماہ اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک تاریک رات جب تابان گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے اپنے بالکل قریب آہٹ سنائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ روزن سے آنے والی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ رسی کی سیڑھی تہہ خانے میں جھول رہی ہے اور کوئی اس کے سہارے اتر کر تہہ خانے میں آ چکا ہے۔ تابان نے غور سے دیکھا اور اس کا سینہ منہ زور دھڑکنوں سے گونج اٹھا۔ آنے والی فیلانہ تھی۔ معلوم نہیں رات کے اس آخری پہر وہ کیونکر اس تہہ خانے

میں آ سکی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ تابان کو جو پہلا احساس ہوا، وہ فتح مندی کا تھا۔ آخر وہ فیلانہ کو اپنے پاس بلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اس کے سوال کا جواب بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سراپا حسن و رعنائی۔

"تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں!" تابان نے پوچھا۔

"تمہیں اس سے کیا مطلب۔ تم تو مجھے یہاں دیکھنا چاہتے تھے نا۔۔۔۔۔۔۔۔ میں آ گئی ہوں۔"

"کیا آج پھر کوئی تہوار ہے؟"

"نہیں!" فیلانہ نے مختصر جواب دیا۔

تابان نے ہاتھ تھام کر اسے پاس بٹھا لیا۔ وہ جانتا تھا وقت بہت قیمتی ہے۔ لہذا فوراً اصل موضوع پر آ گیا۔ موضوع وہی تھا جو اس سے پہلے کئی بار زیر بحث آ چکا تھا۔ تابان چاہتا تھا کہ فیلانہ اس کا پیغام تہہ خانے سے باہر سپہ سالار کے محل تک پہنچا دے۔ فیلانہ یہ مطالبہ سن کر رونے لگی۔ تاریکی میں اس کی سسکیاں گونجتی رہیں پھر اشکوں میں بھیگی ہوئی آواز ابھری۔ "تم جانتے ہو میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اس وجہ سے اپنی بات پر اصرار کر رہے

ہو؟"

تابان نے پوچھا۔ "تو کیا ایسا ہونا ممکن نہیں؟"

"نہیں!" فیلانہ نے بلا توقف کہا۔ "میں نے اباجان کا عندیہ لیا ہے۔ اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ وہ کسی قیمت پر تمہیں رہا نہیں کریں گے۔ ایسے میں تمہارا پیغام سپہ سالار تک پہنچانا ہم سب کے لئے کتنا خطرناک ہو گا۔ یہ شاید تم نہیں سمجھ سکتے۔"

تابان نے کہا۔ "فیلانہ تم وقت سے پہلے آخری رائے کیسے قائم کر سکتی ہو۔ بجا ہے کہ تمہارے والد مجھے آزاد کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے لیکن جو بات آج ناممکن ہے کل ممکن ہو سکتی ہے وہ زمانہ شناس ہیں۔ مجھے یقین ہے شاہی حکم سے روگردانی نہیں کریں گے اور یہ معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو جائے گا۔"

فیلانہ بولی۔ "وہ میرے والد ہیں۔ میں انہیں تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ غیض و غضب کی فراوانی انہیں ایک بالکل بدلا ہوا شخص بنا دیتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو غلاموں و کنیزوں کو زمین پر لٹا کر ذبح کر سکتا ہے۔ بیبیوں کو بے دریغ پیٹ سکتا ہے اور اپنے باپ کے سر پر مکا مار کر اسے ہلاک کر سکتا ہے۔ ایسے شخص سے یہ بھی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ شاہی فرمان ماننے

سے انکار کر دے اور تمہارے بدلے بڑی سے بڑی رقم کی پیشکش ٹھکرا دے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے باپ کی ہٹ دھرمی کے سبب میرے پورے گھرانے پر قیامت ٹوٹے۔ میری بوڑھی ماں کو سرِ بازار گھسیٹا جائے یا میرے بہن بھائیوں کو شاہی عقوبت خانوں کی دیواریں چاٹ جائیں۔۔۔۔۔۔ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی تابو۔ صرف تمہارے لئے نیک خواہشات رکھ سکتی ہوں۔ یا یہ دعا کر سکتی ہوں کہ دیوتا تمہیں اس ذلت سے رہائی نصیب کریں۔"

تابان نے ملتجی لہجے میں کہا۔ "فیلانہ، میری بات تو سنو ایک دفعہ سمجھنے کی کوشش کرو۔" لیکن وہ رکی نہیں۔ تابان نے اسے روکنا چاہا لیکن اس کے گلے کا طوق جھنجھنا اٹھا۔ اس کی زنجیر کی لمبائی اتنی نہیں تھی کہ وہ فیلانہ کو روک سکتا۔ بے بسی کے احساس نے اسے چکنا چور کر دیا۔

فیلانہ چلی گئی اور پھر دوبارہ تہہ خانے میں نہیں اتری۔ نہ ہی پھر کبھی روزن میں دکھائی دی۔ تابان اس کی طرف سے قطعی مایوس ہو گیا۔ جب وہ فیلانہ سے مایوس ہو گیا تو اس کے ذہن نے فرار کے دوسرے طریقوں پر غور شروع کر دیا۔ تابان کا ایمان تھا کہ موت سے پہلے

انسان آزاد ہے اور قبر کے سوا کوئی ایسا قید خانہ نہیں جہاں سے قیدی فرار نہ ہو سکے۔ وہ شب و روز ایسی تدبیریں سوچنے میں مصروف ہو گیا جو اسے تہہ خانے کی منحوس تیرگی سے نجات دلا سکیں۔۔۔۔۔۔ سردار شلال کو آزاد اور تابان کو قید ہوئے اب قریباً دس ماہ ہو چکے تھے۔ تہہ خانے کی نیم گرم فضا سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس قفس سے باہر ایک بار پھر بہار ڈیرے ڈال رہی ہے۔ درختوں پر کونپلیں پھوٹ رہی ہیں۔ پہاڑی ڈھلوانوں پر سبزہ اگ رہا ہے اور آسمان گہرا نیلا ہو چکا ہے۔ ایک روز تابان پہریداروں کی آوازیں سن کر چونک اٹھا۔ وہ بڑی گھبراہٹ میں بول رہے تھے اور ان کی گفتگو میں بار بار مقدونیہ اور سکندر کا ذکر آ رہا تھا۔ تابان ہمہ تن متوجہ ہو کر ان کی آوازیں سننے لگا۔ یکا یک اس پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ اسے لگا کہ اس کا دل پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر نکل آئے گا۔ پہریدار ڈری ڈری آوازوں میں اس عظیم الشان لشکر کا ذکر کر رہے تھے جو سکندر کی قیادت میں مقدونیہ سے نکلا تھا اور قرب و جوار کی انسانی آبادیوں پر اپنی دھاک بٹھاتا ٹرائے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

تابان کا دل چاہا وہ خوشی سے چلانے لگے۔ اچھلے کودے اور ناچے۔ آخر وہ صبح طلوع ہو گئی جس کا اسے انتظار تھا۔ آخر وہ قدم اٹھ گئے جن کی چاپ کے لئے مدتوں سے اس کے کان ترس

رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔ آخر کار اس تاریخی مہم کا آغاز ہو گیا تھا جس کی منصوبہ بندی عرصہ دراز سے کی جا رہی تھی۔ سالار اعظم اپنے محبوب گھوڑے بیو سی فالس پر سوار نکل کھڑا ہوا تھا اور مستقبل کی مفتوح زمینوں کی جانب اس کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اس شام تابان نے محسوس کیا کہ گو ینش اور اس کے اہل خانہ سراسیمگی کے عالم میں یہ مکان چھوڑ رہے ہیں۔ تہہ خانے سے دور مختلف کمروں اور دالانوں میں اسے سامان گھسیٹے جانے، بھاگنے دوڑنے اور ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں آئیں۔ اس کے بعد اچانک خاموشی چھا گئی۔ گہری اور مکمل خاموشی۔ تابان سکوت کے سمندر میں ایک تنہا جزیرے کی مانند تھا۔ آج وہ مشعل بھی تاریک تھی جس کی مدھم روشنی تابان کے تہہ خانے میں جھانکا کرتی تھی۔ رات ذرا گہری ہوئی تو تاریکی کے سبب عمارت کے حشرات الارض زور و شور سے پکارنے لگے۔ مگر یہ ایسا شور تھا جو خاموشی کو مزید گہرا کرتا تھا۔ تابان کو اندازہ ہوا کہ وہ اس وسیع و عریض عمارت میں یکسر تنہا رہ گیا ہے۔ دو منزلہ تہہ خانے کی زیریں منزل میں وہ قطعی بے بس اور لاچار تھا اس کی زندگی کا دار و مدار اب اس بات پر تھا کہ کوئی اس عمارت میں داخل ہو اور اسے تہہ خانے میں سے ڈھونڈ نکالے۔ روشن امید تھی کہ کوئی یہاں آئے گا۔ مکینوں کا خوفزدہ ہو کر بھاگنا ہی اس بات کی دلیل تھا کہ کوئی یہاں پہنچے گا۔۔۔۔۔۔۔ وہ کون ہو گا؟ یقیناً مقدونی فوج کے سپاہی ہوں گے۔ وہ عمارت میں گھسیں گے اور تابان کی چیخ و پکار سننے کے بعد اسے نکال لیں گے لیکن۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو؟ اس سوال کے جواب میں ایک اندوہناک تاریکی منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ اگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ اس عمارت میں کوئی داخل نہ ہوا یا زیریں تہہ خانے تک نہ پہنچ سکا تو کیا ہو گا۔ تابان ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا۔ وہ شخص جس نے مقدونی فوج کی پیش قدمی کا راستہ ہموار کیا، اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر وہ معلومات فراہم کیں جو اس عظیم سفر کی بنیاد بنیں، ایک بدبودار تہہ خانے میں بھوکا پیاسا دم توڑ دے گا اور باہر کھلے نیلگوں آسمان تلے، پھولوں اور باغوں کے جزیرے میں مقدونوی سپاہی جشنِ طرب مناتے رہیں گے۔

رات ہوئی اور پھر دن ہو گیا۔ اس کے بعد دوسری اور پھر تیسری رات سر پر آن کھڑی ہوئی۔ بھوک پیاس اور حبس نے تابان کو ہر سمت سے گھیر رکھا تھا۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ اس کی زبان سوکھتی جا رہی تھی اور پیٹ میں بھڑکتی آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ تابان نے وہ رات جیسے تیسے کاٹی اور صبح ہوتے ہی کسی آنے والے کی چاپ پر کان لگا دیے۔ مگر وہ چاپ کہیں نہیں تھی جو اس کے خشک لبوں کو تر کرتی۔ اس کی گردن سے یہ منحوس طوق

اتارتی اور اسے کھلی فضاؤں کی نوید سناتی۔ جوں جوں دن چڑھ رہا تھا گرمی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا اور یہ بے ہوا تہہ خانہ حبس سے معمور ہوتا جا رہا تھا۔ تابان فرش پر لیٹ گیا اور اپنی الجھتی سانسوں کو ہموار رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ رہ رہ کر سردار گوینش کا سفاک چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ وہ اسے سسک سسک کر مرنے کے لئے چھوڑ گیا تھا اور تو اور فیلانہ کے دل میں بھی اس کے لئے رحم نہ جاگا تھا۔ اس کی محبت کا دم بھرنے والی اس سفاکی کے خلاف آواز بلند کئے بغیر یہاں سے روانہ ہو گئی تھی۔

تابان کو زندہ در گور ہوئے وہ پانچواں روز تھا۔ زندگی اس کے سارے جسم سے کھنچ کر اس کی سماعت میں جمع ہو گئی تھی۔ وہ کوئی آہٹ سننے کی امید پر سانس لے رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ سانس بھی کیا تھی ایک دہکتا خنجر تھا جو سینے کے آر پار چل رہا تھا۔ اس نادیدہ خنجر کے لگاتار وار سہہ کر بھی تابان اگر زندہ تھا تو اس کی سخت جانی ہی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ایک شب پہلے ہی پانی کے لئے تڑپ کر مر گیا ہوتا۔ تابان کو موت کا غم نہیں تھا۔ موت تو بچپن سے اس کا کھلونا تھی۔ دکھ صرف دو باتوں کا تھا۔ ایک تو وہ بے بس قیدی کی موت مر رہا تھا اور دوسرے وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا قرض چکائے بغیر دم توڑ رہا تھا۔ یہ ان فریادی

آنکھوں کا قرض تھا جنہوں نے وحشی سپاہیوں کے نرغے میں گھر کر تابان کی طرف دیکھا تھا اسے مدد کے لئے پکارا تھا اور وہ مدد کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ایتھنز کے نواح میں شہزادی مارشا کی گرفتاری کا وہ منظر تابان کو بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ وہ ہمہ وقت خود کو ملامت کرتا کہ شہزادی کا محافظ ہونے کے باوجود وہ کیوں اسے نہ بچا سکا اور سوچتا رہتا کہ اس "ناکامی" کا مداوا کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔

تابان اپنے خیالوں میں گم بے حس و حرکت فرش پر پڑا تھا۔ اس کی خشک و ویران آنکھیں تہہ خانے کے روزن پر تھیں۔ یہاں سے آنے والی مدھم روشنی سے اندازہ ہوتا تھا کہ شام ہونے والی ہے۔ یہ شام اس کی زندگی کی بھی شام تھی۔ وہ جان بلب تھا۔۔۔۔۔۔۔ دفعتاً روزن کے بالکل پاس ایک آہٹ سنائی دی۔ پہلے تو تابان نے اسے وہم خیال کیا مگر جب بیرونی دروازے کا آہنی کھٹکا کھلا تو یکایک اس کی قنوطیت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ اس نے اپنی رہی سہی قوت سمیٹی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی تقدیر نے ان گنت مرتبہ موت کو مات دی تھی شاید ایک بار پھر ایسا ہو رہا تھا۔ اس کے پپڑی جمے ہونٹوں پر ایک مدھم مسکراہٹ کھل گئی۔ کچھ لوگ بیرونی دروازہ کھولنے کے بعد بالائی تہہ خانے کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ وہ تعداد میں

پانچ یا چھ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ نیچے اتر کر انھوں نے تہہ خانے میں جھانکا۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے۔" ایک آواز آئی۔

"ابھی آہٹ تو سنائی دی تھی۔" دوسری آواز نے کہا۔

تابان نے پکار کر کہا۔ "میں یہاں ہوں۔"

اس کے خشک حلق سے نکلنے والی آواز عجیب و غریب تھی۔ بھاگتے قدم زیریں تہہ خانے کے روزن تک پہنچے۔ تابان نے دیکھا مشعلوں کی روشنی میں چاق و چوبند مقدونی سپاہی گردنیں لمبی کر کے نیچے جھانک رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جزیرے کی سڑکیں شفاف اور روشن تھیں۔ ان سڑکوں پر ہنستے مسکراتے خوش باش چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ جوانوں، بچوں اور بوڑھوں کے چہرے، خوش جمال و خوش لباس عورتیں، بالوں میں رنگ برنگ پھول لگائے اپنے اپنے راستوں پر گامزن

تھیں۔۔۔۔۔۔۔۔ بہار کا موسم پوری حشر سامانیوں کے ساتھ عروج پر تھا۔ تابان ایک گھوڑا گاڑی پر سوار تھا۔ اس کے دائیں بائیں مقدونوی فوج کے چاق و چوبند سپاہی تھے۔ ان سپاہیوں میں دو دستہ سالار بھی تھے۔ تابان ان کی وردیاں بخوبی پہچانتا تھا (سکندر سے ملاقات کے وقت وہ دستہ سالاروں کی معیت میں ہی محل تک پہنچا کرتا تھا) جزیرے کے ماحول میں ایک خاص تبدیلی دیکھنے میں آ رہی تھی مقامی باشندوں کے درمیاں جگہ جگہ مقدونوی سپاہی تنہا یا ٹولیوں کی صورت میں دکھائی دے جاتے تھے۔ بعض مقامات پر مقدونوی جھنڈے بھی لہراتے ہوئے نظر آئے لیکن اس کے ساتھ مقامی سپاہی بھی مسلح دکھائی دیتے تھے اور مختلف مقامات پر پہرہ دے رہے تھے۔ لگتا تھا مقدونوی سپاہی کی حیثیت یہاں فاتحین کی نہیں مہمانوں کی ہے۔ تابان اس بارے میں اپنے ہمراہیوں سے سوال پوچھنا چاہتا تھا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھے تھے اور خدشہ تھا کہ تابان کی کسی بات کا جواب نہیں دیں گے۔ جزیرے کے مختلف راستوں سے گزرنے کے بعد ان کی گھوڑا گاڑی ایک شاندار عمارت کے سامنے رکی۔ یہ عمارت غالباً کسی امیر کی حویلی تھی۔ مگر اب عمارت کے باہر صرف مقدونوی سپاہیوں کے گھوڑے بندھے نظر آ رہے تھے۔ تابان کو اندر لے جا کر ایک سالار کے سامنے پیش کیا گیا۔۔ سالار کی وردی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ یک صدر سردار ہے۔

اس نے تابان کی ناگفتہ بہ حالت کو افسوس بھری نگاہ سے دیکھا۔ گو پانی وغیرہ پی کر اس کے چہرے پر زندگی کے آثار نمودار ہو گئے تھے مگر آنکھیں اب بھی اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور رنگ زرد تھا۔ وہ چلتے ہوئے بار بار ڈگمگا جاتا تھا۔ یک صدی سردار تابان کے لئے اجنبی تھا۔ وہ بھی تابان کو نہیں پہچانتا تھا اس نے تابان سے پہلا سوال یہی پوچھا کہ وہ کون ہے؟ تابان کو جزیرے کے حالات کے متعلق کچھ علم نہیں تھا۔ یہ بھی خبر نہیں تھی کہ وہ جن لوگوں کے ساتھ ہے وہ سکندر کے وفادار ہیں یا کسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہذا ضروری تھا کہ وہ اپنی اصلیت چھپالے اور اپنا تعارف ایک اہم فوجی مہم کے رکن کی حیثیت سے نہ کرائے۔ اس نے سالار کو بتایا کہ وہ مقدونی فوج کا ایک عام سپاہی ہے۔ اپنے دستے کے ساتھ ساحل پر گشت پر تھا کہ ایک ایرانی جنگی کشتی کے ہتھے چڑھ گیا اور اس جزیرے پر فروخت کر دیا گیا۔ تابان کی شباہت چونکہ ایرانی تھی، سالار کو اس پر مختلف شبہات ہوئے تابان نے تسلی بخش جوابات دے کر اسے مطمئن کر دیا پھر تابان نے سالار سے تازہ ترین صورت حال کے بارے میں پوچھا۔ سالار تابان سے پوری طرح مطمئن ہو چکا تھا لہذا اس نے تابان کو بنیادی معلومات فراہم کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھی۔ اس نے بتایا کہ آج سے قریباً بیس روز پہلے سالارِ اعظم سکندر ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ ایتھنز سے روانہ ہوا تھا۔ وہ درہ دانیال پار

کر کے ایشیائی ساحل پر پیش قدمی کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت سکندر ساحل سمندر سے کچھ فاصلے پر خیمہ زن ہے۔ سکندر کا خیال ہے کہ ٹرائے کی طرف بڑھنے سے پہلے راستے میں آنے والے جزیروں اور ساحلی آبادیوں کو ہموار بنالیا جائے۔ اس وقت فوج کا ایک اہم سردار اس جزیرے پر موجود ہے اور مقامی فرمانروا سے گفت وشنید کر رہا ہے۔

یہ جان کر کہ سالارِ اعظم سکندر نزدیک کے ساحلی علاقے میں موجود ہے۔ تابان کا سینہ جوش سے بھر گیا، صرف سکندر ہی وہ شخص تھا جو تابان کی دلیرانہ جدوجہد کا صلہ دے سکتا تھا، ان تکالیف کا احساس کر سکتا تھا جو تابان نے اس کامیاب مہم کے سلسلے میں اٹھائی تھیں۔ تابان نے یک صدی سردار سے پوچھا۔

"چھ ماہ پیشتر جب میں گرفتار ہوا اس سفر کا کہیں تذکرہ نہیں تھا۔ اچانک اتنی بڑی پیش قدمی کا منصوبہ کیسے بن گیا؟"

یک صدی سردار کی معلومات محدود تھیں لیکن تابان کے معاملے میں وہ خود وہ بہت بااختیار اور باخبر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے تابان کی معلومات میں اضافہ ضروری سمجھا۔ تخت پر ٹانگیں پھیلا کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائی اور نیم گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر دانشمندانہ لہجے میں بولا۔ "

ایسی مہمات کے آغاز سے پہلے اعلیٰ سطح پر کھوجی دشمن کے علاقے میں بھیجے جاتے ہیں۔ یہ جانباز اور ہوشیار لوگ ہوتے ہیں۔ کسی بھی یلغار کے لئے در حقیقت یہی لوگ میدان ہموار کرتے ہیں۔ سالارِ اعظم نے بھی کچھ کھوجی اس مقصد سے مشرقی ساحل کی طرف بھیج رکھے تھے۔ چند ماہ پہلے یہ لوگ واپس آ گئے ان کے آتے ہی سکندر نے اپنی مہم کا اعلان کر دیا اور اس سے پیشتر جو تیاریاں خاموشی سے ہو رہی تھیں بر سرِ عام ہونے لگیں۔۔۔۔۔۔۔"

تابان سمجھ گیا کہ سردار کا اشارہ شلال وغیرہ کی طرف ہے۔ یکایک تابان کی نگاہ سالار کے عقب میں پڑی۔ یہاں ایک بلند و بالا محرابی دروازہ تھا دروازے پر خوبصورت ریشمی پردہ جھول رہا تھا۔ ہوا کے زور سے پردے نے ہلکورا لیا تو "پس پردہ" منظر عیاں ہو گیا۔ ایک لڑکی قیدیوں کے لباس میں معمولی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے دائیں بائیں دو خاتون محافظ موجود تھیں۔ تابان لڑکی کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ فیلانہ تھی۔ تابان نے انگلی سے محرابی دروازے کی جانب اشارہ کیا اور پوچھا۔

"محترم سردار' یہ لڑکی کون ہے؟"

"قیدی ہے۔" سالار نے جواب دیا۔ "تم اسے جانتے ہو؟"

تابان کی سمجھ میں فوری طور پر نہیں آیا کہ اس سوال کا جواب ہاں میں دے یا ناں میں۔ آخر اس نے سچ بولنا ہی بہتر سمجھا' بولا۔ "سالار میں انہی لوگوں کی قید میں تو رہا ہوں۔ اس لڑکی کا باپ جزیرے کا ایک خوشحال زمیندار اور بحری مرغابی کا معروف شکاری ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔۔۔ یہ لڑکی آپ کی قید میں کیسے آئی۔۔۔۔۔۔۔؟"

سالار نے اپنی چمکیلی چندیا سہلاتے ہوئے کہا۔ "جزیرے کی پیشتر آبادی نے ہماری آمد کو خوشدلی سے قبول کیا لیکن ایک ایران نواز طبقہ ایسا بھی تھا جو ہماری آمد کے خلاف تھا اور لوگوں کے مخالفانہ جذبات ابھار رہا تھا۔ بالآخر جب ہماری سپاہ جزیرے پر اتریں تو یہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان میں سے کچھ کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ لڑکی بھی گرفتار ہونے والوں میں شامل تھی۔

تابان نے پوچھا۔ "اور اس کے لواحقین؟"

سالار بولا۔ "ان میں سے کسی کا کھوج نہیں ملا۔"

ہوا نے بلند و بالا ریشمی پردے کو پھر ہلکورا دیا۔ تابان کی نگاہ فیلانہ پر پڑی اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ اسے فیلانہ کی گرفتاری پر مطلق افسوس نہیں تھا۔ فیلانہ اور اس کا گھرانہ اسی لائق

تھا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن فیلانہ یہاں کیا کر رہی تھی؟ تابان کے ذہن میں ابھرنے والے اس سوال کا جواب سالار نے دیا وہ بولا۔

"یہ لڑکی نہ ہوتی تو تم اس زمین دوز کوٹھڑی میں سسک سسک کر مر گئے ہوتے۔"

"کک۔۔۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟" تابان کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔

سالر بولا۔ "اسی لڑکی نے ہمیں اس تہہ خانے کا سراغ دیا ہے۔ یہ دوسرے بھگوڑوں کے ساتھ "ہاون" کے قید خانے میں تھی کل اس نے پہریدار عورتوں سے کہہ کر داروغہ سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ مقدونی فوج کا ایک اہم سالار ایک زمین دوز کوٹھڑی میں بند ہے اور اگر اسے بچایا نہ گیا تو وہ بھوکا مر جائے گا۔ داروغہ نے اس بات کا یقین نہیں کیا۔ لڑکی رو رو کر فریاد کرنے لگی اس دوران میں بھی کسی کام سے وہاں پہنچ گیا۔ مجھے لڑکی کے بیان میں سچائی کی جھلک نظر آئی۔ میں نے اس کی نشاندہی پر اپنے ماتحتوں کو بھیجا اور وہ تمہیں یہاں لے آئے۔"

تابان سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا مقدونی سپاہی اس تہہ خانے میں اتفاقاً نہیں پہنچے تھے۔ انہیں خاص طور پر بھیجا گیا تھا اور بھیجنے والی فیلانہ ہی تھی۔ سالار نے خود کو

ذہین ثابت کرنے کے لئے بڑے غور سے تابان کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔ "میں تمہیں دیکھتے ہی جان گیا تھا کہ تم کوئی اعلیٰ عہدیدار نہیں عام سپاہی ہو اور فیلانہ کے باپ پر رعب گانٹھنے کے لئے تم نے خود کو فوجی سپہ سالار بتایا ہو گا۔ بہر حال وہ بیچاری اب بھی یہی سمجھتی ہے کہ تم سکندر کے کوئی خاص آدمی ہو۔"

تابان نے سالار کے احمقانہ تبصرے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے دل و دماغ ریشمی پردے میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ بولا۔ "محترم سالار' میں اس لڑکی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

سالار نے ایک خوبصورت خادمہ کے ہاتھ سے شراب کا جام لیتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ "تم ملنے کی بات کر رہے ہو میں اسے ویسے ہی تمہارے سپرد کر سکتا ہوں۔ اس کی حیثیت یہاں ایک معمولی قیدی کے سوا کچھ نہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا؟" تابان اس پیشکش پر خاموش رہا۔ سالار نے اس خاموشی کو رضامندی جان کر تابان کا کندھا تھپتھپایا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے رکھ لو اسے لیکن کسی کو خبر نہیں ہونی چاہیئے سمجھے میری بات؟" پھر تابان کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ ایک کنیز کو آوازیں دینے لگا۔ چھوٹے قد کی ایک ادھیڑ عمر کنیز تیزی سے آئی اور مؤدب کھڑی ہو گئی۔ سالار اسے فیلانہ کے متعلق ہدایات دینے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جزیرے کی بھری پری آبادی سے تھوڑا سا ہٹ کر یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس میں بیشتر ضروریاتِ زندگی موجود تھیں۔ خدمت کے لئے ایک ادھیڑ عمر نوکر تھا۔ سواری کے لئے ایک صحت مند گھوڑا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ دل بستگی کے لئے ایک سراپا حسن موجود تھی۔ اپنی دانست میں سالار نے ان تمام صعوبتوں کا مداوا کر دیا تھا جو تابان نے چھ ماہ کی قید میں جھیلی تھیں۔ شام ہو چکی تھی مکان کے بالاخانے میں تابان فیلانہ کے ساتھ موجود تھا۔ طاقدانوں میں مومی شمعیں روشن تھیں اور محرابی دروازوں پر خوبصورت پردے تھے۔ دریچوں سے باہر کچھ فاصلے پر جزیرے کی اصل آبادی نظر آتی تھی۔ بے شمار 'کلس' 'مینار اور پون چکیاں 'جہاں تک نگاہ جاتی تھی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ انہی روشنیوں میں کہیں اس عمارت کی روشنی بھی تھی جس کے منحوس تہہ خانے میں تابان کئی ماہ پڑا رہا۔ اس نے دریچے سے نگاہ ہٹا کر فیلانہ کی طرف دیکھا۔ وہ قید خانے کا لباس اتار چکی تھی۔ اب اس کی بدن پر ایک جھلملاتا ریشمی لبادہ تھا۔ وہ سنگھار کئے ہوئے تھی تابان کے ذہن میں اس کی تہوار کی یاد تاہ ہو گئی جب وہ ایسے ہی بناؤ سنگھار کئے تہہ خانے میں آئی تھی اور کافی دیر اس کے پاس رہی تھی لیکن اس ملاقات اور آج کی ملاقات میں بہت فرق تھا۔ آج وہ دونوں آزاد تھے۔ تابان نے کہا۔

"میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اگر تم بھی مجھے فراموش کر دیتیں تو شاید اس وقت تہہ خانے میں میری لاش پڑی ہوتی۔"

فیلانہ نے کہا۔ "میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ احسان تو تم کر رہے ہو جو ایک باندی سے ایسی مہربانی کا برتاؤ کر رہے ہو۔ مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں اپنے گھر میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکی۔ کاش میں اس وقت تمہاری رہائی کی صورت پیدا کر سکتی۔"

تابان نے کہا۔ "میں تمہاری مجبوریاں سمجھتا ہوں فیلانہ۔۔۔۔۔۔۔ تم نے وہی کیا جو ایک سمجھدار لڑکی کو کرنا چاہئے تھا۔ اپنے والد سے اختلاف رکھنے کے باوجود تم نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس سے تمہارے گھرانے پر زد پڑتی۔ میں سمجھتا ہوں غلطی میری ہی تھی جو اپنی اسیری سے گھبرا کر تم پر ناروا دباؤ ڈالتا رہا۔ میرے خیال میں مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔"

فیلانہ حیرت آمیز نظروں سے تابان کو دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شکل سے یکسر بدھو نظر آنے والا معمولی غلام اس وقت ایسی عاقلانہ گفتگو کرنے لگا ہے۔ تابان نے فیلانہ سے پوچھا کہ وہ گرفتار کیسے ہوئی اور اس کے اہل خانہ کہاں ہیں۔ اس سوال نے فیلانہ کو یک دم اداس کر دیا۔ تابان نے محسوس کیا کہ وہ اس سوال کا جواب دینے سے کترا رہی ہے۔ تابان کے دوبارہ پوچھنے پر اس نے صرف اتنا بتایا کہ مقدونوی فوج کی آمد کا سن کر اس کے والد نے فوراً جزیرہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی کوچے کے دو اور گھرانے بھی جزیرہ چھوڑ رہے تھے۔ سب نے مل کر ایک بڑی کشتی کا انتظام کیا۔ شام کے

وقت سب بڑی افرا تفری میں ساحل کی طرف روانہ ہوئے اس افرا تفری میں وہ ساحل پر اہل خانہ سے بچھڑ گئی اور سپاہیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئی۔

تابان کو فیلانہ کے بیان پر یقین نہیں آیا۔ وہ یقیناً کچھ چھپا رہی تھی۔ تابان کے بے حد اصرار پر فیلانہ نے اگلے روز اصل واقعہ کا ذکر کیا۔ اس نے جو کچھ بتایا اور تابان نے کرید کرید کر جو کچھ معلوم کیا اس کا خلاصہ یوں تھا۔

"فیلانہ بچھڑی نہیں تھی جان بوجھ کر جزیرے پر رہ گئی تھی اور جزیرے پر رہنے سے اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ تابان کو تہہ خانے کی اندوہناک موت سے بچانا چاہتی تھی۔ ساحل پر جب سب لوگ جہاز نما کشتی میں سوار ہوئے تو بہت افرا تفری کا عالم تھا مقدونی فوج کسی بھی وقت کھاڑی پر پہنچنا چاہتی تھی۔ فیلانہ جان بوجھ کر پیچھے رہ گئی۔ گھر والوں نے فیلانہ کو اس وقت دیکھا جب کشتی بادبان کھول کر روانہ ہو چکی تھی۔ فیلانہ کو ساحل پر کھڑا دیکھ کر وہ سب چیخ و پکار کرنے لگے۔ رسی کی سیڑھی ابھی تک کشتی سے لٹک رہی تھی۔ فیلانہ چاہتی تو وہ اب بھی کوشش کر کے سوار ہو سکتی تھی 'لیکن وہ سوار ہونے کے لئے تھوڑا ہی رہی تھی۔ وہ ساحل پر کھڑی اشکبار نظروں سے اہل خانہ کو دیکھتی رہی۔ کشتی رانوں کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ پھر کشتی کو ساحل پر لا سکتے۔ تیز ہوا میں وہ کنارے سے دور ہوتی چلی گئی۔ اہل خانہ فیلانہ پر چیختے چلاتے رہے۔ اسے کوستے رہے۔

سردار گونیش نے غضبناک ہو کر فیلانہ پر چند تیر بھی چلائے لیکن وہ رائیگاں گئے۔ کشتی دور

نکل گئی تو فیلانہ واپس مڑی وہ واپس گھر جا رہی تھی تابان کو تہہ خانے سے نکالنے کے لئے۔ مگر اب اس کام کے لئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ فیلانہ ابھی کھاڑی ہی میں تھی کہ مقدونوی سپاہی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے بہت سے دوسرے مسافروں کے ساتھ فیلانہ کو بھی حراست میں لے لیا۔

فیلانہ کی روئیداد بے حد اثر انگیز تھی۔ تابان دم بخود اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ فیلانہ کی شفاف آنکھوں میں تابان کے لئے محبت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں تابان کو لگا جیسے مارسیلہ کی روح فیلانہ کے جسم میں آگئی ہے اور فیلانہ کی آنکھوں سے اسے مارسیلہ دیکھ رہی ہے۔ صورت کے ساتھ ساتھ دونوں بہنوں کا انداز بھی بے حد ملتا جلتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ فیلانہ بے باک اور نوخیز تھی۔ اجنبی سپاہ میں ایسی دوشیزہ کی حیثیت درندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں لاوارث بھیڑ کی تھی۔ تابان کو فیلانہ پر ترس آنے لگا۔ اس نے پوچھا۔

"تمہیں کسی سے کوئی۔۔۔۔۔۔۔شکایت تو نہیں؟"

فیلانہ نے چونک کر دیکھا وہ اس سوال کی گہرائی سے آگاہ تھی۔ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں گرفتار ہوتے ہی مجھے ہاون کے قید خانے پہنچا دیا گیا تھا وہاں عورتیں محافظ تھیں میں پچھلے چار پانچ روز وہیں رہی ہوں۔"

فیلانہ کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جو کہہ رہی ہے درست ہے۔ تاہم تابان کو حیرت ہو رہی تھی۔ وہ مقدونوی سپاہ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایک منظم فوج ہونے کے باوجود ان میں بربری خصائل موجود تھے۔ اگر چار روزان کے رحم و کرم پر رہنے کے باوجود وہ "مصائب کا شکار نہیں ہوئی تھی تو یہ اس کی خوش قسمتی ہی تھی۔۔۔۔۔۔۔

اچانک تابان کو خیال آیا جو اس نے کئی ماہ سے فیلانہ کی امانت سمجھ کر سنبھال رکھی تھی۔ وہ اٹھا اور اپنے پرانے لباس کے اندر سے جگمگاتا آویزہ نکال لایا، "یہ لو اپنا آویزہ۔"

آویزے کو دیکھ کر فیلانہ کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ شاید اسے وہ واقعہ یاد آگیا تھا جب فیلانہ کا آویزہ تابان کے لباس سے الجھ گیا تھا اور کوشش کے باوجود جدا نہیں ہوا تھا۔ مجبوراً یہ آویزہ فیلانہ کے کان سے جدا کرنا پڑا تھا۔ آویزہ دیکھ کر فیلانہ جیسے گزرے دنوں کی یاد میں کھو گئی۔ شاید وہ شب و روز اسے یاد آگئے تھے جب وہ تہہ خانے میں ہر روز تابان سے ملتی تھی۔ اس وقت تابان کی حیثیت قیدی کی تھی اور فیلانہ کی حیثیت آقا کی۔ اب سب کچھ الٹ ہو گیا تھا۔ تابان آقا تھا اور فیلانہ کی حیثیت کنیز سے زیادہ کی نہیں تھی لیکن عجیب بات تھی 'فیلانہ کو یہ حیثیت بھی بری نہیں لگی تھی۔ کوئی اس کے دل سے یہ بات پوچھتا تو وہ برملا کہہ دیتی کہ وہ ساری عمر اس گھر میں ادنیٰ کنیز بن کر رہنا پسند کرے گی۔ وہ صرف تابان کا قرب چاہتی تھی چاہے اس کے لئے اسے کوئی حیثیت بھی اختیار کرنا پڑتی۔

تابان محویت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے فیلانہ کے دل میں کیا آئی تھی کہ اس نے بے اختیار تابان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے رخسار سے لگا لیا۔ اس کی آنکھوں کے چشموں سے شفاف آنسو ابلے اور تابان کے ہاتھ بھگونے لگے۔ وہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔ تابان کا دل فیلانہ کے لئے محبت اور احسان مندی کے جذبات سے بھر گیا۔ اس نے بے اختیار فیلانہ کو اپنے کندھے سے لگا لیا۔ وہ تابان کے سینے میں سمٹ گئی۔ اس کا جسم بہ زبان خاموشی پکار پکار کر تابان سے کہہ رہا تھا کہ وہ اسے اپنی بانہوں میں لے لے۔ تابان تادیر اس پکار سے اپنے کان بند نہ رکھ سکا۔ دونوں محبت کی ایک ایسی لہر میں بہنے لگے جس کے شور میں کچھ سنائی نہیں دیتا تھا اور جس کی روانی ناقابل مزاحمت تھی۔ محبت کی اس لہر نے دونوں کے درمیاں کوئی فاصلہ باقی نہ رہنے دیا۔

اگلے چند روز میں فیلانہ کی محبت نے تابان کو اس طرح ڈھانپا کہ ارد گرد کی ہر شے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ کوہی ندی جیسی محبت تھی جس کی رفتار ہر لحظہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور جو جلد سے جلد آگے سے آگے نکل جانا چاہتی ہے۔ فیلانہ نے تابان کے شب و روز یوں مہکائے کہ وہ ششدر رہ گیا۔ وہ یہ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ اس لڑکی کے سراپے میں اتنا پیار نہ جانے کہاں چھپا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔ ہاں یہ بات تھی کہ کبھی کبھی قربت کے حسین لمحات میں بھی فیلانہ یکدم اداس ہو جاتی تھی۔ چند لمحوں کے لئے وہ خود سے اور تابان سے

کہیں دور 'بہت دور چلی جاتی تھی۔ شاید اسے اپنے بچھڑے اہل خانہ یاد آتے تھے یا پھر کوئی اور بات تھی۔

وہ بڑی حسین رات تھی۔ دل چھو لینے والی ہوا چل رہی تھی۔ نشیب و فراز چاندنی میں دور تک روشن تھے۔ تابان اور فیلانہ ایک جھروکے میں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے فیلانہ دور تک ٹیلوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی حنائی انگلیاں تابان کی گردن پر اس جگہ گردش کر رہی تھیں جہاں آہنی طوق نے جلد پر اَن مٹ نشانات ڈال دیئے تھے۔ وہ کھوئی ہوئی آواز میں بولی۔

"یہ چاند کہاں سے نکلتا ہے تابو؟"

"یہی تو شاہِ مقدونیہ معلوم کرنے کے لئے نکلے ہیں۔ یہ سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ دریا کہاں سے پھوٹتے ہیں اور۔۔۔۔۔۔۔ چاند کس سرزمین سے ابھرتا ہے۔"

فیلانہ رومانی لہجے میں بولی۔ "تابو! مجھے تو لگتا ہے یہ چاند کسی غمزدہ لڑکی کا دل ہے۔ جو ہر رات اس کے سینے سے نکل کر ستاروں کے جھرمٹ میں اپنے محبوب کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ جب امید بندھتی ہے اس دل میں روشنی بھرتی جاتی ہے اور جب مایوسی بڑھتی ہے یہ لاغر اور بے نور ہوتا جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔"

تابان غیر جذباتی لہجے میں بولا۔ "تم تو ہر بات کو اپنے انداز میں لیتی ہو۔"

فیلانہ چونک کر تابان طرف دیکھنے لگی پھر موضوع بدل کر بولی۔ "آج چاند کی کون سی تاریخ ہے؟"

"شاید بارہویں۔" تابان نے جواب دیا۔

"پرسوں پوری رات کا چاند ہوگا۔ شہر کے بڑے دروازے پر "مشعلوں کا میلہ" ہوگا۔ ہم بھی چلیں گے ناں؟"

تابان نے کہا اگر تم جانا چاہتی ہو تو ضرور چلیں گے لیکن۔۔۔۔۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"لیکن کیا؟" فیلانہ نے اس کا کندھا جھنجھوڑا۔

"سنا ہے وہاں دیوتاؤں کے سامنے انسانی قربانی دی جاتی ہے۔ یہ سب دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے ایک بہت بڑا ہتھوڑا میرے ہاتھ میں ہو اور میں ان بتوں کو پاش پاش کر دوں۔"

فیلانہ مسکرا دی۔ تو تم نہ دیکھنا قربانی کا منظر۔ ہم صبح چلے جائیں گے۔ میلہ تو آٹھ پہر رہے گا۔"

"لیکن بدنصیبوں کی لاشیں تو قربانی کے چبوترے پر پڑی رہتی ہیں۔"

لاشیں تمہیں کہیں گی نہیں کہ ہماری جانب دیکھو۔ تم ادھر ادھر دھیان مت دینا۔ بلکہ بہتر ہے میری ہی طرف دیکھتے رہنا اور۔۔۔۔۔۔۔"

"اور کیا؟"

"اور میں میلہ دیکھتی رہوں گی۔" دونوں ہنس دیئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دریچے سے آنے والی خنک ہوا نے تابان کے گھونگھریالے بالوں سے اٹھکیلیاں کیں تو وہ جاگ گیا۔ رات کی آخری گھڑیاں تھیں۔ چودھویں شب کا چاند دور مغربی ڈھلوانوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا۔ تابان کی نگاہ جنوب کی سمت کھلنے والے دریچے میں چلی گئی قریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر شہر کی گنجان آبادی شروع ہو جاتی تھی۔ دور تک گھروں 'راستوں اور گرجوں کی ٹمٹماتی نظر آ رہی تھیں لیکن ایک مقام پر تو روشنی کا جھمگٹا سا لگا تھا۔ یہ شہر کا بڑا دروازہ تھا جہاں "مشعلوں کا میلہ " لگا ہوا تھا۔ ہوا کے دوش پر تیرتی 'ڈھول تاشوں کی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور کبھی کبھی بہت سے لوگوں کا شور ایک دور افتادہ گونج کی طرح سماعت کو چھو جاتا تھا۔ کچھ روشنیاں خاصی بلندی پر نظر آ رہی تھیں۔ یہ وہ بازی گر تھے جو ہاتھوں میں مشعلیں تھامے تنے ہوئے رسے پر چل رہے تھے۔ کچھ روشنیاں ایک بہت بڑے دائرے کی شکل میں چکرا رہی تھیں۔ ایک مقام پر روشنیوں کی اچھل کود جاری تھی۔ یہ سب کھیل تماشے تھے جو شہر کے صدر دروازے پر ہو رہے تھے۔ تابان کچھ دیر محو نظارہ رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بستر پر چت ہو گیا۔ فیلانہ کمرے میں نہیں تھی صرف اس کی خوشبو تھی۔ وہ بہت سویرے اٹھنے کی عادی تھی۔ آج شاید زیادہ جلدی اٹھ گئی تھی۔ اسے میلے پر جانے کے لئے بھی تیار ہونا تھا۔ رات بھی وہ دیر تک میلے کی باتیں کرتی رہی تھی۔ اس نے تابان کو بتایا تھا کہ "مشعلوں کا تہوار" پرومیتھیس دیوتا کی یاد میں منایا جاتا ہے جو "انسان دوست" دیوتا تھا اور جس نے سورج سے آگ چرا کر انسان کو دی تھی۔ وہ پرومیتھیس سمیت ہر دیوتا کے متعلق بہت کچھ جانتی تھی اس کی معلومات بہت وسیع تھیں اور وہ شائستہ زبان میں ان کا اظہار بھی کر سکتی تھی۔ چھوٹی سی عمر میں یہ علمیت اور دانائی متاثر کن تھی۔

فیلانہ کے بارے میں سوچ کر تابان دکھی ہونے لگا وہ کئی روز سے مسلسل سوچ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ فیلانہ کا مستقبل کیا ہو گا۔ اس کے والدین کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کدھر گئے اور اگر پتہ لگ بھی جاتا تو فیلانہ وہاں جانے کے لئے ہر گز تیار نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے اہل خانہ اور خاص طور پر اس کا باپ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ در حقیقت تابان کی مدد کر کے وہ اس بھری پُری دنیا میں تنہا رہ گئی تھی اور تابان بھی اس کا ساتھ کہاں تک دے سکتا تھا۔ اس کی منزل تو بہت دور تھی۔ اسے شہزادی مارشا کو تلاش کرنا تھا۔ وہ مارشا جس کی یاد کا کانٹا تابان کے دل میں ٹوٹ چکا تھا۔ وہ کسی پل اس کانٹے کی چبھن سے نجات نہیں پاتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے شدید تکلیف سے غافل ہو بھی جاتا تو ایک کسک سی دل و دماغ میں موجود رہتی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے میں اس نے سالار اعظم سکندر کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔ سالارِ اعظم کا پڑاؤ کہاں ہے وہ کب کوچ کا ارادہ

رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ کون کون لوگ ہیں۔ یہ سب کچھ اسے معلوم ہو چکا تھا۔ خاص طور پر تابان نے شلال اور نورین وغیرہ کے بارے معلومات حاصل کی تھیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ یہ جان کر اسے ذہنی کرب کا احساس ہوا تھا کہ شلال اور نورین اپنی گراں قدر خدمات کے صلے میں سکندر سے بھرپور صلہ پا چکے ہیں۔ ایشیا کی مہم سے "بامراد" واپسی کے انعام میں شلال کو پنج ہزاری سردار بنا دیا گیا تھا جبکہ نورین کو خاص شاہی دستے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ سکندر کے ایما پر جو اہم سردار جزیرے پر آیا ہوا تھا اور جزیرے کے فرمانروا سے گفت وشنید کر رہا تھا سردار شلال ہی تھا۔ ایک طرح سے یہ پورا جزیرہ اس وقت سردار شلال کے زیر نگیں تھا۔ یہ صورت حال تابان کے لئے بے حد تکلیف دہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جزیرے پر پہنچتے ہی سردار شلال نے سب سے پہلے کورا کو تلاش کرایا ہو گا اور اگر اس کی قسمت بہت اچھی نہیں تھی تو وہ اس وقت سردار شلال کے چنگل میں پھڑپھڑا رہی ہو گی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کورا تک پہنچنے کے باوجود سردار شلال نے اسے معاف کر دیا ہو۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ شلال کو تابان کے زندہ بچ رہنے کا شبہ ہو گیا ہو اور اس کے ہرکارے پورے جزیرے میں تابان کی ٹوہ لگاتے پھر رہے ہوں۔ یہی سبب تھا کہ تابان نے ابھی تک جزیرے سے نکل کر سکندر تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

تابان اپنے خیالوں میں گم تھا جب بیرونی کمرے سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ شاید فیلانہ آ رہی تھی' شبنم میں نہائے پھول کی طرح تروتازہ' مہکی اور سنوری ہوئی لیکن آہٹ قریب آئی تو تابان کو اندازہ ہوا کہ یہ اس کا ادھیڑ عمر گھریلو خادم ہے۔ خادم نے دوسرے کمرے سے آواز دے کر کہا۔ "مالک! غسل کے لئے تازہ پانی رکھ دیا ہے۔"

تابان چونک گیا۔ اس سے پیشتر یہ فقرہ فیلانہ کی زبان سے ادا ہوا کرتا تھا۔ اس نے خادم کو اندر بلایا۔ خادم نے تعمیل کی اور صبح بخیر کہہ کر خاموش و مؤدب کھڑا ہو گیا۔

"مالکن کہاں ہے؟" تابان نے پوچھا۔

"وہ تو۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ تو رات ہی چلی گئی تھیں۔ آپ کے سونے کے بعد۔" خادم نے ہکلا کر جواب دیا۔

"کہاں چلی گئی تھیں؟"

"میلے میں۔"

تابان حیرت زدہ ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔ فیلانہ اسے بتائے بغیر میلے میں چلی گئی تھی اور وہ بھی بالکل تنہا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور منہ دھو کر لباس بدلنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بالا خانے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اب رات کی تیرگی سے دن کا اجالا بغلگیر ہو رہا تھا۔ چاروں طرف پرندوں کی چہکاریں گونج رہی تھیں۔ تابان کا گھوڑا گھر کے سامنے بندھا تھا۔ وہ جست لگا کر گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہوا اور تیزی سے آبادی کی سمت روانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تابان میلے کے مقام پر پہنچا تو ہر طرف ہجوم نظر آیا۔ صبح کا اجالا تیرگی پر حاوی ہو گیا تھا لہذا مشعلیں گل ہو رہی تھیں۔ کھیل تماشہ دکھانے والے تھوڑی دیر ستانے کے لئے یہاں وہاں بیٹھ گئے تھے۔ ایک طرف چولہوں پر بڑے بڑے کڑاہ رکھے تھے اور ان میں گوشت کے نمکین پارچے تلے جا رہے تھے۔ ہر طرف مسالحوں کی تیز خوشبو پھیل رہی تھی مشاق تانبائی اپنے کام میں مصروف تھے۔ یہاں شراب کے مٹکے قطار اندر قطار رکھے تھے اور مہ نوشوں کے لئے دعوتِ عام تھی۔ خوبصورت عورتیں رنگین لباس زیب تن کئے ٹھمکتی پھرتی تھیں اور دل پھینک مرد پروانوں کی طرح ان کے گرد گھوم رہے تھے۔ شہر کے صدر دروازے کے سامنے ایک بڑے چبوترے پر دبیز قالین بچھائے جاتے تھے۔ غالباً یہاں کچھ دیر بعد رقص نغمہ کا مظاہرہ ہونا تھا۔۔۔۔۔۔۔ غرض ہر طرف ایک ہنگامہ برپا تھا۔ تابان اس ہنگامے سے قطعی لاتعلق بے قراری سے ہجوم میں چکراتا پھر رہا تھا۔ اسے فیلانہ کی تلاش تھی۔ فیلانہ جو پچھلے چند دن شب و روز اس کی ساتھی رہی تھی اور اس کی دھڑکن میں سما کر ہر سانس کی ضرورت بن گئی تھی۔ تابان کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ فیلانہ کو نہیں اپنے ہی جسم کے کسی گمشدہ حصے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ فیلانہ کو کھوجتے ہوئے اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔ وہ ہر قدم پھونک کر رکھ رہا تھا اور چاروں طرف سے باخبر تھا۔ اچانک ایک شخص نے تابان کو دیکھ لیا یہ مقدونوی فوج کا وہی یک صدی سردار تھا جس نے پندرہ روز

پیشتر اسے تہہ خانے سے نکلوایا تھا اور فیلانہ کا ہاتھ اسے سونپا تھا۔ اس وقت سردار کی بغل میں ایک دوشیزہ تھی اور وہ بڑی ترنگ میں دکھائی دیا تھا۔

"ٹھہرو!" اس نے تابان کو دیکھ کر ہانک لگائی۔ تابان اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ "کہاں پھر رہے ہو؟" اس نے قریب آ کر تابان سے پوچھا۔

"تابان نے کہا۔ "سردار میں فیلانہ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

یکایک سردار کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی۔ اس نے دوشیزہ کے کندھے سے بازو ہٹایا اور غور سے تابان کو دیکھنے لگا۔ "کس فیلانہ کی بات کر رہے ہو؟" اس نے دریافت کیا۔

"وہی لڑکی' جو آپ نے مجھے سونپی تھی۔" تابان نے جواب دیا۔ سردار نے اپنا گنجا سر سہلایا۔ "اس لڑکی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"کس بارے میں؟"

"اپنے بارے میں۔"

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

سردار نے ایک گہری سانس لی۔ "میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ تم سب کچھ جاننے کے باوجود فیلانہ کو بچانے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔"

تابان کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ "کس کو بچانے کی بات کر رہے ہو تم؟"

"فیلانہ کو۔" سردار نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ گرفتار ہوتے ہی اس کا نام بھینٹ چڑھائے جانے والی دوشیزاؤں کے ناموں میں لکھ لیا گیا تھا وہ قربانی کے لئے منتخب ہو گئی تھی اس لئے گرفتاری کے باوجود مقدونوی سپاہیوں کی دست درازی سے محفوظ رہی تھی۔"

تابان کے ذہن میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہ قریباً چیخ کر بولا۔ "اب کہاں ہے وہ؟"

سردار نے ایک لحظہ تابان کی آنکھوں میں دیکھا' پھر گھمبیر لہجے میں کہا۔ "اسے رات ہی قربان کر دیا گیا تھا۔"

تابان سراپا پتھرا گیا۔ چند لمحوں کے لئے اسے اپنی سماعت پر بھروسہ نہیں ہوا۔ پھر وہ لوگوں کو دائیں بائیں دھکیلتا دیوانہ وار قربان گاہ کی طرف بھاگا۔ شہر کے صدر دروازے کے سامنے انسان دوست دیوتا پرومیتھیس کا ایک بہت بڑا سنگی مجسمہ نصب تھا۔ اس مجسمے کے قدموں میں ایک سیاہی مائل پتھریلا چبوترا تھا۔ اس کہنہ سال چبوترے کے بیچوں بیچ ایک گول گڑھا تھا جس میں قربانی کا خون جمع ہوتا تھا۔ دائیں جانب قربان گاہ تھی۔ تابان نے دیکھا قربان گاہ پر پانچ مردہ جسم پڑے تھے۔ یہ تمام خوبرو دوشیزائیں تھیں۔۔۔۔۔۔۔ اور ان میں ایک فیلانہ تھی۔ تابان نے دودھیا نازک پیروں سے اسے پہچانا۔ وہ بھاگ کر گیا اور اسے لاشوں کے نیچے سے نکالا وہ تابان کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی تارا آنکھوں میں زندگی کی کوئی

رمق باقی نہیں تھی۔ کٹی ہوئی شہ رگ پر لہو جما تھا اور سنہری بال اس لہو میں لتھڑے ہوئے تھے۔ بہت دیر ہوئی وہ مر چکی تھی۔ تابان کی سماعت میں اس کے الفاظ گونجے۔

"تم مت دیکھنا لاشوں کی طرف۔ لاشیں تمہیں کہیں گی نہیں کہ ہماری طرف دیکھو۔"

پھر اس کی ہنسی کا جھرنا تابان کی سماعت میں پھوٹا۔ وہ جیسے غم سے دیوانہ ہو گیا۔ اس کا دل چاہا جسم و جاں کی پوری قوت کے ساتھ دیوتا کے سنگی مجسمے سے جا ٹکرائے اور اس وقت تک ٹکراتا رہے جب تک وہ چبوترے سے اکھڑ کر اپنے سینکڑوں پجاریوں پر نہ جا گرے۔ کاش! وہ یہ سب کچھ کر سکتا' کاش۔ وہ تھوڑی دیر بے حس و حرکت فیلانہ کی لاش پر کھڑا رہا۔ فیلانہ کی گرمجوشی کو یاد کر کے اس کا غم دوچند ہو گیا۔ ایک گہری سانس بھر کر اس نے اپنی آنکھیں موندیں اور بے جان قدموں سے چبوترے کی سیڑھیاں اتر آیا۔ کچھ تماشائی حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان میں یک صدی سردار بھی شامل تھا۔ سردار نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے افسوس ہے نوجوان۔۔۔۔۔۔ مگر اس لڑکی نے جان بوجھ کر موت کو گلے سے لگایا ہے۔ اگر یہ تمہیں اس بارے میں بتا دیتی اور تم مجھ سے ذکر کرتے تو ہم بہ آسانی بھینٹ چڑھنے سے بچا سکتے تھے۔ اس کا نام دوسری لڑکیوں کے ناموں سے خارج کرانا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔"

تابان سنتے ہوئے بھی کچھ نہیں سن رہا تھا۔ وہ عجیب خود فراموشی کے عالم میں سیدھا چلتا گیا اور ہجوم میں گھس کر دور نکل گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گنجان آبادی کو پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ اب اس کے چاروں طرف درخت تھے۔ سبزہ تھا اور باغات تھے وہ اونچے نیچے ٹیلوں کو اپنے پاوں تلے روندتا دور ایک ندی کے کنارے جا بیٹھا۔ فیلانہ کے غم نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ فیلانہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم نے اتنے بڑے راز کو سینے میں چھپا کر کئی شب و روز میرے ساتھ گزار دیئے۔ نہ تمہارے ماتھے پر شکن آئی نہ تماری آنکھوں سے غم جھلکا۔ کیوں اس کم عمری میں اتنی بڑی قربانی دی تم نے؟ وہ کنارے پر بیٹھا پانی میں کنکریاں پھینکتا رہا پھر نڈھال ہو کر وہیں گھاس پر لیٹ گیا اس کا جی چاہا وہ اتنی گہری نیند سوئے کہ کئی راتوں، کئی ہفتوں تک نہ جاگ سکے اور جب اس کی آنکھ کھلے فیلانہ کا چہرہ اس کے تصور میں دھندلا چکا ہو قربان گاہ پر اس کی کٹی ہوئی شہ رگ اور اس کے مڑے ہوئے ہاتھ پاؤں کا منظر اس کے ذہن سے محو ہو چکا ہو۔ یہی آس لے کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن جلد ہی اسے اٹھ جانا پڑا۔ اچانک ہی کورا کا خیال اس کے ذہن میں آیا تھا اور ایک دوسری طرح کی بے قراری اس کے حواس پر چھا گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ کورا کو اس کی ضرورت تھی۔ ممکن تھا کہ وہ کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو۔ اس کی مصیبت کا سوچ کر تابان کے تن بدن میں آگ سلگنے لگی۔ اس دم بھڑکتی آگ میں وہ ماتمی کیفیت دب گئی جو دیوتا کے قدموں میں فیلانہ کی لاش دیکھ کر اس پر طاری ہوئی تھی۔ اس نے چاروں طرف

دیکھ کر سمت کا تعین کیا اور ندی کے ساتھ ساتھ اوپر کی جانب بھاگنے لگا۔ اس کا رخ جزیرے کے شاہی محل کی طرف تھا۔ جہاں دس ماہ پہلے اس نے کورا کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دوپہر سے ذرا قبل تابان شاہی محل کے صدر دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ اور جسم ایک چادر میں چھپا رکھا تھا۔ اس حلئے میں وہ خاصا پُراسرار نظر آتا تھا۔ دروازے پر موجود محافظوں میں سے ایک بھاگ کر اس کے قریب آیا۔ "کون ہو تم؟" کیا بات ہے؟"

تابان نے متانت سے کہا۔ "میں تمہارے کماندار سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اتنے میں کماندار بھی نزدیک پہنچ گیا۔ وہ سرتاپا لوہے میں غرق تھا۔ خود میں سے اس کی تیز چمکیلی آنکھیں جھانک رہی تھیں اور ایک ہاتھ تلوار کے دستے پر تھا۔ "کون ہو تم؟" اس نے رعونت سے پوچھا۔" پھر وہ تابان کا چہرہ دیکھ کر چونک گیا اس کی آنکھوں میں حیرت اور سراسیمگی نظر آئی وہ تابان کی سمت انگلی اٹھا کر بولا۔

"تمہارا نام تابان ہے؟" تابان نے ہاں میں جواب دیا۔ "تم شاہی مہمان تھے؟"

کماندار نے مزید تصدیق چاہی۔

"ہاں!" تابان نے کہا۔ آج سے دس ماہ پیشتر میں شاہی مہمان تھا۔"

کماندار کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے اس نے تابان کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اسے لے کر محل کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ ایک کمرے میں آکر تابان نے چادر اتار پھینکی۔ کماندار نے بغور اسے دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آرہا تھا۔ وہ لرزں آواز میں بولا۔

"تمہاری تلاش میں ہم کہاں کہاں نہیں بھٹکے کہاں چلے گئے تھے تم؟"

"میری کہانی خاصی طویل ہے۔" تابان نے دھیمے لہجے میں کیا۔

"ٹھہرو' میں سپہ سالار کو تمہاری آمد کی اطلاع دیتا ہوں۔"

کماندار اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ "میری بات سنو۔" تابان نے اسے روک لیا۔ "میری آمد ک خبر عام نہیں ہونی چاہیئے۔۔۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔۔۔ وہ لڑکی کہاں ہے جو میرے ساتھ یہاں آئی تھی؟"

کماندار نے کہا۔ "تم کورا کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"وہ خیریت سے ہے تم تھوڑی دیر میں اسے اپنے سامنے پاؤ گے۔" کماندار تیزی سے باہر نکل گیا۔ سپہ سالار یعنی جزیرے کا قائم مقام فرمانروا محل ہی میں تھا۔ چند لمحے بعد تابان کو طلب کر لیا گیا۔ تابان خوابگاہ میں پہنچا جہاں سپہ سالار قیلولہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ تابان کی آمد نے سپہ سالار کو بھی حیران کر رکھا تھا۔ تابان نے آگے بڑھ کر سپہ سالار کو تعظیم پیش کی اور اس کے اشارے پر ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ خوابگاہ میں تخلیہ ہوا تو سپہ سالار نے کہا۔

"آثار سے لگتا ہے کہ پچھلے دس ماہ تم نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ کیا ہمارا اندازہ درست ہے؟"

تابان نے کہا۔ "حضور کی نگاہ تیز اور فراست ہر شک و شبہے سے بالا تر ہے۔"

سپہ سالار نے پوچھا۔ "کون بدبخت تھا وہ جس نے شاہی مہمان پر ہاتھ ڈالنے کی جرات کی؟"

تابان نے کہا۔ "جہاں پناہ وہ جزیرہ ابویا کا ایک سوداگر تھا مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس کے کسی جرم کی سزا ملنا ابھی باقی ہے۔"

سپہ سالار نے تفصیل چاہی تابان نے مختصر الفاظ میں شروع سے آخر تک تمام کہانی سپہ سالار کے گوش گذار کر دی۔ اس نے فیلانہ کے بارے میں بھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ سپہ سالار اس اثر انگیز روئیداد کو بڑے دھیان سے سنتا رہا۔ اس دوران ایک کنیز اندر داخل ہوئی اور اس نے بتایا کہ معزز مہمان کی ساتھی خاتون اس سے ملنا چاہتی ہیں۔

سپہ سالار نے حکم دیا کہ خاتون کو یہیں بلا لیا جائے۔ چند لمحے بعد کورا اندر داخل ہوئی۔ اس نے تابان کو دیکھا اور دم بخود دیکھتی رہی۔ شاید وہ روتی ہوئی اس کے قدموں میں گر پڑتی مگر سپہ سالار کی موجودگی اسے جذبات چھپانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے سپہ سالار کو تعظیم پیش کی پھر تابان کو خوش آمدید کہا اس کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے۔ سپہ سالار گویا ہوا۔

"تم لوگوں نے بہت سی باتیں کرنا ہوں گی اور اس کے لئے تخلئے کی ضرورت ہے۔"

اس نے خدام کو اشارہ کیا کہ وہ دونوں مہمانوں کو احترام سے مہمان خانے میں پہنچا دیں۔۔۔۔۔۔۔ کچھ ہی دیر بعد کورا اور تابان مہمان خانے کے ایک خوبصورت کمرے میں بیٹھے تھے۔ تابان کے چہرے پر رنج و غم کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ اس نے کورا سے پہلا سوال یہی کیا کہ ہوشمند کہاں ہے۔ وہ جانتا تھا اس سوال کے جواب میں ایک اندوہ ناک خبر اس کی منتظر ہو گی۔ ایک ایسی خبر جسے سناتے ہوئے کورا کی ہچکی بندھ جائے گی اور جسے سنتے ہوئے وہ خود بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکے گا لیکن کورا کی آنکھوں میں مسرت کی چمک دیکھ کر تابان بھونچکارہ گیا۔ کورا نے کہا۔

"اب وہ پہلے سے بہتر ہے۔" "کون؟" تابان کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہوشمند!" کورا نے جواب دیا۔ زخم کافی بگڑ گئے تھے۔ دو ماہ پہلے تک وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا لیکن اب حالت سنبھل رہی ہے۔"

تابان کا سینہ مسرت کی تیز لہروں سے لبریز ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا ہوشمند ابھی زندہ ہے۔۔۔۔۔۔ وہ دوست ابھی حیات تھا جسے تابان اپنے تئیں مردہ سمجھ کر خاک میں ملا چکا تھا اور جس کے تصور کو بھولی بسری یاد سمجھ کر آنکھوں میں بسائے ہوئے تھا۔

"کہاں ہے ہوشمند؟" وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"وہ بیمارستان میں ہے۔ اس کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔" تابان دوبارہ نشست پر بیٹھ گیا۔ کورا اسے ہوشمند کے بارے میں تسلی دینے لگی۔۔۔۔۔۔۔ پھر گفتگو کا

رخ پچھلے دس ماہ کے احوال کے طرف مڑ گیا۔ کورا نے تابان سے پوچھا کہ وہ اب تک کہاں رہا ہے۔ تابان نے اسے بھی مختصر الفاظ میں اپنی اسیری کے واقعات سے آگاہ کیا۔ وہ حیرت اور خوف کے سمندر میں ڈوب کر سنتی رہی۔ یہ موضوع ختم ہونے پر تابان نے کورا سے شاہی محل کی صورت حال دریافت کی۔ کورا نے کہا۔

"سپہ سالار کی طرف سے چند یوم پہلے مجھ بتایا گیا کہ مقدونیہ سے ایک بہت بڑی فوج ساحل پر پہنچی ہے اور کچھ فوج جزیرے پر بھی اتری ہے۔ اگر میں چاہوں تو مجھے میرے زخمی ساتھی کے ساتھ مقدونوی سالار تک پہنچا دیا جائے لیکن میں کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔۔۔۔۔۔۔ در حقیقت دس ماہ گزرنے کے باوجود بھی میں آپ کی طرف سے مایوس نہیں ہوئی تھی۔ میں ہر صبح اس یقین کے ساتھ بیدار ہوتی تھی کہ آج آپ کہیں سے آ جائیں گے۔ اور دیوتاؤں کا کرم ہے کہ میری آس بے مراد نہیں رہی۔"

تابان نے کہا۔ "کورا! تم نے جلد بازی نہ کر کے ہوشمند اور خود کو ایک بہت بڑی مصیبت سے بچا لیا ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں جزیرے پر اترنے والی مقدونی فوج کا سالار کون ہے؟" کورا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ تابان نے کہا۔ "وہ شلال ہے۔ محترم سکندر اسے رتبہ دے کر پنج ہزاری سردار بنا چکے ہیں۔"

کورا کا خوبصورت چہرہ خوف سے تاریک ہو گیا۔ شلال کا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں میں سہمے سہمے پنچھی پھڑ پھڑانے لگے تھے۔ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ "اب ہم کیا کریں گے؟"

تابان نے دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ کر چھت کے فانوس کو گھورا اور پُر سوچ لہجے میں بولا۔ "تم محل میں موجود ہو اس کے باوجود سردار شلال تم تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے۔ جزیرے کا قائم مقام فرمانروا ہماری بھرپور مدد کر رہا ہے۔ یقینی امر ہے کہ جزیرے پر اترنے کے بعد شلال نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہوگا کہ فرمانروا سے میرے، تمہارے اور ہوشمند کے متعلق دریافت کیا ہوگا۔ قائم مقام فرمانروا جانتا ہے کہ سردار شلال دس ماہ پیشتر ہمیں زہر دے کر فرار ہو گیا تھا۔ لہذا اس نے شلال کو تمہارے اور ہوشمند تک نہیں پہنچنے دیا۔"

کورا کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ شاید وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ سردار شلال اس کے اتنا قریب موجود ہے۔ بہ الفاظ دیگر وہ اذیت ناک موت کے سائے میں سانس لے رہی تھی۔"

اب آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" وہ اپنا اندرونی اضطراب چھپاتے ہوئے بولی۔

تابان نے متفکر لہجے میں کہا۔ "ہمیں براہ راست سالارِ اعظم تک پہنچنا ہوگا اور انہیں اصل صورت حال سے آگاہ کرنا ہوگا۔"

کورا نے پوچھا۔ "کیا جزیرے کا فرمانروا اس سلسلے میں ہماری مدد کرے گا؟"

تابان نے کہا۔ "ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔ اس نے ہمیں پناہ دے رکھی ہے اور پناہ کا حق بھی ادا کر رہا ہے لیکن ہمیں سالار اعظم تک پہنچانا اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ جزیرے میں ہر

طرف شلال کے سپاہی ہیں۔ یقیناً کھاڑی پر بھی ان کا پہرہ ہوگا۔ ایسی صورت حال میں ہمیں سکوپے لاس سے نکالنا خطرے کو دعوت دینا ہے۔"

کورا نے روہانسی آواز میں پوچھا۔ "آپ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم سردار شلال کے نرغے میں ہیں؟"

تابان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل گئی۔ یہ مسکراہٹ بچپن سے اس کی ساتھی تھی۔ جان لیوا خطرات کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر آ جاتی تھی۔ کچھ عجیب ناتہ تھا تابان سے اس مسکراہٹ کا۔ وہ اطمینان سے بولا۔ "پہلی بات یہ کہ تم مجھے آپ مت کہا کرو۔ میں نے کبھی تمہیں باندی سمجھا تھا اور نہ سمجھتا ہوں اگر ہمارے درمیان کوئی رشتہ ہے تو وہ برابری کا ہے۔ باقی جہاں تک شلال کا تعلق ہے یہ کوئی ایسی پریشان کن بات نہیں۔ مقدونوی فوج کو ایک دو روز میں آبنائے پار کر کے ٹرائے پہنچنا ہے لہذا شلال جزیرے پر زیادہ دیر قیام نہیں کر سکتا جونہی وہ یہاں سے روانہ ہوا ہم بھی جزیرہ چھوڑ دیں گے اور مقدونوی سپاہ کا تعاقب کر کے کسی طرح سکندر تک رسائی حاصل کر لیں گے۔"

تابان اور کورا میں گفتگو جاری تھی کہ دو محافظ تیز قدموں سے گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کی گھبراہٹ اس بات سے عیاں تھی کہ اندر آنے سے پہلے انہوں نے اجازت تک طلب نہ کی۔ یہ دونوں قائم مقام فرمانروا کے خصوصی محافظ تھے اور یقینی طور پر

شاہی حکم کی اطاعت میں یہاں پہنچے تھے۔ ایک محافظ بولا۔ "آپ دونوں فوراً ہمارے ساتھ چلئے۔ یہاں سخت خطرہ ہے۔" اس کی آواز میں لرزش تھی۔

"کیسا خطرہ؟" تابان نے دریافت کیا۔

"یہ شاہی فرمان ہے براہ کرم آپ سوال وجواب میں تاخیر نہ کیجئے۔" ایک محافظ نے فرطِ اضطراب میں تابان کو بازو سے تھام لیا۔ اسی دوران باہر کسی غلام گردش میں بھاگتے دوڑتے قدموں کی صدائیں آئیں۔ پھر ایک بھاری بھرکم آواز گونجی۔ "مہمان خانہ اس طرف ہے۔" اس کے ساتھ ہی کسی مقدونی نے کسی شاہی محافظ کو بری طرح ڈانٹا۔ "تم خاموش رہو۔" اس کی آواز بلند و بالا ایوانوں میں دور تک گونجی۔ ان آوازوں کو سن کر کمرے میں موجود دونوں شاہی محافظوں کے چہرے مٹی ہو گئے۔ وہ شدید تذبذب میں تھے۔ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اپنی جگہ کھڑے رہیں یا کمرا چھوڑ دیں۔ اس دوران مقدونوی سپاہی دندناتے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان کی تعداد دس سے کم ہرگز نہیں تھی۔ وہ پوری طرح مسلح تھے۔ تابان اور کورا کو دیکھتے ہی ان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس مقدونوی دستے کے سالار کو دیکھ کر تابان بری طرح چونکا۔ وہ نورین تھا۔ وہی نورین جو اس جزیرے میں ہاون کے تہہ خانے میں اپنی بیماری کے ہاتھوں سسک سسک کر دم توڑ رہا تھا اور تابان کی کوشش سے اسے رہائی نصیب ہوئی تھی۔ اب یہ احسان فراموش شخص آنکھوں میں

سرخ خون لئے تابان کو گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شرم یا جھجک کا نشان تک نہیں تھا۔ ہاں وہ تابان کی یہاں موجودگی پر تھوڑا سا حیران ضرور نظر آتا تھا۔

" گرفتار کرلو انہیں۔" اس نے اپنے سپاہیوں کو گرج کر حکم دیا۔

مشتعل سپاہی تابان اور کورا کی طرف جھپٹے 'کورا چیخ کر تابان کے بازو سے چمٹ گئی۔

سپاہیوں نے بہ زور اسے جدا کیا اور تابان کو عریاں تلوار کی نوک پر رکھ لیا۔ یہ سارا واقعہ چند ساعتوں کے اندر وقوع پذیر ہو گیا۔

تابان نے نورین کو مخاطب کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سکندر کے ذاتی دستے میں شمولیت مبارک ہو۔" اس مبارک باد میں پنہاں طنز نورین کو تیر کی مانند لگا۔ وہ دانت پیس کر غرایا۔ "اپنی زبان بند رکھ فارسی غلام ورنہ عمر بھر بولنے کو ترسے گا۔"

تابان نے کہا۔ "میں نے ایسی کیا غلط بات کہہ دی۔ تمہیں تمہاری خوش بختی پر مبارک باد دے رہا ہوں۔"

نورین بولا۔ "اور میرا دل تمہاری بدبختی پر ماتم کرن کو چاہتا ہے۔ بڑے بدنصیب ہو تم کہ اس وقت اس جگہ موجود پائے گئے ہو۔" پھر وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ "ان دونوں کی مشکیں کس دو اور چہرے پر نقاب چڑھا کر باہر لے آؤ۔"

نورین کی زبان سے ادا ہوتے ہی کئی تنومند سپاہیوں نے اسے دبوچ لیا اور ہاتھ پاؤں باندھنے لگے۔ تابان کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا

کہ آخر کار سردار شلال کی تلاش کامیاب ہوئی ہے۔ وہ کسی طور اس بات کا کھوج لگانے میں کامیاب رہا ہے کہ کورا شاہی محل میں پناہ گزین ہے۔ یہ اتفاق تھا کہ شلال کے کارندے اس وقت یہاں پہنچے تھے جب تابان بھی یہاں موجود تھا اور اب وہ بھی اس کے ساتھ ہی سردار شلال کے روبرو لے جایا جا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد نورین کے سپاہی تابان اور کورا کو گھسیٹتے ہوئے شاہی محل کے وسیع و عریض دلان میں پہنچے یہاں ایک فوجی گھوڑا گاڑی موجود تھی۔ گھوڑا گاڑی کو دیکھتے ہی تابان کو اندازہ ہو گیا کہ سردار شلال کی رہائش گاہ یہاں سے کچھ دوری پر ہے۔ سپاہیوں نے تابان اور کورا کو بے دردی سے گھوڑا گاڑی کے فرش پر پٹخ دیا اور انہیں لے کر روانہ ہو گئے۔ جونہی گھوڑا گاڑی شاہی محل سے نکلی ان دونوں کے چہروں پر سیاہ نقاب منڈ دیئے گئے۔۔۔۔۔۔اب تابان کے چاروں طرف تاریکی تھی۔ وہ صرف اتنا محسوس کر سکتا تھا کہ کورا اس کے پہلو میں بیٹھی ہے اور گاڑی جزیرے کی بھری پُری سڑکوں پر سفر کرتی ہوئی شمال کی سمت بڑھ رہی ہے۔ معلوم نہیں یہ سفر مختصر تھا یا طویل'بہر حال اس سفر کے آخر میں ان دونوں کو انتہائی سنگین حالات کا سامنا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ ایک دفعہ شلال کے قبضے میں چلے گئے تو ان کی لاشوں کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔ ان دونوں کی سلامتی شلال کے لئے زبردست "خطرہ" تھی۔ اس کا نام مرتبہ'عہدہ'ملازمت زندگی سب کچھ ختم ہو سکتا تھا۔ تابان کو یقین تھا کہ وہ ان دونوں کو تڑپا تڑپا کر مارنے میں بے حد سکون محسوس کرے گا۔ یہ

سفر در حقیقت کربناک موت کی طرف سفر تھا۔ اگر تابان کو اپنی اور کورا کی سلامتی مقصود تھی تو اسے یہ سفر ختم ہونے سے پہلے پہلے کچھ کرنا تھا۔ وہ سیاہ نقاب کی گہری تاریکی میں بے قرار ہو گیا۔ کورا کی طرح اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے تھے اور چاروں طرف عریاں تلواریں تھیں۔ اچانک تابان نے محسوس کیا کہ نرم انگلیاں اس کی کلائیوں پر رینگ رہی ہیں۔ یکایک اس کا سینہ بے قرار دھڑکنوں سے گونج اٹھا۔ یہ پہلو میں بیٹھی کورا کی انگلیاں تھیں۔ وہ اپنے بندھے ہاتھوں سے تابان کے بندھے ہاتھ کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کورا کی یہ دلیرانہ کوشش کافی طویل اور صبر آزما ثابت ہوئی لیکن بالآخر تابان کے ہاتھوں کی گرہ کھل گئی۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ سپاہیوں کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ اور اب گاڑی کسی بھی وقت قلعے کے حصار میں داخل ہونے والی ہے جہاں سردار شلال قیام پذیر ہے۔ اب سوچ بچار کا وقت نہیں تھا۔ جونہی تابان کے ہاتھ آزاد ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے اپنا نقاب نوچا'اطراف کا جائزہ لیا اور ہر اندیشے سے بے نیاز ہو کر اپنے سامنے بیٹھے دو سپاہیوں پر جا پڑا۔ اس کا طوفانی گھونسہ ایک سپاہی کے جبڑے پر لگا اور دوسرے کو تابان کی جان لیوا ضرب برداشت کرنا پڑی۔ بائیں جانب بیٹھے نورین کی تلوار بجلی کی طرح چمکی اس نے بلادریغ تابان کے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ تابان نے جھک کر یہ مہلک وار بچایا اور پیچھے کھڑے سپاہی کی کمر سے پیش قبض کھینچ لی۔ گھوڑا گاڑی کی مختصر سی جگہ میں پیچھے اچانک ہی زلزلہ آ گیا تھا۔ پیش قبض ہاتھوں میں آتے ہی تابان نے بے رحمی

سے حملہ کیا اور ایک سپاہی کی آنتیں فرش پر ڈھیر ہو گئیں۔ ایک دوسرا سپاہی بھی مہلک طور گھائل ہو کر پیچھے ہٹا لیکن اس کے بعد تمام سپاہی یک بیک تابان پر پل پڑے۔ گھوڑا گاڑی مسلسل دوڑ رہی تھی۔ سپاہیوں کے یکبارگی جھپٹنے سے گاڑی کا توازن خراب ہوا اور وہ ایک مہیب گڑگڑاہٹ کے ساتھ الٹ گئی۔ گاڑی کے اندر قلابازی کھاتے ہوئے تابان نے کورا کی چیخ سنی۔ اسے لگا گاڑی کسی چوبی حد بندی سے ٹکرانے کے بعد ہوا میں معلق ہو گئی ہے۔ وہ بلندی سے نیچے گر رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔ پھر زوردار چھپاکا سنائی دیا وہ پانی میں گرے تھے۔ چند لمحے کے لئے تابان حواس سے بیگانہ ہو گیا' مگر پھر اس نے خود پر قابو پایا اور کورا کی تلاش میں چاروں طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔۔ گرنے کے بعد وہ نہ جانے کس طرح گاڑی سے باہر آ گیا تھا وہ ایک چوڑے پاٹ کی ندی میں تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر وہ بلند چوبی پل نظر آ رہا تھا جس کی حفاظتی حد بندی توڑ کر گاڑی نیچے گری تھی۔ دائیں جانب کچھ فاصلے پر ایک قدیم قلعے کی بلند و بالا برجیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ سامنے گھوڑا گاڑی تھی جس کا تین چوتھائی حصہ گھوڑوں سمیت پانی میں غرق ہو چکا تھا اور باقی بھی ہونے والا تھا۔ یہ سارے منظر ایک ساعت کے مختلف حصے تابان کی نظروں سے گزرے۔ وہ پوری قوت سے پکارا۔ ''کورا۔۔۔۔۔۔۔ کورا''

اسے کورا کے بندھے ہاتھوں کا خیال آیا اور وہ جان گیا کہ اگر وہ کورا تک نہ پہنچ سکا تو بے بسی کی موت اس کا مقدر ہو گی۔ دو تین اجسام پانی پر تیر رہے تھے۔ اس نے شام کے جھٹ

پٹے میں غور سے دیکھا' ان میں سے دو نیم بے ہوش مقدونوی تھے اور تیسری کورا تھی۔ تابان نے اسے دراز زلفوں سے پہچانا۔ وہ شاید تہہِ آب جانے سے پہلے آخری بار سطح پر آئی تھی۔ تابان نے جسم و جاں کی پوری قوت سے ہاتھ پاؤں چلائے اور کورا کے اوجھل ہونے سے پہلے اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے کورا کی کمر پر اپنا بازو جمایا اور رخ پھیر کر کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ان کے چاروں طرف تاریکی تھی۔ وہ بھاگ رہے تھے اور بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ کبھی بھاگتے ہوئے کورا لڑکھڑانے لگتی تو تابان اسے سہارا دیتا اور وہ نسبتاً دھیمی رفتار سے چلنے لگتے لیکن ایسے میں عقب سے سنائی دینے والا شور و غل ان کے نزدیک آ جاتا اور وہ پھر تیز قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتے۔ ان کے تعاقب میں آنے والے مقدونوی اور مقامی سپاہی تھے۔ انہوں نے قلعے کی برجیوں سے گاڑی کے ندی میں گرنے کا منظر دیکھا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں سینکڑوں کی تعداد میں وہاں آ پہنچے تھے۔ تابان اس وقت کورا کو بمشکل ہوش میں لا سکا تھا۔ ہوش میں آتے ہی کورا کو تابان کے ہمراہ بھاگنا پڑا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور اب وہ مقدونوی سپاہیوں کی زد سے نکلنے کے لئے جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ ندی کے ساتھ ساتھ زیتون کے درخت تھے۔ انگوروں کی بیلیں تھیں اور آلو بخارے کے وسیع

باغات تھے۔ وہ ایک بہشت سے گزر رہے تھے مگران کے تعاقب میں دوزخ کی آگ تھی۔ آخر ایک مقام پر کورا کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کے ہونٹوں سے کراہ نکلی اور وہ کٹے شہتیر کی طرح دھڑم سے اوندھے منہ گری۔ تابان نے اسے بمشکل اٹھایا اور اس کی کمزور مزاحمت کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔

متعاقب سپاہیوں کی آوازیں ایک دفعہ پھر قریب آرہی تھیں۔ تابان جانتا تھا کہ ان کے بچنے کے امکانات محدود ہوتے جارہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔اب اس نے بہتر سمجھا کہ متعاقب سپاہیوں کے آگے آگے "میراتھن" دوڑ لگانے کے بجائے ندی کا رخ کرے۔ وہ بائیں جانب مڑا اور انگوروں کی نیم پختہ بیلیں پھلانگتا ہوا کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔ متعاقب سپاہیوں سے اس کا فاصلہ خطرناک حد تک کم ہوچکا تھا۔ وہ اب ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سن سکتا تھا اور ہاتھوں میں پکڑی مشعلوں کی روشنی دیکھ سکتا تھا۔ اب تابان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ وہ کورا سمیت ندی میں اتر جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا پانی اس کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ امید کی کرن دکھائی دی۔ یہ ایک بیس چپوؤں والی کشتی تھی جو پانی کے رخ پر بہتی تابان کی سمت بڑھ رہی تھی۔ تابان 'کورا سمیت پانی میں چھپ گیا اب ان دونوں کے صرف سر پانی سے باہر تھے۔ وہ گہری تاریکی میں تاریکی کا حصہ دکھائی دے رہے تھے۔ کشتی ان کے قریب سے گزری تو تابان اس کے عقبی حصے سے لٹک گیا۔ کورا بدستور اس کی کمر سے لپٹی ہوئی تھی۔ کافی دور تک ان دونوں نے ایسے ہی سفر کیا۔ پھر جب تابان کے بازو شل ہونے لگے تو وہ

قوت صرف کرکے کشتی پر چڑھ گیا۔ بعدازاں اس نے کورا کو بھی اوپر کھینچ لیا۔ یہ ایک خاصی بڑی کشتی تھی۔ اس میں بحیرہ ایجیئن سے نکالا جانے والا اسفنج لدا تھا۔ اوپر تک ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ تابان اور کورا اس نرم و گداز اسفنج میں گھس کر لیٹ گئے۔ ندی کا کنارا اب خاموش تھا۔ ان کے تعاب میں آنے والے سپاہی کہیں دور نکل گئے تھے۔

تابان نمناک اسفنج پر لیٹا سانس درست کرتا رہا۔ پھر اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اب گنجان درختوں کے عقب سے چاند نمودار ہوگیا تھا اور اس کی سحرانگیز چاندنی کوہ و دمن کو روشن کرنے لگی تھی۔ شمال سے آنے والی ہوا ان کرنوں کو ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوتی تھی۔ ایسے میں جھونکوں کی بند قبائیں کھل جاتی تھیں۔ اور ان کے دامن میں سمٹی ہوئی زیتون و زعفران کی خوشبو ہر طرف پھیل جاتی تھی۔ چپو چلانے والے کشتی راں ہم آہنگ ہوکر ایک مقامی گیت گارہے تھے۔ اس گیت میں گدازرخساروں والی اس مہربان عورت کا تذکرہ تھا جو بہت دور کسی سرسبز بستی کے چھوٹے سے گھر میں بیٹھی واپس آنے والوں کا انتظار کرتی ہے۔ گندم کی زیتون لگی روٹی کو ڈھانپ ڈھانپ کر رکھتی ہے اور اپنے سوئے ہوئے بچے کو بے خیالی میں تھپکتی رہتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ کشتی ہموار رفتار سے سمندر کی جانب بہتی رہی اور کشتی رانوں کی آوزیں ہوا کی لہروں میں ڈوبتی ابھرتی رہیں۔

تابان گہری سوچ میں گم تھا۔ یہ ایسی سوچیں تھیں کہ وہ اپنے پہلو میں کورا کا وجود بھی فراموش کرچکا تھا۔ آج طلوع آفتاب کے بعد کیا کیا سنگین واقعات اسے پیش آچکے تھے۔

سب سے پہلے اس نے فیلانہ کا بے جان چہرہ دیکھا تھا۔ پھر وہ شاہی محل میں کورا کے ساتھ گرفتار ہوا۔ تب گھوڑا گاڑی کے اندر ہونے والی خونی کشمکش کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ گھوڑا گاڑی کا بلندی سے ندی میں گرنا' گھوڑوں اور مسافروں سمیت ڈوبنا' تابان کا کورا کو بچا کر کنارے پر پہنچانا اور متعاقب سپاہیوں سے بچنے کے لئے تاریک باغات میں اندھا دھند بھاگنا' سب خواب کی باتیں لگتی تھیں۔ اب بھی یہ خواب ٹوٹا نہیں تھا۔ وہ اور کورا نامعلوم کشتی میں سوار نامعلوم ندی میں محو سفر ان دیکھی منزل کی طرف رواں تھے گوینش کے تہہ خانے سے نکلتے ہی تابان کے لئے زندگی نے بلا کی رفتار اختیار کر لی تھی۔ اچانک تابان کو اپنے خیالات سے چونکنا پڑا۔ کشتی کے اگلے حصے سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ کشتی کی رفتار بھی اچانک کم ہو گئی تھی۔ غالباً کسی دوسری کشتی نے اس کشتی کو روک لیا تھا۔ چند لمحوں بعد کشتی مکمل طور پر رک گئی۔ تابان سانپ کی طرح رینگتا ہوا چند ہاتھ آگے گیا۔ اسے مشعلوں کی روشنی میں مقدونی سپاہی نظر آئے وہ ایک فوجی کشتی میں سوار یہاں پہنچے تھے اور اب کشتی رانوں کو روک کر ان سے بات چیت کر رہے تھے، یہ وہی سپاہی تھے جو قلعے سے ان کے پیچھے لگے تھے۔ تابان کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ پھر یہ جان کر اس نے سکھ کی سانس لی کہ مقدونوی سپاہی واپس روانہ ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کشتی پھر اپنی نامعلوم منزل کی سمت روانہ ہو گئی۔ تابان واپس اپنی پناہ گاہ میں آیا۔ ابھی وہ بمشکل آ کر دراز ہی ہوا تھا کہ بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کورا نے سہم کر

تابان کا بازو تھام لیا۔ تابان نے آوازوں پر غور کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ کشتی کا مالک جو ایک فربہ اندام شخص ہے گھوم پھر کر کشتی کا جائزہ لے رہا ہے۔ یقینی بات تھی کہ مقدونوی سپاہی اسے ہوشیار کر گئے تھے۔ فربہ اندام شخص کے ساتھ ایک نحیف و نزار ملازم بھی تھا۔ وہ دونوں کونوں کھدروں میں جھانک رہے تھے۔ تابان کے پاس ہتھیار نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اگر لڑائی بھڑائی کی نوبت آتی تو اسے خالی ہاتھ ہی لڑنا تھا۔ خطرے کے احساس سے اس کے رگ پٹھے تن گئے۔

فربہ اندام شخص نے اپنے ملازم سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ذرا اچھی طرح دیکھ لو کہیں کوئی اسفنج میں ہی نہ چھپا بیٹھا ہو۔"

ملازم نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "آپ سو جائیں میں دیکھ لیتا ہوں۔"

فربہ اندام ملازم نے اسے ڈانٹا۔ "کم بخت دھیان سے۔"

ملازم جو مالک کا منہ چڑھا تھا ہنس کر بولا۔ "آقا' یہ بھی کوئی سمجھانے کی بات ہے۔ ساتھ میں خوبصورت لڑکی بھی ہے۔ میں دھیان سے نہیں دیکھوں گا تو اور کون دیکھے گا۔"

مالک واپس چلا گیا تو دبلے پتلے ملازم نے زوردار جمائیاں لیں پھر مشعل تھامے اسفنج کے پاس آیا۔ بے دلی سے چند ٹکڑے اِدھر اُدھر کیے ایک دو جگہ تلوار چبھوئی پھر مالک پر بڑبڑاتا ہوا مستول کے قریب جا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد تابان اور کورا اس کے خراٹے سن رہے تھے۔

وہ رات تابان اور کورا نے سفر میں گزاری۔ نصف شب کے بعد کشتی کھلے سمندر میں داخل ہو کر مغربی سمت بڑھنے لگی۔ اس سے تابان کو اندازہ ہوا کہ کشتی ران مغربی ساحل کا رُخ کر رہے ہیں۔ کھلے سمندر میں بھی دو تین جگہ کشتی روک کر کشتی رانوں سے پوچھ گچھ کی گئی۔ ان واقعات سے تابان کے علم میں آیا کہ جزیرے کی چہار جانب زبردست نگرانی ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس کڑی نگرانی کا تعلق بھی تابان اور کورا کے فرار سے ہو۔ سردار شلال کے لیے تابان و کورا کو پکڑنا موت وحیات کا سوال تھا۔

مشرق سے سپیدہء سحر نمودار ہو رہا تھا۔ جب کشتی رانوں کی آوازوں سے تابان نے اندازہ لگایا کہ وہ ساحل تک پہنچنے والے ہیں۔ چپواب دھیمی رفتار سے چل رہے تھے اور کشتی کے دو بڑے بادبان بھی گرا دیئے گئے تھے۔ ارد گرد دوسری کشتیوں کے ملاحوں اور ماہی گیروں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ کسی کھاڑی میں داخل ہونے والے تھے۔ یکایک کشتی رک گئی۔ تابان نے خود کو خشک اسفنج کے ڈھیر میں سے نکالا اور گردن لمبی کر کے قریب وجوار میں دیکھا۔ یکایک اسے خطرے کا احساس ہوا۔ کھاڑی ابھی کافی دور تھی لیکن کشتی کو روک لیا گیا تھا اور یہاں رکی ہوئی یہ کوئی اکیلی کشتی نہیں تھی۔ چھوٹی بڑی کم از کم بیس کشتیاں اور دو بجرے تھے جنہیں روک کر ان کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ ہر کشتی اور بجرے پر سرخ وردیوں والے مقدونوی سپاہی چڑھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں اور عریاں تلواریں چمک رہی تھیں۔ تابان کی نگاہ ساحل کی طرف اٹھی تو ایک اور نظارہ اسے حیران کرنے کے

لیے موجود تھا۔ ویران ساحل پر روشنیوں کا جھمگٹا تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ ایک جھلملاتا سمندر تابان کے سامنے تھا۔ جلد ہی وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ سالارِ اعظم کی عظیم الشان فوج کا پڑاؤ اس کے مقابل ہے۔ سالارِ اعظم سکندر کی قربت نے اس کے جسم کو ایک عجیب ولولے سے بھر دیا۔ اس نے ان روشنیوں کو نگاہوں سے بوسہ دیا کیونکہ ان میں سکندر تھا، اور جہاں سکندر تھا وہاں مارشا بھی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مارشا جو اس کی زندگی تھی اور مقصدِ زندگی بھی۔ اپنے قرب وجوار کے خطرات سے بے نیاز ہو کر اس نے اپنا کشادہ سینہ پھیلایا اور سانس اندر کی طرف کھینچا۔ جیسے بادِ صبا میں تیرتی ہوئی زلفِ یار کی مہک کو اپنے ہر ذرہ بدن میں جذب کرنا چاہتا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دفعتاً کشتی کا فرش وزنی جوتوں کی صدا سے لرز اٹھا۔ تابان نے چونک کر دیکھا، درجنوں مقدونوی سپاہی تلواریں اور نیزے سونتے کشتی پر چڑھ آئے تھے اور تلاشی شروع کر دی تھی۔ ایک کماندار کی بھاری بھرکم آواز تابان کی سماعت سے ٹکرائی۔

اسفنج اٹھا کر اگلے حصے میں پھینک دو۔ اچھی طرح تلاش کرو ہر کونے میں۔ کئی سپاہی اسفنج کے ڈھیر کی طرف آئے اور بڑے بڑے ٹکڑے اٹھا کر نیچے پھینکنے لگے۔ اب یہاں چھپے رہنا موت کو دیکھ کر آنکھیں بند کرنے کے مترادف تھا۔ تابان نے کورا کے کان میں سرگوشی کی۔ "تیر سکو گی؟" کورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ تابان اور وہ اسفنج کے ڈھیر سے نکلے نیچے سمندر کے ہلکورے لیتے پانی پر نگاہ ڈالی۔ سانس اندر کی طرف کھینچا اور دو قدم بھاگ کر

چھلانگ لگادی۔ وہ دونوں چھپاکے سے پانی میں گرے اور نیچے اترتے چلے گئے۔ چند ہی لمحے بعد وہ پھر سطحِ آب پر تھے۔ کشتی پر شور وغل سنائی دے رہا تھا۔ یقیناً سپاہی جان چکے تھے کہ کوئی کشتی سے کودا ہے۔ وہ نیزے لہرا لہرا کر پانی کی طرف اشارہ کر رہے تھے اور چلا رہے تھے۔ پھر تابان نے کئی افراد کو کشتی سے سمندر میں کودتے دیکھا۔

تابان اور کورا کا تعاقب شروع ہو گیا تھا۔ تابان نے ہانپتی ہوئی سرگوشی کی۔ "جلدی کرو کورا"۔ کورا پہلے ہی مقدور بھر طاقت سے تیر رہی تھی۔ یہ زندگی اور موت کی دوڑ تھی۔ تابان کو ساحل کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں اور عقب میں موت کے ہرکارے تھے۔ وہ ایک دو نہیں بیسیوں تھے۔ ان کے للکارے تابان اور کورا کو صاف سنائی دے رہے تھے۔

"شاباش کورا تیز ہاتھ چلاؤ۔" تابان بار بار کورا کو اکسا رہا تھا۔ آخر ان کے ہاتھوں نے ساحل کی ریت چھوئی اور وہ پانی سے نکل کر پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے روشنیوں کے بیکراں شہر میں داخل ہو گئے۔ یہ سینکڑوں ہزاروں خیمے اور سائبان تھے جن کے ارد گرد مشعلیں بھڑک رہی تھیں اور سواری کے جانور بندھے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں خوابیدہ پہریدار بھی گشت پر نظر آ رہے تھے۔ بے شمار پرچموں کے درمیان تابان کی نگاہ اس بلند و بالا پرچم پر جمی تھی جو شاہی خیمہ گاہ کی نشاندہی کر رہا تھا۔ تابان اس پرچم کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ جہاں یہ

پرچم تھا وہیں پر شاہ سکندر تھا۔ حسنِ اتفاق سے یہ پرچم زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ تابان اور کورا کوشش کرتے تو وہاں تک پہنچ سکتے تھے۔

"تیز بھاگو کورا!" تابان نے اس کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے مڑ کر دیکھا کہ خیموں کی ایک قطار کے عقب سے ہانپتے ہوئے مسلح سپاہی برآمد ہوئے۔ وہ ان کے پیچھے آ رہے تھے۔ سامنے سے پہریدار انہیں گھیرنے کی کوشش میں تھے۔ تابان پہریداروں کو چکمہ دے کر ایک بغلی راستے پر مڑ گیا۔ چالیس پچاس قدم بھاگنے کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے شاہی خیمہ گاہ کے زرتار خیمے صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ منزل دو ہاتھ پر تھی مگر اب شاہی دستے کے محافظوں نے انہیں گھیر لیا۔ ان کے چمکتے دمکتے نیزوں کے حصار میں آ کر تابان نے اضطراب کی بجائے اطمینان محسوس کیا۔ وہ شاہی محافظوں کی وردیاں پہچان چکا تھا۔ اب اسے یقین تھا کہ سکندر کے علم میں لائے بغیر انہیں موت کے گھاٹ نہیں اتارا جائے گا۔

"کون ہو تم؟" ایک چاق و چوبند شاہی محافظ نے گرج کر پوچھا۔

"میرا نام تابان ہے میں اپنی آمد کا مقصد سالارِ اعظم کو بتاؤں گا۔"

شاہی محافظ اب غور سے تابان کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ اسے کسی حد تک پہچان گیا تھا۔ اس دوران متعاقب سپاہی آندھی کی رفتار سے بھاگتے موقع پر پہنچ گئے

تھے۔ انہیں دیوانہ وار تابان اور کورا کی طرف لپکتے دیکھ کر شاہی محافظوں نے نیزے تان کر دونوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

منظر سالارِ اعظم سکندر کے خیمے کا تھا۔ یہ وسیع و عریض خیمہ کئی حصوں میں منقسم تھا۔ کشادہ نشست گاہ میں دبیز قالین بچھے تھے اور دیواروں سے ریشم و کمخواب کے تھان جھول رہے تھے، خیموں کے بانسوں پر منقش طلائی خول ماحول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے۔ سکندر روئی کا کوٹ پہنے مسند پر جلوہ افروز تھا۔ اس کے عقب میں مسلح محافظ تھے اور اطراف میں حسین و جمیل خادمائیں مؤدب کھڑی تھیں۔ تابان اور کورا کو سکندر کے سامنے پیش کیا گیا۔ تابان کو دیکھ کر سکندر جہاں حیران نظر آرہا تھا وہاں قدرے برہم بھی تھا۔

"تو تم ابھی زندہ ہو؟" اس نے تابان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ سکندر کے اس انداز نے تابان کے جسم میں خفیف جھرجھری پیدا کر دی۔ تاہم جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔ جہاں پناہ میرے نصیب میں ابھی آپ کی قدم بوسی باقی تھی۔"

سکندر نے بے رحمی سے کہا۔ "ہم تمہاری خوش کلامی سے متاثر ہونے والے نہیں تمہاری اصلیت تمہارے دوستوں نے عیاں کر دی ہے۔ اب بہتر تھا تم یہاں نہ آتے اور اپنے لیے کوئی آسان موت منتخب کرتے۔"

"جہاں پناہ! غلام جسارت کی معافی چاہتا ہے۔ جنہیں آپ دوست فرما رہے ہیں وہ میرے بد ترین دشمن ہیں۔ وہ میرے لہو کے پیاسے ہیں ہر جگہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر مجھے آپ کے قدموں میں پناہ نہ ملتی تو اب تک میری لاش آبی جانوروں کا رزق بن چکی ہوتی۔"

سکندر دھاڑا۔ "کیا ہذیان بک رہے ہو تم۔ جن کے خلاف ہرزہ سرائی کر رہے ہو وہ میری فوج کے باعزت عہدیدار ہیں۔ کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ان سرداروں نے تمہارے حوالے سے کوئی جھوٹ بولا ہے؟"

تابان نے کہا۔ "جہاں پناہ میں یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں جبکہ مجھے معلوم ہی نہیں انہوں نے میرے بارے میں آپ کو کیا بتایا ہے۔"

"وہ سب کچھ بتایا گیا ہے جو تم نے کیا ہے۔ تم نے اہم عسکری رازوں کا سودا کیا ہے اور جب تمہاری غداری کا پول کھلا اور سردار شلال نے تمہیں گرفتار کر کے واپس مقدونیہ لانا چاہا تو تم نے انجام سے بچنے کے لیے زہر کھا لیا۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا یہ غلط ہے؟"

تابان نے بڑے تحمل اور حوصلہ مندی سے یہ سب کچھ سنا پھر نہایت عاجزی کے ساتھ گویا ہوا۔ "میں جانتا تھا جہاں پناہ میرے بدخواہوں نے کوئی ایسی ہی کہانی آپ کے گوش گزار کی ہو گی۔ میں اس کے سوا اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ جو کچھ آپ کو بتایا گیا درست نہیں تھا۔"

سکندر کی عقابی نگاہیں تابان کی آنکھوں میں پیوست تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے مخصوص انداز میں تالی بجائی۔ یہ حاضرین کے لیے اشارہ تھا کہ شاہِ مقدونیہ تخلیہ چاہتا تھا۔ ایک ترتیب کے ساتھ تمام افراد خیمے سے باہر نکل گئے۔ اب صرف دو گونگے بہرے محافظ سکندر کے عقب میں کھڑے تھے یا ایک پہریدار خیمے کے دروازے پر تھا۔ کورا اور تابان شاہِ مقدونیہ کے قدموں میں دوزانو بیٹھ گئے۔ سکندر نے بارعب آواز میں کہا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

تابان بولا۔ "شاہِ مقدونیہ! دیوتا آپ کا اقبال بلند کریں۔ غلام کی جان آپ کے قدموں پر نچھاور ہے۔ میں جان بچانے کے لیے نہیں صرف حقیقت حال واضح کرنے کے لیے زبان کھول رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میری زندگی زہر خورانی کے سبب خطرے میں ضرور پڑی تھی لیکن مجھے یہ زہر کھلایا گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور کھلانے والے سردار شلال، گونسل اور نورین تھے انہوں نے مجھ سے وہ دستاویزات چھیننے کے لیے ایسا کیا تھا جو میں نے جزیرہ ساموتھریس سے حاصل کی تھیں۔"

سکندر کی آنکھ میں حیرت اور بے یقینی کے آثار نظر آئے۔ وہ بولا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ وہ نوشتہ جات تم نے تن تنہا حاصل کیے تھے۔"

"جی ہاں عالم پناہ! آپ میرے بیان کی تصدیق فرما سکتے ہیں۔ جزیرہ سکوپے لاس کا فرمانروا ایک غیر جانبدار شخص تھا۔ وہ آپ کو حقائق سے آگاہ کر سکتا ہے۔ وہ سردار شلال کی عداوت مول لینا نہیں چاہتا تھا اس لیے بہت کچھ جانتے بوجھتے بھی خاموش رہنے پر مجبور تھا۔"

سکندر نے کہا۔ "اگر تمہاری بات مان لی جائے تو تم یہ بتانا پسند کرو گے کہ وہ نوشتہ جات تمہیں کہاں سے ملے؟"

تابان نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اس شخص سے جو عالی مرتبت شاہ فیلقوس کے دور میں تحقیقات کی غرض سے مشرقی سواحل کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ میری مراد زرناب سے ہے۔ میں ایجیئن کے ایک جزیرے میں اس کا کھوج لگانے میں کامیاب رہا تھا۔"

"اب وہ شخص کہاں ہے؟"

"میرے ہاتھوں ہلاک ہو کر سمندر کی نذر ہوا تھا۔"

"بہت خوب، عجیب بات ہے کہ ایک ہی شخص دو طرح سے ہلاک ہوا ہے۔ تم کہہ رہے ہو کہ وہ ڈوب گیا جبکہ سردار شلال اور نورین وغیرہ کا کہنا ہے کہ ایک لڑائی کے بعد وہ ڈر کر بھاگا اور جنگلی کتے اسے نوچ کر کھا گئے۔ بہر طور تمہاری بات غور طلب ہے۔"

سکندر کی کشادہ پیشانی پر تفکر کی لکیریں تھیں۔ شاید وہ سچائی تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ زرناب کے بارے میں تابان اور شلال دونوں نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔ شلال نے تو اس لیے جھوٹ بولا تھا کہ اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ جبکہ تابان نے اپنے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ وعدہ جو اس نے دو پیار کرنے والوں اور ان کے معصوم بچے سے کیا تھا۔ اچانک سکندر کے ذہن میں کوئی خیال ابھرا۔ اس نے پوچھا۔

"اس ایرانی سوداگر کا کیا ماجرا ہے جو تمہارا دوست تھا؟"

تابان نے کہا۔ "سالارِ اعظم وہ سوداگر در حقیقت ایتھنز کا ہی ایک غلام ہے۔ اس کا نام ہوشمند ہے۔ آپ تصدیق فرما سکتے ہیں کہ چند ماہ پہلے تک وہ میرے ساتھ ہی ایک شاہی گھرانے کی تحویل میں تھا۔ بیس برس سے وہ ایران گیا ہے اور نہ وہاں کے کسی فرد سے اس کا تعلق ہے۔"

سکندر اب تابان کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے ان دونوں کو ہدایت کی کہ وہ قالین سے اٹھ کر سامنے نشست پر بیٹھیں۔ تابان اور کورا شکریہ ادا کر کے نشست پر بیٹھ گئے۔ سکندر نے کورا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہمارا خیال ہے یہ وہی کنیز ہے جو ہم نے پہلی ملاقات میں تمہیں سونپی تھی۔"

تابان نے اقرار میں سر ہلایا۔ "جی ہاں عالم پناہ اس کنیز کی روئیداد بھی آپ کی توجہ چاہتی ہے۔"

سکندر سوالیہ نگاہوں سے کورا کی جانب دیکھنے لگا۔ کورا نے سہمی نظروں سے پہلے تابان کی سمت دیکھا پھر سکندر کے پُر جلال چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر اپنی بپتا سنانے لگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے مختصر الفاظ میں رک رک کر بتایا کہ کس طرح لوٹ مار کے دوران سردار شلال اس کے ہاتھوں زخمی ہو کر ہمیشہ کے لیے اس کے خون کا پیاسا ہو چکا ہے۔ اس نے سردار شلال کے ہاتھوں اپنے اغوا کا ذکر کیا اور سمندری سفر کے دوران شلال اور اس کے ساتھیوں کی دست درازی کا واقعہ سنایا۔ ہاون کے قید خانے سے لے کر سکوپے لاس کے شاہی محل تک پہنچنے اور پھر تابان کی گمشدگی تک سارے واقعات اس نے اختصار سے بیان کر دیئے۔ بار بار اس کی انکھیں بھیگ جاتی تھیں اور وہ اپنے دہلتے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری سانسیں لینے لگتی تھی۔ اس کا لہجہ چیخ چیخ کر سچائیوں کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ایک فریاد تھی جو براہِ راست دل پر اثر کر رہی تھی۔ کورا کی روئیداد ختم ہوئی تو وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ یہ آنسو غم کا نذرانہ تھے اور اس خوف کا نتیجہ بھی جو بادشاہ وقت کے سامنے زبان کھولنے کے سبب کورا کے حواس پر چھا رہا تھا۔ وہ ان ہچکیوں کو جس قدر روکنے کی کوشش کرتی تھی وہ اتنی ہی بلند ہو رہی تھیں۔ آخر کورا کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلیں اور وہ نازک اندام بے ہوش ہو کر سکندر کے قدموں میں جا گری۔

گونگے بہرے محافظ لپک کر آئے۔ انہوں نے کورا کو سہارا دے کر قالین سے اٹھایا اور بازوؤں میں سنبھال کر خیمے سے باہر لے گئے۔ اب خیمے میں مکمل سکوت تھا۔ سکندر سنگی مجسمے کی طرح بے حرکت بیٹھا تھا۔ تابان بھی خاموش تھا۔ دروازے پر کھڑا پہریدار بھی ساکت و جامد تھا۔ ایسی خاموشی تھی کہ دھڑکنوں کی صدا بھی سنائی دے رہی تھی۔ دفعتاً یہ سکوت ٹوٹ گیا۔ سکندر نے اپنے سڈول برہنہ بازو اٹھا کر تالی بجائی۔ چاق و چوبند محافظ تیزی سے اندر آئے اور تعظیم پیش کر کے ساکت کھڑے ہو گئے۔ سکندر نے رعب دار آواز میں حکم صادر کیا۔

"سردار شلال، سردار گونسل اور کمان دار نورین کو حاضر کیا جائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس کے علاوہ جزیرے سکوپے لاس کے فرمانروا کو رازداری کے ساتھ یہاں لانے کا انتظام کیا جائے۔"

ہوشیار محافظ سکندر کے دو جملوں سے اس کا پورا مدعا جان گئے۔ انہوں نے آبدار تلواروں کے بیش قیمت قبضوں پر ہاتھ رکھ کر سر جھکائے اور تن کر کھڑے ہو گئے۔ سکندر نے تابان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسرا حکم صادر کیا۔

"ان دونوں کو پڑاؤ میں پہنچا دیا جائے۔ یاد رہے یہ ہماری حفاظت میں ہیں۔ انہیں نقصان نہیں پہنچنا چاہیئے۔"

محافظوں نے ایک بار پھر سر جھکا کر سعادت مندی کا اظہار کیا۔ تابان اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور محافظ اسے لے کر خیمے سے باہر آ گئے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلا دن یونان کی تاریخ کا بے حد ہنگامہ خیز دن تھا۔ اس دن فیلقوس کے بیٹے سکندر نے جو آئندہ دنوں میں سکندرِ اعظم کا لقب اختیار کر کے چہار دانگ دہر شہرت پانے والا تھا۔ آبنائے دانیال کو پار کیا اور ایشیائی سرزمین پر قدم رکھا۔ وہ ایک چمکیلا دن تھا۔ مطلع صاف تھا۔ بادِ شمال نے آبنائے کی ابھری ہوئی موجوں میں ایک گوناں سکون پیدا کر رکھا تھا۔ نقارچیوں نے لشکر میں اعلان کیا کہ آج سمندر عبور کر کے مشرقی ساحل پر پیش قدمی کی جائے گی۔ افواج میں جوش و خروش کی ایک تند لہر ابھری۔ سینے شوق سے بھر گئے اور نگاہیں بے قرار ہو گئیں۔ سکندر کی ہدایات پر چھوٹی چھوٹی ماہی گیر کشتیوں اور تجارتی جہازوں کے بیڑے نے دانیال کی انتڑی سے فوج کو ایشیائی ساحل پر پہنچانے کا کام شروع کیا۔

تابان اور کورا بھی ایک ایسی ہی کشتی میں سوار روانہ ہوئے۔ راستے بھر مقدونوی سپاہی ترانے الاپتے رہے اور ہومر کی شہرہ آفاق نظم ایلیڈ کے شعر پڑھتے رہے آخر دور سے ایشیائی ساحل کی سرخی مائل زمین نظر آنے لگی اور "ٹرائے" کی تاریخی پہاڑی بھی دکھائی دینے لگی۔ یہی پہاڑی تھی جہاں سکندر کے آباؤاجداد نے بے مثال جنگی کارنامے انجام دیئے تھے۔ اس پہاڑی کے پیچھے سلسلہ کوہ کے مناظر تھے۔ یہ سلسلہ ریڑھ کی ہڈی کی مانند دور تک پھیلا ہوا

تھا۔ عسکری دستوں نے کشتی سے اتر کر ایشیائی ساحل پر قدم رکھا تو ان کے چہرے جوش سے تمتما رہے تھے۔ سب نے مل کر زندہ باد، مبارک اور سلامت باشد کے نعرے لگائے۔ راستے میں کہیں ایرانی جہاز یا جنگی کشتیاں نظر نہیں آئیں۔ ایک طرح سے یہ نیک شگون تھا کہ مقدونوی فوج بغیر کسی مزاحمت کے ساحل پر پہنچ رہی تھی اور پھر سالارِ اعظم سکندر بھی آبنائے پار کر آیا۔ اس نے زرہ بکتر پہن رکھی تھی۔ سر پر آہنی خود تھا جو سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس پر سفید پر لہرا رہے تھے۔ جب اس نے کشتی سے کود کر ایشیائی ساحل پر قدم رکھا تو ایک جوشیلے سپاہی نے آگے بڑھ کر عشق پیچاں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا۔ سکندر کے پہنچنے کے پیشتر ہی مقدونی سپاہی سینکڑوں کی تعداد میں سنگِ مرمر کے ٹکڑے جمع کر چکے تھے۔ ان چھوٹے بڑے ٹکڑوں کو ملا کر سب سے بڑے دیوتا زیوس کے لیے قربان گاہ بنائی گئی۔ یہ دیوتا مسافروں کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔ ایک قربان گاہ ایتھینا دیوی کے لیے بھی بنائی گئی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ان اہلِ ایتھنز کی حوصلہ افزائی کی جائے جو اس مہم میں ساتھ دے رہے ہیں یا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دونوں قربان گاہوں پر سنہری پیالے سے شراب لنڈھائی گئی پھر یہ عظیم لشکر ایک ترتیب کے ساتھ آگے بڑھا اور ٹرائے پہنچ گیا۔ ٹرائے شہر کی فصیل خستہ حال تھی اور برج گردشِ روزگار سے گر چکے تھے۔ ٹرائے کی پہاڑی کے گرد بہت سے کھنڈر تھے۔ مقدونوی سپاہی ان کھنڈروں میں گھوم پھر کر پرانی یادگاریں دیکھنے لگے۔ پہاڑی کے ارد گرد رہنے والے لوگ جو زیادہ تر ماہی گیر اور تاجر تھے

اس لشکر کی آمد پر بے حد حیران تھے۔ وہ سب سکندر کے گرد جمع ہو گئے اور بڑی سادگی سے مقامی حالات بیان کرنے لگے۔

تابان سکندر کے قریب ہی موجود تھا۔ اسے مقامی لوگوں کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی نہ ہی اس کے لئے ان کھنڈرات میں کوئی کشش تھی۔ اس کی نگاہیں مسلسل سردار شلال کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ ہی گونسل یا نورین نظر آتے تھے۔ سکندر حالانکہ کورا اور تابان کو اپنی امان میں لے چکا تھا پھر بھی تابان کو عیار شلال کی جانب سے خطرہ تھا۔ شلال دل کا بھی اتنا ہی بھیانک تھا جتنا اس کا چہرہ بھیانک ہو چکا تھا۔ وہ کسی لمحے کسی بھی جگہ کورا پر قیامت بن کر ٹوٹ سکتا تھا۔ تابان نے اس کی آنکھوں میں کورا کے لیے ہمیشہ ایک وحشیانہ درندگی دیکھی تھی۔ وہ جانتا تھا شلال کو جس روز اس درندگی کے اظہار کا موقع مل گیا کورا ایک زندگی میں سینکڑوں موتوں کا صدمہ جھیلنے پر مجبور ہو جائے گی۔ کورا مسلسل تابان کے بازو سے لگی ہوئی تھی۔ جیسے وہ ایک دوشیزہ نہ ہو کمسن بچی ہو جسے پُر ہجوم میلے میں اپنے سرپرست سے بچھڑنے کا اندیشہ ہو۔ تابان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی شلال وغیرہ کہاں ہیں۔ اس نے قریب سے گزرتے ایک یک صدی سردار کو روک کر اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ سالارِ اعظم نے انہیں کسی مہم پر روانہ کیا ہو گا۔ تابان کو دوسری پریشانی ہوشمند کے سلسلے میں تھی۔ وہ جزیرہ سکوپے لاس ہی میں رہ گیا تھا۔ سکوپے لاس سے تابان و کورا کو اتنی جلدی نکلنا پڑا تھا کہ وہ

ہوشمند کی عیادت کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اسے دوبارہ دیکھنے کی حسرت تابان کے دل ہی میں رہ گئی تھی۔

یکا یک ایک جانب سے شور بلند ہوا۔ پتہ چلا کہ کھنڈرات میں قدیم یونانی سورماؤں ایکے لیز اور پٹیر وکلوس کی قبریں موجود ہیں۔ ان قبروں کا سراغ بھی مقامی لوگوں نے دیا تھا۔ تابان نے سکندر کو تیزی سے ان قبروں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس دریافت پر وہ بے حد حیران نظر آتا تھا۔ گھنے درختوں کے نیچے پہنچ کر وہ گہری دلچسپی اور عقیدت سے پتھروں کی ان ڈھیریوں کو دیکھتا رہا۔ اس نے مقامی لوگوں سے ان قبروں کے بارے میں مختلف سوالات پوچھے۔ اب شام ہو چکی تھی ان قبروں کے ارد گرد مشعلیں گاڑی گئیں اور جشن کا اہتمام کیا گیا۔ اظہارِ عقیدت کے لیے فوج کے ممتاز سرداروں نے اس جگہ بیٹھ کر شراب پی اور مغنیوں نے منظوم تاریخی قصے گا کر بیان کئے۔ جب نشہ تیز ہو گیا تو بعض سرداروں نے اپنے سروں پر پھول سجائے اور رقص کرنے لگے۔ سالارِ اعظم سکندر بھی ان میں شامل تھا۔ وہ بانسری بجا بجا کر والہانہ ناچ رہا تھا۔ اتنے میں گیروا لبادے پہنے کچھ پجاری سکندر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی آمد پر رقص تھم گیا اور سب سردار پجاریوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پجاریوں نے سکندر کو ایک سیاہ ڈھال اور ایک ٹوٹا ہوا بربط پیش کیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں پاس ہی ایک قدیم معبد ہے یہ دونوں اشیاء عرصہ دراز سے وہاں محفوظ ہیں اور ان کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ یونانی بہادر ایکے لیز کی ہیں۔ سکندر اور

اس کے سرداروں نے ان اشیاء کو بہت غور سے دیکھا پھر ان کے چہروں پر عقیدت نمودار ہوئی۔ وہ تادیر ان اشیاء میں کھوئے رہے۔ تب سکندر نے سیاہ ڈھال نیک شگون کے طور پر اپنے پاس رکھ لی اور اس کی جگہ اپنی ڈھال پجاریوں کو دے دی تاکہ معبد میں رکھ دی جائے۔ اس کے علاوہ پجاریوں کو انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا۔

تابان اور کورا عام لشکریوں کے ہجوم میں کھڑے یہ سارے مناظر دیکھ رہے تھے۔ اس دوران چند ہانپتے ہوئے گھڑ سوار ہجوم میں سے راستہ بناتے مرکز کی جانب آتے دکھائی دیئے سکندر کے قریب پہنچ کر وہ گھوڑوں سے اترے اور جھک کر تعظیم پیش کی۔ یہ سب کے سب مقامی دہقان نظر آتے تھے۔ داڑھیاں بڑھی ہوئی لباس بوسیدہ اور پاؤں ننگے۔ تابان سمیت بہت سے لوگوں کو حیرانی ہوئی کہ یہ بے حیثیت لوگ دندناتے ہوئے سالارِ اعظم تک کیونکر پہنچ گئے ہیں لیکن جلد ہی یہ حیرت دور ہو گئی۔ یہ لوگ دہقانوں کے بھیس میں مقدونوی فوج کے جاسوس تھے۔ ان کے چہروں پر ہیجانی کیفیت تھی۔ انہوں نے سکندر کو بتایا کہ مشرقی جانب سے بھاری ایشیائی فوج کوچ کرتی چلی آ رہی ہے۔

یہ اطلاع بے حد سرعت سے لشکر کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ تاہم کسی ایک شخص کے چہرے پر بھی تشویش کے آثار نظر نہیں آئے۔ آخر یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔ وہ لڑنے کے لئے آئے تھے۔ دشمن کی سرزمین پر پیش قدمی کر رہے تھے۔ جلد یا بدیر دشمن نے اپنی موجودگی کا ثبوت تو دینا ہی تھا۔ رات کا باقی حصہ لڑائی کی تیاری میں کٹا۔ جاسوس لمحہ بہ لمحہ

سالارِ اعظم کو دشمن کی نقل و حرکت سے آگاہ کرتے رہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابان نے کورا کو ان خیموں میں پہنچا دیا جو لشکر کے عقب میں عورتوں کے لیے مخصوص تھے۔ جب تابان کورا کو الوداع کہہ رہا تھا اس کی آنکھوں میں خوف آنسو بن کر لرز رہا تھا۔ تابان نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں کورا، تم شاہِ مقدونیہ کی پناہ گاہ میں ہو، تمہارا بال بیکا نہیں ہو گا۔"

کورا نے کہا۔ "آپ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میرا مطلب ہے تم لوٹ آؤ گے ناں؟"

تابان مسکرایا۔ "تم انتظار کرو گی تو ضرور لوٹ آؤں گا۔"

کورا بولی۔ "میرا دل چاہتا ہے میں کل میدانِ جنگ میں تمہارے ساتھ رہوں۔"

"اور میں تمہاری حفاظت کرتا ہوا اپنے سر سے سبکدوش ہو جاؤں۔" تابان نے اس کی بات مکمل کی۔

کورا نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔ "دیوتا رحم کریں۔ ایسی بات مت کہو۔"

تابان نے ایک حوصلہ بخش مسکراہٹ کورا کی طرف اچھالی اور اس سے رخصت ہو کر واپس لشکر کی طرف چل دیا۔ اس کا رُخ ان گھڑ سوار دستوں کی طرف تھا جو پہاڑی کے دامن میں جنگی مشقیں کر رہے تھے۔ ان مشقوں کو دیکھ کر ایک عجیب ولولہ تابان کی رگوں میں بھرتا جا رہا تھا۔ زندگی اور موت کا کھیل اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ خطرات میں گھِر جانا اس کے لیے ایسے ہی فرحت بخش تھا جیسے مچھلی کا خشکی سے پانی میں گر پڑنا۔

علی الصبح سکندر کو اطلاع ملی کہ ایرانیوں کا لشکر مقابل پہنچ گیا ہے۔ اپنے تجربہ کار سالار پار مینو کے مشورے سے سکندر نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا اور دونوں حصوں کو منظّم طریقے سے دریائے "گرینی کس" کی جانب بڑھایا۔ تابان فوج کے جس حصے میں تھا وہ سکندر کی زیرِ قیادت آگے بڑھ رہا تھا۔ دوسرا حصہ پار مینو کی کمان میں تھا۔ دور چڑھتے سورج کی کرنوں میں ایڈا پہاڑ اور ایشیائی اولمپس کی سفید چوٹیاں روشن میناروں کی طرح دمک رہی تھیں۔ عقب میں آبنائے کا نیلگوں پانی تھا اور سامنے جوش و خروش سے بہتا دریائے گرینی کس۔ جب مقدونوی فوج دریا کے کنارے پہنچی تو اسے پہلی مرتبہ اپنے دشمن کی جھلک نصیب ہوئی۔ دریا کے اس پار ایشیائی دستوں کا ہجوم تھا۔ ان کے لباس مقدونوی سپاہیوں سے مختلف اور عجیب وضع کے تھے تاہم ان کے گھوڑے نہایت صحت مند تھے اور گھڑ سوار چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے دریا کے ساتھ ساتھ دوڑیں لگا رہے تھے۔ سواروں نے کھلے لبادے پہن رکھے تھے۔ ان کی ٹوپیاں رنگین تھیں چھوٹی چھوٹی ڈھالیں اور کوتاہ قیامت برچھیاں ان کے کولہوں سے لٹک رہی تھیں۔ مقدونوی سپاہ کو دیکھ کر ایشیائی سپاہی جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے لگے اور کچھ دستے نعرہ زنی کرتے عین دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں طرف کے سپاہیوں میں زبانی چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ ایشیائی سپاہی زیادہ شوخی دکھا رہے تھے وہ مقدونوی سپاہیوں پر آوازیں کس رہے تھے اور انہیں عجیب و غریب ناموں سے پکار رہے تھے۔ کسی نے پکار کر کہا۔

"اویونانیو! تمہیں کس نے معاوضہ دے کر یہاں مرنے کے لئے بھیج دیا ہے۔ کون ہے تمہاری جانوں کا دشمن، ذرا اس کا نام تو بتاؤ۔"

کسی من چلے نے ہانک لگائی۔ "کیا تم عورتیں ہو جو تم نے گھاگھرے پہن رکھے ہیں۔" جو زیادہ بلند آواز میں نہیں بول سکتے تھے۔ وہ مضحکہ خیز اشاروں سے مقدونوی سپاہیوں کو تاؤ دلانے میں مصروف ہو گئے۔ سکندر کا جوان خون کھول گیا۔ اسے مقابل فوج کا یہ عامیانہ انداز بالکل پسند نہیں آیا۔ یوں بھی وہ ہمیشہ سے آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے کا عادی تھا اور دشمنی کی دعوت کا بروقت جواب نہ دینا اس کی شان کے خلاف تھا۔ وہ ایک ٹیلے پر چڑھ گیا اور باآواز بلند سپاہیوں کو پکار کر بولا۔

"ساتھیو، اپنے ہتھیار تول لو، ہم دریا پار کر کے حملہ کریں گے۔۔۔۔۔۔۔۔"

تابان نے دیکھا سکندر کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا ہے۔ ابھی تقریر کا اگلا جملہ سکندر کے ہونٹوں تک نہیں پہنچا تھا کہ بوڑھا سالار پارمینو آگے بڑھا اور اس کے قریب جھک کر سرگوشیاں کرنے لگا۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سکندر سے اختلاف کر رہا ہے اور ہمیشہ کی طرح اس کا مشورہ یہی ہے کہ جوش کی بجائے ہوش سے کام لیا جائے اور ابھی دریا پار کرنے کی بجائے بہتر وقت کا انتظار کیا جائے۔ سکندر بار بار نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ رہ رہ کر اس کی نگاہیں ایشیائی دستوں کی طرف اٹھ جاتی تھیں جو مسلسل نعرہ زنی کر رہے تھے۔ آخر پارمینو سر جھکا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے سرد دلائل، شعلہ فشاں نوجوان کو قائل نہیں کر سکتے

تھے۔ سکندر نے اپنی تقریر دوبارہ شروع کی۔ اس مختصر لیکن نہایت ولولہ انگیز خطاب کا خلاصہ یہی تھا کہ تاریخی دشمن سامنے ہے، اس پر تاریخی یلغار کرو اور پہلی ضرب ہی ایسی لگاؤ کہ سرِزمین ایران کے اس سرے سے آخری سرے تک ہر شے تھرا اٹھے۔

سکندر کے الفاظ نے لشکر میں برقی لہریں دوڑا دیں۔ پرچم بلند ہوئے اور عریاں تلواریں چمکنے لگیں۔ یہ لشکر اب ایک ایسے تیر کی مثال تھا جو کمان میں کھچا رکھا تھا اور ایک جنبش سے نشانے کی طرف روانہ ہو سکتا تھا۔ سکندر نے ہراول کو حکم دیا کہ وہ فوراً دریا میں اتر پڑے اور خود گھوڑے پر سوار میمنہ میں سب سے آگے جا کھڑا ہوا۔ تابان نے دیکھا کہ ہراول کے دریا میں کودتے ہی سکندر نے بھی اپنی تلوار بلند کی اور اپنے ساتھیوں کو ابھارتا ہوا دلیرانہ دریائے گرینی کس میں کودا، بارش کے سبب دریا زوروں پر تھا۔ چند لمحوں کے لئے محسوس ہوا کہ اترنے والوں کے پاؤں اکھڑ جائیں گے مگر پھر چند ایک کے سوا سب سوار سنبھل گئے۔ سالارِ اعظم سکندر اور دیگر جانباز سرداروں کو دشمن کی جانب بڑھتا دیکھ کر تابان کی رگوں میں آتش بھر گئی اس کا جی چاہا وہ گھوڑے کو ہوا میں اڑا کر صفوں کو پار کرے اور پانی میں اتر جائے مگر نظم و ضبط اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ابھی تابان کے دستے کو دریا میں اترنے کا حکم نہیں ملا تھا۔ تابان نے بے قراری کے عالم میں دیکھا، دوسرے کنارے سے سکندر اور اس کے ساتھیوں پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ بہاؤ اتنا شدید تھا کہ نہ چاہنے کے باوجود سکندر اور اس کے جانباز بائیں رُخ پر ہٹ گئے تھے اور یوں ایرانی "قلب" کے عین سامنے آ گئے

تھے۔ یہ صورتِ حال مخدوش تھی۔ اس مقام پر بھاری ہتھیاروں والے بہترین ایرانی سوار متعین تھے۔ جونہی مقدونوی سپاہی کنارے پر پہنچے زبردست لڑائی چھڑ گئی نعرے بلند ہوئے، برچھیاں چمکیں، تلواریں کوندیں اور ہر طرف ہنگامہ محشر برپا ہو گیا۔ تابان نے کئی مقدونویوں کو زخم کھا کر دریا میں گرتے اور تیز بہاؤ میں بہتے دیکھا، پھر وہ مشکل ترین لمحات آئے جب گھمسان کی جنگ میں سالارِ اعظم بھی گر گیا۔ دشمن کے جنگجو اس پر عقابوں کی طرح جھپٹے اور مقدونوی سرفروشوں نے اپنے جسموں کو ڈھال بنا کر پیش کر دیا۔ کچھ دیر کے لئے یوں لگا کہ یہ عظیم سفر ابتداء میں ہی اپنے انجام کو پہنچ رہا ہے۔ اژدھام میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہی لمحے تھے جب کمانداروں کی طرف سے تازہ دم دستوں کو آگے بڑھنے کا حکم ملا۔ تابان کا دستہ بھی ان میں شامل تھا۔ سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے دلیرانہ پانی میں اترے اور مقامِ جنگ کی طرف بڑھنے لگے۔ تابان ان سواروں میں سب سے آگے تھا۔ کنارے کے پتھروں پر چڑھتے ہی اس نے اپنا گھوڑا اس مقام کی طرف دوڑایا جہاں سکندر کے گرد گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ کم از کم بیس گھڑ سوار تابان کے ساتھ تھے۔ یہ دستہ دیوانہ وار دشمن پر جا پڑا۔ ہتھیار ٹکرائے اور تنومند اجسام سے خون کے فوارے ابل پڑے۔ اس شدید حملے نے سکندر اور اس کے سپاہیوں پر دباؤ کم کر دیا۔ تابان نے سکندر کو زمین سے اٹھتے دیکھا۔ اس کی خود ایک طرف سے پچکی ہوئی تھی اور وہ معمولی زخمی بھی ہوا تھا۔ تاہم ایک بار سنبھلنے کے بعد وہ دشمنوں کے لئے موت بن گیا۔ وہ دلیرانہ دشمنوں میں

گھس گیا اور اس کی تلوار نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ یہ سکندر کا وہ روپ تھا جس کے لئے وہ مشہور تھا، اور اپنے پرائے اس کی اطاعت کرتے تھے۔ یہ ایک جوشیلے نوجوان کا روپ تھا جو ایک منہ زور ریلے کی طرح میدانِ جنگ میں داخل ہوتا تھا اور مقابل کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا تھا۔ ایک بار مقدونوی دستوں کے قدم جم گئے تو انہوں نے ایسا شدید حملہ کیا کہ تھوڑی ہی دیر میں مقابل فوج سینکڑوں لاشیں اور زخمی چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ اس مرحلے میں وہ کرایہ دار یونانی فوجی بھی بھاگ کھڑے ہوئے جو اب تک چٹان کی طرح جمے رہے تھے۔ اب مقدونوی فوج کے لئے میدان صاف تھا۔ بھگوڑے سپاہیوں کو گھیر گھیر کر قتل کیا گیا اور قریباً دو ہزار کرائے کے یونانی فوجی گرفتار کر لیے گئے۔ سکندر اپنے ہم نسلوں کو دیکھ کر حیران ہوا تو پار مینو نے کہا۔ "اگر آپ یونانیوں کے مقابل یونانیوں کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں تو آپ کو ایسی بہت سی حیرانیوں سے واسطہ پڑے گا، میدان میں پڑی لاشوں کی جانچ پڑتال کی گئی تو ان میں ایک لاش شہنشاہ ایران کے داماد کی تھی۔ اس کا چچا اور بہت سے ساتھی مارے گئے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات کا وقت تھا۔ گرینی کس کا خونی معرکہ انجام کو پہنچ چکا تھا۔ دریا کے مشرقی کنارے پر دور تک دشمن کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس فتح نے مقدونوی سپاہ کے حوصلے بلند کر دیئے تھے۔ سالارِ اعظم سکندر پر انہیں پہلے بھی کچھ کم بھروسہ نہیں تھا لیکن اس معرکے کے

بعد یہ اعتماد اور مضبوط ہو گیا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ درست تھی کہ سکندر دریا پار کر کے حملہ آور نہ ہوتا تو ممکن تھا دشمن کو زیادہ کٹھن حالات میں جنگ کرنا پڑتی لیکن سکندر کے فوری جواب نے جہاں موقعے پر دشمن کے دانت کھٹے کیے تھے وہاں مقدونوی سپاہ کو بھی اس مایوسی سے بچا لیا تھا جو تاخیر کی صورت میں پیدا ہوتی۔ در حقیقت سکندر نے ایک بار پھر وہی جارحانہ کردار ادا کیا تھا جو وہ اس سے پیشتر کائی ارنیا اور ایتھنز کی جنگوں میں ادا کر چکا تھا۔

دن بھر کی خونریز مشقت کے بعد تابان ایک پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا اس کے سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ ستاروں کے جھرمٹ تھے اور انجانی کہکشائیں تھیں۔ وہ اس روشن دنیا کے پیچ و خم میں کھویا ہوا تھا۔ کوئی اسے اپنی ساحرانہ جھلک دکھا کر ان پیچ و خم میں چھپ گیا تھا اور وہ اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ کبھی اس جھرمٹ میں کبھی اس کہکشاں میں کہاں ہے شہزادی، تُو کہاں ہے؟ اس کے دل سے رہ رہ کر صدا بلند ہو رہی تھی۔ "دیکھ میں تیرے لئے کہاں کہاں بھٹک رہا ہوں۔ کیسے کیسے ہنگاموں میں گھرا ہوا ہوں۔ تیری خاطر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صرف تیری خاطر میرا جو اقدام بھی اٹھتا ہے تیری راہ میں ہے کیوں میں تیرے دیدار کا حق دار نہیں ٹھہرتا۔" اس کے سینے میں آگ سی لگنے لگی۔ سکندر سے اس کی ملاقات ہوئے اب تین دن ہو چکے تھے۔ ان تین دنوں میں سکندر کو حقیقت پا لینی چاہیئے تھی۔ تابان کے بیانات کی تصدیق کے لئے یہ تین روز بہت تھے۔ اگر جزیرہ سکوپے لاس کا قائم مقام فرمانروا سکندر سے مل چکا تھا اور گواہی دے چکا تھا تو پھر سکندر کسی فیصلے پر کیوں نہیں پہنچا تھا۔ کیوں تابان کو

عزت افزائی کے لئے نہیں بلایا گیا تھا؟ کیوں اس کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا تھا اور اسے انعام و اکرام سے نہیں نوازا گیا تھا۔ وہ ہر طرح اس سلوک کا حقدار تھا۔ اگر سردار شلال، گونسل اور نورین کو جھوٹ بولنے پر اعلیٰ اعزازات اور مراتب سے نوازا جا سکتا تھا تو تابان سچ بول کر بھی سکندر کے حسنِ سلوک سے محروم کیوں تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ پھر اس نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بے وقوف تم عشق کے مارے ہوئے اور دیدار کے ترسے ہوئے ہو۔ تمہارے لئے انتظار کی ہر گھڑی صدی کے برابر ہے جبکہ سالارِ اعظم ایک مصروف شخص ہے اسے تمہارے معاملے پر غور کرنے کے علاوہ بھی کچھ کام ہیں۔ ذرا حوصلہ رکھو۔ چند ایک روز میں سالارِ اعظم کی تحقیق مکمل ہو جائے گی۔ وہ جس گھڑی معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے، اسی گھڑی تمہاری کایا پلٹ جائے گی۔ تمہیں بصد شوق شاہی خیمہ گاہ میں طلب کیا جائے گا اور حسبِ وعدہ اس انعام سے نوازا جائے گا جس کے سامنے بحر و بر کی دولتیں ہیچ ہیں اور جسے پانے کے بعد دنیا میں کچھ اور پانے کی حسرت تمہارے دل میں نہیں رہے گی۔ ذرا تصور کرو ان لمحات کا جب شہزادی مارشا کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں تھمایا جائے گا اور پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ ایک حسین بوسہ جس کے لئے تم اپنے جسم کے ایک ایک ذرے کو ایک ایک قیامت سے دوچار کر سکتے ہو۔ تابان کو محسوس ہوا کہ آسمان پر چمکنے والے سارے تارے اور ساری کہکشائیں آنکھوں کے راستے اس کے سینے میں اتر گئی ہیں اور اس کے بدن میں دور دور تک چراغاں ہو رہا ہے۔

"میں۔۔۔۔۔۔۔۔ میں معافی چاہتا ہوں سردار!" یکایک ایک آواز نے تابان کو چونکا دیا۔ تابان نے گھوم کر دیکھا۔ اس کے پاس یک صدی سردار باکوج کھڑا تھا۔ یہ وہی سردار تھا جس نے اسے گوینش کے تہہ خانے سے نکلوایا اور بعد ازاں فیلانہ سے ملوایا تھا۔ تابان اسے پہچان کر مسکرایا۔ "معافی کس بات کی سردار؟"

سردار باکوج بولا۔ "میں تم سے عام سپاہی کا سا سلوک کرتا رہا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم تابان ہو۔"

"میرے تابان ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

باکوج خوشامدی لہجے میں بولا۔ "تم کوئی معمولی سردار نہیں ہو۔ ایتھنز کی لڑائی میں تم نے تن تنہا تین سرداروں کو قتل کر کے جو حیران کن کارنامہ انجام دیا تھا وہ ہر سپاہی کے ذہن پر نقش ہو چکا ہے۔ میں ہی کیا مقدونوی فوج کا ہر فرد تمہارے نام سے واقف ہے اور تمہیں دیکھنے کا خواہشمند بھی۔ اگر میں اس وقت پکارنے لگوں کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا شخص سردار تابان ہے تو سینکڑوں سپاہی اور کماندار تمہیں دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو جائیں۔ اس وقت بھی تمہارے ارد گرد کئی نگاہیں ایسی ہیں جو چپکے چپکے تمہیں دیکھ رہی ہیں۔"

تابان نے پوچھا۔ "تم میرے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟"

باکوج بولا۔ "بہت کچھ جانتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ تمہیں سردار شلال اور گونسل کے ہمراہ ایک خفیہ مہم پر مقدونیہ سے یہاں بھیجا گیا تھا۔ بعد میں سردار شلال تو مقدونیہ پہنچ گیا لیکن

تمہارے بارے میں بتایا گیا کہ تم نے غداری کی تھی اور سزا سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی ہے۔ اب تم کسی طرح جان بچا کر یہاں پہنچے ہو اور تم نے سکندر کے سامنے دعویٰ کیا ہے کہ مطلوبہ نوشتہ جات حاصل کرنے کا سہرا تمہارے سر ہے اور سردار شلال نے تم سے وہ نوشتے چھین کر تمہیں زہر دے دیا تھا۔"

باکوج کی معلومات وسیع اور سو فیصد درست تھیں۔ تابان نے یاس انگیز سانس بھر کر کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے باکوج۔ ہم دونوں میں سے سچا کون ہے۔ شلال یا میں؟"

باکوج نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔ "اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ تم سچے ہو۔ سالارِ اعظم بھی اس سچ کو قبول کر چکے ہیں۔ یہ اور بات کہ اپنے خیالات کا اظہار انہوں نے ابھی تک نہیں کیا۔ میں تو سمجھتا ہوں سالارِ اعظم اسی وقت قائل ہو گئے جب تمہاری ساتھی لڑکی نے رو رو کر اپنی روئیداد سنائی تھی اور بے ہوش ہو کر گر گئی تھی اگر کوئی شبہ باقی بھی تھا تو وہ سکوپے لاس کے حکمران نے دور کر دیا۔ شاہِ سکندر کے ساتھ اس کی طویل گفتگو ہوئی ہے اور اس نے وہ قیدی بھی پیش کر دیا ہے جس پر تمہیں زہر دینے کا الزام ہے۔ یہ قیدی ایک گھریلو خادم ہے اور اس نے اعتراف کیا ہے کہ آج سے قریباً ایک برس پہلے اس نے سردار شلال کا آلہ کار بن کر تمہیں اور تمہارے دوست کو زہر ملا دودھ دیا تھا۔"

تابان کے سر سے جیسے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ سالارِ اعظم کو تابان کی بے گناہی اور وفاداری کے ٹھوس ثبوت مل چکے ہیں۔ اس نے باکوج سے پوچھا۔

"کیا سردار شلال اور اس کے ساتھیوں سے پوچھ گچھ ہوئی ہے؟"

باکوج کی آنکھوں میں خاصی چمک نظر آئی۔ وہ تابان کے کچھ اور نزدیک کھسک آیا اور رازداری کے لہجے میں بولا۔ "عام لوگ کہتے ہیں کہ سردار شلال، گونسل اور نورین وغیرہ کسی مہم پر بھیجے گئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ تینوں گرفتار ہو چکے ہیں اور سخت عذاب میں ہیں۔ میرا تو خیال تھا کہ تمہیں ان حالات کا علم ہو گا۔ حیرت ہے کہ تم بھی اندھیرے میں ہو۔"

تابان کے ذہن میں عجیب وسوسے جاگنے لگے۔ سالارِ اعظم نے ابھی تک اسے طلب کیوں نہیں کیا تھا۔ کیوں اسے امید و بیم میں رکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں تابان کو پہلے دن سے محسوس ہو رہا تھا سالارِ اعظم مارشا کے بارے میں جان بُوجھ کر تاخیر کر رہے ہیں اور اس سے کوئی بات چھپائی جا رہی ہے۔ ایکدم تابان بے کل سا ہو گیا۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے باکوج کے پاس سے اٹھا اور ایک طرف چل دیا۔ باکوج کچھ دیر حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر آگ کے ایک بڑے آلاؤ کی طرف بڑھ گیا۔ تابان کے ذہن میں ایک آندھی سی چلنی شروع ہو گئی تھی۔ شک کی وہ کونپل جو پچھلے ایک برس سے اس کے ذہن میں پھل پھول رہی تھی، آج ایک دم تناور درخت بن گئی تھی۔ سالارِ اعظم مارشا کے بارے میں اس سے کیا چھپا رہا ہے؟ یہ سوال ہتھوڑا بن کر اس کے ذہن پر برس رہا تھا۔ اس کی چاروں جانب پڑاؤ کا ہنگامہ تھا۔ لاشیں ٹھکانے لگائی جا رہی تھیں۔ زخمی کراہ رہے تھے، طبیب حکیم مصروفِ کار

تھے۔ تابان ان سب مصروفیات سے لاتعلق پڑاؤ کے اس حصے کی طرف بڑھتا رہا جہاں خواتین کی خیمہ گاہ تھی۔ خیمہ گاہ کے چاروں طرف سخت پہرہ تھا۔ تابان نے بڑے دروازے پر موجود پہریداروں سے اپنا تعارف کرایا اور ان سے کہا کہ کورا کو بلا دیں۔ تھوڑی دیر بعد کورا خوبصورت ریشمی لباس میں ملبوس نمودار ہوئی۔ تابان اسے لے کر خیمہ گاہ سے دور درختوں میں آ بیٹھا۔

"تم زخمی تو نہیں ہوئے؟"

"نہیں!" تابان نے مختصر جواب دیا۔ وہ جلد از جلد کورا کی زبان سے کوئی اہم بات سننا چاہتا تھا۔ کل رات اس نے کورا کو ہدایت کی تھی کہ وہ خیمہ گاہ میں شہزادی مارشا کو تلاش کرے۔ کورا چونکہ مارشا کی خاص خادمہ رہ چکی تھی اس کے لئے شہزادی کو پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ کورا تابان کی سوالیہ نگاہوں میں کوندتی ہوئی بے تابی پڑھ چکی تھی۔ اس نے اپنا سر جھکایا اور دھیمی آواز میں بولی۔

"مجھے افسوس ہے سردار تابان، میں ہر جگہ دیکھ چکی ہوں لیکن شہزادی مارشا خیمہ گاہ میں نہیں نہ ہی کسی کو اس کے بارے میں علم ہے۔"

تابان کے ذہن میں چنگاریاں بھر گئیں۔ اس کا مطلب تھا سالارِ اعظم سکندر اسے جان بوجھ کر بے خبر رکھ رہا ہے۔ مارشا اس کے ساتھ نہیں تھی اور وہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ساتھ ہے۔ وہ شاہی خیمہ گاہ میں نہیں تھی۔ خواتین کی خیمہ گاہ میں بھی نہیں تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شاید وہ

تھی ہی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شاید کسی ہوس پرست کی نگاہ اسے کھا گئی ہے یا مقدونیہ کے شاہی محل کی دیواریں اسے چاٹ گئی تھیں۔ کورا نے تابان کے چہرے کا مدو جزر دیکھا تو ڈر گئی۔ سہمی آواز میں بولی۔

"تم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تم کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھنا۔ مجھے یقین ہے کہ شہزادی زندہ ہے۔ وہ مل جائے گی۔" تابان نے خالی نظروں سے کورا کی طرف دیکھا۔ اس گھڑی وہ ایک بدلا ہوا شخص دکھائی دیتا تھا۔ یہ وہ سیدھا سادا غلام نہیں تھا جو بات بات پر مسکرا دیتا تھا اور جس کے چہرے پر ہمہ وقت لاپروائی چھائی رہتی تھی یہ ایک سنجیدہ نوجوان تھا جس کی آنکھوں میں ذہانت کی بجلی تڑپتی تھی اور جو ہر کٹھن کام کر گزرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔ کورا نے پھر کہا۔

"مجھے ڈر ہے کہ تم سالارِ اعظم سے شہزادی کے بارے میں پوچھو گے۔ اگر اس سوال پر سالارِ اعظم ناراض ہو گئے تو بہت بُرا ہو گا۔ شاہی عتاب تمہارے ساتھ میری جان بھی لے لے گا۔"

"میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا۔ تم جا سکتی ہو۔" تابان نے انتہائی خشک لہجے میں کہا۔ اس لہجے نے کورا کو لرزا دیا۔ وہ میکانکی انداز میں کھڑی ہو گئی اور چند لمحے انگلیاں مروڑنے کے بعد واپس لوٹ گئی۔ تابان کچھ دیر بے حِس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ وہ کسی لق و دق ویرانے کی مانند خاموش تھا۔ ایک زہریلی ہوا تھی جو سائیں سائیں اس کے اندر چل رہی تھی پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز قدموں سے شاہی خیمہ گاہ کی طرف چل دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"کیا بات ہے؟ آج تم بہت سنجیدہ نظر آ رہے ہو۔" سالارِ اعظم نے تابان سے پوچھا۔ شاہی خیمے میں ان دونوں کے علاوہ صرف گونگے بہرے محافظ تھے۔

تابان بولا۔ "غلام گستاخی کی معافی چاہتا ہے سالارِ اعظم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں اپنے مقدمے کا فیصلہ دریافت کرنے آیا ہوں۔"

"کیسا مقدمہ؟"

"میں جاننا چاہتا ہوں کہ سردار شلال اور مجھ میں سے کون حق پر پایا گیا ہے؟"

"تمہاری بے صبری گستاخانہ ہے۔ تمہیں یہ جسارت کیسے ہوئی کہ ہم سے فیصلہ طلب کرو۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ ایسے معاملات کی تحقیق کے لئے وقت درکار ہوتا ہے؟"

سکندر کے تند و تیز لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے تابان نے کہا۔ "سالارِ اعظم میں جانتا ہوں میں آپ کے غضب کو آواز دے کر اپنی زندگی داؤ پر لگا رہا ہوں لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کی طرف سے مجھے اندھیروں میں رکھا جا رہا ہے۔ آپ مجھے دس برس انتظار کرنے کا حکم دیں تو میں بسر و چشم کروں گا لیکن جب انتظار کی طوالت ہی معلوم نہ ہو تو دل کیسے قرار پائے۔ میں ایک بشر ہوں اور بشری کمزوریوں سے پاک نہیں۔"

سکندر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ شاید اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایک معمولی غلام یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات کرے گا یہ اس نے خواب میں

بھی نہ سوچا تھا۔ غضب سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ اتنے زور سے بولا کہ خیمے میں آویزاں طلائی پنجرے کی سنہری چڑیاں پھڑ پھڑانے لگیں۔ "بد بخت! تجھے پتہ ہے تُو کس سے بات کر رہا ہے ہم تیری زبان کھنچوا کر کتوں کے آگے پھینک دیں گے۔ تُو سمجھتا ہے کہ ہم تجھے دھوکا دے رہے ہیں۔ یا تیری محبوبہ کو اپنی خواب گاہ کی زینت بنا رہے ہیں؟ کیا سمجھتا ہے تُو؟" سکندر کے غضبناک چہرے کو دیکھتے ہی گونگے بہرے محافظوں نے تلواریں بے نیام کیں اور تابان کو زد میں لے لیا۔ سکندر نے چیخ کر بیرونی محافظوں کو آواز دی۔ خیمے کا پردہ اٹھا اور ذاتی دستے کے چاق وچوبند جوان لپک کر اندر آ گئے۔ سکندر غرایا۔ "لے جاؤ اس کتے کو اور ایک بوٹی الگ کر دو اس کے جسم سے۔"

محافظ تابان پر پل پڑے اور پلک جھپکتے میں اسے کھینچ کر شاہی خیمے سے باہر لے آئے۔ خیمے سے باہر موجود سپاہیوں نے بڑی حیرت سے تابان کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر پہلے اسے بہت عزت واحترام سے خیمے میں لے جایا گیا تھا۔ اب وہ سپاہیوں کے دھکے کھا کر باہر آ رہا تھا۔ تابان کا بے تاثر چہرہ کسی پتھر کی طرح سخت تھا۔ شاید اسے سنبھالنے والے محافظ تعداد میں کم ہوتے تو وہ کسی طرح زور مار کر ان کی گرفت سے نکل جاتا لیکن محافظ اس سے چیونٹیوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ جیسے وہ کوئی غیر مرئی مخلوق ہے جو ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ دھکیلتے ہوئے اور گھسیٹتے ہوئے وہ اسے ایک عقوبت خانے میں لے آئے۔ شاہی خیمہ گاہ سے کچھ فاصلے پر یہ عارضی عقوبت خانہ ایک جھونپڑی میں قائم تھا۔ ایسے جھونپڑوں کو آہنی تاروں کے جال سے محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ جھونپڑے میں پہلے دو تین قیدی موجود تھے۔ جھونپڑے کا چوبی دروازہ بند ہوا تو باہر کی آوازیں یکدم معدوم ہو گئیں۔ اب تابان تھا اور بپھرے ہوئے شاہی محافظ تھے ان کی اعانت کے لیے خونخوار صورتوں والے بربری جلاد بھی موجود تھے۔ تابان کے کپڑے پھاڑ کر جسم سے جدا کر دیئے گئے اور اسے آہنی شکنجے میں کس کر کوڑوں کی بارش کر دی گئی۔ تابان کی کھال موٹی تھی ورنہ وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ وہ برداشت کرتا رہا لیکن کب تک بے پناہ تشدد کے سبب آخر وہ بے ہوش ہو گیا۔

اسے دوبارہ ہوش آیا تو عقوبت خانے سے باہر صبح ہو چکی تھی۔ وہ ساری رات آہنی شکنجے میں کسا رہا تھا۔ جسم کے مختلف حصوں سے خون رس رہا تھا۔ دونوں پاؤں شکنجے کی بندش سے سوجے ہوئے تھے۔ اس نے پاؤں کو حرکت دینا چاہی تو پورا جسم ناقابل برداشت ٹیسوں سے سنسنا اٹھا اس نے گردن ڈھیلی چھوڑ کر آنکھیں موند لیں۔ قریب ہی کسی دوسرے عقوبت خانے سے لرزہ خیز چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ چیخیں اس وقت بھی سنائی دے رہی تھیں جب تابان کو یہاں لایا گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رات کے واقعات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ وہ بے حد دھیمے مزاج کا آدمی تھا۔ مگر رات اس کا دماغ اس بری طرح بھنایا گیا کہ اپنے افعال پر قطعی اختیار نہیں رہا تھا۔ درحقیقت ایک برس کے طویل انتظار نے اسے

برداشت کی آخری حد تک پہنچا دیا تھا۔ وہ جلد از جلد مارشا کی صورت دیکھنا چاہتا تھا کم از کم اسے یہ تو معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ وہ کسی آس کے ساتھ سکندر تک پہنچا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سکندر تک رسائی حاصل ہوتے ہی اس کے سامنے مسرتوں کے انبار لگ جائیں گے۔ ان تمام تکلیفوں کا مداوا ہو جائے گا جو وہ پچھلے ایک برس سے اٹھاتا رہا تھا لیکن ان مصائب کے صلے میں اسے اور مصائب مل رہے تھے۔ اس پر پھولوں کی بارش نہ ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر کوڑوں کی بارش تو نہ ہوتی۔ ایک زخمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں سے کھیل گئی اپنے رہے سہے غضب سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے "پانی" کی صدا بلند کی۔ ایک جانب سے کرخت چہرہ خادم نمودار ہوا۔ اس نے زہرناک نگاہوں سے تابان کو دیکھا۔ پھر مٹی کے پیالے میں گدلا پانی اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ شدید پیاس میں یہ پانی اسے امرت محسوس ہوا۔ سینے میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔ کچھ پانی چھلک کر چھاتی اور پیٹ پر گرا تازہ زخموں سے ٹیسیں بلند ہوئیں۔ وہ ان ٹیسوں کا مزہ لینے لگا۔ یہ اذیت مارشا کی آرزو کا صلہ تھی، اس میں لطف کیوں نہ ہوتا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں "مارشا مارشا" پکارنے لگا۔ آئندہ کیا ہونے والا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا اور وہ معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ موت سمیت ہر حادثے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا تھا جیسے کوئی مہم جو

سامان باندھے ایک پاؤں رکاب میں رکھے ہمہ تن مائل بہ سفر ہو۔ معاً کچھ آہٹوں کے سبب اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے جمعیت متحدہ یونان کی معتبر ترین ہستی سکندر کے روپ میں کھڑی تھی۔ اس کے عقب میں خاص محافظوں کا دستہ تھا۔ عقوبت خانے کا نگرانِ اعلیٰ بھی ہمراہ تھا۔ سکندر رات بھر کی نیند کے بعد تروتازہ نظر آتا تھا۔ اس کی شفاف آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رات کی طرح نشے میں نہیں وہ کچھ دیر خالی نگاہوں سے تابان کو دیکھتا رہا پھر اس نے عقوبت خانے کے نگران جلاد کو اشارہ کیا نگران نے جلدی سے بڑھ کر تابان کی کلائیاں اور ٹخنے آہنی شکنجے سے آزاد کر دیے۔ دو محافظوں نے تابان کو سہارا دیا تاہم تابان اس سہارے کے بغیر ہی کھڑا ہو گیا۔ سکندر کچھ دیر تاسف سے تابان کے زخموں اور ورم آلود پاؤں کا جائزہ لیتا رہا تب اس نے محافظوں کو ہدایت کیا اور وہ اسے لیکر سکندر کے پیچھے چل دیے۔

تھوڑی ہی دیر بعد تابان نہا دھو کر مرہم پٹی سے فارغ ہو چکا تھا اور نئی پوشاک پہنے سالارِ اعظم سکندر کے روبرو بیٹھا تھا۔ سکندر کے چہرے پر ملامت تھی۔ وہ گویا ہوا۔

"ہمیں رات کے واقعے پر افسوس ہے۔ در حقیقت ہم دونوں قصوروار ہیں تم نے ہماری نیت پہ شبہ کیا اور ہم نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم دربار کے آداب سے ناواقف ہو تمہیں سزا دی۔"

تابان نے کہا۔ "عالم پناہ! آپ ہمارے جسم و جاں کے مالک ہیں۔ میں شرمندہ ہوں کہ میرے کلام سے آپ کو رنج پہنچا۔"

سکندر نے منقش جام سے شراب سرخ کا گھونٹ لیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

"تم جانتے ہو ہم تمہاری طرف سے بے رخی کیوں برت رہے تھے؟" پھر خود ہی جواب دیا۔

"اس کا ایک سبب تھا ہم اس امید میں تھے کہ شاید تمہاری نگاہوں میں شرمندہ ہونے سے بچ جائیں۔"

"میں حضور کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔" تابان نے کہا۔

"ہم جانتے ہیں کہ تم نے ایک بے مثال کام کیا ہے۔ ہماری خاطر تم نے اپنی جان خطرے میں ڈالی ہے اور وہ گراں قدر معلومات فراہم کی ہیں جن کی اساس پر ہم آج اس جگہ موجود ہیں۔ اس کارنامے کے عوض تمہیں جواہرات سے تولا جائے تو بھی کم ہے۔۔۔۔۔۔۔ تم

ہر طرح اس انعام کے حقدار ہو جس کا ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا اور یہی امر ہماری شرمندگی کا باعث ہے۔"

تابان اپنی جگہ لرز گیا۔ سینکڑوں وسوسے ذہن میں کلبلائے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ سکندر نے ایک نظر اسے دیکھ کر سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "تابان! ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ تمہیں مہم پر بھیجتے وقت ہم نے ایک مصلحت آمیز جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ دوشیزہ جو تمہیں مطلوب تھی ہماری دسترس میں نہیں تھی۔ تاہم ہمارے خاص اہلکاروں نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ وہ زندہ ہے اور وہ جلد ہی اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس دن سے اس کی تلاش کا کام شروع ہو گیا تھا۔ ہمیں اس سلسلے میں مسلسل باخبر رکھا گیا اور ہم نے گاہے بگاہے متلاشی اہلکاروں کو ہدایات بھی دیں۔۔۔۔۔۔۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک دوشیزہ کو برآمد نہیں کیا جا سکا۔ قریباً ایک ماہ پیشتر ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ مارشا نامی وہ لڑکی ساحلی شہر ہیلی کارنیس میں ہے۔ یہ اطلاع پہنچانے والے ہمارے وہ جاسوس تھے جو پچھلے کئی ماہ سے ملی ٹس میں موجود ہیں۔ یہ اطلاع ہمارے لئے ناقابل یقین تھی لیکن جاسوسوں نے دوشیزہ کے جو کوائف روانہ کئے وہ قابل غور تھے۔

میری ہدایت پر متعلقہ محکمے نے فوراً ایک پیامبر ہیلی کارنیس روانہ کیا۔ اس پیامبر کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ جاسوسوں کی اطلاعات کی تصدیق کرے اور تصدیق ہو جائے تو فوراً واپسی اطلاع دے۔ اس پیام بر کا نام یرغا ہے۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ یرغا واپس آئے تو ہم تم سے کھل کر بات کر سکیں لیکن رات تمہاری ترش روئی نے ہمیں بھڑکا دیا۔ نتیجے میں تمہیں ہماری زبان سے کچھ سخت باتیں سننا پڑیں اور جسمانی اذیت کا سامنا ہوا۔"

تابان بظاہر خاموش بیٹھا تھا لیکن دل و دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ آخر اسکے اندیشے درست ثابت ہوئے۔ مارشا کے سلسلے میں اس سے جھوٹ بولا گیا تھا۔ معلوم نہیں تھا پہلی دفعہ جھوٹ بولنے والا اب بھی اس سے سچ بول رہا ہے یا نہیں وہ کہہ رہا تھا کہ مارشا کا سراغ نہیں ملا۔ ممکن تھا کہ مارشا اس وقت بھی اس کی تحویل میں ہو۔ اسکا حسن بے مثال، اس کا ان چھویا شباب، اس کا ناز و انداز سب کچھ شاہ مقدونیہ کے لئے واقف ہو چکا ہو۔ وہ بادشاہ تھا۔ اس کے لئے یہ سب کچھ حاصل کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور وہ یہ کھیل اس طرح کھیل سکتا تھا کہ دائیں ہاتھ کو خبر بھی نہ ہو پاتی۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ سکندر اس مرتبہ سچ کہہ رہا ہو۔ مارشا واقعی عدم پتہ ہو اور سکندر کی ہدایت پر اس کی تلاش جاری ہو۔ تابان کو وہ وقت یاد آئے جو مشرقی ساحل کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے پیش آئے تھے۔ ایک رات اسے قید خانے میں لے جایا گیا تھا اور کچھ قیدیوں کی شناخت کرائی گئی تھی بعد ازاں شاہی اہلکار تابان سے مارشا کے متعلق عجیب و غریب سوال کرتے رہے تھے۔ ایسے سوال جو مارشا سے دریافت کئے جاتے تو زیادہ بہتر تھا۔ ان دنوں تابان نے اپنے ارد گرد پراسرار سرگرمیاں محسوس کی تھیں۔ شاید یہ سرگرمیاں مارشا کی تلاش کے سلسلے میں ہی تھیں۔ تابان نے ان معاملات پر غور کیا تو اسے سکندر کی باتوں سے سچائی کی بو آنے لگی۔

اچانک سکندر کا ہاتھ تابان کے شانے پر آیا۔ انگلیوں نے نرمی سے شانہ دبایا۔ سکندر کی حوصلہ بخش آواز ابھری۔ "ہم تمہارے جذبات سے آگاہ ہیں یقین رکھو ہم نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور نہ آئندہ کریں گے۔ اس دوشیزہ کا سراغ لگانا اب تمہارا ہی نہیں ہمارا بھی مسئلہ ہے۔۔۔۔۔۔۔ اس کام میں تاخیر ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ہو کر رہے گا۔ تم ایک طویل مہم سے واپس آئے ہو۔ بہت تھکے ماندے ہو۔ چند ہفتوں کی رخصت تمہارا حق بنتی ہے تم چاہو تو واپس ایتھنز جا سکتے ہو یا کسی ساحلی جزیرے میں آرام کر سکتے ہو اور اگر مناسب سمجھو تو ہمارے ساتھ سفر جاری رکھ سکتے ہو۔ میں نے وزیر مہمانداری کو ہدایت

کر دی ہے۔ وہ ہر طرح تمہاری سہولت کا خیال رکھے گا۔۔۔۔۔۔۔۔ اور ہاں تمہارے لئے ایک اچھی خبر بھی ہے۔" سکندر نے ایک لمحہ رک کر تابان کی آنکھوں میں جھانکا پھر مسکرا کر بولا۔ "آج سے تم یک ہزاری سالار ہو۔ سالاری کی تلوار تمہیں ایک تقریب میں پیش کی جائے گی اور اس تقریب میں تمہارے مجرموں کے لئے سزا کا اعلان بھی کیا جائے گا۔"

"میرے مجرم؟" تابان نے بے ساختہ پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔۔۔۔ سردار شلال اور اس کے دوونوں ساتھی وہ تمہارے مجرم ہیں۔ اس وقت وہ حراست میں ہیں اور ہمارے عذاب کا مزا چکھ رہے ہیں۔ اگر تم چاہو تو ان کی حالت کا مشاہدہ کر سکتے ہو۔" سکندر کے لہجے میں اچانک ہی خوفناک سفاکی عود کر آئی تھی۔ اس سے پہلے کہ تابان کوئی جواب دیتا سکندر نے تالی بجائی۔ مسلح محافظ تنے ہوئے سینوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ سکندر نے کہا۔ "یک ہزاری سالار تابان کو لے جاؤ اور عقوبت خانے میں شلال اور اس کے ساتھیوں سے ملاؤ۔"

محافظوں نے جھک کر تابان کو تعظیم پیش کی تابان اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سب الٹے پاؤں چلتے سکندر کے خیمے سے نکلے اور عقوبت خانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ قریباً دو فرلانگ چل

کر وہ ان منحوس جھونپڑوں کے سامنے پہنچے جن کو باریک آہنی تاروں کے جال سے ڈھانپا گیا تھا۔ ایسے ہی ایک جھونپڑے میں رات تابان پر تشدد ہوا تھا۔ مسلح محافظ تابان کو لیکر ایک دوسرے جھونپڑے میں داخل ہوئے۔ اندر سے چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ تابان کو اندازہ ہوا کہ یہی آوازیں رات اس نے سنی تھیں۔ جھونپڑے کا دروازہ کھلا تو اندرونی منظر تابان کو ششدر کر گیا۔ وہ سردار شلال جو کل تک سکوپے لاس میں سیاہ و سفید کا مالک تھا اور نورین و گونسل جو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ زنجیروں میں جکڑے اوندھے منہ پڑے تھے۔ ان کے جسموں پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور چہرے پسینے و گرد و غبار سے اٹ چکے تھے۔ جھونپڑے میں جلے ہوئے گوشت کی بو پھیلی تھی اور آلات ایزا رسائی بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف بھٹی میں پتھر کی ایک بڑی سل تپائی جا رہی تھی، دوسری سل سردار گونسل کی پشت پر پڑی تھی اور وہ اس کے بوجھ تلے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سل ٹھنڈی ہو گئی۔ اسے اٹھایا گیا تو سل کے ساتھ ہی گونسل کی پشت کا گوشت اور چربی اتر آئی۔ وہ اپنا سر زمین سے ٹکرانے لگا اور دیوتاؤں سے موت طلب کرنے لگا۔ یہ نظارہ تابان جیسے پتھر دل کو بھی لرزا گیا۔ عتاب شاہی کے بارے میں اسے نے بہت کچھ سنا تھا لیکن

دیکھ پہلی مرتبہ رہا تھا۔ وہ ان تینوں مکاروں کو ان کے حال پر چھوڑ کر عقوبت خانے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جنگِ گرینی کس کے بعد سکندر نے پانچ روز تک اسی جگہ قیام کیا۔ اس دوران سکندر نے ٹرائے کی خستہ حالی اور کھنڈرات کی لاوارثی پر توجہ دی۔ اس نے اہل شہر کو شاہی خزانے سے رقوم دیں تاکہ فصیل کی مرمت کی جائے اور آثارِ قدیمہ کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ اس نے ٹرائے کے باشندوں پر کسی طرح کا محصول بھی نہیں لگایا۔ یک ہزاری سردار کا رتبہ پانے کے بعد تابان بڑی آسائش سے پڑاؤ میں رہ رہا تھا۔ اس کا خیمہ شاندار تھا اور خدمت پر دو ملازم مامور تھے۔ وہ جو کل تک خود خدمتگار تھا آج سرداری کی مسند پر بیٹھا تھا۔ وہ دستہ جو تابان کی کمان میں آیا تھا خود کو خوش قسمت سمجھ رہا تھا کہ اسے ایک نامور بہادر کی قیادت نصیب ہوئی ہے۔

یہ پانچویں روز کی بات ہے عسکری مشقوں کے بعد تابان ابھی اپنے خیمے میں واپس لوٹا ہی تھا کہ سکندر کے حفاظتی دستے کا سالار اس کے پاس پہنچا۔ سالار نے تابان کو اطلاع دی کہ کل

شام ایک تقریب میں ترقی پانے والے سالاروں کو تلواریں اور پوشاکیں دی جائیں گی، تابان کو بھی یک ہزاری سردار کی تلوار اور پوشاک دی جائے گی۔ اس کے علاوہ تقریب کے بعد چند مجرموں کو موت کی سزا دی جائے گی ان میں سردار شلال کا نام بھی شامل ہے۔ تقریب میں شریک تمام افراد سزاؤں پر عمل درآمد دیکھ سکیں گے۔

اس اطلاع سے تابان کا دل بجھ سا گیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے کچھ حیرت بھی ہوئی۔ سالار نے صرف شلال کا نام لیا تھا جبکہ شلال کے ساتھ نورین اور گونسل بھی شاہی معتوبین میں شامل تھے۔ اس نے سالار سے پوچھا۔ "شلال کے ساتھیوں کے بارے کیا فیصلہ ہوا؟"

سالار نے اطمینان سے کہا۔ "ان کا فیصلہ قدرت نے کر دیا۔ وہ دونوں کل رات عقوبت خانے ہی میں دم توڑ گئے تھے۔"

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ "یاد رہے کل غروب آفتاب سے قبل آپ کو تقریب میں شریک ہونا ہے۔"

سالار خیمے سے نکل گیا تو تابان گونسل اور نورین کے بارے سوچنے لگا۔ مکافات عمل نے آناً فاناً نہیں آ دبوچا تھا۔ تابان اور ہوشمند کو "قتل" کر کے انہوں نے اپنے سر پر کامیاب کی

دستار سجائی تھی۔ سکندر سے رتبے اور انعامات حاصل کئے تھے اور چند روز تک نشے میں ڈوب کر حسینوں کے جھرمٹ میں داد عیش دے رہے تھے۔ آج۔۔۔۔۔۔۔۔ ان میں سے دو اذیتیں جھیل کر خاک میں پنہاں ہو گئے تھے اور ایک کو کل بر سرِ عام پھانسی چڑھ جانا تھا۔ شلال کے بارے سوچتے ہوئے تابان کو کورا کا خیال آیا تو شلال کے انجام کی کسک اس کے دل سے دور ہو گئی۔ وہ شخص ایسی ہی موت کا مستحق تھا۔ نہ جانے کورا جیسی کتنی دوشیزائیں صرف اس کے خوف سے ہی مر چکی تھیں۔ وہ صنفِ مخالف کے لئے دہشت ناک خواب کی مانند تھا۔ خاص کر کورا تو اس کی نگاہِ ستم کا مرکز تھی۔ وہ جب آزاد رہا تھا کسی خون آشام درندے کی طرح کورا کے خون کی بو سونگھتا پھرا تھا۔ تابان کا دل چاہا کہ وہ اسی وقت خواتین کی خیمہ گاہ میں جائے اور ڈری سہمی کورا کو مبارکباد دے۔ اسے بتائے کہ اس کی آہیں رنگ لائی ہیں۔ اس کی عزت اور زندگی کا دشمن کل سرِ عام اپنے انجام کو پہنچ رہا ہے۔

وہ کھانا کھاتے ہی اپنے خیمے سے نکلا اور کورا کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ شاہی خیمہ گاہ کے پاس ہلچل نظر آئی۔ ایک ہجوم سکندر کے خیمے کو گھیرے ہوئے تھا۔ تابان کے قدم بے اختیار شاہی خیمہ گاہ کی طرف اٹھ گئے۔ پہریداروں نے اسے پہچان کر راہداری

دی۔ تابان نے دیکھا خیمے سے باہر سکندر ایک پتھر پر کھڑا تھا۔ سورج کی روشنی میں اس کا چہرہ تانبے کی مانند چمک رہا تھا۔ سکندر کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر حبشی تھا۔ اس کے بال گھونگھریالے اور آنکھیں گہری پیلی تھیں۔ چہرہ دیکھتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک طویل سفر طے کر کے آیا ہے۔ اس نے کمانداروں اور سرداروں کے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"سردارانِ لشکر، میں نے جو کچھ دیکھا تھا سالارِ اعظم اور آپ کے سامنے بیان دیا ہے۔ ممکن ہے مجھ سے اندازے کی بھول چوک ہو گئی ہو لیکن مجموعی صورتِ حال یہی ہے جو میں نے بیان کی ہے۔ شاہ مقدونیہ کے ایک ادنٰی خدمتگار کی حیثیت سے میری ذمے داری ختم ہوتی ہے۔ اب آپ سرداروں کا یہ کام ہے کہ غور و خوض کریں اور حتمی فیصلہ کرنے میں سالارِ اعظم کی معاونت کا فرض انجام دیں۔"

تقریر ختم کر کے ادھیڑ عمر حبشی پتھر سے نیچے اتر گیا۔ مجمعے میں سرگوشیاں سرسرانے لگیں۔ تابان نے ایک شناسا کماندار سے صورتِ حال پوچھی۔ اس نے انکشاف کیا کہ یہ حبشی سکندر کے والد محترم شاہ فیلقوس کا قریبی مصاحب ہے اور اب سکندر کے لئے خدمت انجام دے

رہا ہے۔ یہ دس روز کی مسافت طے کر کے آج ہی یونانی نوآبادی ملی ٹس سے لوٹا ہے اور اس نے اطلاع دی ہے کہ جزیرہ روڈز کا کماندار "میمنان" جو ایک نہایت تجربہ کار جنگجو ہے، جنگ گرینی کس سے بچ کر نکل گیا ہے۔ وہ سیدھا ایرانی بحری بیڑے پر پہنچا ہے یقینی بات ہے کہ وہ بیڑے کے کمانداروں کو درہِ دانیال کی ناکہ بندی پر آمادہ کرے گا اور اس طرح مقدونوی فوج کی رسد منقطع کر کے اسے گھیر لیا جائے گا۔"

صورت حال واقعی تشویش ناک تھی۔ تابان جیسا غیر فوجی آدمی بھی یہ جان سکتا تھا کہ ان حالات میں مقدونوی فوج کو فوراً یہاں سے کوچ کرنا چاہیے تاکہ نئی آبادیوں پر قابض ہو کر خوراک اور رسد کے مسائل پر قابو پایا جائے۔ تابان دوسرے کمانداروں کے ساتھ کھڑا انہی معاملات پر بات چیت کر رہا تھا کہ سالار اعظم سکندر نے اہم سرداروں کو مشورے کے لئے خیمے میں طلب کر لیا۔ تابان ان اہم سرداروں میں شامل نہیں تھا لٰہذا وہ دوبارہ خیمے میں لوٹ آیا تھوڑی ہی دیر بعد وہ یہ اہم اطلاع سن رہا تھا کہ سالار اعظم نے فوری کوچ کا حکم صادر کیا ہے۔

دوپہر کے فوراً بعد مقدونوی سپاہ دریائے گرینی کس سے روانہ ہو رہی تھی سب سے آگے ہلکے ہتھیاروں والے ہراول دستے تھے۔ اس کے بعد رسالے۔ پھر پیدل فوج اور آخر میں خدمتگارہ اور غیر فوجی ذمے داریاں نبھانے والے لوگ۔ ان میں طبیعاتی علوم کے ماہرین اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اہمیت حاصل تھی۔ لشکر کا آخری حصہ بڑی بڑی گاڑیوں، چھکڑوں اور منجنیقوں وغیرہ پر مشتمل تھا۔ ندیاں نالے پار کرنے کے لئے اور فصیلوں پر چڑھنے کے لئے لکڑی اور رسے کی بے شمار سیڑھیاں لشکر کے ساتھ تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسی جنگی مشینیں بھی تھیں جو ویادس نامی ایک تجربہ کار مقدونوی نے حال ہی میں تیار کی تھیں۔

روانہ ہوتے وقت سکندر نے ایک جیش اس مقام پر چھوڑ دیا جہاں سے مقدونوی فوج نے سمندر عبور کیا تھا۔ باقی سارا لشکر اس کی قیادت میں ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پہلے روز کم و بیش بیس میل کا فاصلہ طے کیا گیا۔ سکندر کا خیال تھا کہ پیش قدمی کی رفتار یہی رکھی جائے تاکہ جلد از جلد اہم ایرانی شہروں تک پہنچ سکے۔

بوڑھا سالار پارمینو ایک بار پھر سکندر کی جلد بازی سے نالاں نظر آتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گرینی کس کی جنگ سے بچ کر نکل جانے والا سالار میمنان ایک خطرناک دشمن ہے وہ پہلے تو مقدونوی فوج کو آزادنہ پیش قدمی کرنے دے گا جب وہ ایرانی علاقے میں کافی آگے نکل آئے گی تو اسے گھیر لیا جائے گا، اس سلسلے میں ایران کا طاقتور بحری بیڑا بھی زمینی فوج کی مدد کر سکتا ہے۔

سکندر نے ایک بار پھر سوچ بچار پر جوش و خروش کو ترجیح دی اور دلیرانہ فیصلہ کرتے ہوئے پیش قدمی کی رفتار برقرار رکھی۔ مقدونوی فوج بارونق ساحل کی عمدہ سڑکوں پر تیزی سے آگے بڑھتی گئی۔ علاقے کی خوشحال آبادیوں نے سکندر کی پیش قدمی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی نہ ہی سکندر نے ان سے مفتوحین کا سلوک کیا۔ تاہم سکندر کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس علاقے کے باشندوں کو شہنشاہ ایران کے خلاف نہیں ابھار سکے گا اور لوگ کسی جنگ میں الجھنے کی بجائے اپنے حال میں مست رہنا پسند کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں سکندر کو اپنی اس مہم کا ایک اہم مقصد حاصل ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ نئی جمعیت متحدہ یونان کے سپہ سالار اعظم کی حیثیت سے ایشیا پر یلغار کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یونان نو آبادیوں کو شہنشاہ ایران کے

جوئے سے نجات دلائی جائے۔ مگر نو آبادیوں کے باشندے ایسی کوئی خواہش نہیں رکھتے تھے۔ وہ اصل یونانیوں سے بدرجہا بہتر زندگی گزار رہے تھے اور یونان سے نقل مکانی کرنے کے بعد وہ کسی طرح بھی گھاٹے میں نہیں تھے۔

وہ ایک چمکیلی صبح تھی مقدونوی لشکر حالتِ سفر میں تھا۔ سکندر اپنے خوبصورت گھوڑے بیوسی فالس پر سوار تھا۔ ایک خدمتگار سکندر کے بالکل ساتھ ساتھ اپنا گھوڑا اچلا رہا تھا۔ اس نے سرخ ریشم کا نقرئی جھالروں والا سائبان سکندر پر تان رکھا تھا۔ سکندر کے ہم رکاب وہی ادھیڑ عمر حبشی تھا جو بحری بیڑے کی نقل و حرکت کی اطلاع لایا تھا۔ چلتے چلتے اچانک سکندر کی نظر تابان پر پڑ گئی۔ اس نے فوراً ایک محافظ کو بھیج کر تابان کو اپنے قریب بلایا۔ تابان اپنا گھوڑا سکندر کے پاس لے آیا۔ سکندر آج خوش باش نظر آ رہا تھا۔ تابان کو دیکھتے ہی بولا۔

"کہاں تھے تم؟ ہم کل بھی لشکر کے ہراول میں تمہیں دیکھتے رہے۔"

تابان نے کہا۔ "میری بدنصیبی ہے کہ میں آپکی نگاہ میں نہ آ سکا۔"

سکندر بولا۔ "تمہارے لئے میرے پاس ایک خوشخبری ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ پیام بر واپس آ گیا ہے، جس کا ہم نے تم سے ذکر کیا تھا۔"

"کہاں ہے وہ؟" تابان کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

سکندر نے پہلو کی طرف دیکھ کر ادھیڑ عمر حبشی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہی تو ہے یرغا۔ یہ والد محترم کے زمانے سے ہمارے لئے خدمت انجام دے رہا ہے۔ ہمارے دل میں اس کی اور اس کے اہل خانہ کی بہت عزت ہے۔"

تابان نے بے تابی سے پوچھا۔ "محترم یرغا کیا خبر لائے ہیں"

سکندر نے کہا۔ "جاسوسوں کی اطلاعات درست تھیں۔ وہ دوشیزہ شہزادی مارشاہی ہے۔ اس وقت وہ ہیلی کارنیس کے ایک بڑے عبادت خانے میں موجود ہے۔ باقی تفصیلات تم یرغا سے جان سکتے ہو۔" یرغا جہاندیدہ نگاہوں سے تابان کو دیکھ رہا تھا۔ سکندر نے یرغا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہی وہ یک ہزاری تابان ہے جس کا ذکر تم سنتے رہے ہو۔ ہم چاہیں گے کہ آج شب پڑاؤ میں تم اسے شہزادی کے بارے میں تمام تفصیلات سے آگاہ کر دو۔"

یرغا نے اطاعت مندی سے سر ہلایا۔ تاہم منہ سے کچھ نہیں بولا۔ وہ بھیگی بھیگی آنکھوں والا ایک خاموش طبع شخص تھا۔ تابان کو اس کی آنکھوں میں عجیب درد کروٹیں لیتا محسوس ہوا۔

شام کا انتظار تابان کے لئے روح فرسا تھا۔ سورج غروب ہونے تک وہ ایک ایک پل گنتا رہا۔ آخر شام نے پر پھیلائے اور ایک سرسبز ویرانے میں لشکر کے خیمے ایستادہ ہو گئے۔ پڑاؤ کے طول و عرض سے بلند ہونے والا دھواں اس امر کی نشاندہی کرنے لگا کہ رات کا کھانا تیار ہو رہا ہے۔ کھانا کھا کر اور شراب پی کر جب لشکریوں نے الاؤ بھڑکائے اور حسبِ معمول ناچ گانا شروع کیا تو تابان اپنے خیمے سے نکلا اور تیز قدموں سے یرغا کے مسکن کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ یرغا اسے خیمے میں مل گیا اور تنہائی بھی مل گئی۔ تابان نے اندازہ لگایا کہ یہ بوڑھا شخص الگ تھلگ رہنے کا عادی ہے۔ تابان نے جھک کر اسے سلام کیا اور پھر قریب ہی ایک غالیچے پر مؤدب بیٹھ گیا۔ ادھیڑ عمر حبشی اپنی گھنی بھنوؤں کے نیچے سے اسے بغور دیکھتا رہا پھر بزرگانہ لہجے میں بولا۔

"تم صحت مند ہو، جوان ہو، زور آور ہو۔ ان خرافات میں کیوں پڑ گئے ہو۔ یاد رکھو عورت مرد کے پاؤں کی زنجیر ہوتی ہے۔ یہ زنجیر پاؤں میں ہو تو ترقی کے راستے پر دو گام چلنا محال ہو جاتا ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ شاید تمہیں خود بھی معلوم نہیں کہ تم کیا چیز ہو تم ایک پیدائشی جنگجو ہو۔ میں تمہاری پیشانی پر بلند اقبالی کا ستارہ دیکھ رہا ہوں۔

مقدونوی لشکر میں تمہارے لئے ترقی کے بے شمار راستے کھلے ہیں اور قابلِ رشک عسکری عہدے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ تم ایک تابناک، مستقبل کو ایک اندھی خواہش پر کیوں قربان کر رہے ہو؟"

"اندھی خواہش؟ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میری مراد یونانی دوشیزہ سے ہے میں نے اسے دیکھا ہے۔ تم نے اس پر عاشق ہو کر کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ دیوتاؤں نے اسے صورت ہی ایسی دی ہے جو بھی دیکھتا ہو گا دل دے بیٹھتا ہو گا اور ایسے بیوقوفوں میں امیر زادے، شہزادے اور بڑے بڑے صاحبِ ثروت شامل ہوں گے۔ ظاہر ہے ان میں سے کئی تم سے زیادہ وجیہہ اور پر کشش ہوں گے ان کا اثرورسوخ، ان کا حسب نسب تم سے کہیں زیادہ قابل قدر ہو گا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ عشاق کی اس بھیڑ میں اپنی مہربانیوں کے لئے تمہیں منتخب کرے گی؟ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے آگ سے ٹھنڈک پانی کی حدت اور چاند سے ہم آغوشی کی تمنا کی جائے۔"

تابان نے ایک گہری سانس بھر کر کہا۔ "سردار محترم! میں آپ سے بحث کی جسارت نہیں کر سکتا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ مارشا کی تمنا وہ شعلہ ہے جس سے میری زندگی کی حرارت قائم ہے۔ یہ شعلہ بجھ گیا تو کچھ بھی باقی نہیں رہے گا میری پیشانی پر چمکتا ہوا بلند اقبالی کا ستارہ بھی آپ کو کہیں نظر نہیں آئے گا میں۔۔۔۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں سردار محترم میری آرزو دیوانے کا خواب ہے اور اس آرزو کا حاصل محرومی کے سوا اور کچھ نہیں لیکن میں اس آرزو سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔۔۔ ایسا کرنا میرے اختیار سے باہر ہے۔"

یرغا نے کہا۔ "ہر عاشق کی بربادی اس جملے میں پنہاں ہوتی ہے کہ وہ اپنی آرزو سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ وہ اس آرزو کو لہو دے کر پالتا ہے اور ایک روز وہ ناگ بن کر اسے ڈستی ہے۔ پھر وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکتا اور اپنی تمام ترشہ زوری کے باوجود منہ کے بل خاک پر گرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ عورت کی محبت ایک ناپائیدار جذبہ ہے نوجوان۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ جسم کی پیاس ہوتی ہے جو چند راتوں کی رفاقت میں بجھ جاتی ہے اس ناپائیدار جذبے کے لئے کیا تم اس اعتماد کا خون کرو گے جو سالارِ اعظم نے تم پر کیا ہے؟ ان تمام اعلیٰ مقاصد کو پس پشت ڈال دو گے جو تمہارے منصب سے وابستہ ہیں جن کا حصول تمہیں نام و نمود اور آسائش کی دولتوں سے مالا مال کر دے گا۔"

تابان بے دلی سے مسکرایا۔ "گستاخی معاف بزرگوار! آپ کس منصب اور کن اعلیٰ مقاصد کی بات کررہے ہیں۔ میں کسی اعلیٰ مقصد کو لیکر میدان جنگ میں نہیں آیا لوگ مال غنیمت کے لئے لڑتے ہیں۔ عہدوں کے لئے لڑتے ہیں اور جو زیادہ اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں ملک و قوم اور مذہب کے لئے برسرپیکار ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ ایسے بھی اعلیٰ مقاصد لیکر میدان جنگ میں اترتے ہوں لیکن آج آپ کے سامنے ایسا شخص بیٹھا ہے جو صرف ایک عاشق ہے اور محبت کی خاطر میدان جنگ میں موجود ہے۔ میری تمام وفاداریاں اور کوششیں میری آرزو سے مشروط ہیں۔"

یرغا نے کہا۔ "تم جیسے جوجوان قابل بھروسہ نہیں ہوتے۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم زیادہ دیر سکندر کے حلقہ احباب میں رہ سکو گے۔ جلد یا بدیر تمہیں پیشمان ہو کر اپنا عہدہ اور مقام چھوڑنا پڑے گا۔"

تابان نے کہا۔ "بزرگوار! میں آپ کی دانشمندی کا قدردان ہوں، لیکن اس وقت آپ کی کوئی نصیحت مجھ پر اثر نہیں کررہی۔ میرا دھیان شہزادی مارشا کی طرف لگا ہوا ہے۔ میں اسکے حالات سننے کے لئے بے تاب ہوں۔"

تابان کی صاف گوئی نے یرغا کو ایک گہری سانس لینے پر مجبور کردیا۔ اس نے پھونک مار کر شمعدان کی فالتوں شمعیں گل کردیں۔ خیمے میں خوابناک روشنی باقی رہ گئی یرغا گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بولا۔

"میں شاہ فیلقوس کے دور میں کئی مرتبہ یونان آچکا ہوں۔ یہاں میں نے غارس زنوب کی بیٹی مارشا کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ دس بارہ برس کی تھی لیکن حسن وجمال میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ جو دیکھتا تھا پیار کرنے کو مچل جاتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ پچھلے مہینے سکندر کو میں نے ہی بتایا تھا کہ میں شہزادی مارشا کو پہچانتا ہوں اور "ہیلی کارنیس" جا کر تصدیق کرسکتا ہوں کہ جاسوسوں نے جس لڑکی کے بارے اطلاع دی ہے وہ مارشا ہے یا نہیں۔ سکندر نے مجھے ہیلی کارنیس بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں ایک چرواہے کے بھیس میں روانہ ہوا تھا۔ یہ ایک کٹھن اور طویل سفر تھا جس کی تفصیلات تمہارے لئے بیکار ہیں۔ ہیلی کارنیس پہنچ کر میں نے مقدونوی جاسوسوں سے رابطہ قائم کیا اور ان کے ذریعے زرتشتیوں کی اس عظیم عبادت گاہ میں پہنچا جہاں پتھر کے بڑے بڑے ستونوں پر آگ جلتی ہے۔ وہاں میں نے شہزادی مارشا کو مقدس دیوی کے روپ میں دیکھا لوگ اسکے سامنے سجدہ ریز تھے اور چڑھاوے چڑھا رہے تھے۔ وہ

ایک عجیب و غریب منظر تھا، جب تک آدمی خود نہ دیکھے اس کی پراسراریت کو محسوس نہیں کر سکتے۔ اس عبادت گاہ میں صدیوں پرانے تیل میں بھیگی ہوئی مشعلیں جلتی ہیں اور سنگی محرابوں میں انجانی خوشبوئیں سلگائی جاتی ہیں۔ میں نے شہزادی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا کہ وہ ایتھنز کے نواح سے غائب ہونے کے بعد مشرقی ساحل کے شہری ہیلی کارنیس تک کیسے پہنچے اور کیونکر زرتشتیوں کے ہتھے چڑھ کر اس عبادت گاہ کی زینت بنی ہے۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ چند ماہ پہلے ہیلی کارنیس کے کاہنوں کو دریا میں بہتا ایک بند صندوق ملا تھا اور خیال ہے کہ مارشا کا تعلق اس صندوق سے ہے لیکن یہ بات غلط بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اطلاع دینے والا اس حوالے سے کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکا۔۔۔۔۔۔۔۔"

حبشی یرغا کی باتیں تابان کے سینے میں ایک ہلچل جگا رہی تھیں۔ یہ ہلچل بتدریج طوفانی صورت اختیار کر رہی تھی۔ ایک عجیب طرح کا جوش تابان کے رگ و پے میں بھرتا جا رہا تھا۔ ایک سال بعد آخر اسے مارشا کے متعلق ایک اچھی اطلاع مل گئی تھی۔ مارشا ہیلی کارنیس میں تھی اور تابان ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ ہیلی کارنیس جا رہا تھا۔ اس کا رخ مارشا کی طرف تھا۔ جلد یا بدیر اسے اس شہر کے دروازے پر دستک دینا تھی جس میں مارشا رہتی تھی اس کا دل چاہا اندھیرے کی چادر آناً فاناً چاک ہو جائے۔ خورشیدِ تابناک اچھل کر مشرق سے طلوع ہو۔ کوچ کا نقارہ بجے اور وہ اپنے سفر پر روانہ ہو جائیں۔ اس وقت تک چلتے رہے جب تک انکے گھوڑوں میں دم ہو، اور جب گھوڑے ہانپ کر گر جائیں، وہ پاپیادہ بھاگنا شروع کر دیں اور ہیلی کارنیس کی فصیل تلے پہنچ کر دم لیں۔

حبشی یرغا نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

تابان چونک کر اپنے خیالوں سے باہر آیا۔ پھر گھمبیر لہجے میں بولا۔ "آپ کو یقین کہ وہ شہزادی ہی تھی۔ میرا مطلب ہے آپ نے اسے کئی برس پہلے دیکھا تھا۔ اب وہ ایک نو عمر لڑکی نہیں، جوان دوشیزہ ہے۔"

حبشی یرغا نے کہا۔ "میرے جواب سے اس لڑکی کی تعریف کا پہلو نکلتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ جو اس چہرے کو ایک بار دیکھ لے پھر بھول نہیں سکتا۔"

تابان اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ "بہت شکریہ سردار یرغا۔۔۔۔۔۔۔۔ میں اب سالارِ اعظم کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔"

"رک جاؤ۔" یرغا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ تابان نہ چاہتے ہوئے بھی پھر بیٹھ گیا۔ یرغا نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "میں محبت کا دشمن نہیں۔۔۔۔۔۔۔ محبت اس کائنات کی سب سے حسین شے ہے لیکن کوئی چیز جتنی قیمتی ہوتی ہے اس کا حصول اتنی ہی قربانی مانگتا ہے۔ اگر تم قربانی دینے کا حوصلہ رکھتے ہو، زہریلے سانپوں کے بستر پر سو سکتے ہو۔ ننگے پاؤں کانٹوں پر چل سکتے ہو، انگارے نگل سکتے ہو اور اپنے لہو میں تیر سکتے ہو۔۔۔۔۔۔۔ تو محبت ضرور کرو۔۔۔۔۔۔۔ اس سے بڑھ کر ایک شخص کی خوش قسمتی اور کوئی نہیں کہ وہ کسی کا عاشق یا محبوب ہو۔ محبت تم سے سب کچھ لے کر ایک چھوٹی سی مسرت بخش دے تو اس کا بدل تمہیں پوری کائنات میں نہیں ملے گا۔"

تابان نے یرغا کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں دیکھا۔ اسے لگا جیسے یہ شخص جگ بیتی نہیں آپ بیتی کہہ رہا ہے۔ محبت کا کوئی سانحہ اس پر بھی گزر چکا ہے۔ کوئی دل گداز کہانی اس نے بھی سینے میں چھپا رکھی ہے۔ یرغا نے اپنا چہرہ تابان کی جانب سے پھیر لیا اور خیمے کے ایک روزن میں نظریں گاڑے ہوئے بولا۔

"محبت مت کرو، اور اگر کرنی ہے تو پھر پوری طاقت اور ہمت سے کرو۔ ایسا جوش و خروش ہو کہ دنیا دنگ رہ جائے۔ دہر کے اس کنارے سے اس کنارے تک تہلکہ مچ جائے۔ بے حس ساعتوں کے پردے چاک ہو جائیں پتھر دلوں میں جونک لگے اور گنگ ساعتیں پکار اٹھیں کہ ہاں۔۔۔۔۔۔۔ کوئی محبت کر رہا ہے کوئی کر رہا ہے محبت۔"

تابان نے دیکھا کہ یرغا کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا ہے۔ وہ رخ پھیرے کھڑا تھا۔ تابان اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکا۔ ہاں اس کا لہجہ دل میں اتر جانے والا تھا تابان کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر بوڑھے کو الوداع کہہ کر خیمے سے نکل آیا۔۔۔۔۔۔۔۔ اپنے خیمے تک کا فاصلہ جیسے اس نے ہوا پر پرواز کرتے طے کیا۔ اس کا ذہن اس پڑاؤ سے بہت دور ہیلی کارنیس کے گلی کوچوں میں پہنچا ہوا تھا۔ جیسے کوئی انجانی کشش اسے جنوب کی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ سیدھا ایک صدی سالار باکوج کے خیمے میں پہنچا۔ باکوج کو راستوں اور فاصلوں کی بہت خبر رہتی تھی۔ اس کے پاس ایران کے سرحدی علاقوں کا ایک کٹا پھٹا نقشہ بھی تھا۔ تابان رات گئے تک باکوج کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ دونوں تلے ہوئے گوشت کے پارچے کھاتے رہے۔ چاول سے کشید کی ہوئی شراب پیتے رہے اور سفر کی باتیں کرتے رہے۔ تابان کی گفتگو کا محور

ہیلی کارینس ہی تھا۔ ہیلی کارینس کتنے دنوں کی مسافت پر ہے؟ وہ کتنا بڑا شہر ہے۔ اس کی فتح کے امکانات کیا ہیں؟ لشکر کب وہاں پہنچے گا؟ تابان کے سارے سوال اسی نوعیت کے تھے۔ باکوج حیران تھا کہ تابان کو ایکا ایکی ہیلی کارینس سے اتنی دلچسپی کیونکر پیدا ہو گئی۔ جب باکوج تابان کی "معلومات" میں اضافہ کرتے کرتے تنگ آگیا اور باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگا تو تابان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ باکوج کی حالت پر رحم کھاتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ گیا اور اپنے خیمے میں پہنچ گیا۔

نیند آج اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ آج وہ ماضی کا ہر غم ہر دکھ بھولا ہوا تھا۔ حتٰی کہ فیلانہ کا غم بھی ایک اجنبی دھند میں لپٹا ہوا کچھ فاصلے پر خاموش کھڑا ہوتا تھا۔ اس نے اپنے تصور کی آنکھوں سے دیکھا۔ فلک بوس ستونوں کے ایک بہت بڑے ایوان میں مارشا ایک زرنگاہ تخت پر بیٹھی تھی۔ اس کے لباس پر ستارے لٹکے ہوئے تھے اور لعل وجواہر سے مرصع گہنے اس کے حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔ تابان نے دیکھا سینکڑوں زرتشتی اس کے سامنے سربہ سجود ہیں، وہ مبہوت کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ "تم یہاں کیسے آئی ہو مارشا؟ کون لایا ہے تمہیں یہاں؟" اس کی آواز بلند و بالا ایوان میں گونجی اور گونجتی چلی گئی۔ وہ ہنس دی تابان کے تصور

میں ہزاروں جلترنگ بج اٹھے۔ زمین و آسمان کے قلابے میں نغمگی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔۔۔۔۔۔۔۔ یکایک تابان اپنے حسین خیالات سے چونک اٹھا۔ خیمے کی گہری تاریکی میں اسے ایک سایہ سا حرکت کرتا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی اس کے بستر کے پاس کھڑا ہو۔ تابان نے اپنی آنکھیں پوری کھولیں اور غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ حسبِ عادت اس نے خیمے کا در بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور کوئی بہ آہستگی خیمے کے اندر آگیا تھا۔ کون تھا یہ؟ کوئی دوست؟ دشمن؟ یا کوئی اجنبی؟ ایک ساعت کے مختلف وقفے میں یہ سارے خیالات تابان کے ذہن میں کوندے۔ یکایک سائے نے حرکت کی۔ تابان کی چھٹی حس اس کی زندگی کی ضمانت بن گئی۔ ورنہ اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے پھرتی سے اپنا سر جھکایا اور ایک تلوار سنسناتی ہوئی اس کے سر پر سے گزر گئی۔ یہ سوچنے کا نہیں کچھ کرنے کا وقت تھا۔ تابان اپنی جگہ سے اچھلا اور کندھے کی بھرپور ضرب مدمقابل کے پیٹ پر لگائی وہ دونوں اوپر تلے دری پر گرے۔ تابان نے اندھوں کی طرح اپنا دایاں ہاتھ گھمایا اور مدمقابل کی تلوار والی کلائی اپنی گرفت میں لے لی۔ یہ اس کی بہت بڑی کامیاب تھی۔ مدمقابل کا تلوار والا بازو آزاد رہتا تو کسی بھی وقت تابان کے جسم سے خون کا فوارہ پھوٹ سکتا تھا۔ کلائی ہاتھ میں آتے ہی تابان

کو اندازہ ہوا کہ مد مقابل ایک طاقتور اور مضبوط شخص ہے۔ تابان کا یہ تجزیہ سو فیصد درست تھا۔ حملہ آور نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اپنی دونوں ٹانگیں سمیٹ کر تابان کے سینے پر رکھیں اور پوری قوت سے اسے پیچھے اچھال دیا۔ تابان جیسے ہوا میں اڑتا ہوا دوبارہ اپنے بستر پر گرا۔ اس نے ایک پرچھائیں خود پر جھپٹتے دیکھی۔ تلوار دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن وہ اسکے نشانے پر تھا۔ اس نے تڑپ کر اپنی جگہ چھوڑ دی اور ایک بار پھر اپنی زندگی بچانے میں کامیاب رہا۔ تلوار اس کے کندھے کو زخمی کرتی ہوئی زمین میں پیوست ہو گئی۔ یہ ایک چھوٹی تلوار تھی اور حملہ آور نے اسے بعین خنجر کی طرح استعمال کیا تھا۔ وار خالی گیا مگر حملہ آور کے جسم کا پورا بوجھ تابان پر آپڑا۔ اسکے ساتھ ہی ایک مضبوط ہاتھ بے پناہ قوت سے تابان کے جبڑے پر پڑا۔ اس کی آنکھوں میں ہفت رنگ ستارے ناچ گئے۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھلا بھی نہیں تھا کہ تلوار کی دھار اسے اپنی گردن کے آس پاس محسوس ہوئی۔ یہ اس لڑائی کے نازک ترین لمحے تھے۔ تابان نے وحشیانہ عجلت کے ساتھ ایک بار پھر حملہ آور کی تلوار بدست کلائی تلاش کی اور اسے گرفت میں لے لیا۔ حملہ آور نے تلوار کی دھار تابان کی گردن تک پہنچانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اس کے حلق سے خوفناک غراہٹیں برآمد ہو رہی تھیں مگر تابان پر سکون تھا۔ وہ اچانک حملے کے صدمے سے سنبھل چکا تھا اور یہ بھی

اندازہ لگا چکا تھا کہ اسے زیر کرنا حملہ آور کے بس کا روگ نہیں۔ بہت طاقتور ہونے کے باوجود لڑائی جیتنے کا لمحہ حملہ آور کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ تابان نے مد مقابل کا داؤ اس پر الٹتے ہوئے اپنی ٹانگیں سمیٹ کر اس کے پیٹ سے لگائیں اور زبردست قوت سے اسے پیچھے اچھال دیا۔ وہ گرانڈیل شخص ایک دھماکے سے دروازے کے پاس گرا اور گرتے ساتھ ہی باہر نکل گیا۔ تابان جست کر کے دروازے پر پہنچا۔ پردہ اٹھا کر باہر نکلا اور چند قدم بھاگ کر ٹھہر گیا۔ حملہ آور خیموں کے جنگل میں گم ہو چکا تھا۔

"کون ہے؟" پہریدار کی کڑکتی ہوئی آواز آئی۔

تابان نے اپنی شناخت کرائی اور زخمی کندھے کو دبائے ہوئے خیمے میں واپس آ گیا۔ خون کے گرم قطرے اس کے ننگے پاؤں پر گر رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ٹھیک چوتھے روز سکندر کی فوج ہیلی کارنیس کے بند دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ خدشے کے عین مطابق اہل ہیلی کارنیس نے اطاعت قبول کرنے کی بجائے مزاحمت کا فیصلہ کیا تھا اور شہر کو بند کر کے بیٹھ گئے۔۔۔۔۔۔۔۔ سکندر جب یونان سے چلا تو اس کے پاس

چالیس ہزار کے قریب سپاہ تھی۔ خیال تھا کہ راستے کی یونانی نوآبادیوں سے بھی بھاری تعداد میں رضاکار یونانی فوج میں شامل ہو جائیں گے مگر یہ امید بر نہیں آئی تھی۔ یونانی و مقدونوی فوج میں شامل ہو کر ایرانی شہروں پر حملہ کرنے کے سلسلے میں بہت کم لوگوں نے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔ بہر حال سکندر کو اس سے کچھ زیادہ فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ وہ دل میں نہ صرف ایران پر قابض ہونے کا تہیہ کر چکا تھا بلکہ اس سے بھی بہت آگے جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے سرداروں میں بیٹھ کر ہمہ وقت روئے زمین کے نقشوں کی باتیں کرتا رہتا اور ان انجانی سرزمیوں کے خواب دیکھتا تھا جن کے تذکرے اس نے عالموں سے سنے تھے اور درسی اور تحقیقی کتابوں میں پڑھے تھے۔

شام کا وقت تھا، تابان گھوڑے پر سوار پڑاؤ سے نکلا اور مغربی جانب کے بے آباد ٹیلوں پر آگیا۔ یہ جگہ بلندی پر واقعہ تھی نہ صرف یہاں سے ہیلی کارنیس کی بلند و بالا فصیل نظر آتی تھی بلکہ وہ مقدونوی لشکر بھی دور دور تک دکھائی دیتا تھا جس نے شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ تابان محویت سے دیکھنے لگا۔ حد نگاہ تک رنگ برنگ پرچم اڑ رہے تھے۔ ان پرچموں تلے پرجوش سپاہیوں کے جتھے نقل و حرکت میں مصروف تھے۔ محاصرہ کرتے ہی سکندر نے فوج

کے انجینئروں کو بڑے بڑے برج بنانے کا حکم دے دیا تھا۔ ان برجوں سے نہ صرف شہر پناہ پر اچھی نگاہ رکھی جا سکتی تھی بلکہ دشمن پر کارگر تیر اندازی بھی ہو سکتی تھی۔ ان برجوں کی تعمیر کے ساتھ ہی منجنیقوں کی نقل و حرکت کا کام بھی جاری تھا۔ شہر پناہ کے ارد گرد ہر بلند مقام پر مورچے کھودے جا رہے تھے اور حفاظت کے لئے عارضی دیواریں تعمیر ہو رہی تھیں۔ سکندر اہل شہر پر واضح کر دینا چاہتا تھا کہ وہ ہمت ہار کر یہاں سے جانے والا نہیں۔ وہ طویل محاصرے کے لئے پوری طرح تیار ہے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر ہی آگے جائے گا۔ بلند پختہ فصیل پر چلتے پھرتے ایرانی سپاہی تابان کو بوٹوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ ان کے جسموں پر ہتھیار چمک رہے تھے اور حرکات و سکنات میں چستی تھی۔ تابان نے سوچا اس بلند فصیل کے پیچھے ہیلی کارنیس کا گنجان شہر ہو گا۔ گلیاں ہوں گی، بازار ہوں گے، باغات اور محلات ہوں گے اور انہی در و دیوار میں کہیں وہ قدیم عبادت گاہ ہو گی جہاں مارشا کا حسین و جمیل وجود کسی مورتی کی طرح سجا ہوا ہو گا۔

اس کا جی چاہا کہ پوری قوت سے شہزادی کا نام پکارے اور اس کی صدا بلند و بالا رکاوٹوں کو پار کرتی ہوئی مارشا کے کانوں تک پہنچ جائے۔ اچانک تابان نے دیکھا ایک بہت بڑا گول پتھر ہوا

میں تیرتا ہوا فصیل کی طرف جارہا ہے۔ پھر ایک خوفناک دھماکے سے زمین دہل گئی۔ تابان سمجھ گیا کہ فصیل پر سنگ باری شروع ہوگئی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی منجنیقیں فصیل کی طرف پتھر چلانے لگیں۔ یہ کوئی معمولی پتھر نہیں تھے۔ ان میں بڑی بڑی چٹانیں بھی تھیں۔ جنہیں فوجی سنگ تراشوں نے تراش کر گولوں کی شکل دے دی تھی۔ انجنئیر ویادس کی تیار کردہ طاقتور منجنیقوں کے ذریعے یہ پتھر حیرت انگیز قوت سے فصیل کی طرف جارہے تھے۔ یکے بعد دیگرے ہونے والے دھماکوں نے ایک طویل گڑگڑاہٹ کی صورت اختیار کرلی اور تابان کو فصیل پر ہر طرف سراسیمگی کے آثار نظر آئے۔ چہل قدمی کرنے والے ایرانی دستے محفوظ برجیوں میں جاچھپے اور وہاں سے تیر اندازی کرنے لگے۔ اس دوران تابان کو اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے گھوم کر دیکھا، سامنے کورا کھڑی تھی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور شفاف گردن پسینے میں تر تھی۔ وہ پڑاؤ سے بھاگتی ہوئی یہاں پہنچی تھی۔ اس نے ہراساں نظروں سے تابان کو دیکھا پھر دور فصیل کی جانب دیکھنے لگی جہاں منجنیقوں کے گولے برس رہے تھے۔

"کیا بات ہے کورا؟" تابان نے نرمی سے پوچھا۔

"مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو، خود دیکھ لو۔ کیا جنگ شروع نہیں ہوگئی؟"

تابان دھیرے سے مسکرایا۔ "نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ ابھی شروع نہیں ہوئی۔ یہ تو معمولی سا ہنگامہ ہے۔ ایسے ہنگامے ہر روز دو تین مرتبہ ہوا کریں گے۔ مقصد محصور فوج کو پریشان کرنا ہے۔ بڑا حملہ اس وقت ہوگا جب دوسرے تمام حربے ناکام ہوجائیں گے۔"

کورا کا وجود دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ تابان کے حوصلہ بخش انداز سے اسے کچھ اطمینان ہوا۔ وہ سر جھکا کر تابان کے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔ تاثرات رودینے والے تھے۔ وہ آنسو روکنے کے لئے نچلا ہونٹ مسلسل دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟ پریشان ہو؟" تابان نے پوچھا۔

"مجھے اکیلا مت چھوڑا کرو تابان!" کورا نے روہانسی آواز میں کہا۔ "تمہارے بغیر مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ بھیڑیا میری تاک میں ہے۔ جونہی تم نے مجھ سے نگاہ پھیر وہ مجھے چیر پھاڑ جائے گا۔"

تابان جان گیا کورا کا اشارہ شلال کی طرف تھا۔ اس نے کورا کے نزدیک بیٹھ کر بڑی محبت سے اس کے گلے میں بانہیں ڈالی اور کندھے سے لگالیا۔ "وہ تمہاری پرچھائیں کو بھی نہیں چھو

سکتا۔ وہ تو خود موت کے آگے بھاگ رہا ہے۔ ممکن ہے وہ بحر متوسط پار کر کے ایران سے ہی نکل چکا ہو اور اگر ایسا نہیں ہوا تو تم ایک دو روز میں اس کی موت کی خبر سن لو گی۔ مقدونوی چھاپا مار شکاری کتوں کی طرح اس کی بو سونگھ رہے ہیں۔"

کورا قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ اس نے آنسو پونچھ کر تابان کی طرف دیکھا اور بولی۔

"سالارِ اعظم بہت اچھے ہیں۔ میں نے شروع سے ہی انہیں انصاف پسند پایا ہے۔ تم خوامخواہ ان کی نیت پر شبہ کرتے رہے۔"

"ہاں!" تابان نے گھمبیر آواز میں کہا۔ "مجھ سے یہ خطا ہوئی ہے۔ مارشا کی گمشدگی نے مجھے دیوانہ کر رکھا تھا۔ دل میں سو طرح کے وسوسے جاگتے تھے۔ سالار اعظم کی خاموشی نے میرے شک کو تقویت دی اور ایک موقع پر مجھے یقین ہونے لگا کہ مارشا سالار اعظم کے قبضے میں ہے۔"

کورا نے عجیب نظروں سے تابان کو دیکھا پھر نگاہ جھکا کر بولی۔ "کسی نے سچ کہا ہے محبت اندھی ہوتی ہے، اسے اپنے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔"

تابان مسکرایا۔ "تم بڑی سمجھداری کی باتیں کرتی ہو۔ اگر میری زندگی میں شہزادی مارشا نہ ہوتی تو شاید میں تمہیں دل دے بیٹھتا۔"

کورا کے رخسار شہابی ہو گئے۔ ہونٹ تھرائے لیکن وہ کچھ نہ بول سکی۔ تابان نے کہا۔ "کورا تم ایک عورت ہو۔ عورت کے دل کو اچھی طرح سمجھتی ہو، تم شہزادی کے قریب بھی رہی ہو۔ میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"

کورا رضامندی سے تابان کی طرف دیکھنے لگی۔ تابان نے کہا۔ "جب ایتھنز تباہ ہوا، شہادی کی شادی تھسلی کے کسی امیر زادے سے ہونے والی تھی۔ اس شادی کی تیاریاں بھی وسیع پیانے پر شروع ہو چکی تھیں۔ تمہارا کیا خیال ہے شہزادی اس شادی پر رضامند تھی؟"

کورا نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ہاں۔۔۔۔۔۔۔ وہ رضامند ھتی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ اس امیر زادے کو پسند کرتی تھی؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا؟"

"تو پھر کیا کہا ہے؟"

"میں نے کہا ہے کہ وہ اس شادی پر رضامند تھی۔۔۔۔۔۔ دراصل۔۔۔۔۔۔۔۔" کورا کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ تابان نے اصرار کیا کہ وہ بات پوری کرے۔ کورا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "دراصل۔۔۔۔۔۔۔ شہزادی پر لڑکپن سے بے تحاشا پابندیاں تھیں وہ بے حد خوبصورت تھی لہذا انہیں سات پردوں میں چھپا کر رکھا جاتا تھا۔ مرد تو مرد انہیں محل کی عام عورتوں سے بھی پردہ کرایا جاتا تھا۔ آقا غارس زنوب اور ملکن نورا ہر وقت شہزای پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ایک قدم کے بعد دوسرا قدم اٹھانے سے پہلے شہزادی کو والدین سے پوچھنا پڑتا تھا۔ ایسی صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی شادی پر رضامندی ظاہر نہ کرتیں۔ انہیں تو کسی پتھر سے بھی بیاہ دیا جاتا تو وہ لب نہ ہلاتیں۔"

تابان کے سینے میں خوشگوار دھڑکنیں جاگنے لگیں۔ اس نے بے تکلفی سے کورا کی آغوش میں سر رکھا اور نرم گھاس پر دراز ہو گیا۔ اس کی شفاف آنکھیں کہیں بہت دور دیکھ رہی تھیں۔

"کورا تم میرے دل کی بات شہزادی تک پہنچاؤ گی؟"

کورا نے کہا۔ "تم نے مجھے برابری کا درجہ دے رکھا ہے لیکن میں یہ فراموش نہیں کر سکتی کہ میں تمہاری کنیز ہوں اور ایک کنیز آقا کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ جو تم کہو گے میں کروں گی اس کے بعد۔۔۔۔۔۔۔"

کورا پھر خاموش ہو گئی۔ تابان بگڑ کر بولا۔ "کورا، بات مکمل کیا کرو کیوں میرے صبر کا امتحان لیتی ہو۔"

کورا نے کہا۔ "اس کے بعد تمہاری قسمت۔" اور بات مکمل کر دی۔

تابان نے آنکھیں بند کر لیں۔ "میرا دل گواہی دیتا ہے کورا، میری قسمت میں شہزادی ہے، اور اگر شہزادی نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہے۔" تابان کی مدھم آواز کسی جادوئی سرسراہٹ کی طرح فضا میں بکھر گئی۔۔۔۔۔۔ دور قلعے کی فصیل پر ابھی بھی اکا دکا دھماکے ہو رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہیلی کارنیس کا محاصرہ طویل ہوا اور ہوتا چلا گیا۔ شہر میں خوراک کے وافر ذخائر تھے۔ فصیل مضبوط تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہریوں کو روڈز کے کماندار میمنان کی مدد بھی حاصل

تھی۔ جنگ گرینی کس سے بچ نکلنے والا یہ مشہور سالار بے شمار تنخواہ دار یونانیوں اور ایرانیوں کے ہمراہ شہر میں پہنچ چکا تھا (اس سے پہلے ملی ٹس کے مقام پر میمنان اور سکندر کا آمنا سامنا ہو چکا تھا لیکن براہ راست ٹکراؤ کی نوبت نہیں پہنچی تھی۔ اس لڑائی میں میمنان اپنے بحری بیڑے کے ساتھ سمندر میں رہا تھا اور سکندر نے خشکی پر قدم جمائے رکھے تھے۔ تاہم اب صورت حال مختلف تھی میمنان محاصرے سے چند روز پہلے شہر میں داخل ہوا تھا اور اب مزاحمتی کاروائیوں کی بھرپور نگرانی کر رہا تھا۔ ہیلی کارنیس میں یقیناً کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو خونریزی سے بچنے کے لئے سکندر سے شرائط طے کر کے شہر کے دروازے کھولنا چاہتے ہوں گے لیکن میمنان کی موجودگی نے پرامن تصفیے کے ہر امکان کو ختم کر رکھا تھا۔ میمنان فطرتاً جنگجو شخص تھا اور اس کے خیالات شہر کے امن پسند باشندوں سے قطعی مختلف تھے جو اس سے پہلے ایرانیوں کی اطاعت قبول کئے ہوئے تھے اور اب انہی شرائط پر سکندر کی حکمرانی بھی گوارا کر سکتے تھے۔

دوسری طرف گزرنے والے ہر دن کے ساتھ مقدونوی سپاہیوں کی اکتاہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ شہر کی فصیل کے گرد بیٹھے بیٹھے وہ تنگ آ چکے تھے۔ ان کی بیزاری کم کرنے کے

لئے سکندر روزانہ فصیل پر سنگ باری کراتا۔ کبھی کبھی وہ ایسے احکامات بھی جاری کرتا جن سے ظاہر ہوتا کہ بڑا حملہ ہونے ہی والا ہے۔ روزانہ کی جنگی مشقیں بھی زور شور سے جاری تھیں۔ اس طرح کئی ہفتے گزر گئے۔ وہ ایک چاندنی رات تھی۔ قلعے کی فصیل اور گردونواح کا علاقہ چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ تابان اپنے خیمے میں موجود تھا۔ اس کے یک ہزاری دستے کے کئی کماندار بھی خیمے میں براجمان تھے۔ ایسا عجیب و غریب سالار انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا جو اپنے ماتحتوں کے ساتھ آلتی پالتی مار کر بیٹھتا تھا اور جس کے چہرے پر ہر وقت ایک عجیب بھولپن چھایا رہتا تھا۔ جب وہ قہقہہ لگا کر ہنستا تھا تو یہ بھولپن اور بھی نمایاں ہو جاتا تھا۔ خیمے سے باہر ہوا میں خنکی تھی۔ مٹی کے آتشدان میں آگ جل رہی تھی اور وہ سب اس کے گرد بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ ایک سپاہی کہیں سے شراب کی صراحی لے آیا۔ مہ نوش پیالے بھر بھر کر پینے لگے۔ اداسی اور اکتاہٹ کو نشے میں ڈبونے کی کوشش دیر تک جاری رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محفل رنگ پر آتی گئی۔ چھوٹے بڑے کمانداروں کا امتیاز ختم ہو گیا۔ وہ پھر بے تکلفی سے ہنسی مذاق کرنے لگے۔ ایک سپاہی نے لہک لہک کر جنگی گانا شروع کر دیا۔ اس یونانی زبان کے ترانے کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔

کیا ہوا جو ہم وطن سے دور ہیں

ہم وہاں بھی شیر تھے ہم یہاں بھی شیر ہیں۔

میمنان کے پاس جنگی جہاز ہیں تو کوئی ڈر نہیں۔

ہمارے پاس حوصلہ ہے اور آہنی بازو ہیں۔

تم دیکھو گے جب وقت آئے گا۔

ہم اپنے تجارتی جہازوں کو دشمن کے جنگی بیڑوں سے لڑا دیں گے۔

اور زیوس دیوتا کی مہربانیوں سے

بحر و بر پر فتح ہماری ہو گی۔

ایک دوسرا سپاہی نشے میں جھوم کر بولا۔ "یہ تم کیا بے ہودہ شعر لے بیٹھے ہو۔ یہ میدان جنگ نہیں چاندنی کی بساط ہے۔ ایسی راتوں میں خون خرابے کی نہیں خوش ادا حسیناؤں اور ان کے ریشمی اجسام کی باتیں کرتے ہیں اور اس شہد کی باتیں کرتے ہیں جو ان کے ہونٹوں سے ٹپکتا اور آنکھوں سے چھلکتا ہے۔ پھر وہ جھوم جھوم کر ایک ایسی قدیم نظم پڑھنے لگا جس

میں سرد راتوں اور گرم لمس کا تذکرہ تھا اور ان سرگوشیوں کی بات تھی جنہیں سن کر مہ وشوں کی جبینیں عرق آلود اور آنکھیں نیم باز ہو جاتی ہیں۔

سپاہی نے اسے طعنہ دیا۔ "تم سپاہی نہیں مسخرے ہو۔ اگر تمہیں بیوی بچے یاد آ رہے ہیں تو کماندار سے رخصت لے کر واپس چلے جاؤ۔ یہ میدانِ کارزار ہے یہاں لب و رخسار کی نہیں تیر و تفنگ کی باتیں ہوں گی۔"

دوسرے سپاہی کو یہ طعنہ ناگوار گزرا، بگڑ کر بولا۔ "تم بہادر نہیں بے وقوف ہو۔ بہار میں خزاں کا رونا رو رہے ہو اور مصیبت سے پہلے ہی واویلا کر رہے ہو۔ میں نے تم سے بڑے جی دار دیکھے ہیں جب جنگی ترانے الاپنے کا وقت ہوتا ہے وہ الاماں پکار رہے ہوتے ہیں۔ اگر بہت بھروسہ ہے بازوؤں پر تو ابھی میدان جنگ میں نکل کر اور دشمن کو للکار کر دیکھ لو۔ معلوم ہو جائے گا کون کتنے پانی میں ہے۔"

پہلا سپاہی تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ کا جام ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کیا اور غرا کر بولا۔ "چلو آؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ ابھی آؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ دیکھتے ہیں کون فصیل پر چڑھتا ہے اور کتنے دشمنوں کو قتل کرتا ہے۔"

دوسرے سپاہی نے بھڑک کر تلوار کھینچ لی اور جھومتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ کماندار ہنسنے لگے ایک کماندار نے پہلی سپاہی کو جھانپڑ رسید کیا۔ دو دوسرے کمانداروں نے دوسرے سپاہی کو دبوچ کر نیچے بٹھالیا۔ تابان نے ہلکے پھلکے انداز میں انہیں سرزنش کی اور کہا کہ وہ آپے میں رہیں یہ نہ ہو الٹا لٹکا کر ساری شراب انکے اندر سے نکالنا پڑے۔ دستے کے پنج صدی سالار نے اس واقعہ سے ملتا جلتا ایک واقعہ سنانا شروع کر دیا جو انہیں ملی ٹس کی لڑائی میں پیش آیا۔ یہ واقعہ طویل ہوتا چلا گیا اور رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ کچھ حاضرین اس داستان گوئی کے دوران ہی اٹھ کر چلے گئے باقی داستان ختم ہونے کے بعد اپنے اپنے خیموں میں لوٹ گئے۔ چند کماندار جو زیادہ نشے میں تھے تابان کے خیمے میں ہی پڑ رہے۔ تابان نے شراب نہیں پی تھی لیکن نیند اسے بھی بہت زور کی آ رہی تھی۔ وہ جس جگہ بیٹھا تھا وہیں ایک تکئے سے ٹیک لگا کر سو گیا۔

معلوم نہیں وہ کتنی دیر سویا رہا اچانک اس کی آنکھ ایک نامانوس شور سے کھل گئی اس نے لیٹے لیٹے کان لگا کر سنا۔ فصیل کی جانب سے ایک للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ کوئی یونانی زبان میں بولا۔ "ہمت ہے تو باہر آؤ۔۔۔۔۔۔۔ نکلو۔۔۔۔۔۔۔ مقابلہ کرو ہم سے۔"

نشے میں ڈوبی ہوئی ایک دوسری آواز سنائی دی۔ "چوہو! نکلو باہر اپنے سوراخوں سے تمہارے سر نہ کچل دیے تو نام نہیں۔۔۔۔۔۔۔"

دفعتاً تابان ان چیختی چلاتی آوازوں کو پہچان گیا۔ یہ وہی سپاہی تھے جو تھوڑی دیر پہلے خیمے میں بیٹھے بڑی ہانک رہے تھے۔ نشے نے ان کی عقل خبط کر لی تھی اور وہ اپنی بڑوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فصیل کے قریب چلے گئے تھے۔ ان کے یہ للکارے ایرانی سپاہیوں کے لئے تھے۔ یہ صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ فصیل کے اس حصے میں ایرانیوں کا دفاع بہت مضبوط تھا۔ مقدونوی سپاہی جس طرح انہیں اشتعال دلا رہے تھے کوئی بھی ناخوشگوار صورتِ حال پیش آسکتی تھی۔ ابھی تابان یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایکا ایکی زوردار نعرے گونجے تابان اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا، سرہانے رکھے میان سے تلوار کھینچی اور باہر کی طرف لپکا رات کا آخری پہر تھا، چاندنی کا زاویہ بدل چکا تھا لیکن آب و تاب میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ تابان نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک ہنگامہ خیز منظر دیکھا۔ شہر کا دروازہ کھل گیا تھا اور اس میں سے ایرانی سپاہی سیلاب کی طرح امڈے آ رہے تھے۔ ان کا رخ ان دو مقدونوی سپاہیوں کی طرف تھا جو فصیل سے صرف دو سو گز کی دوری پر ٹانگیں پھیلائی کھڑے تھے۔

ایرانی سپاہی غضبناک انداز میں جھپٹ رہے تھے۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ قریب پہنچتے ہی ان دونوں سپاہیوں کے ٹکڑے کر دیں گے۔ تابان حلق کی پوری قوت سے چیخا۔ "بھاگو!" مقدونوی سپاہی جیسے سکتے کی کیفیت سے باہر آئے اور مڑ کر تیزی سے بھاگے۔ فصیل سے قریباً ڈیڑھ سو گز کی دوری پر ایک چٹان زمین میں دھنسی ہوئی تھی۔ دونوں سپاہیوں نے چٹان کے پیچھے پناہ لے لی اور ایرانیوں پر تابڑ توڑ تیر برسانے لگے۔ تابان کو اندازہ ہوا کہ شرابی سپاہیوں نے ایرانیوں کو خاصا مشتعل کر رکھا ہے۔ وہ غلیظ گالیاں بک رہے تھے اور تیروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سپاہیوں کو گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے تابان واپس خیمے میں گیا۔ پہلے تو اس نے ساتھیوں کو آوازیں دیں پھر جھنجھوڑ کر انہیں جگانا چاہا۔ ان میں سے بیشتر مدہوش پڑے تھے۔ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

دو تین افراد اٹھے اور بدحواسی میں ہتھیار ڈھونڈنے لگے۔ تابان پھر باہر لپکا۔ ایرانی سپاہیوں کی تعداد سو سے کم ہرگز نہیں تھی۔ وہ دونوں مقدونوی سپاہیوں کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ مقدونوی سپاہیوں نے بے وقوفی کی تھی لیکن کچھ بھی تھا وہ تابان کے دستے کے سپاہی تھے۔ انہیں بچانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری تابان پر عائد ہوتی تھی۔ وہ تلوار سونت کر

"دلیرانہ" اپنے سپاہوں کی طرف بڑھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسرے سپاہیوں کو بیدار کرنے کے لئے چلاتا بھی جا رہا تھا۔ ایرانی سپاہیوں نے تابان کو چٹان کی جانب بڑھتے دیکھا تو تیزے ی سے تیر برسائے۔ کئی تیر اس کے دائیں بائیں سے گزر گئے۔ جھک کر بھاگتے بھاگتے اس نے جست لگائی اور چٹان کی اوٹ میں گرا۔ دو ایرانی سپاہی چٹان کے بالکل پاس پہنچ چکے تھے۔ تابان نے اوٹ سے نکل کر یک بارگی ان پر حملہ کیا۔ اس کی وزنی تلوار ایک سپاہی کی ذرہ توڑتی ہوئی سینے میں اتر گئی اور وہ پلٹ کر پیچھے جا گرا۔ دوسرا سپاہی بڑی بے جگری سے تابان پر آیا۔ تابان نے چند وار مہارت سے روک کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔ بیس ایرانی اور آ گئے۔ اب تابان کے پانچ چھ ساتھی اس کی مدد کو آ گئے تھے۔ ان سب نے مل کر ایک زوردار نعرہ لگایا اور ایرانیوں سے بھڑ گئے۔ تلوار بازی شروع ہوتے ہی تیر اندازی رک گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چٹان کے ارد گرد گھمسان کا رن پڑ گیا۔ دونوں طرف کے کم از کم چار سو سپاہی اس لڑائی میں شریک ہو چکے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے عام حملہ ہو گیا ہے۔ ایرانی سپاہیوں میں لمبے نیزوں والا ایک دستہ شامل تھا۔ اس دستے نے مقدونوی سپاہیوں کو خاصا نقصان پہنچایا کئی سپاہی ہلاک و زخمی ہو گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں ایک دستہ سالار بھی شامل تھا۔ دستہ سالار کی سر بریدہ لاش دیکھ کر تابان کے سپاہیوں نے پورے جوش سے حملہ کیا اور ایرانیوں کو

ایک درجن لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ تابان کی ہدایت پر اس کے سپاہیوں نے بھاگنے والوں کا پیچھا کیا، وہ اس کوشش میں تھے کہ واپس جانے والے ایرانیوں کے ساتھ ہی فصیل تک پہنچ جائیں اور کسی طرح ایرانیوں کو دروازہ بند کرنے سے روک دیں۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو مقدونوی سپاہویں کا سیلاب بلاخیز دروازے پر امڈ پڑتا اور وہ حفاظتی حصار ٹوٹ جاتا جس نے کئی ہفتوں سے سکندری فوج کو شہر سے باہر روک رکھا تھا۔ دروازے تک پہنچنے والوں میں تابان سب سے آگے تھا۔ اس کے جبڑے بھینچے ہوئے اور آنکھوں میں انگاروں کی جلن تھی۔ ایرانی سپاہیوں نے جب دیکھا کہ لینے کے دینے پڑ گئے ہیں اور مقدونوی سپاہی ان کے ساتھ ہی دروازے میں داخل ہو جانا چاہتے ہیں تو وہ واپس پلٹے اور ایک بار پھر مقدونوی دستے سے ٹکرا گئے۔ تاہم اس دفعہ مقابلہ کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ بمشکل تیس افراد ہوں گے اور ان میں سے بھی کچھ دروازے میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر اچانک بلند و بالا دروازہ ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ جو ایرانی سپاہی باہر رہ گئے وہ تابان وغیرہ کے لئے تر لقمہ تھے۔ ان میں سے کچھ تو قتل ہوئے اور باقیوں کو تابان اور اس کے ساتھی اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے واپس پڑاؤ میں آ گئے۔

علی الصبح سکندر کو اس جھڑپ کی خبر ملی۔ اس نے تابان کو بلایا۔ جانی نقصان ہوا تھا لیکن سکندر اس بات پر خوش تھا کہ تابان نے دونوں سپاہیوں کو ایرانیوں کے قبضے میں نہیں جانے دیا۔ اس واقعے سے جہاں مقدونوی سپاہیوں کے حوصلے بلند ہوئے تھے وہاں محصور فوج کو بھی حملہ آور فوج کی طاقت کا تھوڑا سا اندازہ ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اپنے ہلاک شدگان کی موت کا بدلہ لینے کے لئے سکندر نے دوپہر کے وقت شہر کی فصیل پر زبردست سنگ باری کروائی۔ جانبازوں کی مختلف ٹولیوں نے ڈھالوں کے سائے تلے شہر کے دروازوں پر بار بار ہلہ بولا اور انہیں نقصان پہنچایا۔ شام تک فصیل کئی جگہوں سے ٹوٹ چکی تھی اور ایرانی معمار مسلسل اسے مرمت کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ سکندر شہر پر حملہ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے فصیل کے گرد ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ محصور فوج کو ہر لحظہ یہی محسوس ہوتا تھا کہ بڑا حملہ ہونے والا ہے۔ یہ ایک ایسا نفسیاتی دباؤ تھا جس کے بوجھ تلے شہر کے عوام و خواص چور چور ہو رہے تھے۔

دوسرے تیسرے روز سکندر کو نہایت اہم ذرائع سے اطلاع ملی کہ "میمنان" شہر خالی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ روسائے شہر کوئی ایسا طریقہ وضع کرنے میں مصروف ہیں

جس سے شہر اور اہل شہر کا کم سے کم نقصان ہو اور انہیں ہزیمت بھی نہ اٹھانی پڑے۔ ان ذرائع نے یہ خبر بھی دی کہ میمنان نے شہر میں موجود منجنیقیں اور ہتھیاروں کے ذخائر تباہ کرنے شروع کر دیے ہیں اور اناج کے ذخیروں کو آگ لگائی جا رہی ہے۔ یہ اطلاع سننے کے بعد سکندر فوراً اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ مقابل فوج کی کمرِ ہمت ٹوٹ چکی ہے اور اب اسے مہلت دینا اپنی چمکتی دمکتی فتح کو داغدار کرنے سے مترادف ہے۔ اس رات نہایت خاموشی سے تیاری کی گئی اور اگلے روز علی الصبح بھرپور حملے کا حکم دے دیا گیا۔

تابان جسم پر مکمل ہتھیار سجائے جنگی گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کا نصف دستہ میمنہ کے ہراول میں شامل کر لیا گیا جبکہ نصف پچھلی صفوں میں تھا۔ حملے کے آغاز سے قبل تابان نے دیکھا قلعے کی فصیل پر اکا دکا پہریدار نظر آ رہے تھے۔ وہ سست قدموں سے روزمرہ کے گشت میں مصروف تھے۔ انہیں مولوم نہیں تھا، موت ان کے سروں پر منڈلا رہی تھی۔ جس طوفانی یلغار نے انہیں کئی شب و روز سے خوفزدہ کر رکھا تھا وہ آ ہی چاہتی ہے۔ مقدونی لشکر کی صف بندی سے بالکل ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑا حملہ کرنے والے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ عسکری مشقوں کی تیاری کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ جب اچانک فلک

شگاف نعرے بلند ہوئے اور مختلف سمتوں سے مقدونوی و یونانی سپاہی سیلاب کی مانند فصیل کی جانب بڑھے تو اوپر کھڑے پہریداروں اور تیر اندازوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ مستعدی سے مورچہ زن ہوتے اور حملہ آوروں پر سنگ و آہن کی بارش کرتے سینکڑوں سیڑھیاں فصیل سے لگ گئیں اور لاتعداد مقدونوی جانباز حشرات الارض کی مانند فصیل پر چڑھنے لگے۔ یہ ایک دیدنی منظر تھا۔ تابان نے حیرت سے ان جنگ بازوں کو دیکھا جو پتھروں اور نیزوں کی بارش میں جان ہتھیلی پر لئے اوپر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اس وقت تابان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ بھی کبھی کسی ایسی ہی دلیرانہ کاروائی میں حصہ لے۔ فی الوقت تابان کو اپنے دستے کے ساتھ کوئی دروازہ کھلنے کا انتظار کرنا تھا اور زور مار کر اندر گھسنے کی کوشش کرنا تھی۔ اس کام کے لئے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا جلد ہی فصیل پر جنگ کا ہنگامہ عروج پر پہنچ گیا۔ فصیل کے ایک شکستہ حصے پر مقدونوی سپاہیوں نے سینکڑوں ایرانیوں اور تنخواہ دار یونانیوں کو تہہ تیغ کر کے نیچے جانے کا راستہ بنا لیا اور دو دروازے کھول دیے۔ منتظر مقدونوی رسالوں نے گھوڑوں کو ایڑی لگائی اور آب دار تلواریں چمکاتے شاندار رفتار سے دروازوں پر جھپٹے۔ دونوں مقامات پر خونریز لڑائی ہوئی۔ جھمگٹے کے باعث لمبی تلواریں اور برچھیاں بیکار ہو گئیں تو پیش قبض اور خنجر چلائے

گئے۔۔۔۔۔۔ آخر مقدونوی دستے لاشوں کے ڈھیر روند کر شہر میں داخل ہو گئے۔ تابان نے لڑتے لڑتے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مقدونوی سپاہیوں کا سیلِ رواں دروازوں کی طرف بڑھا آرہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب فتح اور مقدونوی فوج کے درمیان کوئی شے حائل نہیں۔ ہیلی کارنیس کا شہر جو اپنے خوبصورت آثار قدیمہ، اپنی خوشحالی اور گہما گہمی کی وجہ سے مشہور تھا، مقدونوی سپاہ کے قدموں تلے دہل رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سکندر نے ایک بڑے رتھ میں سوار شہر کا چکر لگایا۔ گلیوں میں جابجا ایرانیوں اور تنخواہ دار یونانیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ گھروں سے رونے پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں اور پورے شہر پر انجانا خوف مسلط تھا۔ ایک بازار سے گزرتے ہوئے سکندر کو اطلاع ملی کہ فتح کے نشے میں چور کچھ مقدونوی سپاہی ایک محلے سے کئی نوجوان لڑکیوں کو گھوڑا گاڑیوں میں بٹھا کر لے گئے ہیں سکندر نے فوراً حکم جاری کر دیا کہ کوئی سپاہی کسی گھر میں گھسنے کی کوشش نہ کرے۔ نہ لوٹ مار کی جائے اور نہ کسی عمارت کو نقصان پہنچایا جائے۔ سکندر کو شہر کا تعمیراتی حسن بہت متاثر کر رہا تھا اور وہ اس حسن کو غارت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شہر کے وسط میں سکندر کو

اطلاع ملی کہ روڈز کا سالار میمنان بہت سی فوج کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب رہا ہے۔ اس کی باقی ماندہ فوج شہر کے دو محفوظ گوشوں میں محصور بیٹھ گئی ہے اور مسلسل مزاحمت کر رہی ہے۔ کمانداروں نے اجازت طلب کی کہ بھرپور حملہ کر کے ان محصورین کو کچل دیا جائے لیکن سکندر نے اجازت نہیں دی۔ وہ شہر کے آثارِ قدیمہ کو ہر نقصان سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے دو یک ہزاری دستوں کو حکم دیا کہ وہ مزاحمت کرنے والے ایرانیوں کو مکمل طور پر محاصرے میں لے لیں جن کمانداروں کو محاصرے کا حکم ملا ان میں تابان بھی شامل تھا۔ وہ دست بستہ سکندر کی خدمت میں پیش ہوا اور گزارش کے انداز میں بولا۔

"سالارِ اعظم! میں آپ کو شہزادی کے بارے میں یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ کہیں وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔"

تابان کا مقصد پورا ہو گیا۔ سکندر کو سب کچھ یاد آگیا۔ وہ بولا۔ "تم نے بہت اچھا کیا ہمیں یاد دلا دیا۔ ہم محاصرے کے لئے تمہاری جگہ کسی اور کو بھیجیں گے۔ تم فوراً کسی باخبر شخص کو ساتھ لو اور شہزادی کو برآمد کرو۔"

تابان خوشی سے پھولے نہیں سمایا۔ تعظیم پیش کر کے فوراً واپس مڑا۔ سامنے اسے حبشی یرغا نظر آیا۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اطمینان سے تابان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آنکھوں میں وہی اداس نمی تھی جو اس کی شخصیت کو پر اسرار بنا دیتی تھی۔ تابان نے کہا۔

"محترم سردار! آپ میرے ساتھ اس عبادت گاہ تک چلیں گے جہاں شہزادی رہتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے جہاں اسے قید کیا گیا ہے۔"

یرغا، تابان کی بے تابی دیکھ کر زیر لب مسکرایا۔ "میں تو خود تمہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ تمہیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ چلو آؤ میں خود تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

دونوں گھوڑے بھگاتے ہوئے ہجوم سے نکلے اور جنوبی رخ پر روانہ ہو گئے۔ تابان کے دستے کے پچاس سوار بھی پیچھے پیچھے چل دیئے۔ تابان کی بے تابی عروج پر تھی کسی وقت وہ تیز رفتاری سے گھوڑا بھگاتے ہوئے یرغا سے بھی آگے نکل جاتا تب اسے خیال آتا کہ وہ تو راستے سے واقف ہی نہیں، وہ رفتار دھیمی کر کے پھر یرغا سے آملتا۔ گلیوں بازاروں میں متحدہ یونانی جمعیت کے سپاہی فاتحانہ نعرے لگانے میں مصروف تھے۔ لاشوں کو ٹھکانے لگایا جا رہا تھا اور

کئی جگہ اس آگ کو بجھانے کی کوشش کی جا رہی تھی جو میمنان کے سپاہی بھاگتے ہوئے غلے کے ذخیروں کو لگا گئے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد تابان اور سیاہ فام یرغا اپنے گھوڑے کو دوڑاتے ایک عظیم الشان عمارت کے سامنے پہنچے۔ یہ عمارت گو شہر پناہ کے اندر ہی تھی لیکن اس کے چاروں طرف ایک وسیع میدان تھا اور چھوٹے چھوٹے تالاب بنے ہوئے تھے۔ جہاں ان تالابوں کا سلسلہ ختم ہوتا تھا وہاں سنگِ سرخ سے بنی ہوئی وسیع و عریض سیڑھیاں تھیں۔ یہ سیڑھیاں تابان یرغا اور انکے ساتھیوں کو ایک بیکراں صحن میں لے آئیں اس صحن کی جانب کئی ایک فلک بوس ستون تھے۔ ان ستونوں کے بالائی سروں پر بڑے بڑے پیالے تھے اور ان میں آگ جل رہی تھی۔ ان دیوہیکل ستونوں اور آگ کے بھڑکتے شعلوں کو دیکھ کر دل پر ہیبت سی طاری ہوتی تھی۔ ستونوں کے عقب میں ایک عمارت تھی۔ یہ عمارت بھی سیڑھیوں اور ستونوں کی طرح اپنے حجم اور وسعت میں غیر معمولی تھی۔ تابان اور یرغا بھاگتے ہوئے اس عمارت کے بلند و بالا چھت تلے پہنچے تو ان کے جوتوں کی ٹھک ٹھک دور تک گونج گئی۔ عمارت کے صدر دروازے پر تابان کو کم از کم پچاس خوبصورت دوشیزاؤں کی لاشیں دکھائی دیں۔ ان سب کو

پیٹ یا سینے میں نیزہ گھونپ کر ہلاک کیا گیا تھا۔ وہ الٹی سیدھی سنگ مرمر کے فرش پر پڑی تھیں اور ان کا لہو دور تک پھیل کر جم چکا تھا۔ سب دوشیزاوں کے لباس ایک جیسے تھے۔ سفید قبائیں جن پر سینے کی جانب زربفت کی پٹیاں تھی۔ ارستوانی شکل کی ٹوپیاں جن کے سرخ فیتے ٹھوڑیوں کے نیچے بندھے ہوئے تھے۔ سب کے پاؤں ننگے تھے۔ تابان کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ اس عبادت گاہ کی خادمائیں ہیں جنہیں قابض فوج سے محفوظ رکھنے کے لئے عبادت گاہ کے منتظمین نے ہلاک کر دیا ہے۔ آثار سے نظر آتا تھا کہ عمارت میں اب کوئی ذی نفس موجود نہیں۔ تابان نے بلند و بالا دروازے کو دھکیلا اور تیزی سے اندر داخل ہوا۔

"کوئی ہے۔۔۔۔۔۔۔ کوئی ہے؟"

اس کی آواز بلند ایوان میں دور دور تک گونجی۔ چاروں طرف گل کاری سے سجی ہوئی دیواریں تھیں۔ خوبصورت محرابیں تھیں اور ایسے طاقدان تھے جن میں سونے کی ہیروں جڑی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں لیکن وہ زندہ مورتی کہیں نہیں تھی جس کی تلاش میں تابان یہاں آیا تھا۔ اچانک تابان کو ایک دبیز پردے کے پیچھے ایک خوبصورت نسوانی پاؤں دکھائی دیا۔ سیاہ فام یرغا بھی پاؤں دیکھ چکا تھا۔ وہ آگے گیا اور جھپٹ کر پردے کے پیچھے سے دو

خوبصورت لڑکیاں برآمد کر لیں۔ لڑکیوں کے بال یرغا کی مٹھیوں میں آئے تو وہ زور زور سے چیخنے لگیں۔ وہ بری طرح خوفزدہ تھیں۔ ان کے ادھڑے ہوئے لباس اور ننگے پاؤں دیکھ کر تابان کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنے مردوں کے ساتھ قتل ہونے سے بچنے کے لئے یہاں چھپ ہوئی تھیں۔

تابان نے ایک لڑکی کے شانے تھامے اور اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ "شہزادی مارشا کہاں ہے۔۔۔۔۔۔۔ وہ لڑکی کہاں ہے جسے یہاں دیوی کہا جاتا تھا؟"

لڑکی دہشت زدہ نگاہوں سے تابان کی طرف دیکھتی رہی پھر روہانسی آواز میں بولی۔ "ہمیں کچھ معلوم نہیں دیوتا گواہ ہیں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔"

"پھر یہ عمارت خالی کیوں ہے؟" تاابان نے پوچھا۔

"وہ سب لوگ چلے گئے۔ کل رتھیں انہیں لینے آئی تھیں۔ انہوں نے دیوی کو ساتھ لیا اور رتھوں پر سوار ہو کر نکل گئے۔ چند راہب یہاں رہ گئے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے تمام عورتوں کو قتل کیا اور خود بھی بھاگ گئے۔"

"کہاں گئی ہے دیوی؟" اس دفعہ یرغا نے پوچھا۔

لڑکی نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "ہمیں کچھ معلوم نہیں، ہماری جان بخشی کرو۔ ہم بے گناہ ہیں۔"

یرغا کے حکم پر مقدونی سپاہی جوتوں سمیت اس عبادت گاہ میں پھیل گئے انہوں نے یہاں کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن کسی متنفس کا سراغ نہیں ملا۔ یہ وسیع و عریض عمارت بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ نذرانے کے طور پر اس معبد پر چڑھائی جانے والی بہت سی قیمتی اشیاء ابھی تک مختلف ایوانوں میں بکھری ہوئی تھیں اور آثار سے نظر آتا تھا کہ بھاگنے والے بڑی افراتفری میں بھاگے ہیں۔

تابان سر تھام کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن آنسوؤں کا ایک آبشار حلق کے اندر گر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مارشا کو کھو دیا تھا بہت قریب پہنچ کر وہ پھر دور چلا گیا تھا۔ شاید کل اس وقت وہ سراپا شباب ورعنائی اپنے وجود کی شمع سے اس ایوان کو روشن کئے ہوئے تھی' لیکن آج یہاں تیرگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک خلا تھا جس میں لامتناہی جدائی کا عفریت پھنکار رہا تھا اس عفریت کے خونی پنجے تابان کے سینے پر تھے۔ وہ اپنے ناخنوں سے ہولے ہولے تابان کا جگر نوچ رہا تھا۔ نہ جانے تابان کتنی دیر ساکت وجامد اپنی

جگہ بیٹھا رہا۔ آخر یرغا نے اس کا شانہ ہلایا۔ "اٹھو' تابان' شام ہونے والی ہے' ہمیں واپس جانا ہوگا۔"

"نہیں سردار آپ جائیں۔" تابان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "میں کچھ دیر بعد آجاوں گا۔"

یرغا نے رحم آمیز نظروں سے تابان کو دیکھا۔ پھر دونوں لڑکیوں کو ساتھ لیا اور گھوڑوں کی طرف بڑھ گیا۔ بدنصیب دوشیزاؤں کی لاشیں پہلے ہی دو گھوڑا گاڑیوں پر بار کی جا چکی تھیں۔ ذرا ہی دیر بعد مقدنودی سواروں کا دستہ عبادت گاہ سے روانہ ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں تابان انہیں دور تک جاتے دیکھتا رہا۔۔۔۔۔۔۔۔ اب وہ اس ہیبت ناک آتش کدے میں یکسر تنہا تھا۔ نامانوس خوشبوئیں اس کے نتھوں سے ٹکرا رہی تھیں اور بلند و بالا چھتوں کے نیچے کہیں کہیں روشن شمعدان جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے نظر آتے تھے۔ تابان بے مقصد ان در و دیواروں میں چکرانے لگا۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ انہونی خواہش پل رہی تھی' کاش کسی ستون کی اوٹ سے یا دبیز پردے کے عقب سے مارشا کا ہیولا نمودار ہوا۔ وہ حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھے اور رسیلی آواز میں پوچھے۔ "غلام تم یہاں؟

کہاں تھے اب تک تم؟" وہ کوئی جواب نہ دے۔ بس گھٹنوں کے بل اس کے سامنے جھک جائے اور آنکھیں بند کر کے سر اس کے قدموں میں رکھ دئے۔ اس کے پیاسے ہونٹ اپنی منزل پالیں اور سر اٹھانے کی خواہش ہمیشہ کے لئے سینے میں دفن ہو جائے۔۔۔۔۔۔

اچانک ایک آہٹ نے تابان کو چونکا دیا۔ وہ اپنے قدموں کی جانب دیکھنے لگا۔ آواز عین اس کے نیچے سے آئی تھی۔ اس نے ایک مورتی کے قریب رکھا ہوا طلائی شمعدان اٹھایا اور غور سے فرش کو دیکھنے لگا۔ یہ جاننے میں اسے ذرا دیر نہیں لگی کہ وہ ایک تہہ خانے پر کھڑا ہے۔ معمولی کوشش سے اس نے وہ طریقہ دریافت کر لیا جس سے تہہ خانے کا راستہ بند کرنے والی پتھریلی سل کو سرکایا جا سکتا تھا۔ ایک آہنی کنڈے کی حرکت دینے کے بعد اس نے سل کو دھکیلا تو وہ چھوٹے چھوٹے پہیوں پر با آسانی حرکت کرتی ہوئی ایک طرف ہٹ گئی۔ سامنے تہہ خانے کی سیڑھیاں تھیں۔ تابان نے تلوار بے نیام کر کے چند زینے طے کئے تو اس کے سامنے ایک انتہائی حیران کن منظر آیا۔ یہ ایک کتب خانہ تھا۔ یہاں کتابیں رکھنے کے لئے بڑے بڑے آہنی چوکھٹے بنے ہوئے تھے۔ ان چوکھٹوں میں فرش سے چھت تک کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ اس کتب خانے میں سینکڑوں کتابیں تھیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر

باریک چمڑے کے ٹکڑوں پر لکھی گئی تھیں۔ تابان یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بیشتر کتابوں کو آگ لگ چکی ہے اور وہ دھڑا دھڑ جل رہی ہیں۔ جلتے چمڑے کی بُو چاروں طرف پھیل رہی تھی اور گاڑھا سیاہ دھواں تیزی سے تہہ خانے میں بھرتا جا رہا تھا۔ دفعتاً تابان کو ایک شخص نظر آیا' وہ اپنا ڈھیلا ڈھالا لبادہ پھڑ پھڑاتا تیزی سے سیڑھیوں کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعل تھیں۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ کتب خانے کو آگ لگانے والا یہی شخص ہے۔ زینوں پر پہلا قدم رکھنے سے پہلے اس شخص کی نگاہ تابان پر پڑی۔ وہ ٹھٹکا پھر ایک قدم پیچھے ہٹنے کے بعد اس نے مشعل ایک قریبی الماری کی طرف اچھال دی اور نیام سے تلوار کھینچ کر سینہ تان لیا۔ وہ کوئی چالیس برس کا ایک درویش نما شخص تھا چہرے سے وقار اور بزرگی ٹپکتی تھی۔ اس کے شانے پر کپڑے کی دو رنگی پٹیاں دیکھ کر تابان کو اندازہ ہوا کہ وہ اس عبادت گاہ میں کوئی اہم مرتبہ رکھتا ہے۔ جسمانی لحاظ سے وہ تابان سے کہیں کمزور تھا۔ لیکن اس نے ایک ساعت ضائع کئے بغیر تابان پر بھرپور حملہ کر دیا۔ تابان اس کے وار تلوار پر روکتا ہوا الٹے قدموں تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔ کھلی جگہ پر پہنچتے ہی نووارد کے حملوں میں شدت آ گئی۔ تلواروں کی جھنکار وسیع ایوان میں دور دور تک گونج رہی تھی۔ تابان کو اپنا دفاع کرنے میں مطلق دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ اسے صاف طور پر اندازہ ہو رہا تھا کہ

مدمقابل کوئی مذہبی قسم کا آدمی ہے۔ اور لڑائی بھڑائی سے اس کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ تاہم وہ بے پناہ جوش کا مظاہرہ کر رہا تھا اور تلوار چلانے کے ساتھ ساتھ تابان کو دھمکاتا بھی جا رہا تھا۔

''ناپاک کتے 'نکل جاؤ یہاں سے دور ہو جاؤ اس متبرک مقام سے۔'' اس کی بدکلامی سے تنگ آ کر تابان نے ایک ہلکا سا وار اس کے دائیں کندھے پر کیا۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا اپنے ہی زور میں ''دیوی ناہید'' کے ایک قد آدم مجسمے کے قدموں میں گرا۔ تابان کی ایک نپی تلی ٹھوکر نے اس کی تلوار ہوا میں اڑا دی۔ جب وہ اٹھا تو اس کا گریبان تابان کی مضبوط گرفت میں تھا۔ تابان کا خیال تھا کہ وہ بے خود کو بے بس پا کر سہم جائے گا۔ لیکن اس نے بڑی بے خوفی سے تابان کے منہ پر تھوک دیا اور اس سے تلوار چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ تابان کا دماغ چیخ گیا۔ اس کا دل چاہا ایک ہی وار سے اس کا شخص کا کام تمام کر دے مگر پھر وہ سنبھل گیا ۔ اسے احساس ہوا کہ مدمقابل خود بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کا قتل کر دیا جائے اور اگر تابان نے ایسا کیا تو مدمقابل کی خواہش کا احترام ہو گا۔ تابان نے اپنے اشتعال پر قابو پا کر تلوار کو خون آلود ہونے سے بچا لیا۔ تہہ خانے کی آگ اب پھنکارتی ہوئی باہر نکل رہی تھی اور ایوان

کی بلند چھت کے نیچے دھواں بھرتا جا رہا تھا۔ تابان نے اپنے جوشیلے حریف کو بازوؤں میں بھرا اور اس کی مزاحمت کو خاطر میں لائے بغیر اٹھا کر باہر لے آیا اسے فرش پر پٹخ کر تابان پھنکارا۔

''کون ہو تم اور کتب خانے میں آگ کیوں لگائی تم نے؟''

ادھیڑ عمر حریف سینہ تان کر بولا۔ ''میں محافظ ہوں اس عبادت گاہ کا' تم نے یا تم جیسے کسی اور کتے نے اس جگہ کو نجس کرنے کی کوشش کی تو میں بوٹیاں نوچ لوں گا اس کی۔'' پھر اس کی نگاہ اس خون پر پڑی جو بدنصیب دوشیزاؤں کے بدن سے نکلا تھا اور سنگی فرش پر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وحشیانہ لہجے میں بولا۔ ''دیکھ رہے ہو یہ لہو۔ اس معصوم لہو کا ہر قطرہ تمہاری گردن پر ہے۔ تم جو نامعلوم باپوں کی اولاد ہو ہمارے جوانوں کے ہاتھوں حشرات الارض کی موت مرو گے یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔''

تابان پر اب واضح ہو چکا تھا کہ یہ شخص اسے اشتعال دلانے کی شعوری کوشش میں مصروف ہے اور چاہتا ہے کہ تابان اسے زندگی کی قید سے آزاد کر ڈالے۔ وہ باطمینان اپنی جگہ کھڑا رہا۔ باریش شخص نے مایوس ہو کر تابان پر چھلانگ لگائی اور اپنی انگلیوں سے اس کی آنکھیں

نوچ لیناچاہیں۔ تابان نے بمشکل چہرہ بچایا۔ وہ شخص خالی ہاتھ ہونے کے باوجود بار بار تابان پر حملہ آور ہونے لگا۔ اب تابان کا پیمانہ صبر بھی لبریز ہو گیا۔ اس نے تلوار ایک طرف پھینکی اور چند روزدار ہاتھ مدِ مقابل کو رسید کئے۔ اس کا ایک ہونٹ پھٹ گیا اور ناک سے خون بہہ نکلا۔ تابان کی آخری ضرب کھانے کے بعد وہ اوندھے منہ خون آلود فرش پر گرا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے خون سے لتھڑ گئے اور وہ اچانک ہچکیوں سے رونے لگا۔ کافی دیر روچکنے کے بعد اس نے التجائیہ انداز میں تابان سے کہا کہ وہ اسے جان سے مار ڈالے گا۔۔۔۔۔۔۔ تابان نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ صحن کے تالاب سے اس کا چہرہ دھلایا اور ہونٹ کے زخم سے خون روکنے کی کوشش کی۔

تہہ خانے میں بھڑکتی آگ تہہ خانے تک ہی محدود رہی تھی لیکن دھواں چارسو پھیل گیا تھا۔ تابان نے ادھیڑ عمر شخص کو ساتھ لیا اور دھوئیں کے مرغولوں سے کافی ہٹ کر آتش کدے کی طویل وعریض سیڑھیوں میں آبیٹھا۔ ادھیڑ عمر شخص اب قدرے حواس میں تھا۔ تابان کے کچھ پوچھنے سے پیشتر ہی وہ کہنے لگا۔ "میرا نام روہتاس ہے۔ میں اس معبد کا منتظم اعلی ہوں۔ ایک خلقت میری مداح ہے اور دل وجان سے میری عزت کرتی ہے یہ مرتبہ مجھے

یونہی نہیں ملا۔ میں نے ہر قسم کی دنیاوی لذتوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ ہوش سنبھالنے سے اب تک میں نے ایک وقت میں سات لقمے سے زیادہ کھانا نہیں کیا۔ ایک دن میں ایک پہر سے زیادہ نہیں سویا اور عورت کو اپنی خلوت سے ہمیشہ دور رکھا ہے۔ کڑی ریاضتوں نے مجھے اس مقام کا حقدار ٹھہرایا ہے اور اب میں یہ مقام کھونا نہیں چاہتا۔ لہذا بہتر ہے کہ اب جہان فانی سے اپنی آنکھیں بند کر لوں۔ میرے عقیدے کی رُو سے خود کشی گناہ عظیم ہے ورنہ میں اب تک تہہ خانے کے شعلوں میں بھسم ہو چکا ہوتا۔"

تابان نے پوچھا۔ "اے محترم بزرگ کون تم سے تمہارا منصب چھین رہا ہے۔ ہم لٹیرے ہیں اور نہ غارت گر' ہمارا سالار اعظم بستیاں بسانے پر یقین رکھتا ہے اجاڑنے پر نہیں۔ ہم نے اب تک جن شہروں کو زیر نگیں کیا ہے ان میں سے چند کے سوا سب کے سب آباد ہیں اور وہاں کے باشندے ہی وہاں حکومت کرتے ہیں سب کی عزتیں محفوظ اور منصب برقرار ہیں۔"

روہتاس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں یہ سب جانتا ہوں' سچ پوچھتے ہو تو۔۔۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں صرف اشتعال دلانے کے لئے وہ الزامات لگائے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری وجہ سے میرے منصب اور مرتبے کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔"

"تو پھر کس سے خطرہ لاحق ہے؟"

"اپنے آپ سے۔" روہتاس نے سکون سے جواب دیا۔ "میں تو خود ہی اپنی عزت کا لٹیرا اور اپنی ناموس کا دشمن ہو گیا ہوں۔"

تابان نے حیرانی سے کہا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں۔"

روہتاس نے ایک گہری سانس لی سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ شمالاً جنوباً ایک فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ روہتاس کے لمبے کھچڑی بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور چہرے کی تمکنت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بولا۔ "نوجوان' میری ساری زندگی لوگوں کو یہ درس دیتے ہوئے گزری ہے کہ وہ نفسانی خواہشات سے دور رہیں خاص طور پر صنف نازک کی قربت سے۔ میں اس موضوع کے حق میں ساری زندگی دلائل کے انبار لگاتا رہا ہوں۔ کتابیں لکھتا رہا ہوں اور جمع کرتا رہا ہوں۔ ان گنت شب و روز میں اپنے مؤقف کو تقویت دینے کے لئے سوچ و بچار میں

گزار دیئے اور ہر موسم میں میرے دل و دماغ پر فکر اور تحقیق کا موسم چھایا رہا۔ لوگوں نے میرے افکار کو سنا اور روح میں بسا لیا۔ چاہنے والوں نے اپنی زندگیاں میرے فلسفے کے تابع کر دیا۔

لیکن پھر ایک روز میری زندگی میں ایک چہرہ آیا۔ اے اجنبی نوجوان! وہ چہرہ اتنا حسین تھا کہ اس کی ایک جھلک نے میری برسوں کی ریاضت پر پانی پھیر دیا۔۔۔۔۔۔۔"

یکایک بوڑھا چپ ہو گیا۔ غالباً وہ بات کو اتنے واضح انداز میں کہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے نگاہیں جھکائیں اور موضوع بدل کر بولا۔ "تم میرے دشمن ہو اور میں تم سے کوئی ایسی چیز نہیں مانگ رہا جو تم دے نہ سکو۔ تمہاری تلوار کا ایک وار میرے سارے مصائب کا خاتمہ کر سکتا ہے۔"

تابان نے کہا۔ "آپ کسی چہرے کا ذکر کر رہے تھے' کس کا چہرہ تھا وہ؟"

"یوں سمجھ لو کہ میری دبی ہوئی خواہشات کا چہرہ تھا۔ ان ناآسودہ جذبوں کا چہرہ جو مر کر بھی انسان کے اندر زندہ رہتے ہیں۔"

روہتاس نے کہا۔ "تمہارے قتل نہ کرنے سے میں بچ نہیں جاوں گا۔ جو شخص مرنے کا ارادہ کرلے اکثر تقدیر بھی اس کے راستے سے ہٹ جاتی ہے۔" اس نے اٹھ کر اپنی تلوار اٹھائی اور چل دیا۔

"کہاں جارہے ہیں؟" تابان نے پوچھا۔

"موت کی تلاش میں۔ مجھے یقین ہے کہ کل طلوع آفتاب سے پہلے پہلے میں اسے ڈھونڈلوں گا۔"

"لیکن آپ کے عقیدے کی رو سے خودکشی گناہ عظیم ہے۔"

"میں خودکشی نہیں کروں گا۔ لڑتے ہوئے جان دوں گا۔ شہر میں گشت کرتے ہوئے کسی بھی مقدونوی دستے پر ٹوٹ پڑوں گا۔"

"ممکن ہے آپ گرفتار ہوں اور طویل عرصے کے لئے قید خانے میں ڈال دیئے جائیں۔"

"ہاں' اس بات کا بھی امکان ہے۔ تاہم طویل عرصے کے لئے گرفتار ہونے سے بھی میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔"

تابان نے کہا۔ "محترم بزرگ' مجھے آپ کی باتوں کا مفہوم سمجھ نہیں آرہا لیکن یہ اندازہ ہورہا ہے کہ آپ وہی کریں گے جو کہہ رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ آپ ایسا کیوں کررہے ہیں۔ میں تو بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ کو اپنی زندگی یوں داؤ پر نہیں لگانی چاہیے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ گرفتاری سے آپ کا مسئلہ حل ہوتا ہے تو میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں اور جب تک آپ کہیں آپ کو گرفتار رکھوں گا۔"

ادھیڑ عمر روہتاس نے چند زینے طے کئے اور دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں کے سیاہ مرغولوں میں روپوش ہوگیا۔ تابان بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ملاقات کسی جیتے جاگتے انسان سے نہیں ہوئی۔ یہ کسی قدیم داستان کا افسانوی کردار تھا جو اس ویران معبد میں ایک جھلک دکھا کر اوجھل ہوگیا ہے۔ آخر اس کی کیا مجبوری تھی کہ وہ مرنا چاہتا تھا؟ یہ سوال بار بار تابان کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ اس نے کسی حسین چہرے کا ذکر کیا تھا۔ وہ کس کا چہرہ تھا اور روہتاس کے مرنے یا قید ہوجانے سے اس چہرے کا کیا تعلق تھا۔

ادھیڑ عمر روہتاس اب یہاں نہیں تھا۔ ان سوالوں کے جواب تابان کو کون دیتا۔ شاید یہ سوال ہمیشہ اس کے لئے حل طلب رہتے لیکن دوبارہ تہہ خانے کی طرف جانے سے اسے ان

سوالوں کا جواب مل گیا۔۔۔۔۔۔۔ کافی رات گئے وہ سیڑھیوں سے اٹھا اور اس بلند و بالا ایوان میں داخل ہوا جہاں روشن طاقوں میں "ناہید دیوی" کی چھوٹی بڑی مورتیاں نفاست سے سجی تھیں اور منقش محرابوں میں ایسے چراغ جل رہے تھے جن میں صدیوں پرانا تیل ڈالا گیا تھا۔ اسی دیوان کے فرش میں کتب خانے کا راستہ تھا۔ کتب خانے کی آگ اب بجھ چکی تھی اور ایوان میں جلے ہوئے "چرمی کاغذ" کی بو رچی بسی تھی۔ ایک نظر کتب خانے کو دیکھنے کے لئے تابان نے سیڑھیوں پر قدم رکھا اور آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ کتب خانے میں حرارت ابھی باقی تھی اور در و دیوار سیاہ نظر آ رہے تھے۔ کئی الماریاں ابھی تک سلگ رہی تھیں۔ زینوں کے قریب کتابوں کا ایک ڈھیر غیر متوقع طور پر بالکل محفوظ رہا تھا۔ تابان ان کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ یہ فارسی میں تھیں اور تابان فارسی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ تاہم ان کتابوں کے مضامین بہت مشکل اور تابان کے لئے ناقابل فہم تھے۔ ان کتابوں میں رکھی ہوئی ایک لمبوتری سی کتاب قدرے مختلف تھی اور اس کی تحریر بھی نسبتاً آسان نظر آئی۔ تابان نے اس کی ورق گردانی کی تو جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک روزنامچہ ہے اور اسے لکھنے والا خود روہتاس ہے۔ اس روزنامچے میں آٹھ دس روز پہلے تک احوال تفصیل سے درج تھا۔ تابان کو اس روزنامچے میں دلچسپی محسوس ہوئی اور وہ اسے لے کر باہر آ گیا۔ "ناہید

دیوی" کی سب بڑی مورتی کے قریب شمعوں کی روشنی میں ایک چبوترے پر بیٹھ کر اس نے یہ روزنامچہ پڑھنا شروع کیا۔ ایک صفحے پر دس ماہ پہلے کی ایک تاریخ درج تھی۔ اس صفحے کی تحریر نے تابان کو بری طرح چونکا دیا۔

لکھا تھا "وہ ایک صندوق میں بند' دریا کی لہروں پر بہتی یہاں پہنچی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ یونان کی شہزادی ہے مگر مجھے تو وہ آسمان کی شہزادی دکھائی دیتی ہے۔ میرے علاوہ صرف تین افراد نے اسے قریب سے دیکھا ہے اور وہ تینوں بھی حیران ہیں کہ کیا انسانی چہرے میں اتنی وجاہت سما سکتی ہے۔ وہ حسین ساحرہ ہے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا' ہونٹ ہلانا' پلکوں کو جنبش دینا سب کچھ اپنے اندر بیکراں حسن سمیٹے ہوئے ہے۔ ایسی عورت بڑے سے بڑے عابد زاہد کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اس عبادت گاہ میں آئے لیکن والئی شہر حکم صادر کر چکا ہے۔ اب مجھے رضامندی ظاہر کرنا ہی پڑے گی۔"

تابان نے جلدی جلدی چند ورق پلٹے۔ پانچ روز بعد کی ایک اور تاریخ میں اسے یہی سنسنی خیز ذکر ملا۔ روہتاس نے لکھا تھا۔ "وہ اپنا نام مارشا بتاتی ہے۔ یہ خوبصورت نام ہے جیسے دھند میں چھپی ہوئی انگوروں کی بیلوں پر کوئی تتلی منڈلا رہی ہو۔ یا گرم دودھ میں خالص شہد ملایا

جارہا ہو اور اس کی خوشبو ہوا میں اڑ رہی ہو۔ مگر اسے دیوی کی مسند پر بٹھانے سے پہلے ہمیں اس کے لئے کوئی اور نام بھی تجویز کرنا ہو گا۔ کوئی متبرک اور مقدس نام۔ میں آج سارا دن قدیم مذہبی کتب کے نسخے کھنگالتا رہا ہوں لیکن کوئی ایسا نام سامنے نہیں آیا جو اس کی شخصیت پر جچ سکے۔ کچھ عجیب شخصیت کی مالکہ ہے وہ۔ اس کے اندر سے مقناطیسی شعاعیں پھوٹتی ہیں اور ہر قریبی جسم کو اپنی طرف کھینچتی ہیں یا شاید مجھے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ وہ ایک خطرناک عورت ہے 'بے حد خطرناک۔ کبھی کبھی اس کی موجودگی کے تصور سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے ۔ میں خود کو ملامت کرتا ہوں لیکن اس کا تصور بار بار میرے ذہن سے آ چپکتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں جب مجھ جیسے شخص کی یہ کیفیت ہے تو ان پجاریوں کی کیا کیفیت ہو گی جو اس معبد میں اسے دیکھ چکے ہیں یا آئندہ دیکھیں گے۔"

اس تاریخ کے بعد قریباً ایک ماہ تک مارشا کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ بس مذہبی رسوم کی تفصیل تھی۔ مانی کے پیروکاروں کے ساتھ مباحثوں کا تذکرہ تھا معبد کی آمدن و خرچ کا حساب لکھا تھا۔ پھر ایک جگہ مارشا کا ذکر ان الفاظ میں آتا تھا۔ "یہ عورت میرے لئے دیوتاؤں کی طرف سے آزمائش بن کر آئی ہے۔۔۔۔۔۔۔ ایک ایسی آزمائش جو ہر طرح عذاب کی ہم پلہ

ہے۔ میرے سارے نظریات اور عقائد ایک ایک کر کے ریت کی دیواروں کی طرح ڈھیر ہوتے جا رہے ہیں۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ میری برسوں کی ریاضت رائیگاں جانے والی ہے۔ میں سب کچھ جانتے بُوجھتے بھی کچھ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میری روح درمیان سے دو لخت ہو گئی ہے اور ایک حصہ میرے اختیار میں نہیں رہا۔ وہ لمحہ لمحہ اس عورت کی طرف کھنچتا چلا جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر لرز جاتا ہوں اگر میری ان کیفیات کا علم میرے پیروکاروں کو ہو جائے تو کیا ہو وہ سب کے سب صدمے سے پاگل نہ ہو جائیں گے۔۔۔۔۔۔ چند روز پہلے سکندر مقدونوی کی چالیس ہزار سپاہ شہر کا محاصرہ کر چکے ہیں۔ خدشہ ہے کہ بات چیت ناکام ہو گئی تو ایک دو دن میں شہر پر ہلہ بول دیا جائے گا۔ سوچتا ہوں اس جنگ میں میری روح بھی جسم سے آزادی پا جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اس رسوائی سے تو بچ جاؤں جو قدم قدم میری طرف بڑھ رہی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو اپنے اندر کے شیطان کو جو روز بروز طاقتور ہو رہا ہے 'اس عورت کی جانب بڑھنے سے نہ روک سکوں گا۔ میرے اندر اس کے حسن کے لئے نہ ختم ہونے والی بھوک پیدا ہوتی جا رہی ہے۔"

روزنامچے میں درج یہ تحریر آخری تھی۔ تابان نے یہ چرمی کتاب تہہ کی اور خیالوں میں کھو گیا۔ روہتاس کی گتھی سلجھ چکی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے جس حسین چہرے کا ذکر کیا تھا وہ مارشاہی کا تھا۔ روہتاسن نے اسے دیکھا تھا اور اس کے پتھریلے دل میں جونک لگ گئی تھی۔ انجام کار نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ اس کے جذبے بے لگام ہو گئے تھے اور وہ خود اپنے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ یہ بے بسی اسے خود کشی کی طرف لے جا رہی تھی لیکن خود کشی اس کے نزدیک گناہ عظیم تھی۔ جب لوگ شہر سے بھاگ رہے تھے وہ معبد کی حفاظت کے بہانے یہاں تنہا رہ گیا تھا۔ شاید مایوسی کے عالم میں اس نے وہ کتابیں جلا ڈالیں تھیں جن پر اب تک اس کا غیر متزلزل ایمان تھا' پھر اس نے تابان پر حملہ کر کے موت کو گلے لگانا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ وہ ہر صورت مرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کا یہ وہم پختہ ہو چکا تھا کہ اگر زندہ رہا تو اپنی خواہشات پر قابو نہ رکھ سکے گا اور مارشا کی جانب کھنچا چلا جائے گا۔

مارشا کی صورت تابان کی نگاہوں میں گھومنے لگی۔ ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ چہرہ ایسا ہی تھا۔ اسے دیکھ کر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی تھیں اور پھر یہ بے ترتیبی آنے والے روز و شب اور ماہ و سال پر حاوی ہو جاتی تھی۔ کوئی اس سحر سے کم متاثر ہوتا تھا اور کوئی زیادہ لیکن ہوتا ضرور تھا۔ شاید اس حسن کو دیکھ کر فراموش کر دینا انسانی آنکھ کے بس میں ہی نہیں تھا۔ مورتی کے چبوترے سے ٹیک لگائے تابان سرد آہیں کھینچتا رہا اور ان در و دیوار میں مارشا کی خوشبو سونگھتا رہا۔ ایک ناقابل برداشت درد قطرہ قطرہ اس کے سینے میں جمع ہو رہا تھا اور اب کرب کا سمندر بن گیا تھا۔ تابان کا دم گھٹنے لگا۔ وہ گھبرا کر معبد کے بلند و بالا ایوان سے نکل آیا۔ ان لمحات میں اسے کسی ہم راز دیرینہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کوئی ایسا ساتھی جو اس کے روگ سے آگاہ ہو اور اس کی روح میں اتر کر اس کے غم کو محسوس کر سکے۔ اس کی نگاہوں میں کورا کی صورت گھومنے لگی۔ اس کا دل چاہا کورا اس کے سامنے بیٹھی ہو اور وہ اس کی آغوش میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر لے۔ بند پلکوں کے نیچے سے آنسوؤں کا سوتا پھوٹے اور اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ وہ ان آنسوؤں کو روکنے کی کوشش نہ کرے اور نہ منہ سے کچھ بولے۔ بس اس طرح گم لیٹا رہے۔

وہ ویران معبد کی سیڑھیاں اتر کر اپنے تنہا گھوڑے تک پہنچا۔ وہ اس ویرانی اور تاریکی کا ایک حصہ محسوس ہو رہا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر اس نے ایڑ لگائی اور شہر کے گنجان حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ شاید مایوسی اور اداسی کا اس کی زندگی میں دخل ہی نہ تھا۔ وہ تو یونان کے گھنے

جنگلوں کا ایک آزاد "دوپایہ" تھا۔ شوخ و چنچل اور بے حد برق رفتار۔ اس کی صورت کا بھولپن شکاریوں کو دام پھیلانے پر اکساتا تھا۔ مگر وہ ہر دام کاٹتا تھا اور شکاریوں کو یادگار صدمے دے کر نکل جاتا تھا۔ یہ سلسلہ غارس زنوب کی بیٹی پر آ کر ختم ہوا تھا۔ اس حسین شکاری نے اسے ایسا پھانسا تھا کہ وہ ساری چوکڑی بھول گیا تھا۔ اس کی ساری شوخیاں دھری رہ گئی تھیں۔ اب وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا اور اپنے درد کی دوا ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

جلد ہی تابان شہر کے رہائشی علاقے میں پہنچ گیا۔ بیشتر مقامات پر لگی ہوئی آگ اب بجھ چکی تھی اور غلے کے ادھ جلے گوداموں کے گرد مسلح مقدونوی گشت کر رہے تھے۔ تابان شہر کے مرکز میں پہنچا۔ سالار اعظم سکندر والئی شہر کے محل نما مکان میں قیام پذیر تھا۔ اس مکان کے قریب ہی کسی مدرسے کی بہت بڑی عمارت تھی۔ اس عمارت کو عارضی طور پر لشکر کے ساتھ آنے والی خواتین کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ تابان کورا کی تلاش میں یہاں پہنچا اور پھاٹک پر موجود محافظوں کو اپنی شناخت کرانے کے بعد کورا کو بلانے کی ہدایت کی۔

محافظوں نے یہ اطلاع دے کر تابان کو حیران کیا کہ کورا ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی کام سے باہر گئی ہے۔ تابان سوچ میں ڈوب گیا۔ کورا کو اس کی عمارت سے باہر کیا کام ہو سکتا تھا۔ اس نے محافظوں کو کورا کی ایک قریبی سہیلی کا نام بتایا اور اسے بلانے کی ہدایت کی۔ تھوڑی دیر بعد یہ لڑکی تابان کے سامنے حاضر تھی۔ تابان کو دیکھ کر لڑکی کے چہرے پر شدید حیرت نمودار ہوئی۔ تاہم اس کیفیت کو چھپاتے ہوئے وہ تابان کے قریب چلی آئی اور سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگی۔

"سردار' آپ یہاں؟ کورا تو آپ کی طرف گئی ہے۔"

تابان بولا۔ "کیوں' میری طرف کیوں گئی ہے؟"

لڑکی نے اپنی آواز اور دھیمی کی۔ "کیا آپ زخمی نہیں ہوئے؟"

یکایک تابان کو احساس ہوا کہ کوئی تشویشناک واقعہ پیش آ چکا ہے۔ وہ تیزی سے بولا۔ "کون لایا تھا زخمی ہونے کی اطلاع؟"

آپ ہی کے دستے کے سپاہی تھے۔ ایک کا نام فرال ہے اور دوسرے کو میں شکل سے جانتی ہوں۔"

"کیا بتایا ہے انہوں نے؟"

"وہ کہہ رہے تھے کہ آپ کسی کو بتائے بغیر شہزادی مارشا کی تلاش میں شہر پناہ سے باہر گئے تھے اور قریبی جنگل میں شدید زخمی ہو گئے ہیں۔"

تابان بولا۔ "کسی نے تمہیں بہکایا ہے۔ میں سالارِ اعظم کی اجازت سے گیا تھا اور مجھے کوئی حادثہ بھی پیش نہیں آیا۔"

لڑکی کا چہرہ اب واضح طور پر خوف وہراس کی زد میں تھا۔ اس کے ہونٹ لرزے۔

"تو پھر کہاں گئی ہے؟"

اچانک سردار شلال کا منحوس چہرہ اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ تابان کے تصور میں چمکا اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بغیر کچھ کہے سنے وہ واپس مڑا اور جست کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس نے دونوں پاؤں سے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے شہر کے صدر دروازے کی طرف لپکتا چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ شہر سے نکل کر ایک نیم پختہ راستے پر اُڑا جارہا تھا۔ اس کا رخ قریبی جنگل کی طرف تھا۔ چہرے پر چٹانوں کی سختی تھی اور ہاتھ بے انتہا مضبوطی سے لگام پر جمے ہوئے تھے۔ ذہن میں ایک ہی تصور تھا۔ کورا کی عزت اور زندگی خطرے میں ہے۔ وہ اپنے بدترین

دشمن کے ہاتھ چڑھ چکی ہے یا چڑھنے والی ہے۔ فیلانہ کا انجام تابان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ ذہن میں بار بار ایک ہی سوال ابھر رہا تھا کیا کورا کا خونچکاں جسم دیکھنا بھی اس کی قسمت میں لکھا ہے۔ فصیل سے کوئی اٹھارہ اسٹیڈیم (دو میل) دور آنے والے کے بعد اس نے گھوڑا روک لیا۔ اب وہ گھنے جنگل میں تھا۔ چاروں طرف خودرو جھاڑیاں تھیں۔ لمبی گھاس تھی اور کیلے کے جھنڈ تھے۔ چھپنے کے لئے یہ جگہ نہایت موزوں تھی۔ دن کا اجالا ابھی دور تھا مگر پرندوں نے شاخوں سے چہکار کے آبشار بہانے شروع کر دئے تھے۔ اس بے بہا چہکار میں تابان کے ہانپتے ہوئے گھوڑے کی صدائیں گھل مل گئی تھی جیسے وہ اس چہکار کا ہی نامانوس جز ہو۔ تابان نے گھوڑے کو چکر دے کر چاروں طرف دیکھا اور سینے کی پوری قوت سے پکارا "کورا" اس کی گونجدار مردانہ آواز شیر کی دھاڑ کی مانند جنگل میں دور تک گئی مگر اس آواز کا جواب کہیں نہیں تھا۔ تابان نے گھوڑے کو دلکی چال چلاتے ہوئے ایک سٹیڈم کا فاصلہ مزید طے کیا اور ایک بار پھر کورا کو پکارنے لگا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اس نے یہ عمل کئی مرتبہ دہرایا۔ آخر اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ اس گھنے جنگل میں کوئی اس کے آس پاس موجود ہے۔ کوئی جانور یا انسان۔ اس نے اپنی تلوار بے نیام کی اور چوکنے انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ دفعتاً ایک ٹیلے کے عقب سے دو گھڑ سوار برآمد ہوئے اور تیزی سے

ایک طرف بھاگ نکلے۔ تابان نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ان کے پیچھے لپکا۔ تابان کے نیچے اصیل گھوڑا تھا۔ وہ سوار کے اشاروں پر معمول کی طرح چلتا تھا۔ تابان اسے انچی نیچی زمین پر پوری مہارت سے دوڑانے لگا۔ دوسری طرف دونوں گھڑ سوار بھی شہسوار دکھائی دیتے تھے۔ وہ مشکل راستوں پر گھوڑوں کو اڑائے چلے جا رہے تھے۔ "رک جاؤ۔۔۔۔۔۔ رک جاؤ۔" تابان بار بار پکار رہا تھا لیکن وہ رکنے کے لئے نہیں بھاگے تھے۔ صبح کے ملگجے اجالے میں شور مچاتے جنگل کے درمیان یہ ایک زوردار دوڑ ثابت ہوئی۔ یکایک تابان کو احساس ہوا کہ گھڑ سوار اسے دام میں لا رہے ہیں۔ انہوں نے جان بُوجھ کر تابان کو پیچھے لگایا تھا اور اب اپنے من پسند مقام پر لے جا رہے تھے۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود تابان رک نہیں سکتا تھا۔ اسے کورا تک پہنچنا تھا اور جلد سے جلد۔ اس سے پہلے کہ شلال کا دست ستم ایک گل بدن کی پتیاں نوچ کر پھینک دیتا تابان کو اپنی سی کوشش کرنا تھی۔ درختوں سے گھری ہوئی ایک مسطح جگہ پر آ کر دونوں گھڑ سوار رک گئے۔ جونہی تابان ان کے پیچھے اس مقام پر پہنچا ایک ٹیلے کے عقب سے دو پیادے نکل کر اس کے سامنے آ گئے۔ تابان نے غور سے دیکھا اور اس کی رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ اس کے تمام خدشات عین حقیقت ثابت ہوئے تھے۔ پیادوں میں ایک لحیم شحیم سردار شلال تھا۔ اسے پہچاننے میں تابان کو خاصی دشواری ہوئی۔

شلال کا چہرہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک گڈریے کے بھیس میں تھا اور ہاتھ میں گڈریوں ہی کی طرح ایک طویل لاٹھی بھی تھی۔ کہیں قریب سے کتوں کے بھونکنے کی صدا آ رہی تھی۔ در حقیقت تابان نے شلال کو اس بد نما زخم سے پہچانا تھا جو دو برس پہلے اسے کورا کے ہاتھوں نے دیا تھا اور جس کا کچھ حصہ ابھی تک شلال کی گھنی داڑھی میں سے جھانک رہا تھا۔ شلال کی زہریلی نگاہیں تابان پر جمی تھیں۔ تابان بہ آہستگی گھوڑے سے اتر آیا۔ برہنہ تلوار بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے مقابل چاروں افراد نے بھی اپنے اپنے ہتھیار تول لئے۔ شلال کی قہرناک آواز فضا میں ابھری۔

مجھے امید تھی کہ تجھ سے آمنا سامنا ہو گا۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر خوشی اور کوئی نہیں ہے کہ میں تیری آنکھوں کے سامنے کورا کو تار تار کروں۔ اس کے بعد سالار اعظم مجھے دس مرتبہ پھانسی پر چڑھا دے تو پرواہ نہیں۔"

تابان نے اطمینان سے کہا۔ "ایسا کرنے کے لئے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا ہو گا اور مجھے یقین ہے کہ تم میں سے کوئی اس کام کا اہل نہیں۔"

"بالکل درست۔۔۔۔۔۔۔۔ سو فیصد درست۔" شلال نے جنونی انداز میں کہا۔ "ہم میں سے کوئی تجھے لاش میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ تم تو ہمیں زندہ درکار ہو۔ اگر زندہ نہ رہو گے تو کورا کی دردناک موت کا تماشہ کیسے دیکھو گے اور پھر تمہاری زرگری کی ہوس بھی تو پوری کرنی ہے۔ جس سونے چاندی کے لئے تم نے سازشوں کا جال بچھایا اور سالار اعظم کے وفاداروں کو پیچھے دھکیل کر دربار میں اپنی جگہ بنالی 'وہ سونا چاندی آج تمہیں ہم دیں گے۔ تمہارے چہرے کے تمام سوراخ پگھلے ہوئے سونے چاندی سے میں خود بند کروں گا۔" شلال کے لہجے میں ہیجانی کیفیت تھی۔ یوں لگتا تھا عقوبت خانے میں جھیلی ہوئی تمام اذیت زہر بن کر اس کی آواز میں گھل مل گئی ہے۔ تلوار کے دستے پر تابان کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ وہ دیکھ رہا تھا دونوں گھڑ سوار اسے بے خبری میں آلینے کے لیے عقب سے بڑھ رہے ہیں۔ یہ دونوں سوار فرال اور بھورن تھے۔ ان دونوں کا تعلق تابان ہی کے "یک ہزاری" دستے سے تھا۔ انہوں نے شلال سے درپردہ وفاداری نبھائی تھی۔ اور کورا کو پھسلا کر یہاں لے آئے تھے۔ ان دونوں کے لئے تابان کے جسم میں بجلی بھر گئی تھی۔ وہ جونہی قریب پہنچتے تابان بے دریغ ان پر جھپٹ پڑتا مگر وہ قریب پہنچے نہیں۔ شلال کی زوردار آواز نے انہیں روک دیا۔ اس نے گرج کر اعلان کیا کہ تابان کا مقابلہ وہ تنہا کرے گا۔

یہ سنسنی خیز اعلان تابان نے بڑے اطمینان سے سنی اور اس کی رگوں میں ایک میٹھا میٹھا جوش لہریں لینے لگا۔ شلال جیسے دیرینہ دشمن سے دوبدو مقابلہ تابان کے لئے فرحت بخش تھا۔ شلال نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ سر جھکا کر ٹیلے کے عقب میں اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ وزنی تلواریں اور ڈھالیں لئے برآمد ہوا۔ شلال نے تابان سے کہا کہ وہ ایک تلوار اور ڈھال منتخب کر سکتا ہے۔ تابان نے کہا۔

"فی الحال میرے پاس اپنے ہتھیار موجود ہیں۔"

اس نے کمر سے ہلکی پھلکی ڈھال کر اتار کر ہاتھ میں کر لی اور شلال سے مقابلے کے لئے تیار ہو گیا۔ شلال نے تانبے کی منقش ڈال سنبھالی پھر تلوار پر گرفت مضبوط کی اور تابان کے روبرو آ گیا۔ قد کے اعتبار سے دونوں مساوی تھے لیکن پھیلاؤ کے لحاظ سے شلال زیادہ جسیم نظر آتا تھا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور آتشیں نگاہیں تابان کی آنکھوں میں پیوست تھیں۔

چمکیلے اجالے نے جنگل کے نشیب و فراز کو روشن کر دیا تھا۔ شبنم آلود برگ و بار بادِ صبا میں جھوم رہے تھے اور لچکیلی شاخوں پر پرندے نغمہ سرا تھے۔ تاہم اس خوبصورت ماحول میں جو

کچھ ہونے جا رہا تھا وہ نہایت بد صورت اور خوفناک تھا۔ وہ طاقتور جنگجو تیز دھار آلے لئے مقابل تھے اور نگاہوں نگاہوں میں ایک دوسرے کی قوت بازو کا جائزہ لے رہے تھے۔ ایکا ایکی سردار شلال کے حلق سے لرزہ خیز چنگھاڑ بلند ہوئی۔ جیسے کوئی خوابیدہ آتش فشاں کسی ارض جنبش سے یک لخت جاگ اٹھے اور اس کا دہانہ سماعت شکن دھماکے سے پھٹ جائے۔

شلال کا پہلا وار تابان کی توقع سے کہیں زیادہ مہلک اور بھرپور تھا۔ اس طوفانی وار میں وہ تمام نفرت یکجا ہو گئی تھی جو پچھلے ڈیڑھ برس سے شلال نے ریزہ ریزہ کر کے اپنے دل میں جمع کی تھی۔ اور وہ عداوت بھی شامل تھی جسے وہ اپنی وحشتوں کا خون دے کر پال رہا تھا۔ شلال کی منہ زور جسمانی قوت نے اس وار کو دو آتشہ کر کے مد مقابل کے لئے سراسر موت بنا دیا تھا۔

تابان نے اپنی جگہ چھوڑنے میں ایک ساعت کی بھی تاخیر کی ہوتی تو اس کا سر ڈھلوان پر لڑھکتا نظر آتا پھر بھی اپنی بہترین کوشش کے باوجود وہ خود کو زخمی ہونے سے نہ بچا سکا۔ اس کا ایک بازو کندھے سے کہنی تک چر گیا۔ ڈھال دو ٹکڑے ہو گئی اور تلوار دستے سے ٹوٹ کر دور جا گری۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد شلال کی تلوار کا زور ٹوٹا۔ اس نے بے حد تیزی سے تلوار کو سر پر لہرایا اور وحشیانہ چنگھاڑ کے ساتھ دوسرا وار تابان پر کیا۔ تابان یہ وار بچاتے ہوئے بے اختیار زمین پر گر گیا۔ اس گھڑی موت اسے آنکھوں کے روبرو دکھائی دی۔ اسے

لگا جیسے اچانک وہ ایک پاگل ہاتھی کے سامنے آ گیا ہے۔ اور وہ ہر صورت کچل دینا چاہتا ہے۔ ان لمحات میں تابان حواس بحال نہ رکھتا تو اس کی ہلاکت یقینی تھی۔ وہ ان لمحوں کی نزاکت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ تمام تر توانائی مجتمع کر کے وہ شلال کے ہاتھوں میں کوندتی برق سے بچنے کے لئے تیار ہو گیا۔

دو وار خالی جانے کے بعد شلال مکمل طور پر آپے سے باہر ہو چکا تھا۔ وہ تابان پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ تابان کی تمام تر توجہ اس کے ہاتھوں کی حرکت پر تھی۔ وہ ہر وار قابل دید پھرتی سے بچا رہا تھا۔ اب یہ کام اس کے لئے پہلے سا دشوار نہیں رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ تلوار کتنی تیزی سے اور کس رخ سے آئے گی۔ وہ ہر بار جسم کی ایک تیز جنبش کے ساتھ موت کو چکمہ دے رہا تھا۔ آناً فاناً شلال ہانپ گیا۔ اس کے وار اوچھے پڑنے لگے۔ تابان نے جھکائی دے کر ایک لمبی جست کی اور سیدھا اس بھاری بھرکم تلوار پر آیا جس کی پیشکش شلال اسے کچھ دیر پیشتر کر چکا تھا۔ اس تلوار کے استعمال کا یہ بہترین موقع تھا۔ جونہی یہ تلوار تابان کے ہاتھ میں آئی ارد گرد کھڑے تینوں افراد کے چہروں پر سراسیمگی کے آثار نظر آئے۔ تابان کو دوبارہ مسلح دیکھ کر شلال بھی سنبھل گیا۔ اس نے تابان کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں اور

مہارت سے قدموں کو آگے پیچھے حرکت دینے لگا۔ تابان کی تمام تر توجہ اس کی حرکات پر تھی۔ آنکھوں میں ایک وحشی چمک عود کر آئی تھی۔ پھر اچانک جیسے بجلی لپک گئی۔ تابان نے دونوں ہاتھوں کے زور سے تاک کر وار کیا اور اسے ڈھال پر لینے کی کوشش میں شلال الٹ کر ایک گھوڑے کے پاؤں میں جا گرا۔ گھوڑے نے بدک کر ٹانگیں چلائیں اور شلال کو اپنے آپ میں الجھالیا۔ تابان کے لئے یہ مہلت بہت تھی۔ وہ جھپٹ کر آگے آیا اور اس کی تلوار کسی نیزے کی مانند شلال کی کلائی میں پیوست ہو کر زمین میں دھنس گئی۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس میں شلال نے تلوار سنبھال رکھی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ اب شلال بے بس تھا۔ اسے شکست خوردہ دیکھ کر اس کے تینوں ساتھی متحرک ہوئے لیکن انہیں ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ ایک جانب کے درختوں سے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے مقدونوی سپاہیوں کی رنگین وردیاں نظر آئیں۔ وہ نیزے چمکاتے ہوئے موقعہ کی طرف آ رہے تھے۔ تابان اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ کر رہ گیا۔ اس کی شعلہ بار نگاہیں شلال پر جمی تھیں۔ مقدونوی سپاہیوں کی آمد میں چند ساعتوں کی دیر ہوتی تو تابان 'شلال کو قیدِ زندگی سے آزاد کر چکا تھا مگر سپاہیوں کی موجودگی میں وہ اسے ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔ گھڑ سوار سپاہی قریب پہنچے اور انہوں نے کراہتے ہوئے شلال کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ تابان نے چونک کر ٹیلے کی

طرف دیکھا اس لمحاتی مہلت سے فائدہ اٹھا کر شلال کے تینوں ساتھی راہ فرار اختیار کر چکے تھے۔ ٹیلے کے عقب میں جسیم کتے مسلسل بھونک رہے تھے۔ تابان نے تلوار شلال کی کلائی سے کھینچی اور ٹیلے کی طرف دوڑا۔ بلندی پر پہنچ کر اس نے نشیب میں جھانکا۔ یہاں تقریباً تیس بھیڑوں کا ایک ریوڑ موجود تھا۔ ان بھیڑوں کے گرد رکھوالی کے تین چار بھیڑیا نما کتے چکرا رہے تھے 'آئی رونیا کی برفانی سطح مرتفع پر پائے جانے والے یہ کتے اپنی خون آشامی میں مشہور تھے۔ ان کی زرد آنکھوں میں بلا کی سفاکی تھی۔ بھیڑیں ان کے خوف سے ایک جگہ سمٹی ہوئی تھیں۔ ان بھیڑوں میں ایک انسان بھی تھا اور وہ کورا تھی۔ اس کے بالائی جسم پر لباس کے نام پر بس چند دھجیاں رہ گئی تھیں۔ وہ اپنے آپ میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ جونہی وہ ریوڑ سے نکلنے کی سعی کرتی ایک خوفناک کتا کان کھڑے کرتا اور دم کو گردش دے کر زور سے بھونکتا۔ کورا کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلتی اور وہ چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیتی۔ رو رو کر اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ تابان کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دنیا جہاں کی فریاد سمٹ آئی۔ تابان نے بلا تاخیر ایک کتے پر حملہ کیا۔ اس سے پیشتر کہ کتا رخ پھیر کر تابان پر جھپٹتا وہ درمیان سے دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔ یہ لرزہ خیز منظر دیکھ کر کورا نے دلخراش چیخ ماری اور چہرا ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ دیگر دو کتے پوری وحشت سے تابان پر آئے۔ گرتے گرتے تابان نے ایک

کتے کا پیٹ چاک کر دیا مگر دوسرے نے اپنے نوکیلے دانت تابان کے زخمی بازو میں گاڑنے کی کوشش کی۔ اس اثناء میں مقدونوی سپاہی موقعے پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے پلک جھپکتے میں ایک کتے کو پکڑ لیا اور دوسرے کو تہ تیغ کر ڈالا۔ تابان کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا بازو مسلسل خون اگل رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شہر پہنچتے ہی سردار شلال کو سکندر کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ سکندر نے اس وقت شہر کے قلعے میں دربار لگا رکھا تھا۔ شلال کو دیکھ کر سکندر کی بڑی بڑی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد اس نے کاتب کو حکم دیا کہ شلال کے خلاف تابان اور دیگر سپاہیوں کا بیان قلم بند کیا جائے۔ اپنا بیان قلمبند کرانے کے فوراً بعد تابان شاہی دربار سے باہر نکل آیا۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ شلال کا کیا انجام ہوا ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ آتی جاتی سانس ایک آرے کی مانند سینے کو کاٹ رہی تھی۔ ہر دھڑکن مارشا کی جدائی پر ماتم کناں تھی اور ہر نگاہ خارِ مغلیاں ہو کر اس کی آنکھوں میں ٹوٹ آئی تھی۔ کہاں ہے مارشا تو کہاں ہے؟ وہ بہ زبان خاموشی ہر در و دیوار سے پوچھ رہا تھا۔ اس

کے ذہن میں ایک سوال آہنی میخ کی طرح گڑا رہتا تھا۔ کیا مارشا اس کے دل کی حالت سے آگاہ ہو گی۔ کیا اسے معلوم ہو گا کوئی اس کے لئے اتنا تڑپ رہا ہے؟ وہ سوچتا رہا اور چلتا رہا آخر اس کے پاؤں ایک پر ہنگام مہ خانے میں جا رکے۔ معلوم نہیں کیوں آج شراب کی کریہہ بو اس کی حس شامہ کو بھا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا کسی نے جام اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ اس آتشیں جام کو حلق میں انڈیل گیا اور اس کے بعد کئی ایسے جام لبوں سے لگا کر خالی کر ڈالے۔ دیکھنے والے اس مہ نوش کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ شخص جس نے افواج سکندر میں بے انتہا تیزی سے ترقی کی منازل طے کی تھیں اور میدان جنگ میں جوانوں کی آنکھ کا تارا بنا رہا تھا آج یوں مے خانے میں گھوم رہا تھا کہ نہ اس کا سر کندھوں پر ٹھہرتا اور نہ زمین پاؤں تلے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مدہوش ہو کر کسی گوشے میں جا گرتا اور نشے میں دھت شرابیوں کی طرح اپنی ہی قے میں لتھڑ جاتا دو نازک بازوؤں نے اسے تھام لیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا اور دیکھتے رہ گئے۔ ان میں سے کچھ اسے پہچان بھی گئے۔ وہ کورا تھی۔ وہ اسے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے مہ خانے سے باہر آئی اور ایک گھوڑا گاڑی میں لاد کر کچھ دور ایک خوبصورت مکان میں لے آئی۔ مکان کے دروازے پر موجود پہریدار نے کورا کو روکتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریئے' کہاں جا رہی ہیں آپ؟"

"میں سردار کو اندر لے جانا چاہ رہی ہوں۔"

"لیکن یہ مکان یک ہزاری سردار تابان کے لئے مخصوص ہے۔"

"یہ سردار تابان ہی ہے۔" کورا نے مختصر جواب دیا۔

دربان نے حیرت سے تابان کو دیکھا جو چہرے مہرے سے ہر گز اتنا بڑا سردار نظر نہیں آتا تھا پھر جلدی سے اسے سہارنے میں کورا کی مدد کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد تابان ایک شاندار خوابگاہ کی آرام دہ مسہری پر دراز تھا۔ مسہری کے عین اوپر ایک بیش قیمت فانوس جگمگا رہا تھا۔ در و دیوار کی آرائش سے ظاہر تھا کہ یہ کسی بڑے رئیس کا مکان ہے جو موت کے خوف سے اہل و عیال سمیت یہاں سے نکل بھاگا ہے۔ سکندر ایسے خالی مکان اپنے سرداروں کی رہائش کے لئے استعمال کرتا تھا اور درجہ بدرجہ انہیں بہترین مکانوں میں ٹھہراتا تھا۔

کچھ دیر بعد تابان کے حواس قدرے بحال ہوئے تو اس نے کورا کو اپنے سرہانے پایا۔ اس کی گرم و گداز قربت نے تابان کو ایک گونہ سکون بخشا۔ کیا بات ہے تابان۔ تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"کورا! مجھے ایک روگ لگ گیا ہے۔ اب میں تم سب کے لئے کسی کام کا نہیں رہا۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں' میں بے کار ہو گیا ہوں۔ مجھے مردہ جان کر تنہا چھوڑ دو۔ سالارِ اعظم سے بھی یہ کہہ دو کہ وہ تابان جو تمہارا اغلام تھا مر گیا۔"

تابان! ایسی مایوسی کی باتیں کیوں زبان پر لاتے ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حوصلہ رکھو شہزادی صاحبہ مل جائیں گی۔"

"مجھے جھوٹی تسلی مت دو کورا۔۔۔۔۔۔۔ میں اسے کھو چکا ہوں۔ کبھی نہ پانے کے لئے۔"

کورا اس کے بالوں میں اپنی نرم انگلیاں چلانے لگی۔ اس عمل نے تابان کو پُر سکون کرنے کی بجائے اور بے چین کر دیا۔ اس نے کورا کا ہاتھ بری طرح جھٹکا۔ "مت ہمدردی جتاؤ مجھ سے۔ تمہاری محافظت اب میرے بس کا روگ نہیں۔ کوئی اور سہارا ڈھونڈ لو۔ میں ایک گرتی ہوئی دیوار ہوں۔ میرے سائے میں مت بیٹھو۔"

کورا حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنی روکھائی سے بول رہا تھا۔ کتنی آسانی سے دیرینہ ناطے توڑنے کی بات کر رہا تھا۔ پھر کورا اسے سنبھالتی ہی رہ گئی۔ وہ اس کے ہاتھوں سے نکل کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے سینے میں ایک نیلی آگ روشن تھی۔ وہ شعلے

جنہیں اس نے صبر کے چھینٹوں سے ایک برس تک بجھائے رکھا تھا بھڑک کر الاؤ ہو گئے تھے۔ وہ نیم دیوانگی کے عالم میں ہیلی کارنیس کی گلیوں میں چکرانے لگا۔ بے مقصد' بے مراد۔ نشہ ٹوٹنے لگتا تو کسی مہ خانے میں اپنے اندر مزید آگ انڈیل لیتا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ لوگ سایوں کی طرح اس کے تعاقب میں ہیں۔ معلوم نہیں یہ لوگ کون تھے؟ دوست یا دشمن یا سکندر کے مقرر کردہ نگران۔ جو فاصلے پر رہ کر اس کی نگہداشت کے پابند تھے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا اور وہ معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے ہر گھڑی یک گونہ مدہوشی درکار تھی اور وہ سے مل رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔ نہ جانے اس عالم میں کتنے شب و روز گزر گئے۔ شام کے بعد وہ اسی ویران معبد میں چلا جاتا جہاں مارشا کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی آوازیں ابھی تک گونجتی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ رات بھر ان آوازوں کو سنتا اور اس مہک کو سونگھتا جو اس گلبدن کے جسم سے اڑ کر ان درودیوار میں جذب ہو چکی تھی۔ ایک شام وہ اسی طرح لڑکھڑاتے قدموں سے معبد کی طرف چلا جا رہا تھا کہ بازار میں ایک چہرہ دیکھ کر چونک گیا۔ ایک ہی ساعت میں اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ اسے مارشا دکھائی دی تھی۔۔۔۔۔۔۔ مارشا۔۔۔۔۔۔۔ اس کی روح اس کی دھڑکن۔۔ جس زاویے سے تابان نے اسے دیکھا تھا وہ ہو بہو مارشا نظر آ رہی تھی۔ وہی کان' وہی رخسار کا ابھار' وہی بالوں کا

انداز' وہ ہاتھ میں ایک ٹوکری لئے چلی جا رہی تھی۔ چار پانچ سال کا ایک بچہ اس کے ہمراہ تھا۔ بچے نے اپنی ننھی مٹھی میں مارشا کا لبادہ تھام رکھا تھا۔

"مارشا۔۔۔۔۔۔" تابان نے سینے کی پوری طاقت سے پکار کر کہا اور لوگوں کو دھکیلتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ نوجوان عورت نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ تابان ٹھٹک گیا۔ اب وہ مارشا نہیں تھی۔ وہ چند لمحے خوف کے عالم میں تابان کی طرف دیکھتی رہی۔ "کون ہے یہ؟" ایک راہ گیر نے عورت سے سوال کیا۔ راہ گیر کی طرف دیکھنے کے لئے عورت نے رخ پھیرا تو وہ ایک بار پھر مارشا نظر آنے لگی۔ تابان کا سینہ پھر دھڑک اٹھا۔ یہ عورت عجیب معمہ تھی۔ ایک رخ سے ہو بہو مارشا دکھائی دیتی تھی۔ جب اس کا چہرہ ایک مخصوص زاویئے سے ہٹ جاتا تھا تو وہ مارشا نہیں رہتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تابان بے تابانہ اس کی طرف بڑھا۔ اسے جیسے اپنے افعال پر قابو ہی نہ رہا تھا۔ ایک تنومند راہ گیر نے تابان کا راستہ روکا اور اسے دھکیل کر عورت سے دور ہٹا دیا' چند دوسرے راہ گیر بھی تابان کو دھکیلنے اور لعنت ملامت کرنے لگے۔ تابان کے جسم پر مقدونوی سالار کی وردی

تھی۔ گو پچھلے ایک ہفتے کی دربدری سے بہت خستہ حال ہو چکی تھی لیکن پہچانی جاتی تھی۔ اسی وردی کے سبب لوگ تابان سے زیادہ سخت رویہ اختیار نہیں کر رہے تھے ورنہ اس نے جس طرح عورت پر جھپٹنے کی کوشش کی تھی وہ مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیتے۔ چند دھکے کھانے کے بعد تابان پیچھے ہٹ گیا' لیکن اس کی نگاہیں بدستور عورت پر رہیں۔ عورت اب بچے بازوؤں میں اٹھا چکی تھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ایک بغلی بازار میں مڑ رہی تھی۔ تابان جانتا تھا یہ بازار نیم دائرے کی شکل میں گھوم کر قریبی چوراہے سے آملے گا۔ اس نے اپنی صدری کے اندر سے شراب کی چھوٹی بوتل نکالی۔ چند گھنٹوں میں اسے خالی کیا اور لڑکھڑاتا ہوا چوراہے کی طرف بڑھنے لگا۔

اس کی ترکیب کارگر رہی۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے عورت کو بچے کے ساتھ جاتے دیکھا۔ اس کی ٹوکری میں اب سبزی اور پھل وغیرہ رکھے تھے۔ تابان اس سے کافی دور تھا۔ لیکن اس فاصلے سے بھی وہ عورت کے خوبصورت چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ سکتا تھا۔ تابان نے مناسب فاصلہ رکھ کر عورت کا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ جلد ہی عورت اپنے تعاقب سے آگاہ ہو گئی۔ شاید اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا۔ چلتے چلتے اس نے یونہی مڑ کر دیکھا اور

اس کی نگاہ سیدھی تابان پر پڑی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خوف و ہراس سمٹ آیا۔ اس نے بچے کو دوبارہ بانہوں میں اٹھایا اور اپنی رفتار تیز کر دی۔ کسی وقت تو یوں لگتا کہ وہ بھاگ کھڑی ہو گی۔ اس کا سبز لبادہ ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ جیسے وہ بھی اس سیمیں بدن کی بے قراری میں برابر کا شریک ہو۔ تابان نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی تھی اور درمیانی فاصلہ برقرار رکھے ہوئے تھا۔ آخر عورت ایک کشادہ گلی میں داخل ہوئی اور قریباً بھاگتی ہوئی ایک خوبصورت مکان میں گھس گئی۔ سیاہ رنگ کا آبنوسی دروازہ ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔ تابان نے تذبذب کے عالم میں دروازے کے سامنے تھوڑی سی چہل قدمی کی پھر گلی کے سرے پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی سر میں خاک تھی اور آنکھیں بلانوشی سے انگارہ ہو رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو ہٹے کٹے افراد اسے اپنی جانب آتے دکھائی دیئے۔ اپنے لباس سے وہ نوکر یا غلام نظر آتے تھے۔ ان کے ساتھ ایک عمر رسیدہ منحنی سا شخص بھی تھا۔ اسکے جسم پر بیش قیمت لباس اور ہاتھوں میں ہیرے کی انگشتریاں تھیں۔ قریب آ کر اس نے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے اور اپنی باریک لیکن کڑک دار آواز میں بولا۔

"کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ تابان سے ہم کلام تھا۔

تابان نے ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی۔ "تم یہ پوچھنے والے کون ہو۔ میں کسی کے گھر میں نہیں 'گلی میں بیٹھا ہوں۔"

بوڑھا غصے سے کانپنے لگا۔ "تم بدمعاش ہو۔ میری بہو کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہو۔ تمہارے سالار نے ہمیں امان دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے گھروں میں ہماری عزتیں اور ہمارا مال و جان محفوظ ہے۔ یا تمہارا سالار جھوٹا ہے یا تم اس کے نافرمان ہو۔" بوڑھے کی بلند آواز سن کر دیگر لوگ بھی تابان کے گرد اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ سب اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ اگر تابان چاہتا تو وہ اکیلا ہی ان سب پر حاوی آ سکتا تھا لیکن وہ یہاں کشت و خون نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اس شریف صورت عورت کا تعاقب بھی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن پتہ نہیں اسے دیکھ کر وہ اپنے دل پر قابو کیوں نہیں رکھ سکا تھا۔ لوگوں میں سے ایک جوشیلے شخص نے اپنی تلوار بے نیام کر لی اور بے حد غصیلی آواز میں تابان سے بولا۔

"بدمعاش! دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ پاؤں پر چل کر نہیں جا سکو گے۔" تابان کے سامنے اس گرانڈیل شخص کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ اگر تابان لڑنے پر آتا تو اسے خالی ہاتھ چیر پھاڑ

سکتا تھا لیکن اپنے سے کم تر لوگوں کو زیر کرنا اس کا شیوہ ہی نہیں تھا۔ نشے میں ہونے کے باوجود اس نے خود پر قابو رکھا اور کان لپیٹ کر وہاں سے چلا آیا۔۔۔۔۔۔۔ مگر واپسی مستقل نہیں تھی۔ اسی رات وہ ایک بار پھر اسی گلی میں موجود تھا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ٹھنڈی مست کر دینے والی ہوا نے شہر کے باسیوں کو گہری نیند سلا رکھا تھا۔ سیاہ آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے ستارے بھی جیسے اونگھنے لگے تھے۔ دو منزلہ مکان کے سامنے پہنچ کر تابان نے ایک لحظے میں گلی کے دونوں سروں کا جائزہ لیا اور اچک کر ایک چھجے کو تھام لیا۔ اپنے جسم کو موڑ کر وہ چھجے پر پہنچا اور تب ایک دوسرے چھجے کو تھام کر دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ یہ ایک بے حد مشقت طلب کام تھا لیکن تابان نے آسانی سے کر لیا۔ اس کے چہرے پر پسینہ آیا اور نہ سانسوں کے زیر و بم میں معمولی سی تیزی آئی۔ دوسری منزل کے چھجے پر پاؤں جما کر اس نے چیتے کی مانند زقند بھری اور چھت کی منڈیر کو تھام لیا۔۔۔۔۔۔ چھت پر کھڑے ہو کر اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ دور دور تک ہیلی کارنیس کی خوابیدہ روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ مینار گنبد 'پون چکیاں سب کچھ ایک نیلگوں روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس دو منزلہ عمارت کے قرب و جوار میں کشادہ اور تنگ گلیوں کا جال

سا بچھا ہوا تھا۔ تابان جانتا تھا کہ یہیں کسی گلی میں وہ پُر اسرار سائے بھی موجود ہوں گے جو کئی روز سے اس کے تعاقب میں تھے۔ وہ روز و شب ایک فاصلے سے اس کے ساتھ رہتے تھے۔ معلوم نہیں وہ کون تھے۔ اس ایک سوال سے کئی سوال پھوٹتے تھے۔

تابان ان تمام سوالات کو ذہن سے جھٹک کر نیچے جانے والے زینوں کی طرف بڑھا۔ زمین پر پاؤں رکھنے سے پہلے اس نے اپنے لبادے میں سے چمکتی دمکتی پیش قبض نکال لی تھی۔ جوتا اس کے پاؤں میں پہلے ہی نہیں تھا۔ وہ بلی کی چال چلتا دوسری منزل کے ایک کمرے میں پہنچا اور وہاں سے ایک سجی سجائی خوابگاہ میں آ گیا۔ خوابگاہ میں نیلگوں فانوس کی مدھم روشنی بکھری ہوئی تھی۔ ایک بیش قیمت مسہری پر گھونگھریالے بالوں والا ایک تنومند شخص سو رہا تھا جبکہ اس کے پہلو میں وہی عورت محو خواب تھی۔ عورت کے چہرے کا رخ اوجھل تھا جسے دیکھ کر تابان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا تھا۔ وہ خوابگاہ کے وسط میں ننگی تلوار ہاتھ میں لئے دم بخود کھڑا اس عورت کو دیکھتا چلا جا رہا تھا جو ایتھنز کے چاند کا "ایک" ٹکڑا اپنے چہرے پر سجائے ہوئے تھی۔ تابان کو عورت کے پہلو میں وہ کل والا بچہ نظر نہیں آیا لیکن خواب گاہ میں موجود مختلف اشیاء سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس گھر میں ایک یا ایک سے زائد بچے موجود ہیں۔

کچھ دیر اس جوڑے کو محویت سے دیکھنے کے بعد تابان دبے قدموں آگے بڑھا۔ مسہری کے پاس پہنچ کر اس نے پیش قبض دوبارہ لباس میں رکھی۔ نیچے جھک کر ایک ہاتھ خوابیدہ عورت کے ہونٹوں پر جما لیا اور پھول کی مانند مسہری سے اٹھا لیا۔ بیدار ہو کر عورت بری طرح مچلی اور خود کو انجانے بازوؤں سے رہا کرانے کے لئے زبردست کوشش کرنے لگی لیکن تابان کے سامنے اس کی ایک نہیں چلی۔ وہ اپنے ساتھی مرد کو جگانے کے لئے حقیر سی آواز بھی پیدا نہ کر سکی اور تابان اسے لے کر خوابگاہ سے باہر نکل آیا۔ نہایت خاموشی اور احتیاط سے وہ اسے ایک دوسرے کمرے میں لے آیا۔ آرائش سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کمرہ نشست گاہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ کھڑکیوں پر دبیز پردے' منقش پشت والی نشستیں اور فرش پر نفیس قالین۔ تابان نے عورت کو بہ آہستگی قالین پر رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک مضبوطی سے عورت کے ہونٹوں پر جما تھا۔ ورنہ وہ چیخ و پکار کر کے عمارت میں موجود ہر ذی نفس کو جگا دیتی۔ وہ مزاحمت کر کے تھک چکی تھی اور اب مکمل طور پر تابان کے رحم و کرم پر تھی۔ اسکے ہونٹوں سے ہاتھ اٹھانے سے پہلے تابان نے اسے سمجھایا۔ "دیکھو تم میرے زور بازو کا اندازہ کر چکی ہو۔ اگر میری نیت تمہارے بارے میں خراب ہو' تو کوئی تمہیں بچا نہیں سکتا۔ تمہارے ہونٹوں سے ہاتھ اس لئے ہٹا رہا ہوں کہ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میرا

وعدہ ہے کہ اگر تم شور نہیں مچاؤ گی تو میری ذات سے تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ "کوشش بسیار کے بعد تابان عورت کو قائل کرنے میں کامیاب رہا اور اس نے تابان کو سر کی جنبش سے بتایا کہ اگر وہ اس کے ہونٹ آزاد کر دے تو وہ چیخ و پکار نہیں کرے گی۔

تابان نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹایا تو وہ پھنکاری۔

"کیا چاہتے ہو مجھ سے۔ "آنسو اس کے حسین رخساروں پر آبشار کی مانند بہہ رہے تھے۔

"تمہاری محبت!"

"میری محبت اپنے بچوں کے لئے ہے اور اپنے شوہر کے لئے۔"

"لیکن تمہارے چہرے میں اس عورت کی شباہت ہے جو میرے لئے دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر عزیز ہے۔ میں تمہارے چہرے کی اس جھلک سے دور نہیں رہ سکتا جس میں میرے محبوب کا عکس دکھائی دیتا ہے۔"

"میں تمہیں برباد کرنا نہیں چاہتا بس تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں۔۔۔۔۔۔ تمہیں اپنے قریب رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کا کوئی حل بتاؤ' ورنہ میں مر جاؤں گا اور میرا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔ ہاں۔۔۔۔۔ اگر تم نے مجھے دھتکار دیا تو شاید میں اسی چوکھٹ پر یہ پیش قبض اپنے سینے میں اتارلوں میں مقدونوی فوج کا ایک سپہ سالار ہوں۔ میری لاش تمہارے گھر سے نکلی تو تم اور تمہارا شوہر دونوں موردالزام ٹھہرو گے۔۔۔۔۔ اور یہ بات بہت دور تک جائے گی۔ تم دیوتاؤں کو مانتی ہو تو دیوتاؤں کے نام پر آتش پرست ہو تو تمہیں آتش کا واسطہ مجھے غلط مت جانو۔ میری مجبوری کو سمجھو۔ میں ایک ڈوبتا ہوا شخص ہوں اور سہارے کے لئے تمہاری جانب بڑھ رہا ہوں۔"

تابان کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ خود بھی اپنے لہجے کے اثر میں آ رہا تھا۔ اس نے دیکھا عورت کی آنکھوں میں ہراس ماند پڑ گیا ہے اور چہرے کے تاثرات بدل رہے ہیں۔ وہ قدرے نرمی سے بولی۔ "مجھے لگتا ہے نشے نے تمہاری عقل خبط کر رکھی ہے ورنہ تم اس چھت تلے کھڑے ہو کر ایسی بات نہ کرتے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ یہ امیر ارژنگ دوم کی حویلی ہے اور امیر ارژنگ کوئی معمولی شخص نہیں ہے۔ امیر کا تعلق ایک قبائلی خاندان سے ہے اور یہ خاندان اپنے دشمن کو معاف نہ کرنے کے لئے مشہور ہے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ دیوتا گواہ ہے مجھے تمہاری صورت پر ترس آ رہا ہے۔ دفعتاً

کسی قریبی کمرے سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ عورت تڑپ کر بولی۔ "میرا بچہ جاگ گیا۔ اب تم جاؤ یہاں سے ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔

تابان نے دلیری سے اس کا شانہ تھام لیا۔ "پہلے مجھ سے وعدہ کرو کہ کل مکان کی چھت پر مجھ سے ملو گی۔"

عورت کے چہرے پر شدید ناگواری کے تاثرات ابھرے لیکن اس نے خود پر قابو پالیا اور کوئی سخت کلمہ کہنے سے باز رہی۔ تابان نے اس کی خاموشی سے حوصلہ پایا اور لہجے میں فریاد سمیٹ کر بولا۔ "میں تمہیں دل چیر کر نہیں دکھا سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم میرے لاعلاج مرض کی دوا بن گئی ہو۔۔۔۔۔۔"

ایکاایکی تابان کو خاموش ہونا پڑا۔ عورت بھی ٹھٹک کر دروازے کی سمت دیکھنے لگی۔ بھاری قدموں کی آواز بالکل نزدیک سنائی دی تھی۔ یہ نہایت مخدوش صورتِ حال تھی۔ تابان کا ہاتھ خود بخود اپنی پیش قبض تک پہنچ گیا۔ عورت تڑپ کر اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی لیکن چند قدم چل کر اسے رک جانا پڑا۔ دروازہ کھلا اور سامنے وہی تنومند شخص نظر آیا جو تھوڑی دیر پہلے خوابگاہ کی کشادہ مسہری پر محو خواب تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کی سرخی

تھی۔ تابان کو دیکھ کر پہلے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں پھر ان میں غضب کی چنگاریاں بھر گئیں۔ وہ کتنی ہی دیر وحشت ناک انداز میں تابان کو گھورتا رہا۔ پھر اس کا ہاتھ بڑے دھیمے انداز میں دیوار کی طرف بڑھ گیا جہاں خوفناک پھل والی دو کلہاڑیاں آویزاں تھیں۔ اس نے ایک کلہاڑی اتاری اور آگ برساتے لہجے میں بولا۔

"تو تم وہ بدنصیب ہو جو صبح سے اپنی موت کا تعاقب کر رہے ہو۔" تابان اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہا۔ تنومند شخص نے کسی خونخوار درندے کی مانند دانت نکوسے اور غرا کر بولا۔ "ہتھیار پھینک کر چہرہ دیوار کی طرف کر لے کتے۔۔۔۔۔۔ میں تجھے اس قابل نہیں سمجھتا کہ تیرے سینے پر زخم لگاؤں۔"

بھاگتے قدموں کی تیز آواز آئی۔ وہی منحنی بوڑھا کمرے میں داخل ہوا جو دوپہر کو گلی میں دکھائی دیا تھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھا۔ سفید بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے عقب میں دو ہانپتے ہوئے مسلح غلام بھی نظر آرہے تھے۔ بوڑھے نے گھبرا کر کہا۔ "رک جاؤ بیٹا! اس کو مارنا ہمارے لئے مصیبت بن جائے گا۔ یہ مقدونوی فوج کا ایک ہزاری سردار

ہے اور کل دوپہر کئی لوگ یہ جان چکے ہیں کہ اس نے افشاندہ کا تعاقب کیا تھا اور میں نے اسے سرزنش کی تھی۔"

تنومند شخص دھاڑا۔ "تو آپ کیا چاہتے ہیں بابا۔۔۔۔۔۔۔ ہم عزت کے اس لیٹرے کو احترام کے ساتھ رخصت کر دیں؟"

"نہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن ہمیں سوچ لینا چاہیئے کہ اس کی موت کا انجام کیا ہو گا۔ ایک طریقہ ہے اس کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالو اور چارپائی پر ڈال کر والئی شہر کے پاس لے جاؤ۔ پھر اس سے پوچھو کہ اس شرابی زانی کی سزا کیا ہونی چاہیئے۔"

"نہیں بابا۔" تنومند شخص فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "یہ ہماری خاندانی آن بان کے خلاف ہے ہم اپنے مجرموں کو خود سزا دیتے ہیں حکمرانوں سے انصاف کی بھیک نہیں مانگتے۔"

اب تین چار اور مسلح افراد بھی کمرے میں جمع ہو چکے تھے۔ سب خونی نگاہوں سے تابان کو گھور رہے تھے۔ گھنی مونچھوں اور سرخ انگارہ آنکھوں والا ایک جلاد صورت شخص بولا۔ "میرا خیال ہے چچا اسے مار کر اسی کمرے میں دفن کر دیتے ہیں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی اور ہوئی بھی تو کوئی لاش ڈھونڈنے میں کامیاب نہ ہو گا۔"

ایک شخص نے دیوار سے دوسری کلہاڑی اتاری اور غصے سے بے قابو ہو کر تابان پر ٹوٹ پڑا۔ تابان نے دیکھا خوبرو عورت جواب تک کھڑی تھی چیخیں مارتی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔ کلہاڑی کا ایک وار دیوار پر پڑا اور دوسرا تابان کے کندھے پر۔ بوڑھا ایک بار پھر تابان اور حملہ آور کے درمیان آ گیا۔ اس نے بمشکل حملہ آور کو پیچھے دھکیلا اور ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "عقل کی بات کرو۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہ مارو۔۔۔۔۔۔ اگر اسے قتل کرنا ہی ہے تو کسی حیلے سے کرو۔" ایک شخص جو صورت سے نسبتاً معاملہ فہم دکھائی دیتا تھا۔ آگے آیا اور سنسنی خیز انداز میں ساتھیوں کو سمجھانے لگا۔ "بابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اسے حیلے بہانے سے مارنا چاہیئے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ نشے میں ہے۔ اسے زبردستی اور شراب پلاؤ۔ بالکل مدہوش ہو جائے تو سڑک پر ڈال کر اوپر سے گھوڑا گاڑی گزار دو۔ یہ سمجھا جائے گا کہ نشے میں مدہوش حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔"

وہ لوگ بڑے اطمینان سے تابان کے سامنے اس کے قتل کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چمکتے ہتھیار تھے اور چہرے غصہ سے تمتمائے ہوئے تھے۔ اس وسیع و عریض مکان میں انہوں نے خون آشام بھیڑیوں کی طرح تابان کو گھیر رکھا تھا۔ اب ان کی

تعداد دس تک پہنچ چکی تھی۔ ان میں چار تو لباس سے اہل خانہ نظر آتے تھے اور باقی وفادار ملازم اور غلام تھے۔ تابان کے قتل کی منصوبہ بندی جاری تھی۔ کلہاڑی بردار نوجوان اپنا پیمانہ صبر پھر چھلکا بیٹھا۔ وہ اپنے بزرگوں کے عقب سے نکلا اور مغلظات بکتا ہوا ایک بار پھر تابان پر جھپٹا۔ اس مرتبہ اس کے حملے میں پہلے سے زیادہ شدت اور وحشت تھی۔ اسے حملہ آور دیکھ کر ایکا ایکی دوسرے افراد بھی خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ وہ سب کے سب ہتھیار لہراتے تابان پر جھپٹے۔ تابان سمجھ گیا کہ اب اسے جان بچانے کے لئے بھرپور مزاحمت کرنا ہو گی۔ اس نے کلہاڑی کے دو وار بچائے اور پیش قبض کھینچتے ہوئے کھڑکی کی طرف جست بھری۔ پھولدار رنگین شیشے کو چکنا چور کرتے ہوئے وہ دوسرے کمرے میں گرا اور اٹھ کر زینوں کی طرف بھاگا مگر وہاں پہلے سے دو مسلح افراد پہنچ چکے تھے۔ ایک شخص نے وحشیانہ انداز میں اسے برچھی میں پرونا چاہا لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا واسطہ مقدونوی فوج کے ایک بے مثال جنگجو سے پڑا ہے۔ اس کے سامنے وہ شخص ہے جو مقدونیہ کے تین بہترین جنگ بازوں کو ایک ہی حملے میں قتل کرنے کی شہرت رکھتا ہے۔ تابان نے برچھی کا وار بچایا اور اس سے پیشتر کی برچھی بردار کو اپنا وار خالی جانے کا احساس ہوتا اس کی آنتیں پیٹ سے باہر جھول رہی تھیں۔ اس کا ساتھی ایک ساعت کے لئے ٹھٹکا۔ تابان جیسے جنگجو کے لئے یہ مہلت بہت

تھی۔ اس نے اپنی پیش قبض دستے تک اس کے سینے میں گھونپ دی اور اس کی تلوار چھین کر پشت کے بل قالین پر گرا۔ ایسا کر کے اس نے خود کو دو قاتل تلواروں کی زد سے بچا لیا۔ قالین سے اٹھتے ہی وہ بے خوف ہو کر اپنے حریفوں سے بھڑ گیا۔ وہ ایک دو افراد کو زخمی کر کے یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن اسے گھیرنے والے بھی اب مرنے مارنے پر آ گئے تھے وہ ہر صورت اس کے خون سے ہاتھ رنگنا چاہتے تھے۔ کلہاڑی کے وار نے تابان کا کندھا زخمی کیا تھا اور وہ اپنی تلوار کو پوری آزادی سے حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔ حریفوں نے اسے تین اطراف سے گھیرا ہوا تھا اور کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ دفعتاً گھر کے در و دیوار وزنی جوتوں کی دھمک سے لرز اٹھے۔ یوں لگا جیسے بہت سے افراد بھرا مار کر اندر گھس آئے ہیں۔ آنے والے اگر دشمن تھے تو اب تابان کی موت یقینی تھی۔ چند لمحے تذبذب میں گزرے اور پھر تابان نے مقدونوی سپاہیوں کی جھلک دیکھی وہ گھر کی ہر کھڑکی اور دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے ان کے ہاتھوں میں عریاں تلواریں تھیں۔ بے انتہا پھرتی سے انہوں نے گھر کے مردوں کو تلواروں کی نوک پر رکھ لیا اور گرجدار آوازوں میں انہیں حکم سنا دیا کہ وہ ہتھیار پھینک دیں۔ اس اچانک افتاد نے تابان کے حریفوں کو سراسیمہ کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کے لئے اس فیصلے پر پہنچنا قطعی مشکل نہیں تھا کہ اگر وہ جانیں بچانا چاہتے ہیں تو بے چوں

چراں ہتھیار پھینک دیں۔ پھر انہوں نے ایسا ہی کیا۔ تابان یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ اس کی مدد کو پہنچنے والے سکندر کے ایک خصوصی دستے کے ارکان ہیں۔ جانبازی اور سفاکی میں یہ لوگ اپنی مثال آپ تھے۔ اہل خانہ کی آدھی جان توان کی صورتیں دیکھ کر ہی نکل گئی تھی۔ چند لمحے بعد گھر کی خواتین کو بھی اس وسیع کمرے میں حاضر کر دیا گیا۔ ان میں افشاندہ بھی شامل تھی۔ تابان نے دستہ سالار کو ہدایت کی کہ اہل خانہ سے نرمی کا سلوک کا جائے اور ان میں سے کسی کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ تابان کے ہاتھوں زخمی ہونے والے ایک شخص کو تابان کی ہدایت پر فوراً شفاخانے روانہ کر دیا گیا۔۔۔۔۔۔۔ تابان اپنے مددگاروں کی آمد پر کچھ زیادہ حیران ہوا۔ اب اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ پچھلے چند روز سے اس کے تعاقب میں رہنے والے یہی مددگار تھے۔ یقینی طور پر سالارِ اعظم نے انہیں ایسا کرنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ انہوں نے تابان کی ہر نقل و حرکت پر نگاہ رکھی ہوئی تھی اور یہ وجہ تھی کہ وہ برقت اس مکان میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ بات جان کر تابان کو خوشگوار احساس ہوا کہ وہ سالارِ اعظم کی نگاہ میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے روز دربار سے پہلے سکندر نے تابان کو خلوت میں طلب کیا۔ تابان سکندر کے سامنے پیش ہوا تو وہ ابھی ابھی صبحانے سے فارغ ہوا تھا۔ خدام دستر خوان سے سونے چاندی کے برتن اٹھا رہے تھے اور وہ خود نشست سے ٹیک لگا کر دانتوں میں خلال کر رہا تھا۔ تابان کو دیکھا تو سکندر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تابان نے تعظیم پیش کی اور سکندر کی ہدایت پر قریب ہی ایک نشست سنبھال لی۔ سکندر بھاری بھر کم آواز میں بولا۔

"ہم نے سنا ہے آج کل تم بہت شراب پی رہے ہو اور راتوں کو اپنی قیام گاہ پر بھی نہیں پہنچتے۔" تابان نے سر جھکا لیا اور خاموش رہا۔ سکندر کچھ دیر اسے گہری نظروں سے دیکھنے کے بعد بولا۔ "تابان! ایک عورت کے نہ ملنے سے زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ تم خود یک ہزاری سردار ہو۔ تم اب کوئی معمولی شخص نہیں ہماری فوج کے یک ہزاری سردار ہو۔ تمہارے سامنے ایک نہایت روشن مستقبل ہے۔ دنیا کے ہنگامے ہیں اور بڑی بڑی فتوحات ہیں۔۔۔۔۔۔۔" تابان نے اس مرتبہ بھی زبان نہیں کھولی اور سر جھکائے رکھا۔ سکندر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اس عورت کا کیا معاملہ ہے جسے رات اس کے اہل خانہ سمیت حراست میں لیا گیا ہے۔"

تابان نے پہلی بار سر اٹھا کر سکندر سے نگاہ ملائی اور گھمبیر لہجے میں بولا۔

"سالار اعظم! گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے اس عورت میں گمشدہ شہزادی کی جھلک نظر آتی ہے اور اب میرا دل اس کی جانب کھنچتا چلا جاتا ہے۔ میں۔۔۔۔۔۔۔ اسے اپنے قریب رکھنا چاہتا ہوں۔"

سکندر نے نرمی سے کہا۔ "تو اس میں اتنا ہنگامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم ہمیں کہہ دیتے کسی کے ہاتھ کہلا بھیجتے۔ وہ عورت تمہاری خلوت میں حاضر کر دی جاتی۔"

تابان نے کہا۔ "سالار اعظم میں شرمندہ ہوں کہ میرے رویے سے آپکو پریشانی ہوئی۔"

سکندر نے پوچھا۔ "وہ شادی شدہ تو نہیں۔"

تابان نے جھجک کر کہا۔ "وہ شادی شدہ ہے۔"

"اوہ" سکندر کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ وہ کچھ دیر سنہری گھونگریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا پھر پہلو بدل کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ معاملہ ہمارے سامنے پیش ہوگا۔ ہم دیکھیں کے اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔" ایک لمحہ توقف کرنے

کے بعد وہ بولا۔ "اور جہاں تک شہزادی مارشا کا تعلق ہے تمہیں اس کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمارے آدمی دن رات اس کی تلاش میں ہیں۔ درست ہے کہ ایران ایک بڑا ملک ہے' یہاں ہزاروں شہر و قصبات ہیں لیکن مستقل مزاجی سے تلاش کیا جائے تو کوئی بھی چیز ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ "

"میں اب جا سکتا ہوں؟" تابان نے سینے پر ہاتھ رکھ رکھتے ہوئے اجازت طلب کی۔

"ہاں۔۔۔۔۔۔۔ لیکن ابھی تھوڑی دیر بعد تمہیں مقدمے کی کاروائی کے لئے دوبارہ میں پیش ہونا چاہیئے۔"

تابان نے سر جھکا کر اطاعت مندی کا اظہار کیا اور تعظیم پیش کر کے الٹے قدموں باہر نکل آیا۔

دن چڑھے وہ سکندر کے دربار میں موجود تھا۔ یہ دربار والئی شہر کی رہائش گاہ پر ہی لگایا گیا تھا، افشاندہ اور اس کے اہل خانہ بھی ایک جانب نشستوں پر بیٹھے تھے ان میں سے چند مرد وزن کے ہاتھ ریشمی ڈوریوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ سکندر ایک بیضوی تخت پر بیٹھا تھا۔ اس تخت کے پائے چاندی کے تھے اور اطراف میں سونے کے منقش پترے جڑے ہوئے تھے،

اس نے زربفت کے تکئیے سے ٹیک لگا رکھی تھی جبکہ سر پر ایک چھپر کھٹ کا سایہ تھا۔ وہ یونانی طرز کا کرتہ پہنے ہوئے تھا اور سڈول ٹانگیں حسبِ دستور گھٹنوں تک ننگی تھیں۔ اس کے پیچھے برچھی بردار محافظوں کی طویل قطار تھی۔ دربار میں خوب گہما گہمی تھی۔ ہیلی کارنیس کی فتح کے بعد قرب وجوار کے شہروں اور قصبوں کے باشندے سکندر کی اطاعت اختیار کرنے کے لئے بے چین تھے۔ کئی دفعہ تحفے تحائف لے کر حاضر ہوئے تھے اور جمیعت متحدہ یونان کے سالااعظم کی خوشنودی حاصل کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وفود کی آمد ورفت قدرے کم ہوئی تو تابان اور افشاندہ کا معاملہ دربار میں پیش ہوا۔

سرکاری اہلکاروں نے اپنا مؤقف کچھ اس طرح پیش کیا کہ چند روز پہلے ایک مہ خانے سے باہر امیر ارژنگ اور یک ہزار سردار تابان میں ایک جھڑپ ہوئی تھی۔ امیر ارژنگ کے دل میں رنجش تھی اور وہ یک ہزاری سردار سے بدلہ لینے کی تاک میں تھا۔ کل یک ہزاری سردار جب مہ خانے سے نکل رہا تھا اسے اغوا کر لیا گیا اور گھر لے جا کر جان سے مارنے کی کوشش کی گئی۔ مقصد یہ تھے کہ اس پر چار دیواری کی پامالی کا الزام لگایا جا سکے۔۔۔۔۔۔"

نہ جانے کیوں تابان کو یہ ساری کارروائی بے معنی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے دکھ ہو رہا تھا کہ اس کی خاطر سرکاری اہلکار اتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ جھوٹ اور منافقت اس کے لئے نئی بات نہیں تھی۔ یہی جبر ناروا شب وروز اس کے تعاقب میں رہا تھا۔ یہ جابر اور منافق وہ آقا تھے جو اسے پابہ زنجیر کرتے تھے اور تاریک جنگلوں میں اس کے پیچھے کتے دوڑاتے تھے۔ اس کا دل یہی چاہا کہ وہ اس غیر عادلانہ کارروائی میں فریق بنے۔ اس نے بازو کی تکلیف کا عذر کیا اور سکندر کے دربار کے نائب بطلیموس سے اجازت لے کر وہاں سے اٹھ آیا۔۔۔۔۔۔۔ اس کی قیام گاہ سکندر کے دربار سے دو سٹیڈیم کے فاصلے پر تھی۔ یہ راستہ اس نے گردن جھکائے سوچوں میں ڈوبتے ابھرتے طے کیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کا موقف کیا ہونا چاہیئے۔ کیا اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ ایک عیال دار عورت کو اس کے بچوں اور شہر سے جدا کر دے اور اپنی بے جا ضد کی بھینٹ چڑھائے۔ اگر تابان کو اس میں مارشا کی جھلک نظر آتی تھی۔ تو اس میں اس بیچاری کا کیا قصور تھا۔ اسے اتنی بڑی سزا کیسے دی جا سکتی تھی۔۔۔۔۔۔۔ دوسری طرف تابان کی پیاس اور ناآسودگی کسی عفریت کی مانند منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ مارشا کی جدائی کے اس لق ودق صحرا میں وہ افشاندہ کے نخلستان سے دور رہا تو تڑپ کر مر جائے گا۔ اس کی بنجر آنکھیں پھٹ جائیں گی۔ اور وہ کسی

اندھے کنوئیں میں گر کر دم توڑ دے گا۔ یہی کچھ سوچتا وہ اپنی قیام گاہ پر پہنچا اور بے دم ہو کر مسہری پر گر پڑا۔ نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ دوبارہ اٹھا تو شاہی طبیب اس کے بازو کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ کوئی طربیہ گیت بھی گنگنا رہا تھا۔ تابان کو بیدار ہوتے دیکھ کر اس کی گنگناہٹ تو رک گئی لیکن آنکھوں میں بدستور شوخی ناچتی رہی۔

اصدار نامی یہ جواں سال طبیب تابان سے خاصا بے تکلف تھا۔ ایتھنز میں جب تابان کی قسمت نے پلٹا کھایا تھا اور وہ شاہی نوازشات کا مستحق ٹھہرا تھا تو اسی طبیب نے اس کی چھاتی کے زخم کا علاج کیا تھا۔

اصدار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہاری تو قسمت کی پڑیا نکل آئی۔ دربار میں وہی فیصلہ ہوا ہے جو تم چاہتے تھے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ حور شمائل پری خصائل لڑکی تمہیں دستیاب ہو گئی ہے۔"

"لیکن اس کا شوہر؟"

"یہی تو لطف کی بات ہوئی ہے۔" اصدار نے مزا لے کر کہا۔ "ہم تم جسے اس کا شوہر سمجھ رہے تھے وہ اس کا شوہر نہیں تھا۔ اس کا شوہر تو کوئی دو برس پہلے مر چکا ہے اور اسے مارنے والا اسی امیر ارژنگ کا کوئی رشتے دار تھا۔"

تابان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "تمہارا کیا مطلب ہے۔ ارژنگ اس کا شوہر نہیں!"

ہرگز نہیں۔ افشاندہ اس کی زر خرید لونڈی ہے اور اس سے پہلے بھی وہ بیچاری کئی جگہ فروخت ہو چکی ہے۔ اس نے سالارِ اعظم کے سامنے ساری روئیداد وضاحت سے بیان کی ہے۔ اس کے دونوں بچے اپنے شوہر سے تھے۔ اس کا شوہر جو والئی ملی ٹس کا غلام تھا بحیرہ ایجیئن میں قزاقوں کے ہاتھ مارا گیا۔ قزاقوں نے افشاندہ اور اس کے دونوں بچوں کو غلام بنا لیا۔ قزاقوں کا سردار امیر ارژنگ کے قبیلے ہی کا کوئی فرد ہے۔ اس نے افشاندہ کو پہلے کچھ عرصے اپنے پاس رکھا پھر امیر ارژنگ کے ایک سگے چچا کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ افشاندہ کوئی ڈیڑھ برس تک دیہی علاقے میں اس اذیت پسند آقا کی ملکیت رہی۔ آخر اس نے اوپر تلے کئی بار خودکشی کی کوشش کی تو اس شخص نے اسے شہر لا کر اپنے بھتیجے ارژنگ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ دونوں بچوں سمیت افشاندہ ارژنگ کے پاس تھی۔ ارژنگ کا باپ افشاندہ کے حسن سلوک اور

فطری ذہانت سے بہت متاثر تھا۔ وہ بیٹے پر زور دیتا تھا کہ وہ افشاندہ سے شادی کر لے۔ وہ افشاندہ کو اپنی بہو سمجھتا تھا اور اسی لقب سے بلاتا تھا لیکن ارژنگ جو بے حد عیاش ہونے کے علاوہ انا پرست بھی تھا ایک کنیز کو اپنے حرم میں داخل کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ وہ افشاندہ کو زر خرید لونڈی سمجھتا تھا اور افشاندہ سے اس کا سلوک اسی حوالے سے تھا۔ وہ افشاندہ کے بچوں کو اپنی نگاہ سے دور رکھتا تھا اور اس نے افشاندہ کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ جب اس کے سامنے آئے تو بچے اس کے ساتھ نہ ہوں۔ افشاندہ نے سالارِ اعظم کے سامنے برملا اظہار کیا ہے کہ وہ اپنے مالک سے آزادی چاہتی ہے۔"

"پھر سالارِ اعظم نے کیا حکم دیا ہے؟" تابان نے بے تابی سے پوچھا۔"

"افشاندہ آزاد ہو گئی ہے اور تم دونوں کے درمیان کوئی روکاوٹ نہیں رہی۔"

تابان کے چہرے پر ایک معصوم خوشی نمودار ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے یہ تاثر گہرے فکر میں ڈوب گیا۔

اصدار نے کہا۔ "کیوں! خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ کیا اب کوئی اور مطالبہ ہے؟"

"نہیں اصدار! تابان نے پُر سوچ انداز میں کہا۔ "سوچتا ہوں کیا افشاندہ کسی دوسری عورت کا تصور اجاگر کرنے کے لئے میری خلوت کا ساتھی بننا قبول کر لے گی۔"

اصدار نے قہقہہ لگایا۔ "معلوم نہیں سالارِ اعظم نے تمہیں یک ہزاری سردار کیسے بنا دیا ہے۔ بہتر تھا پہلے تمہیں کسی مدرسے میں داخل کرا دیا جاتا۔ بھلے مانس وہ اب تمہاری کنیز ہے۔ اب اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں۔ جو تمہاری آرزو ہو گی وہ اس کی مرضی ہو گی۔"

"نہیں اصدار۔" تابان نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ "ہر شخص کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔ اور اس پر مرضی ٹھونسنے والا جابر ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ کہاں ہے اس وقت افشاندہ؟"

اصدار نے کہا۔ "جب میں آیا تو وہ زنان خانے میں تھی۔ میرا خیال ہے آج رات تک اسے بنا سنوار کر تمہارے قیام گاہ تک پہنچا دیا جائے گا تاکہ تمہاری تنہائی کو رنگین بنا سکے۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔" تابان اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "تم میری طرف سے زنان خانے کے منتظم کے نام پیغام لے جاؤ کہ افشاندہ کو فی الحال وہیں رہنا چاہیئے جب میں ضروری سمجھوں گا اسے خود بلا لوں گا۔ بلکہ بہتر ہے میں تمہیں یہ پیغام تحریر کر دوں۔" تابان لکھنے والی چوکی کے پاس پہنچا اور قلم سے ایک چمڑے پر یہ مختصر حکم لکھ دیا۔ "افشاندہ نامی وہ کنیز جو

سالار اعظم کی جانب سے مجھے سونپی گئی ہے فی الوقت دوسری عورتوں کے ساتھ رکھی جائے ۔ زنان خانے میں میری ایک کنیز کورا پہلے سے موجود ہے۔ بہتر ہو گا اگر افشاندہ کو کورا کی تحویل میں دے دیا جائے۔

یہ سطور لکھ کر تابان نے نیچے اپنی مہر لگائی اور دستخط کر کے چمڑے کا چوکور ٹکڑا اصدار کو دے دیا۔

اصدار اجازت لے کر تابان سے رخصت ہوا تو وہ اپنے زخمی بازو کو تھام کر بستر پر گر گیا۔ افشاندہ کے بارے میں اس کا ذہن زبردست کشمکش کا شکار ہو چکا تھا۔ اگلے روز سکندر نے دربار میں بہت سے سرداروں اور مصاحبوں کو طلب کر رکھا تھا۔ خیال تھا کہ کوئی اہم اعلان کیا جائے گا۔ تابان مقررہ وقت سے کچھ تاخیر کے ساتھ دربار پہنچا۔ حسبِ معمول اس کا لباس بھی موزوں نہیں تھا۔ وردی شکن آلود' بال منتشر اور ہتھیار لاپرواہی سے باندھے گئے تھے۔ سکندر اپنی تقریر شروع کر چکا تھا۔ وہ حسب معمول نپے تلے الفاظ ادا کر رہا تھا اور بولتے ہوئے اس کی نگاہیں مسلسل حاضرین کے چہرے پڑھ رہی تھیں۔

اپنی اس تقریر میں سکندر نے آئندہ لائحہ عمل بڑی وضاحت سے بیان کیا اور کئی اہم اعلان کئے۔ سب سے پہلا اعلان یہ تھا کہ فوج کے مختصر سے بحری بیڑے کو ختم کر دیا گیا ہے۔ ملاحوں کو چھٹی دے دی گئی ہے اور کچھ کو بری فوج میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس کارروائی کا مقصد فوجی اخراجات کم کرنا اور اپنے سپاہیوں کو طاقتور ایرانی بیڑے کے ساتھ ٹکراؤ سے بچانا تھا۔۔۔۔۔۔ سکندر نے جو دوسرا فیصلہ سنایا وہ یہ تھا کہ نوبیاہتا فوجیوں کو جلد ہی وطن واپس جانے کی اجازت مل جائے گی یہ لوگ آئندہ موسم بہار تک گھروں میں رہیں گے اور واپسی پر زیادہ سے زیادہ تعداد میں نئے سپاہی لے کر آئیں گے۔ اس دوران سکندر باقی سپاہ کے ساتھ آئی رونیا کی برف پوش سطح مرتفع پر گشت کرے گا۔ سلسلہ ہائے کوہ میں جو قبائلی آباد ہیں انہیں زیر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تاکہ اس سے پہلے ایرانی افواج سے کوئی بڑی جنگ ہو قرب وجوار کے علاقوں کو مطیع کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف فوجی امور کے بارے میں اور عام اور خصوصی فیصلے کئے گئے۔ تابان اس ساری گفتگو سے لاتعلق رہا۔ اسے ان پیچیدہ معاملات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اتنا جانتا تھا اسے میدان جنگ میں اپنی سپاہ کی کمان کرنی ہے اور جہاں سالارِ اعظم کا حکم ہو وہاں سیسہ پلائی دیوار کی طرح جم جانا ہے۔ وہ حکم کا بندہ تھا۔ کبھی کبھی وہ خود سوچتا تھا کہ وہ اتنے بڑے عہدے کے قابل ہرگز

نہیں۔ اس سے زیادہ تجربہ کار اور باصلاحیت لوگ اس کے ماتحت تھے۔ معلوم نہیں سالارِ اعظم کو اس میں کیا بات نظر آئی تھی کہ اتنا بڑا عہدہ اسے سونپ دیا تھا۔

ہیلی کارنیس سے کوچ کرنے کے بعد یونانی و مقدونوی سپاہ نے ایشیائے کوچک کے ساحل پر پڑاؤ کیا تاکہ جتنا علاقہ فتح ہو چکا ہے اس کا انتظام درست کر لیا جائے۔ نو بیاہتا سپاہیوں کو رخصت پر وطن بھیج دیا گیا۔ سکندر نے آزمودہ کار پیادہ فوج کا کچھ حصہ ساتھ لیا اور ایران کے اندرونی حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔ تاکہ برفستانی سطح مرتفع پر تسلط قائم کر سکے۔ سکندر کے ساتھ جانے والی فوج میں تابان کا دستہ بھی شامل تھا۔ یونان سے روانہ ہونے کے بعد سکندر کی سپاہ کا واسطہ سمندر سے رہا تھا یا ساحلی علاقوں سے۔ اب ان کے قدموں تلے برفیلی زمین آئی تھی اور انہوں نے برف پوش ٹیلوں کا نظارہ کیا تھا تو طبیعتوں پر چھائی ہوئی اکتاہٹ خود بخود دور ہونے لگی تھی۔ وہ انجانے علاقوں سے گزر رہے تھے اور نئے نئے لوگوں سے ان کا واسطہ پڑ رہا تھا۔ راستے میں چھوٹی موٹی لڑائیاں بھی ہو رہی تھیں لیکن مجموعی طور پر وہ اس سفر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تابان خود کو سارا دن مصروف رکھتا۔ کبھی وہ ساتھی کمانداروں کے ساتھ گھڑ دوڑ میں حصہ لیتا کبھی وہ سب شکار کو نکل جاتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ

کسی مقامی قبیلے سے جھڑپیں شروع ہو جاتیں اور کئی روز اس مصروفیت میں گزر جاتے۔ شام کو تابان تھکا ماندہ اپنے خیمے میں لوٹتا اور نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑتا۔ اسے معلوم ہوتا کہ قریب ہی ایک خیمے میں افشاندہ موجود ہے۔ وہ چند قدم اٹھانے کی زحمت کر لے تو اس کے خیمے میں پہنچ سکتا ہے اور صبح تک اس کے حسن سے سیراب ہو سکتا ہے۔ اس کے چہرے میں کسی کا چہرہ تلاش کر کے اپنے دکھتے دل کو آرام پہنچا سکتا ہے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا' ایسا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا۔ ایک دیوار سی اس کے اور افشاندہ کے درمیان حائل ہو گئی ہے۔

یہ ایک ابر آلود سہ پہر کا ذکر ہے۔ تیز برفیلی ہوا ہڈیوں کو کاٹتی ہوئی گزر رہی تھی۔ سکندر اور اس کی پیادہ فوج نے صرف ایک روز قبل اس کوہستانی علاقے کے مشہور شہر گورڈیم پر قبضہ کیا تھا اور اب وہ لوگ شہر میں گشت کر رہے تھے۔ سکندر ایک شاندار رتھ میں سوار تھا۔ ان پر کماندار اور مصاحب درجہ بدرجہ سوار تھے' سب سے آخر میں گھڑ سوار دستہ تھا۔ ایک ایسا ہی چمکتا دمکتا دستہ سکندر کے آگے آگے بھی رواں تھا۔ شہر کے مرد و زن سڑکوں پر دو رویہ کھڑے تھے اور مکانوں کی چھتوں و بالکونیوں پر جھکے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے تاثرات سے

عاری تھے۔ وہ زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے اور نہ ہی خوفزدہ تھے۔ سکندر کا رخ گورڈیم کے اس قدیم معبد کی طرف تھا جس کے بارے میں ایک دیرینہ کہانی مشہور تھی۔ کہانی کے مطابق اس معبد میں ایک گاڑی زمانہ قدیم سے موجود تھی۔ کہاوت تھی کہ اس شہر کا بانی اس گاڑی پر یہاں پہنچا تھا۔ یہ گاڑی کئی برسوں سے جہاں کی تہاں کھڑی تھی۔ اس گاڑی کے جوئے کی رسی ایک نہایت مضبوط گرہ میں بندھی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے باتدبیر اور ذہین لوگ اس گرہ کو کھولنے کی کوشش کر چکے تھے لیکن ناکام ہوئے تھے۔ معبد کے کاہنوں اور پجاریوں کا کہنا تھا کہ جو شخص اس گرہ کو کھولے گا 'اسے ایشیا کی بادشاہی نصیب ہو گی۔ سکندر نے بھی یہ کہاوت سن رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گورڈیم پہنچتے ہی اس پر گاڑی دیکھنے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔

کئی بھرے پُرے راستوں سے گزرنے کے بعد سکندر اور اس کے مصاحب ایک بلند عمارے کے سامنے پہنچے۔ عمارت کے منتظمین نے اس کا استقبال کیا۔ وہ سکندر کو دیکھتے ہی جان گئے تھے کہ جوئے کی گرہ پر طبع آزمائی کے لئے آیا ہے۔ سکندر کو احترام کے ساتھ اس چھت کے نیچے پہنچایا گیا جہاں گاڑی کھڑی تھی۔ اس دوران بہت سے مقامی لوگ بھی جمع

ہو گئے۔ وہ سب یہ جاننے کے لئے مشتاق تھے کہ آیا یہ بلند ہمت مقدونوی سالار گرہ کھولنے میں کامیاب ہو جائے گا 'سکندر نے موٹے رسے کی اس مضبوط گرہ کو دلچسپی سے دیکھا جس پر بے شمار ہاتھوں اور موسموں کی میل جم چکی تھی۔ گرہ اس طرح باندھی گئی تھی کہ اس کے دونوں سرے اندر آ گئے تھے۔ سکندر کافی دیر تک گرہ کھولنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ سکندر کے ہاتھ پھسل پھسل جا رہے تھے۔ تماشائی نگاہوں کی چبھن محسوس کر کے اس کی پیشانی عرق آلود ہونے لگی۔ وہ پریشان نظر آ رہا تھا لیکن پھر اچانک پر سکون ہو گیا اور اس کے ہونٹوں پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس نے تلوار نیام سے کھینچی اور گرہ کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ ہجوم یہ منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ سکندر نے تلوار کو پیار سے بوسہ دے کر پھر نیام میں رکھ لیا۔ ایک طرح سے سکندر نے معبد کے پجاریوں کے سامنے اعلان کیا تھا کہ " تلوار " سے بڑھ کر باتدبیر اور کوئی نہیں۔ جو ہر گتھی کو سلجھاتی ہے اور ہر مسئلے کو حل کرتی ہے۔ سکندر کی اس کارروائی کا اس کے مصاحبوں نے پُرجوش خیر مقدم کیا اور بعض تو اسی جگہ کھڑے کھڑے یہ پیشن گوئیاں صادر کرنے لگے کی سالارِ اعظم نہ صرف ایشیا بلکہ تمام معلوم دنیا کو فتح کرے گا۔

اس شب گورڈیم کی فتح کا جشن برپا کیا گیا۔ یہ تقریب شہر کی بجائے فوج کے پڑاؤ میں ہوئی۔ یخ بستہ سردی کو مات دینے کے لئے جگہ جگہ الاؤ بھڑکائے گئے۔ سپاہیوں نے اس آگ کے گرد بیٹھ کر لذیذ قوت بخش کھانے کھائے اور گیت گائے۔ بازی گروں نے اپنے کرتب دکھائے اور کہانی سنانے والوں نے داستاں گوئی پر ساری قوت صرف کر دی۔ شاہی خیمے کے سامنے بھی ایک بہت بڑا الاؤ روشن تھا۔ ناؤ نوش کی محفل جمی ہوئی تھی اور شام کی ایک حسین مغنیہ نغمہ سرا تھی۔ تابان بھی اس محفل میں موجود تھا۔ شامی مغنیہ کے پُر سوز نغمے اور آواز نے تابان کے سینے میں انوکھا درد جگا دیا۔ شہزادی مارشا کی یاد آئی اور گھنگھور گھٹا کی طرح اس کے دل کے افق پر چھاتی چلی گئی۔ اس کے بدن کا رواں رواں مارشا پکار اٹھا۔ آج پہلی بار اس کا دل چاہا کہ وہ افشاندہ کے خیمے میں جائے۔ اسے شمع دان کے سامنے ایک مخصوص زاویے سے بٹھا دے اور دیکھتا چلا جائے۔۔۔۔۔۔ نہ اسے حرکت کرنے دے اور نہ خود جنبش کرے۔

تابان اپنے چرمی خیمے میں داخل ہوا تو ایک خوشگوار حدت نے اس کا استقبال کیا۔ خادم نے انگیٹھی دہکا رکھی تھی اور انگیٹھی کی سرخ روشنی نے شمعدان کی زرد روشنی سے بغلگیر ہو کر

ایک عجیب سا رنگ خیمے میں بکھیر دیا تھا۔ تابان نے بستر پر گر کر تکیے سے ٹیک لگائی اور خالی خالی نگاہوں سے خادم کو دیکھنے لگا۔ خادم مؤدب کھڑا رہا۔ وہ اپنے آقا کے اس طرح دیکھنے سے سخت بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ آخر تابان نے خاموشی کی جھیل میں کنکر پھینکا۔ "افشاندہ کہاں ہے؟"

خادم نے جھک کر کہا۔ "وہ اپنے خیمے میں ہے سردار۔ کورا بھی اس کے ساتھ ہے۔ میں ابھی ان کے خیمے میں انگیٹھی دہکا کر آ رہا ہوں۔"

تابان نے کہا۔ "افشاندہ کو میرا پیغام پہنچاؤ۔ میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"بہت بہتر سردار۔" خادم نے فرطِ احترام سے دوہرا ہو کر کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

تابان تکیے سے ٹیک لگائے اپنے خیالوں میں کھویا رہا۔ خیمے سے باہر بے قرار سرد ہوا ٹیلوں میں چکراتی رہی اور شاخوں سے الجھتی رہی۔ آخر خیمے سے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور تابان کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ چند لمحے بعد خادم افشاندہ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ سبز رنگ کے زرتار ریشمی لباس میں تھی۔ بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے اور چہرے پر غازہ تھا۔ وہ خیمے میں آئی تو ایک بھینی خوشبو نے تابان کو گھیر لیا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اس

کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ نہ خوشی نہ غم نہ ہمدردی نہ نفرت۔ وہ ایک بے جان تصویر تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" تابان نے آہستگی سے کہا۔

وہ بیٹھ گئی۔ اس کے کنگنوں کی کھنک نے شب کے سناٹے میں جلترنگ بکھیر دیے۔ تابان نے شمعدان اٹھا کر اس کے عین سامنے رکھ دیا۔ وہ خوبصورت چہرہ روشنی میں چمک اٹھا۔ تابان اس کے نقوش پر نگاہیں گاڑے دھیرے دھیرے نیم دائرے کی شکل میں حرکت کرنے لگا۔ وہ اس زاویے کی تلاش میں تھا جو اس کی چہرے پر خوبصورت ترین تھا اور جس میں مارشا کی حسن کی کرن چمکتی تھی۔ آخر وہ رخ تابان کی نگاہوں میں آیا۔ اس کے قدموں کے ساتھ اس کی دھڑکن بھی تھم گئی۔ وہ اپنی جگہ ساکت و جامد رہ گیا۔ پھر جیسے اس میں کھڑے رہنے کی تاب بھی نہ رہی۔ وہ اپنے گھٹنوں پر گرا اور دو زانو بیٹھ گیا۔ وہ اسے دیکھتا چلا گیا اور اس کی گرمئ نگاہ افشاندہ کو بے قرار کرتی چلی گئی۔ وہ اضطراب میں اپنی حنائی انگلیاں مروڑ رہی تھی اور اپنے لرزاں ہونٹوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر اس بے ڈھنگی خاموشی کو توڑنے کے لئے وہ بولی۔ "آپ مجھ سے خفا ہیں؟"

"نہیں۔" تابان نے گمشدہ لہجے میں کہا۔ نگاہیں بدستور افشاندہ کے چہرے پر تھیں۔

افشاندہ نے کہا۔ "آپ کے "نہیں" کہنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ مجھے آپ سے وابستہ ہوئے چار ماہ گزر گئے ہیں۔ آج میں پہلی دفعہ آپ کی صورت دیکھ رہی ہوں۔"

تابان نے کہا۔ "تم میری صورت کہاں دیکھ رہی ہو۔ میں تمہاری صورت دیکھ رہا ہوں اور تمہاری صورت بھی کیا دیکھ رہا ہوں۔ اس صورت میں کسی اور کا عکس دیکھ رہا ہوں۔" افشاندہ نے کن اکھیوں سے تابان کی طرف دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں۔ تابان کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ مارشا کا عکس اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہا تھا۔ ایک عجیب خود فراموشی کے عالم میں وہ افشاندہ کی طرف بڑھا مگر پھر ایک جھٹکے سے رک گیا۔ جیسے سوتے میں چلنے والا اچانک جاگ جائے۔ اس نے اپنی نگاہیں جھکائیں اور بے حد گھمبیر آواز میں بولا۔

"افشاندہ! تم جا سکتی ہو۔"

تابان کی ہدایت کے باوجود افشاندہ اپنی جگہ سے اٹھی نہیں۔ چند لمحوں بعد تابان نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ تابان سے نگاہ ملائے بغیر بولی۔ "آپ مجھے بھیجنا نہیں چاہتے اس کے باوجود بھیج رہے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"نہیں" تابان کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

افشاندہ بولی۔ "ایک عورت کے لئے یہ بہت تکلیف دہ بات ہوتی ہے کہ مرد اس سے اس لئے محبت کرے کہ وہ کسی دوسری عورت سے مشابہ رکھتی ہے لیکن میں آپ کی دلی کیفیت سمجھ رہی ہوں۔ میں آپ کا بے پناہ دکھ سمیٹنا چاہتی ہوں اور اس کے لئے ہر قربانی دے سکتی ہوں۔ میری صرف ایک گزارش ہو گی۔"

"وہ کیا؟" تابان نے پوچھا۔

"آپ مجھے زندگی بھر خود سے جدا نہیں کریں گے۔ اگر آپ کو غارس زنوب کی خوش نصیب بیٹی بھی مل گئی تو مجھے اپنے قدموں میں پڑا رہنے دیں گے۔ کوئی تنہا گوشہ مجھے دے دیں گے جہاں بیٹھ کر میں آپ کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہوں۔"

تابان نے دیکھا افشاندہ کے چہرے پر عورت کی ازلی خواہش آئینہ بن کر چمک رہی تھی۔ وہ دائمی رفاقت کے سوا کچھ نہیں مانگ رہی تھی۔ تابان نے کہا "افشاندہ! پھر میری بھی ایک شرط ہے۔"

تابان نے کہا۔ "آج سے تم کنیز نہیں ہو۔ میں تمہیں اور تمہارے بچوں کو آزاد کرتا ہوں۔ تم جب چاہو مجھے چھوڑ کے جا سکتی ہو۔ اگر چاہو تو میں ابھی تمہاری آزادی کا پروانہ لکھ دیتا ہوں۔"

افشاندہ نے کوئی جواب نہیں دیا بس پُر نم آنکھوں سے تابان کو دیکھتی رہی۔ اس وقت نہ جانے کس درز سے سرد ہوا کا ایک تند جھونکا خیمے میں گھس آیا اور اس نے شمعدان گل کر دیا۔ یک لخت خیمے میں گہری تیرگی پھیل گئی۔ افشاندہ کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ ڈر کر تابان سے آ ٹکرائی۔ تابان نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اس کے ذہن میں مارشا کا تصور اجاگر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ گہری تیرگی میں چاروں طرف مارشا ہی مارشا تھی۔ اس کا لمس اس کی خوشبو تھی۔ اس کے سانسوں کی آواز تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آئی رونیا کے برف پوش کوہستانی علاقوں میں سکندر اور اس کی سپاہ کا گشت جاری رہا۔ سکندر اب یہ بات بخوبی جان گیا تھا کہ علاقے کے مکینوں کو موسم سرما میں زیر کرنا بہت آسان ہے۔ وجہ یہ تھی کہ اس موسم میں وہ لوگ چھاپہ مار لڑائی کے لئے پہاڑوں پر نہیں چڑھ سکتے تھے۔

گورڈیم سے کوئی 800 سٹیڈیم دور شمال میں ایک وادی سکندر کو پڑاؤ کے لئے پسند آئی۔ یہاں یخ بستہ ہواؤں کا زور کم تھا اور ٹیلوں کے دامن میں کہیں کہیں گھاس بھی موجود تھی۔ سکندر نے فیصلہ کیا کہ یہاں چند ہفتے آرام کر کے آگے بڑھا جائے۔ دل بہلانے کے لئے یہاں شکار موجود تھا اور پانی سمیت پڑاؤ کی دوسری سہولتیں بھی حاصل تھیں۔ سکندر کے حکم پر ایک گھاٹی کی بلند دیوار کے ساتھ ساتھ سینکڑوں خیمے ایستادہ کر دیے گئے اور لشکریوں نے ہتھیار کھول کر آرام کا ارادہ باندھ لیا۔

کٹھن سفر اور خونی جھڑپوں کے بعد فراغت کے ان شب و روز سے سپاہیوں نے خوب حظ اٹھایا۔ اہم سرداروں کی بیویاں ان کے ہمراہ تھیں۔ وہ ان کے ساتھ شکار پر نکل جاتے۔ چھوٹے چھوٹے تفریحی سفر کرتے یا پھر بازیگروں کے تماشے دیکھتے۔ اندھیرا پھیلتے ہی الاؤ بھڑکا کر ناؤنوش کی محفلیں جمائی جاتیں۔ پرانی منظوم داستانیں سنی جاتیں اور لطیفہ گوئی کے دور چلتے۔ تابان کے یہ شب و روز نسبتاً پرسکون تھے۔ اسے افشاندہ کی زلفوں کی چھاؤں میسر تھی۔ مارشا کا ہلکان کر دینے والا غم کسی حد تک بھولا ہوا تھا۔ جب کبھی بے قراری فزوں تر ہو جاتی وہ اپنا اصیل گھوڑا لے کر پڑاؤ سے دور نکل جاتا۔ گھورے کو ایڑ لگاتا اور اندھا دھند

بھگانے لگتا۔ خطرناک راستوں پر گھاٹیوں میں ڈھلوانوں پر وہ گھوڑے سے اتر آتا اور برف پوش زمین پر اوندھا گر کر آنکھیں بند کر لیتا۔ اسے محسوس ہوتا اس کا تصور بھی ایک سرکش گھوڑا ہے جو لپک لپک کر مارشا کی طرف جاتا ہے۔ وہ اس گھوڑے کے منہ میں لگام ڈالتا اور اپنی مرضی سے چلانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔

ایک روز وہ "درد کے اسی سفر" کو طے کر کے پڑاؤ میں واپس آیا تو افشاندہ خیمے میں بے قراری سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تابان اس سے کافی مانوس ہو چکا تھا اس کے کنگنوں کی کھنک ہی تابان کو سمجھا دیتی تھی کہ وہ پریشان ہے۔؟ غمزدہ ہے؟ یا خوش؟ تابان کی آمد سے پہلے دسترخوان بچھ چکا تھا۔ افشاندہ کی ہدایت پر خادم نے کھانا نکال لیا کھانے کے دوران بھی افشاندہ خاموش ہی رہی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ کمرے میں تنہا تھے اور شمعدان کی پانچ شمعوں میں سے تین گل کی جا چکی تھیں افشاندہ اس کے پہلو میں آ بیٹھی۔ تابان نے محسوس کیا کہ وہ بات شروع کرنے کے لئے موزوں الفاظ ڈھونڈ رہی ہے۔ وہ خاموشی سے اس کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ آخر وہ ایک گہری سانس لے کر گویا ہوئی۔

"تابان! میں ڈر رہی ہوں۔ آپ میری بات سے کوئی غلط مطلب نہ لیں۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں پوری نیک نیتی سے کہہ رہی ہوں اور مقصد صرف آپ کو صورتِ حال سے آگاہ کرنا ہے۔"

اس تمہید نے تابان کو سمجھا دیا کہ افشاندہ کوئی اہم اطلاع دینے جا رہی ہے۔ اس نے سر کی جنبش سے افشاندہ کو بات جاری رکھنے کی ہدایت کی۔۔۔۔۔۔۔ وہ بولی۔ "کورا اور آپ کا ساتھ بہت پرانا ہے۔ میں تو آپ دونوں میں نووارد ہوں۔ مجھ زیب نہیں دیتا کہ کورا کے بارے میں اپنی کسی رائے کا اظہار کروں۔۔۔۔۔۔ لیکن صورت حال ایسی ہے کہ مجھے زبان کھولنا پڑ رہی ہے۔۔۔۔۔ دراصل کچھ یوم سے کورا مجھے بہت بدلی بدلی نظر آ رہی ہے۔ وہ گم صم رہتی ہے اور ساتھی عورتوں کی گفتگو میں بہت کم حصہ لیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی اس کی بول چال ضروری گفتگو کی حد تک رہ گئی ہے۔ میں نے کئی بار اس کی آنکھیں سرخ اور متورم دیکھی ہیں جیسے تنہائی میں روتی رہی ہو۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ اسے میرا آپ کے قریب آنا اچھا نہیں لگا۔ شاید دل ہی دل میں آپ کی رفاقت کی خواہشمند تھی۔"

اگر افشاندہ نے یہ باتیں چند روز پیشتر کہی ہوتیں تو تابان انہیں یکسر رد کر دیتا لیکن اب ایسا کرنا مشکل تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ خود بھی محسوس کر رہا تھا کہ کورا کے رویے میں نمایاں تبدیلی آئی ہے اور وہ کوئی اہم بات تابان سے چھپا رہی ہے۔ یوں لگتا تھا تابان اور افشاندہ کے ملاپ کے بعد کورا اور تابان کے درمیان غیریت کی ایک بلند دیوار حائل ہو گئی ہے۔

افشاندہ نے کہا۔ "مجھے جرات نہیں ہو رہی کہ اس معاملے پر اظہار کروں لیکن کہے بغیر چارہ نہیں۔ دیوتا کریں میرا اندازہ غلط ثابت ہو اور مجھے اپنے کہے پر شرمندگی اٹھانا پڑے۔۔۔۔۔۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا کہ کورا۔۔۔۔۔۔ کسی کے کہنے میں آ گئی ہے اور اس کی ذات سے آپ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔"

تابان حیرت زدہ رہ گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ افشاندہ ایسی بات کہے گی۔ وہ روکھے لہجے میں بولا "یہ اندازہ تم نے کیونکر لگایا ہے؟"

افشاندہ نے کہا۔ "میں نے محسوس کیا تھا کہ کورا آپ کا کھانا اپنے ہاتھوں سے تیار کرنا چاہتی ہے۔ ایک روز مجھے لگا کہ وہ کھانے میں کچھ ملانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی اور کوئی چیز لبادے میں چھپا کر خیمے سے باہر نکل گئی۔"

تابان نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تم تصدیق کئے بغیر ایک نہایت سنگین الزام لگا رہی ہو۔"

افشاندہ نے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک پڑیا نکال کر تابان کو تھما دی۔ "یہ پڑیا آج مجھے کورا کے بستر سے ملی ہے۔ اس نے اپنے تکیئے کے غلاف میں چھپا رکھی تھی۔" تابان نے پڑیا کھولی۔ اس میں سفید رنگ کا ایک نہایت ہی باریک سفوف تھا۔ افشاندہ نے کہا۔ "میرے خیال میں یہ زہر ہے یا کوئی نہایت تیز اثر خواب آور دوا۔" تابان نے پڑیا کو بند کر کے احتیاط سے لباس میں رکھ لیا۔ اس کے دل و دماغ میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اگر اس پڑیا میں زہر تھا تو کیا واقعی کورا اس کی جان لینا چاہ رہی تھی۔ وہ کورا جو اس سے بے لوث محبت کا دم بھرتی تھی' اس کے پسینے پر خون گراتی تھی اور راستے میں پلکیں بچھائے رہتی تھی۔ جس سے تابان کا کوئی رشتہ نہیں تھا اور بہت سے رشتے تھے۔ اسے اپنی سماعت پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ بہت سے سوال ذہن میں سر اٹھا رہے تھے اور کسی سوال کا جواب واضح نہیں تھا۔ یکبارگی اس کا دل چاہا کہ وہ افشاندہ پر برس پڑے اور اس سے پوچھے کہ ایسی باتیں زبان پر لانے کی جرات اسے کیونکر ہوئی۔ کیوں اس نے ایسی سنگین الزام تراشی کی۔۔۔۔۔۔۔ لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا اور نڈھال لہجے میں بولا۔

"افشاندہ 'تم یہ ساری باتیں اپنے تک رکھو گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔ جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہ ملے کورا پر شبہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ تم نہیں جانتی۔۔۔۔۔۔ میری نگاہوں میں کورا کا کیا مقام ہے۔"

افشاندہ کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ "مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ کے لئے دکھ کا باعث بن رہی ہوں۔ کاش یہ اطلاعات آپ تک میری وساطت سے نہ پہنچتیں۔"

وہ دونوں کافی دیر انگیٹھی کے گرد گم صم بیٹھے رہے۔ آگ اب راکھ میں تبدیل ہو رہی تھی۔ سردی کا عفریت جو انگیٹھی کے دہکتے انگاروں سے ڈر کر خیمے سے باہر کھڑا تھا اب آہستہ آہستہ پھر خیمے میں داخل ہو رہا تھا۔ تابان بیماروں کی طرح گھٹنوں پر زور دے کر انگیٹھی کے سامنے سے اٹھا اور نڈھال قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ معلوم نہیں کیوں تھوڑی ہی دیر میں اس کا چاق و چوبند جسم نقاہت کے جال میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس نے ڈوری کھول کر دروازے کا پردہ وا کیا اور خادم کو خشک لکڑیاں لانے کے لئے آواز دی۔ خادم نے اپنے خیمے کے اندر سے "اچھا مالک" کی صدا لگائی۔ تابان دوبارہ خیمے کا پردہ برابر کرنا چاہ رہا تھا جب اس کی نگاہ تاریکی میں ایک ہیولے پر پڑی۔ یہ کوئی عورت تھی جو گرم شال میں لپٹی ایک خیمے

کے عقب سے نکلی تھی اور تیز روی سے نشیب کی طرف جا رہی تھی۔ تابان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ چال اس کی جانی پہچانی تھی۔۔۔۔۔۔ شک کی ایک تیز لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ وہ کچھ دیر اس ہیولے کو نشیب میں اوجھل ہوتے دیکھتا رہا پھر تیزی سے واپس مڑا۔ اپنی اونی صدری اور تلوار اٹھا کر کمر سے باندھ لی۔ "کہاں جا رہے ہیں؟" افشاندہ نے اس کی تیاری دیکھ کر پوچھا۔

"تم خیمہ اندر سے بند کر لو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" تابان نے کہا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ ایک ٹھٹھری ہوئی گدلی چاندنی نے نشیب و فراز کو دور تک ڈھانپ رکھا تھا۔ جہاں تک تابان کی نگاہ جا رہی تھی متحدہ یونانی فوج کے خیمے دکھائی دیتے تھے۔ ان خیموں کے اوپر مختلف رنگوں کے شناختی پرچم تیز ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ابھی پہریداروں کا گشت شروع نہیں ہوا تھا تاہم اکا دکا پہریدار قندیلیں اٹھائے گھوم رہے تھے۔ تابان اس سارے منظر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتا ہوا نشیب کی طرف گھوم گیا۔ اس کی عقابی نگاہ چادر پوش ہیولے کو تلاش کرنے لگی۔ جلد ہی اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔ سرو کے درختوں کے بیچ اسے وہ عورت نظر آ گئی۔ اس کی بے خوفی حیران کن تھی۔ یونانی عورتیں رات اترنے کے بعد خیمے

سے باہر نہیں نکلتی تھیں اور کہاں یہ پڑاؤ کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ تابان بغور اس کی چال دیکھ رہا تھا اور اب اسے ذرا بھی شبہ نہیں رہا تھا کہ یہ کورا ہے۔ اتنی سخت سردی میں اتنی رات گئے کورا کہاں جا رہی تھی۔ یہ سوال بے حد اسرار انگیز تھا۔ قریباً ایک سٹیڈیم فاصلہ طے کرنے کے بعد کورا پڑاؤ سے دور نکل آئی اور ایک خشک نالہ پار کر کے اپنے دائیں ہاتھ مڑ گئی۔ یکایک تابان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ سکندر کی افواج میں جہاں کم و بیش چالیس ہزار سپاہی تھے وہاں بہت سے فن کار' اہل کار' اہل دانش' ہنر مند اور روحانی پیشوا بھی شامل تھے۔ سکندر نوجوانی ہی میں مذہبی رجحانات رکھتا تھا۔ لہذا روحانی علم رکھنے والوں کی ایک جماعت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ ان کی بہت قدر کرتا تھا اور مختلف مواقع پر ان سے رہنمائی بھی حاصل کرتا تھا۔ اس جماعت میں کچھ لوگ واقعی قابل قدر تھے اور ان کی نیکو کاری مسلمہ تھی لیکن کچھ روحانیت کے نام پر شعبدہ بازی کرتے تھے اور نت نئے سوانگ رچا کر سالارِ اعظم کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ عرف عام میں اسے خاتام کہا جاتا تھا۔ اس کے سیاہ بال شانوں تک بکھرے رہتے تھے۔ آنکھیں بھوری اور رنگ سرخ و سپید تھا۔ وہ آئے روز کوئی سخت قسم کا چلہ شروع کر دیتا اور لوگ اس کی چلہ کشی دیکھنے کے لئے کھچے آتے تھے۔ جب سے سکندر نے اس وادی میں پڑاؤ کیا تھا خاتام ایک چوٹی پر چڑھا ہوا

تھا اور اپنا نصف دھڑ برف میں دفن کر رکھا تھا۔ بالائی جسم پر بھی برائے نام لباس تھا۔ صرف ہفتے کی شب پڑاؤ میں آتا تھا ورنہ شب و روز یخ بستہ ہوا میں برف کے اندر کھڑا رہتا تھا۔

کورا کا رخ دیکھ کر تابان بخوبی سمجھ گیا کہ وہ کاہن خاتام کی طرف جا رہی ہے۔ مناسب فاصلے سے اس نے کورا کا تعاقب جاری رکھا۔ وہ جلد ہی چیڑ کے بلند و بالا درختوں میں پہنچ گئی۔ کچھ فاصلے پر وہ روشنی دکھائی دی جو کاہن خاتام کی جھونپڑی میں جل رہی تھی۔ تابان نے اب محتاط انداز اختیار کر لیا اور درختوں میں سائے کی مانند رینگتا ہوا جھونپڑی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے خاتام کو دیکھا۔ وہ حسب معمول ناف تک برف میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے سامنے دو چٹائیوں پر چھ سات مرد اور دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ تیسری عورت ان میں کورا شامل ہو گئی تھی۔ ان سب کا انداز نہایت مؤدبانہ تھا۔ وہ دو زانو بیٹھے تھے اور ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ خاتام کچھ پڑھ پڑھ کر ان پر پھونک رہا تھا اور دھیمے لہجے میں باتیں بھی کر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں حاضرین کی تعداد کم ہو گئی۔ اب کورا سمیت وہ صرف تین تھے۔ چند لمحوں بعد دوسرے دو بھی چلے گئے۔ اب خاتام اور کورا کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ جھونپڑی سے پھوٹتی ہوئی روشنی میں تابان نے غور سے دیکھا۔ کورا خاتام سے کچھ کہہ رہی تھی لیکن وہ آنکھیں بند کئے یکسر خاموش تھا۔ اس کی جانب دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ پھر تابان نے کورا کو کاہن کے سامنے سجدہ ریز دیکھا۔ وہ فریادی لہجے میں بول رہی تھی۔ کورا کی آواز سننے کے لئے ضروری تھا کہ تابان کچھ مزید آگے جائے۔ مزید آگے جانے کے لئے تابان کو بے حد احتیاط کرنا پڑی۔ وہ اوندھے منہ لیٹ گیا اور خشک پتوں پر سانپ کی مانند بے آواز رینگتا ہوا درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچ گیا۔ اب کاہن خاتام اس سے تین ہاتھ کی دوری پر تھا۔ جھونپڑی سے پھوٹنے والی روشنی میں کاہن کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اور اس کا تانبے جیسا بدن بھی۔ کورا نے اب سجدے سے سر اٹھا لیا تھا اور خوفزدہ نظروں سے کاہن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے لرزاں آواز نکلی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں خاتام۔۔۔۔۔۔۔مجھے زیوس دیوتا کے صدقے معاف کر دیں۔" تابان نے دیکھا کورا کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہے۔ چند لمحے ہوا کی سائیں سائیں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ پھر خاتام نے بوجھل لہجے میں کہا۔

"تم معافی کے قابل تو نہیں ہو' لیکن ہمیں تم پر ترس آ رہا۔۔۔۔۔۔ اب جاؤ جیسا تمہیں کہا گیا تھا وہ کرو۔۔۔۔۔۔ اور ایک بات یاد رکھو۔ خاتام کے حکم کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والوں کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ "

کورا گھگھیائی۔ "نہیں خاتام۔۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔۔ میں نے شک نہیں کیا تھا۔ میں گھبرا گئی تھی۔۔۔۔۔۔ در۔۔۔۔۔۔ دراصل افشاندہ نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ "

"ٹھیک ہے۔ اب تمہیں کوئی نہیں دیکھے گا۔ ہم اس لڑکی کی نگاہ بند کر دیتے ہیں۔ تم جاؤ اور اپنا کام کرو۔ اس میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم اپنے مالک کی بھلائی کر رہی ہو۔ اس کا نقصان نہیں کر رہی ہو۔ "

کورا نے کہا۔ "لیکن۔۔۔۔۔۔ لیکن خاتام وہ سفوف تو میں نے کہیں کھو دیا۔ وہ پڑیا میں نے تکیئے کے غلاف میں رکھی تھی اب وہاں نہیں ہے۔ "

تابان نے دیکھا۔ خاتام کے چہرے پر شدید برہمی کے آثار نظر آئے۔ اس کی بھوری آنکھیں کورا کو غضبناک انداز میں گھورنے لگیں۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ ہاتھ دو برق گزیدہ شاخوں کی طرح آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ معلوم

نہیں وہ اپنا غضب دبانے کی کوشش کر رہا تھا یا کورا کو مرعوب کرنے کی۔ کافی دیر اسی عالم میں گزر گئی۔ پھر کورا نے سہمی آواز میں کہا۔

"خاتام! مجھے افسوس ہے میں ابھی تک آپ کے لئے کوئی کام کی بات معلوم نہیں کر سکی۔ "

خاتام نے اپنی بھوری آنکھیں کھولیں۔ کورا کے سوال نے ان میں عجیب سے چمک بھر دی تھی وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اب اس کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔۔ ہم اپنے اندر کی آنکھوں سے شہزادی کو ڈھونڈ چکے ہیں۔ وہ اس وقت ہماری نگاہوں کے روبرو ہے۔ ہم کل اس کی طرف روانہ ہوں گے۔ "

کورا کے چہرے سے شادی مرگ کی کیفیت ظاہر ہوئی۔ وہ عاجزی سے بولی۔ "خاتام' آپ عظیم ہیں۔ مجھے یقین تھا یہ کام آپ کے سوا کوئی اور نہ کر سکے گا۔۔۔۔۔۔ کیا میں یہ خبر تابان کو دے سکتی ہوں؟"

"خبردار۔ " کاہن خاتام گرجا۔ "اس بیوقوف کو ہرگز معلوم نہیں ہونا چاہیئے بلکہ کسی کو بھی اطلاع نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر ایسا ہوا تو دیوتا کرونوس کا قہر نازل ہو گا تم پر۔ "

کورا نے سہم کر ہونٹ بھینچ لئے جیسے دیوتا کرونوس کو اس نے اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔ کچھ دیر خاموشی سے اپنے سامنے کی زمین کو گھورتی رہی پھر حوصلہ جمع کر کے بولی۔

"شہزادی یہاں کب تک پہنچ جائے گی؟"

"کچھ معلوم نہیں۔" خاتام نے رکھائی سے جواب دیا۔

"کیا شہزادی اور تابان کا ملاپ ہو جائے گا؟" کورا نے دبے دبے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس کا فیصلہ شہزادی کو کرنا ہے 'ہمیں نہیں۔ اب تم یہاں سے جا سکتی ہو۔"

کورا ڈر رہی تھی لیکن یہاں سے ٹل بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "خاتام! آپ کے لئے کچھ ناممکن نہیں۔ آپ کے حکم سے کیا نہیں ہو سکتا۔ آپ کو دیوتاؤں کا واسطہ 'شہزادی کے دل میں بھی وہی درد جگا دیجئے جو تابان کے دل میں جاگا ہے۔ ان دونوں کے غم اور خوشیاں ایک کر دیجئے۔"

تابان کورا کے اس نالہ نیم شب کو حیرت سے سن رہا تھا۔ اس کی نگاہیں خاتام کے چوڑے چکلے چہرے پر تھیں جو کہ کورا کی دخل در معقولات پر سرخی مائل ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تابان کو لگا جیسے وہ برف سے نکل کر کورا پر ٹھوکروں اور تھپڑوں کی بارش کر دے گا۔ لیکن پھر اچانک اس کے چہرے نے تاثر بدلا جیسے کوئی نیا خیال اس کے دماغ میں آیا ہو۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کیں اور اپنے جھلسے ہوئے بازوؤں کو آسمان کی طرف اٹھا کر بڑبڑانے لگا۔ آواز کے آہنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی قدیم مناجات دہرا رہا ہے۔ کورا کسی پجارن کی مانند دم بخود بیٹھی تھی۔ آخر خاتام نے پلکیں اٹھائیں اور کورا کو حکم دیا کہ وہ جھونپڑی کے وسط میں لٹکی ہوئی کپڑے کی سیاہ تھیلی لے آئے۔ کورا اپنی جگہ سے اٹھی۔ تیز ہوا میں اس کی چادر کسی عفریت کی مانند پھڑ پھڑا رہی تھی۔ بادل گھر آئے تھے اور رہ رہ کر بجلی نشیب و فراز کو روشن کر دیتی تھی۔ وہ جھونپڑی میں داخل ہوئی اور ایک سیاہ تھیلی نکال لائی۔

خاتام نے پوچھا۔ "جانتی ہو اس میں کیا ہے؟" کورا نے نفی میں سر ہلایا۔ خاتام بولا۔ "اس میں سانپ ہے۔ دنیا دار اسے زہریلا سانپ کہیں گے اور اس سے دور بھاگیں گے لیکن جسے ہم پر بھروسہ ہے وہ ہمارے کہنے پر اس سانپ کو بلا جھجک منہ میں رکھ لے گا۔ بس یہی فرق

ہے اعتقادی میں اور بے اعتقادی میں۔ بے اعتقادی محرومی کے سوا کچھ نہیں بخشتی اور اعتقاد سے فیض کے چشمے پھوٹتے ہیں۔" ایک لمحہ توقف کر کے خاتام نے عقابی نگاہوں سے کورا کو دیکھا پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "تمہارے آقا کے جسم میں مایوسی اور قنوطیت کا بے پناہ زہر ہے جو اس کے ذہن کو منتشر رکھتا ہے اور اسے عام انسانوں سے بہت دور لے جا رہا ہے۔ ہم نے پہلے بھی تم سے یہی کہا تھا کہ اس کی بھلائی چاہتی ہو تو ہمارے ہدایت پر عمل کرو۔۔۔۔۔۔۔ یہ سانپ لے جاؤ اور اس کے بستر پر چھوڑ دو۔ اس سانپ کا زہر تمہارے آقا کے زہر کی کاٹ کرے گا اور وہ ایک بار پھر عام انسانوں جیسا ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔۔ اس کی جنونی کیفیت باقی رہے گی وہ شراب میں ڈوبے گا اور نہ آدھی رات کو ویرانوں میں گھوڑا بھگاتا پھرے گا۔ اگر شہزادی مارشا کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو وہ اس کے انتظار کی گھڑیاں سکون سے کاٹ سکے گا۔"

ایک بار زور سے بجلی چمکی۔ تابان نے دیکھا کہ کورا کی آنکھوں میں ہراس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جونہی خاتام نے انکشاف کیا تھا کہ سیاہ تھیلی میں زہریلا سانپ ہے کورا نے تھیلی ہاتھ سے گرا دی تھی۔ اب وہ سہمی ہوئی نظروں سے تھیلی کو دیکھ رہی تھی۔

"اسے اٹھا لو۔" خاتام کی گرجدار آواز بادلوں کی گرج سے ہم آہنگ ہو گئی۔ "کیا تمہیں ہم پر بھروسہ نہیں۔ اگر بھروسہ نہیں تو چلی جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔۔۔ اور اگر ہے تو ہمارا کہنا مانو۔ "

کورا لرز کر جھکی اور تھیلی کو اٹھا لیا۔ لگتا تھا خاتام نے اسے مسحور کر رکھا ہے اور وہ اس کی ہدایات پر معمول کی طرح عمل کر رہی ہے۔ "جاؤ" خاتام نے زور سے کہا۔ "دیوتا تمہاری من کی مرادیں پوری کریں گے۔"

کورا بدحواسی میں واپس مڑی لیکن پھر اسے یاد آیا کہ اس نے تعظیم پیش نہیں کی۔ وہ گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور سر اس طرح جھکایا کہ وہ برف پوش زمین کو چھونے لگا۔ تب وہ اٹھ کر الٹے پاؤں چلتی چیڑ اور سرو کے پیڑوں میں روپوش ہو گئی۔ اس کے روانہ ہوتے ہی تابان نے بھی اپنی جگہ چھوڑی اور پڑاؤ کی طرف چل دیا۔ تابان کے پڑاؤ تک پہنچتے پہنچتے تیز بارش شروع ہو چکی تھی۔

بارش ایک بار شروع ہوئی تو پھر اس نے رکنے کا نام نہیں لیا۔ سردی جو پہلے ہی کم نہیں تھی اب اور بڑھ گئی۔ یہ اگلی شب کی بات ہے جب حسین و جمیل افشاندہ تابان کے خیمے میں گہری

نیند سو گئی۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور خیمے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ سامنے ہی ایک اور چھوٹا سا خیمہ تھا۔ اس خیمے میں تین فراد قیام پذیر تھے۔ یہ تینوں خادم تھے اور ان میں تابان کا ذاتی خادم بھی تھا۔ تابان ان کے خیمے میں داخل ہوا تو وہ تینوں ٹھٹک گئے لیکن انہیں کچھ زیادہ حیرانی ہوئی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر تابان وقت گزاری کے لئے ان کے خیمے میں چلا آتا تھا۔ یہ بات بھول کر کہ وہ ایک ہزاری سردار ہے وہ ان خادمیں میں گھل مل جاتا تھا۔ ان کے ساتھ بوسیدہ دری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتا تھا' قہوہ پیتا تھا۔ شطرنج نما کھیل کھیلتا تھا اور بعض اوقات زور آزمائی پر بھی اتر آتا تھا۔ اس وقت بھی تینوں خادم یہی سمجھے کہ "آقا" کھیل کود کے لئے تشریف لائے ہیں لیکن جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ آج صورتِ حال مختلف ہے۔ تابان کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری پرچھائیاں تھیں اور وہ خادمین سے لئے دیئے نظر آ رہا تھا۔ اس نے خادموں کو حکم دیا کہ وہ اپنے بستروں پر آرام کریں وہ کچھ دیر خیمے میں بیٹھ کر واپس چلا جایئے گا۔

ایک خادم نے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وضاحت چاہی تو تابان نے اسے ڈانٹ دیا۔ یہ ڈانٹ دوسرے خادمین کے لئے بھی مؤثر ثابت ہوئی۔ وہ کان لپیٹ کر اپنے بچھونوں کی

طرف چلے گئے۔ تابان نے انہیں شمعیں گل کرنے کا حکم دیا خیمے میں مکمل تیرگی چھا گئی تو وہ خیمے کے در کے پاس نیم دراز ہو گیا۔ یہاں سے اسے اپنا خیمہ اور خیمے کا در صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جس مقصد سے یہاں لیٹا تھا وہ بہت جلد پورا ہو گیا۔ اسے کورا کے لئے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رم جھم برستی بارش میں ایک تاریک ہیولا مشرقی خیموں کی طرف سے برآمد ہوا اور تابان کے خیمے کے سامنے آرکا۔ تابان صاف دیکھ رہا تھا وہ کورا تھی۔ دری سہمی ہوئی اور چوروں کی طرح چاروں طرف دیکھتی ہوئی۔ وہ چند لمحے دروازے کے سامنے رک کر آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دور جا کر واپس آئی اور بے قراری سے خیمے کا نصف چکر کاٹا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی اور تابان جانتا تھا۔ یہ چیز سیاہ تھیلی کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ کچھ دیر خیمے آڑ میں کھڑی رہی۔ پہریدار گشت مکمل کر کے آگے نکل گیا تو کورا پھر دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ تابان نے دیکھا سیاہ تھیلی اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ شدید کشمکش کے عالم میں دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ دروازے کے عین اوپر ایک روزن نما سوراخ تھا۔ وہ تھیلی کا منہ کھول کر اسے بہ آسانی سوارخ سے اندر پھینک سکتی تھی لیکن اس کا تذبذب اسے کچھ کرنے نہیں دے رہا تھا۔ بے حال ہو کر اس نے ایک بار پھر خیمے کا چکر لگایا۔ چند لمحے

دروازے کے سامنے کھڑی رہی۔ پھر تابان نے دیکھا وہ تھیلی پھینکے بغیر بھاگتی ہوئی واپس لوٹ گئی۔

تابان کچھ دیر بے حس و حرکت اپنی جگہ بیٹھا رہا تب اس نے خادمین کو خیمہ اندر سے بند کرنے کا حکم دیا اور کورا کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ وہ اپنے خیمے کی طرف جانے کی بجائے نشیب کی طرف چلی گئی تھی۔ نشیب میں پہنچ کر تابان نے دیکھا وہ شاہ بلوط کے بلند پیڑوں تلے کسی پتھر کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ سردی اور بارش جیسے اس پر اثر انداز ہی نہیں ہو رہی تھی۔ نزدیک پہنچ کر تابان کو اندازہ ہو کہ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا ہے اور سسکیوں سے رو رہی ہے۔ تابان چند قدم مزید آگے گیا تو وہ اس کی موجودگی سے آگاہ ہو گئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور ششدر رہ گئی۔

"تم یہاں؟" وہ ہکلائی۔

"یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔" تابان نے کہا۔

"مم۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ میرا دل گھبرا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ اس لئے۔"

"وہ تھیلی کہاں ہے؟" تابان نے اس کی بات کاٹی۔

"تابان۔۔۔۔۔۔ کون سی تھیلی؟" کورا کا خوف نقطہ عروج پہ پہنچ گیا۔

"وہ جو تمہارے ہاتھ میں تھی اور جس میں خاتام کا دیا ہوا سانپ تھا۔"

کورا کی آنکھیں حیرت سے واہو گئیں۔ اس کے ہونٹ لرزاں تھے اور وہ مبہوت سی تابان کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔ تابان غرایا۔ "کچھ چھپانے کی کوشش فضول ہے میں کل تمہاری اور خاتام کی تمام باتیں سن چکا ہوں۔"

میں کچھ نہیں جانتی تابان۔ تمہیں۔۔۔۔۔۔ غلط۔۔۔۔۔۔ فہمی ہو رہی ہے۔"

یکا یک تابان غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے بالوں سے پکڑ کر کورا کو زور کا جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گری۔ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ تابان نے ایک بار پھر اس کے بال جکڑ لئے۔ "مجھ سے جھوٹ مت بول کورا۔ خاتام نے تجھے جس جال میں الجھا رکھا ہے وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں۔۔۔۔۔۔ بتا کس کی اجازت سے تو جاتی تھی اس کے پاس۔ کیوں اس کے کہنے پر میرے لئے موت کا سامان اکٹھا کر رہی تھی؟ کیوں یہ سب کچھ چھپا رہی تھی مجھ سے؟"

یکایک کورا نے اپنا بازو موڑ کر چہرے پر رکھا اور زور زور سے رونے لگی۔ "میں تمہاری مجرم ہوں۔ میں نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے مار ڈالو۔۔۔۔۔۔۔۔ مار کر یہیں دفن کر دو۔۔۔۔۔۔۔ میں اسی لائق ہوں۔۔۔۔۔۔۔ ہاں میں اسی لائق ہوں۔۔۔۔۔۔۔" تابان نے اس کے بال چھوڑ دیے اور خاموشی سے اس کے رونے کا نظارہ کرنے لگا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اس موقعے پر کیا کرے۔ وہ جانتا تھا کہ کورا سے سنگین غلطیاں ہوئی ہیں مگر وہ بے وفا نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا اور تابان کی بھلائی کے لئے کیا۔ خاتام جیسے شعبدہ نے کورا جیسی نہ جانے کتنی سادہ لوح عورتوں کو ورغلا رکھا تھا۔ اپنے شعبدوں کو "پراسرار علوم" قرار دینے والے یہ لوگ آسیب کی طرح اپنے پیروکاروں پر حاوی ہو جاتے تھے۔

تابان نے کورا کے دل کا غبار اس کی آنکھوں کے راستے نکلنے دیا۔ وہ کافی رو دھو چکی تو وہ نرمی سے بولا۔ "میرے ساتھ آؤ کورا۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" کورا کو اپنے کندھے سے لگائے وہ اسے اپنے خیمے میں لے آیا۔ اس نے کورا کی بھیگی ہوئی گرم چادر اتاری اور ایک دوسری چادر دے کر اسے انگیٹھی کے قریب بٹھایا۔ پھر اس نے شمعدان کی ساری

شمعیں روشن کر دیں اور کورا کے قریب آ بیٹھا۔ آہٹ سن کر افشاندہ جاگ اٹھی اور حیرت سے ان دونوں کو دیکھنے لگی۔ تابان نے افشاندہ کو تھوڑی دیر کے لئے دوسرے خیمے میں بھیج دیا اور مکمل تنہائی میں کورا سے ہمکلام ہوا۔ اس نے کورا سے تھیلی کے بارے میں پوچھا تو کورا نے اسے بتایا کہ اس نے نشیبی درختوں میں پھینک دی ہے۔

تابان نے کہا۔ "کورا میں جانتا ہوں وہ تھیلی تم نے کیوں پھینکی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ تمہیں کیوں دی گئی تھی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہیں خاتام کے جال میں الجھانے والا کون ہے؟"

کورا نے ڈری ہوئی آواز میں کہا۔ "تابان! تم کاہن خاتام کا نام گستاخی سے مت لو۔ وہ اپنے مخالفین کے لئے قہر آسمانی سے کم نہیں ہے۔"

تابان نے بیزاری سے کہا۔ "وہ جو کوئی بھی ہے مجھے اس سے سروکار نہیں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم اس تک کیسے پہنچیں؟"

جواب میں کورا کچھ دیر تک خاموشی کے خول میں سمٹی رہی۔ پھر اس نے ڈرے ڈرے انداز میں آہوں اور سسکیوں کے درمیان جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

"یہ کوئی چار ماہ پہلے کی بات ہے 'ہیلی کارنیس فتح ہو چکا تھا۔ فوج نے ایک بڑی جھیل کے کنارے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ میں رات کو اپنے خیمے میں افشاندہ کے ساتھ سوئی۔ کسی پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا خیمے میں پُراسرار روشنی پھیلی ہے اور ایک ہیولا سا میرے بالکل قریب کھڑا ہے۔ اس ہیولے کا لباس سفید تھا اور سینے کے مقام پر لباس کے اندر سے روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ میں وہشت زدہ رہ گئی۔ یہ ہیولا کاہن خاتام کا تھا' میں تب تک اسے جانتی نہیں تھی لیکن وہ بہت بارعب نظر آرہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میرا علم کہتا ہے کہ تمہارا نام کورال ویر ہے تم ایتھنز سے آئی ہو' غارس زنوب کی کنیز ہو اور شہزادی مارشا کی خادمہ خاص رہ چکی ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" میں نے بے اختیار نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد کاہن خاتام نے میرے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ میں اس کی ساحرانہ گفتگو سے بے حد مرعوب ہوئی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ دکھائے جو کہنیوں تک جلے ہوئے تھے اور بتایا کہ آسمانی بجلیاں اس سے ہمکلام ہوتی ہیں اور وہ غیب کے پردوں میں جھانک سکتا ہے۔ میں یہ جان کر حیران ہوئی کہ اس ساری گفتگو کے دوران افشاندہ اپنے بستر پر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ مجھے اس کی طرف دیکھتے پا کر خاتام نے کہا۔ "اس کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تک میرا حکم نہ ہو گا یہ نہیں جاگے گی۔۔۔۔۔۔ میں تم سے کچھ باتیں

دریافت کرنا چاہتا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ تم ان کے جواب پوری تفصیل سے دو۔" میں کاہن کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئی وہ مجھ سے مارشا کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ اس نے کئی سوال پوچھے۔ آخری بار وہ مجھے کہاں ملی تھی؟ مقدونوی حملے کے وقت وہ محل کے کس حصے میں تھی؟ کیا میں نے اسے گرفتار ہوتے دیکھا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا بلا کم و کاست کاہن کو بتا دیا۔ وہ پھر بھی مطمئن نہیں ہوا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ گمشدگی کے بعد مجھے کبھی مارشا کا کوئی سراغ ملا ہے۔ میں نے ایسے تمام سوالات کا جواب نفی میں دیا۔ آخر میں وہ بولا میں ایک غیبی آواز کی ہدایت پر مارشا کو ڈھونڈنے یونان سے یہاں پہنچا ہوں اور وہ تادیر میری نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکے گی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے اس کے لئے ابتلا کے دن ختم ہوئے۔ اب وہ بہت جلد اپنوں میں ہو گی اور عیش و آرام کی زندگی شروع کرے گی۔ میں کاہن کے پاؤں میں گر گئی۔ میں نے برملا کہا۔ "اے کاہن! اس لشکر میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو مارشا سے بے پناہ پیار کرتا ہے۔ اتنا پیار جو شاید ہی کسی مرد نے کسی عورت سے کیا ہو گا۔ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ کیا میں اسے یہ نوید سنا سکتی ہوں کہ مارشا مل جائے گی؟ کاہن خاتام نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اس نے کہا فی الحال تم یہ راز اپنے تک رکھو ورنہ عملیات میں خلل پڑے گا۔ ہاں تم اپنے ارد گرد کڑی نگاہ رکھو۔ اگر مارشا کے بارے کوئی

اہم یا غیر اہم کھوج ملے' مجھے مطلع کرو۔" میں نے کاہن خاتام کی ہدایات پر پوری طرح عمل کیا اور خواہش کے باوجود تمہیں کاہن خاتام کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ چند روز بعد مجھے معلوم ہوا کہ کاہن خاتام سپارٹا سے آیا ہے اور سکندر نے اس کی جادوئی قوتوں سے متاثر ہو کر اسے اپنے دربار میں جگہ دے دی ہے۔

"بہت جلد کاہن خاتام کے عقیدت مندوں کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچی۔ میں بھی کئی بار اس کی خدمت میں حاضری دے چکی ہوں۔ چند ہفتے پہلے میں نے اس سے تمہاری حد سے بڑھی ہوئی مایوسی اور پریشانی کا ذکر کیا۔ خاتام نے مجھے کچھ عملیات بتائیں اور ایک پڑیا دی۔ خاتام نے کہا اس میں تمہارے آقا کی تمام زہرناکیوں کا تریاق موجود ہے۔ خاتام کی ہدایت کے مطابق مجھے وہ سفوف تمہارے کھانے میں ملانا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں میں کئی مرتبہ کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکی۔ ایک وسوسہ سا میرے دل کو گھیر لیتا تھا۔ کاہن خاتام پر مجھے پورا بھروسہ تھا اور شاید کسی حد تک اب بھی ہے لیکن میں نہ تو تمہارے کھانے میں سفوف ملا سکی اور وہ نہ وہ زہریلا سانپ تمہارے خیمے میں چھوڑ سکی۔ معلوم نہیں میں نے اچھا کیا ہے یا برا۔ اگر برا کیا ہے تو ہر سزا کے لئے تیار ہوں اور اگر اچھا کیا ہے تو تم مجھے معاف کر دو۔"

تابان نے کورا کی ساری روائیداد تحمل سے سنی۔ صورتِ حال اب کچھ کچھ واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے کورا سے پوچھا۔ "خاتام کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے اندر کی آنکھوں سے شہزادی مارشا کو دیکھ چکا ہے اور کل اس کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔۔۔۔۔۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ واقعی وہ شہزادی کا کھوج لگا چکا ہے؟"

کورا آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "اگر تم خاتام کو پُراسرار قوتوں کا مالک نہ بھی سمجھو تو یہ حقیت ہے کہ وہ بہت دور تک دیکھ سکتا ہے۔ وہ اپنی فہم و فراست سے ایسی گتھیاں سلجھاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ کوئی عام انسان نہیں ہے اگر وہ کہہ رہا ہے کہ وہ شہزادی مارشا تک پہنچ گیا ہے تو ضرور ایسی کوئی بات ہو چکی ہے، میں پُرامید ہوں کہ ہم جلد ہی شہزادی صاحبہ کی صورت دیکھ سکیں گے۔"

تابان کافی دیر تک کورا سے سوال و جواب کرتا رہا۔ اس معاملے میں اس کی دلچسپی ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اگر خاتام نے شہزادی مارشا کا کھوج لگایا تھا تو کیسے؟ اور اس سے بھی اہم سوال یہ تھا کہ وہ شہزادی کو ڈھونڈنا کیوں چاہتا تھا؟ اب یہ بات کوئی راز نہیں رہی تھی کہ وہ کورا کے ہاتھوں تابان کو مروانا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب تھا مارشا کو ڈھونڈنے میں بھی اس کا کوئی سنگین

مقصد پوشیدہ تھا۔ تابان اب جلد از جلد کورا کے پاس سے اٹھنا چاہتا تھا۔ اس کا فوری طور پر کسی اہم سرکاری عہدیدار سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے کورا کی طرف دیکھا۔ اس کے زرد چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تھیں۔ یہ کیفیت وہ اکثر کورا کے چہرے پر دیکھ چکا تھا لیکن اس سے پہلے یہ کیفیت سردار شلال کے خوف کا نتیجہ ہوتی تھی جبکہ آج وہ کاہن خاتام کے قہر سے سہمی ہوئی تھی۔ اس نے خاتام سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ تابان کو ان تمام حالات سے بے خبر رکھے گی اور وہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہ سکی تھی۔ تابان نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور اس کے دل و دماغ سے وہ پُراسرار خوف کھرچنے کی کوشش کرتا رہا جو خاتام کی بھوری آنکھوں نے پچھلے چار ماہ میں نقش کیا تھا۔

جب رات کا تیسرا پہر شروع ہوا' تابان نے کورا اور افشاندہ کو خیمے میں چھوڑا اور بارش سے محفوظ رکھنے والی مومی چادر اوڑھ کر شاہی خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اتنی رات گئے کسی سرکاری اہلکار کو جگانا قطعی نامناسب اور خلاف ضابطہ تھا' لیکن تابان نے قاعدوں اور ضابطوں کی کب پرواہ کی تھی جواب کرتا۔ وہ بکھرے بالوں اور آلودہ وردی کے ساتھ سیدھا شاہی بطلیموس کے خیمے میں گھس گیا۔ بطلیموس کچی نیند میں تھا' پہلے اسے دیکھ کر حیران ہوا۔

پھر برے برے منہ بنانے لگا۔ کہیں قریب ہی سے ایک دوشیزہ متحرک ہوئی اور چھپاک سے خیمے کے دوسرے حصے میں گھس گئی۔ بطلیموس نے خشک لہجے میں پوچھا۔ "کیا بات ہے' کیوں چلے آئے ہو؟"

تابان رسمی انداز میں بولا۔ "بے وقت مداخلت کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے ایک شخص کے بارے میں معلومات درکار ہیں اور یہ معلومات آپ ہی دے سکتے ہیں۔"

"کہو۔" بطلیموس نے تکئے سے ٹیک لگا کر الٹی ہوئی صراحی سیدھی کی اور اس میں سے شراب منقش پیالے میں ٹپکانے لگا۔

تابان نے بغیر کسی تمہید کے بات شروع کر دی۔ "محترم بطلیموس! مذہبی پیشواؤں اور یونانی کاہنوں کی جماعت میں ایک خاتام نامی شخص سالارِ اعظم کے مقربین میں شامل ہے۔ میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

بطلیموس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "وہ تو آج کل چلہ کشی کر رہا ہے۔ بہت دن ہوئے میں نے اسے دیکھا نہیں۔

"لیکن میں نے سنا ہے کہ وہ اپنا چلہ ادھورا چھوڑ کر کہیں روانہ ہو رہا ہے۔"

بطلیموس بولا۔ "میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔۔۔۔۔۔۔ ٹھہرو میں تاز شی کو بلاتا ہوں۔"

تاز شی پیشواؤں کی جماعت کا خدمتگار اعلیٰ تھا۔ بطلیموس نے ایک خادم کو دوڑایا۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں تاز شی کے وسیع خیمے میں لے آیا۔ قالین کا ایک حصہ مشروب سے تربتر تھا اور فضا میں ایک خوابیدہ نسوانی مہک رچی ہوئی تھی۔ تاز شی نے ناک سکوڑ کر اس رنگین ماحول کی بو سونگھی اور للچائی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد بطلیموس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بطلیموس نے تاز شی کی جانب توجہ دلائی اور اسے بتایا کہ تابان کیا معلوم کرنا چاہتا ہے۔ کاہن خاتام کا نام سن کر تاز شی نے تفہیمی انداز میں سر اوپر اور نیچے ہلایا اور بولا۔ "آپ کا قیافہ درست ہے۔ کاہن خاتام اپنا چِلہ چھوڑ کر کسی اہم مقصد سے پہاڑی علاقے کی طرف جا رہے ہیں' تاہم یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہے۔ قدرت نے انہیں غیب دانی کا وصف بخشا ہے۔ وہ اکثر اس طرح اچانک فیصلے کرتے ہیں۔ ہمیں ان فیصلوں کی اہمیت معلوم نہیں ہوتی مگر یہ فیصلے بہت دوررس ہوتے ہیں۔"

تابان نے تاز شی کی مدح سرائی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "وہ کب روانہ ہو رہا ہے؟"

تاز شی نے کہا۔ "مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔ شاید آج رات۔۔۔۔۔۔۔۔ یا پھر کل صبح ویسے میں ان سے الوداعی ملاقات کر چکا ہوں۔"

تابان نے پوچھا۔ "وہ اکیلا جا رہا ہے؟"

"نہیں۔" تاز شی نے کہا "ایک مرید خاص ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کا نام ازبک ہے۔ وہ شاہی کاتبوں میں شامل ہے اور خط و کتابت کا زیادہ کام اسی کے ذمے ہوتا ہے۔ اس کا خیمہ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ ہم ابھی جا کر دیکھ لیتے ہیں۔ اگر وہ خیمے میں موجود ہے تو اس کا مطلب ہے کاہن خاتام بھی ابھی روانہ نہیں ہوئے۔"

تابان نے بطلیموس سے اجازت چاہی اور تاز شی کو لے کر خیمے سے نکل آیا۔ کوئی سو قدم دور وہ ازبک کے خیمے میں پہنچے تو وہاں ایک بوڑھے خادم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تابان نے خادم کو مخاطب کرتے ہوئے بے تابی سے پوچھا "تمہارا آقا کہاں ہے؟"

خادم نے کھانستے ہوئے کہا۔ "وہ تو چلے گئے حضور۔"

"کہاں؟"

"حضور! انہیں کاہنِ مقدونیہ محترم خاتام کے ساتھ کسی سفر پر روانہ ہونا تھا۔"

"کب گئے وہ؟" تابان نے خادم کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"دوسرا پہر کوئی دو گھڑی گزرا تھا جب وہ یہاں سے چلے تھے۔"

خادم کا جواب سنتے ہی تابان واپس مڑا اور پڑاؤ کی گلیوں میں بھاگتا اپنے خیمے میں واپس آ گیا۔ وہاں افشاندہ اور کورا ابھی تک جاگ رہی تھیں۔ تابان نے جلدی جلدی انہیں کچھ ہدایات دیں اور ان سے فارغ ہو کر اصطبل کی طرف دوڑا۔۔۔۔۔۔ اصطبل میں ہنگامی ضرورت کے لئے خرجینوں میں راشن بھر کر رکھ دیا جاتا تھا۔ تابان نے راشن سے بھری ہوئی ایک خرجین اٹھا کر گھوڑے پر رکھی اور سوار ہو کر اصطبل سے نکل آیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ سرپٹ گھوڑا دوڑاتا شمال مشرق کی طرف جا رہا تھا۔

اونچی نیچی گھاٹیوں میں بل کھاتا یہی واحد راستہ تھا جو مسافروں کو شمال مشرق کے بلند پہاڑی علاقے میں لے جا سکتا تھا۔ خاتام اور اس کا مرید خاص شمال مشرق کی طرف گئے تھے۔ لہذا تابان کو یقین تھا کہ جلد یا بدیر اسی راستے پر ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ تاریکی اور پھسلن نے اس خطرناک راستے کو اور پُر خطر بنا دیا تھا۔ تابان کے ایک جانب گہری کھائی تھی اور اسے

معلوم تھا پائے رخش کی ایک لغزش کا مطلب موت کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ مگر رکنا تو دور کی بات ہے وہ اپنی رفتار بھی کم نہیں کر سکتا تھا۔ خاتام کو پڑاؤ سے نکلے چار گھڑیاں ہو چکی تھیں۔ اگر تابان مزید تاخیر کرتا تو اس کا ہاتھ آنا بے حد دشوار تھا۔ کل رات ہونے والی بارش تھوڑی دیر کے لئے بھی نہیں رکی تھی اور اب تو اس میں مزید شدت پیدا ہو رہی تھی۔ اچانک تابان کو احساس ہوا کہ کچھ گھڑ سوار اس کے عقب میں آ رہے ہیں۔ اس نے لگام کھینچ کر گھوڑے کو روکا اور دھیان سے آوازوں پر غور کرنے لگا۔ آوازیں قریباً ایک سٹیڈیم سے دور تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ گھڑ سوار تابان کے سر پر پہنچ گئے۔ وہ تعداد میں تین تھے اور انہوں نے بارش سے بچاؤ کے لئے مومی چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ وہ قریب پہنچے تو تابان دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہی تین خادم تھے جنہیں تابان تھوڑی دیر پیشتر خیمے میں چھوڑ کر آیا تھا۔ ان میں سے ایک خادم تابان کی خدمت پر مامور تھا۔ تابان نے انتہائی کڑے لہجے میں پوچھا۔

"تم تینوں یہاں کیا کر رہے ہو؟"

تابان کے خادم نے اطمینان سے کہا۔ "یک ہزاری سردار بن کر پوچھ رہے ہو یا بے تکلف دوست بن کر؟"

تابان دانت پیس کر بولا۔ "لعنت ہے تم پر اور تمہاری دوستی پر۔ میں کہتا ہوں تم میرے پیچھے کیوں آئے ہو؟"

خادم نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے یک ہزاری سردار بن کر پوچھ رہے ہو۔ اب ہمیں بھی خادم بن کر جواب دینا ہوگا۔"

تابان نے اس شخص کے لہجے پر حیران ہو رہا تھا۔ وہ تینوں اس سے بے تکلف ضرور تھے لیکن اتنے بھی نہیں کہ یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال وجواب کریں اور تابان کے تیوروں کو خاطر میں ہی نہ لائیں۔ دفعتاً تابان کو احساس ہوا کہ کوئی خلاف توقع بات ہو چکی ہے۔ اسے اپنی دائیں جانب مدہم آہٹ سنائی دی۔' وہ تیزی سے گھوما۔ ایک تنگ گھاٹی میں سے نکل کر دو اور گھڑ سوار اس کے سامنے آ گئے۔ تابان نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ایک جانی پہچانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"خوش آمدید سردار تابان۔۔۔۔۔۔ میں امیر ارژنگ ہوں۔"

تابان کی سماعت میں دھماکا ہوا۔ وہ اس نام کو کیسے بھول سکتا تھا۔ یہی شخص تو تھا جس سے چند ماہ پہلے تابان نے افشاندہ کو چھینا تھا۔ وہ افشاندہ جو اب اس کی کالی سنسان راتوں میں جگنو کی چمک تھی۔ ارژنگ کی آواز ایک بار پھر اندھیرے سے ابھری۔

"مجھے تجھ پر ترس آرہا ہے سردار تابان۔ کاش تجھے کسی نے بتادیا ہوتا کہ تُو جس خانوادے سے ٹکر لے رہا ہے وہ سو نسل تک اپنی دشمنی نہیں بھولتا اور اپنے مجرم کو زمین کی ساتویں تہہ سے ڈھونڈ نکالتا ہے۔۔۔۔۔۔۔" امیر ارژنگ کے پیچھے چند اور گھڑ سوار نمودار ہوئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں عریاں تلواریں تھیں۔ ارژنگ نے تابان کے بالکل سامنے پہنچتے ہوئے کہا۔ "آہ۔۔۔۔۔۔۔۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ اس طوفانی شب کوئی تمہاری مدد کو نہیں آنے والا۔ متحدہ جمعیت یونان کا سالار اعظم سکندر اپنی لاتعداد سپاہ کے باوجود تمہاری جان بچانے سے قاصر ہے۔"

تابان نے دیکھا امیر ارژنگ کے ساتھ آنے والے تقریباً سبھی افراد کے بال لمبے اور کانوں میں کسی دھات کے باریک چھلے تھے۔ ان میں وہ تینوں خادم بھی شامل تھے۔ تابان کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ تینوں خادم درحقیقت امیر ارژنگ کے قبیلے ہی کے افراد ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

امیر ارژنگ بیش قیمت لباس میں تھا۔ ہاتھوں میں قیمتی انگشتریاں دمک رہی تھیں۔ گھوڑے پر ایک ملازم امیر کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے سینے پر ایک بڑے مومی چھاتے کا دستہ چرمی تسموں سے بندھا ہوا تھا۔ چھاتہ ایسے زاویے سے جھکا ہوا تھا کہ امیر پر بارش کی ایک بوند نہیں پڑ رہی تھی۔ ملازم کے داہنے ہاتھ میں ایک مشعل تھی۔ امیر کی آنکھوں میں زہریلے سانپ کی چمک تھی اور یہ آنکھیں تابان پر گڑی ہوئی تھیں۔

"کیا چاہتے ہو مجھ سے؟" تابان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"تمہاری موت۔" ارژنگ نے جواب دیا۔ "لیکن کوئی ایسی ویسی موت نہیں۔ تمہیں جہنم واصل ہی کرنا ہوتا تو پچھلے ایک ماہ کئی مواقع ایسے آئے تھے کہ تمہارے سینے میں زہریلا تیر پیوست کیا جا سکتا تھا لیکن ہم تمہیں شایانِ شان موت دینا چاہتے ہیں۔ آخر تم نے امیر ارژنگ سے دشمنی مول لی ہے کسی معمولی شخص کو نہیں للکارا ہے۔"

تابان کے کانوں میں افشاندہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔ تابان سے وابستہ ہونے کے بعد کئی بار وہ یہ بات کہہ چکی تھی کہ امیر ارژنگ اپنی شکست فراموش نہیں کرے گا۔ ایسا

کرنا "طہرامی قبیلے" کسی فرد کو آتا ہی نہیں۔۔۔۔۔۔۔ وہ انتقام کے لئے جیتے ہیں اور انتقام کے لئے مرتے ہیں۔ دشمن کی بو سونگھنا اور مرنے مارنے کے لئے اس تک پہنچ جانا طہرامیوں کا صدیوں پرانا شعار ہے۔۔۔۔۔۔۔ اچانک کوئی بہت وزنی چیز تابان کی پشت سے ٹکرائی۔ وہ گھوڑے سے اچھل کر سنگلاخ زمین پر گرا۔ گھٹنے اور کہنیاں چھل گئیں۔ چہرہ کسی پتھر سے ٹکرایا اور زیریں ہونٹ خون آلود ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ نیام تک پہنچاتا اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑتا۔ کم از کم چھ نیزے اس کے جسم سے آ لگے۔

"خبردار۔" ایک نہایت ہی کرخت آواز گونجی۔ "حرکت کی تو دیوتاؤں کے پاس پہنچ جاؤ گے۔"

یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا۔ درحقیقت بلندی پر کھڑے ایک شخص نے تابان کی پشت پر ایک گول پتھر دے مارا تھا۔ اسی دھکے سے تابان نیچے گرا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ خود کو سنبھالتا نصف درجن نیزوں کی انیاں اسے بوسے دینے لگی تھیں۔ یہ لمحات تابان کے لئے بے حد کٹھن تھے۔ وہ کاہن خاتام کے تعاقب میں تھا اور کاہن خاتام کا سفر کسی معمولی نوعیت کا نہیں تھا۔ وہ کسی ایسی منزل کا راہی تھا جہاں مارشا تھی۔۔۔۔۔۔۔ مارشا جو تابان کے لئے زندگی کا

ہی دوسرا نام تھی۔۔۔۔۔۔۔ہاں کاہن خاتام تابان کی زندگی کی طرف جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ تابان کو بہر صورت اس کے تعاقب میں رہنا تھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر امیر ارژنگ کی طرف دیکھا۔ وہ چھاتی تانے کسی دیوار کی طرح تابان نے سامنے کھڑا تھا۔ تابان کا دل چاہا کہ وہ اٹھے اور جسم و جان کی پوری قوت کے ساتھ اس دیوار سے جا ٹکرائے۔۔۔۔۔۔۔۔ اس سنگ راہ کو پاش پاش کر ڈالے جو خاتام اور اس کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ابھی جسم کو جنبش ہی دی تھی کہ گردن اور چھاتی پر نیزوں کا دباؤ جان لیوا ہو گیا تھا۔ مدمقابل اسے ذرا بھی رعایت دینے کو تیار نہ تھے۔ غالباً ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ وہ پوری طرح چوکس رہیں اور خطرہ محسوس ہوتے ہی اسے چھلنی کر ڈالیں۔۔۔۔۔۔۔ تابان دل مسوس کر رہ گیا۔ امیر ارژنگ نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی رسی اچھالی۔ رسی کے سرے پر پھندا تھا جو چکرا کر تابان کی گردن میں آ پھنسا۔ "چل اٹھ غلام زادے!" ارژنگ گرجا۔ اگر مقدونیوں نے تیری اصلیت جانتے ہوئے بھی تجھے سرداری دی ہے تو ان سے بڑا بیوقوف اور کوئی نہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے تھا رگوں میں "کم ذات" خون ہو تو سرداری اور مرتبہ بھی کسی کو قابل عزت نہیں بنا سکتا۔"

"غلام زادے" کے خطاب نے تابان کے دماغ میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ ایسے موقعوں پر اس کی یہی کیفیت ہوا کرتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ شروع شروع میں وہ اس کیفیت کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ بپھر کر "آقازادوں" پر جا پڑتا تھا کسی وحشی جانور کی طرح دانتوں سے ان کی چمڑی ادھیڑ دیتا تھا' کپڑے پھاڑ ڈالتا تھا اور نیچے گرا کر ادھ موا کر دیتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور اگر یہ سب کچھ نہ کر سکتا تھا تو بھاگ جاتا تھا۔ اس دیدہ دلیری کے نتائج بڑے سنگین نکلا کرتے تھے۔ کبھی اسے مادر زاد برہنہ کر کے تپتی ریت پر لٹایا جاتا تھا۔ کبھی غلاظت گھول کر پلائی جاتی تھی اور کبھی گھوڑوں کے پیچھے گھسیٹا جاتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے اسے اپنے منہ زور جذبات کو چھپانا آ گیا تھا۔ اس نے اپنی دلی کیفیت کو سینے میں دفن رکھنے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ وہ ضبط کرتا تھا اور کاری ضرب لگانے کے لئے انتظار کرتا تھا۔ امیر ارژنگ کے سامنے بھی اس نے اپنے سینے کی اتھل پتھل کو چہرے پر نمایاں نہیں ہونے دیا اور عام لہجے میں بولا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ میرے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہوا ہے جس کے لئے تم مجھے ملعون ٹھہراؤ۔"

امیر ارژنگ کے ہونٹ زہر خند انداز میں کھنچ گئے۔ "بہت خوب۔۔۔۔۔۔۔ بہت ہی خوب۔۔۔۔۔۔ ایک راہ چلتی گھریلو عورت پر نگاہ ڈالنا۔ اس کے گھر میں گھسنا اسے اغوا کرنے کی کوشش میں دو افراد کی جان سے کھیلنا اور پھر اپنے عہدے و مرتبے کے بل بوتے پر اسے گھر میں ڈال لینا' کیا یہ سب معصومانہ افعال ہیں؟"

تابان نے کہا۔ "میں نے اس عورت پر ظلم نہیں ڈھایا' اسے ظلم اور بربریت سے بچایا ہے۔ اس نے خود ہی شاہی دربار میں فریاد کی تھی کہ اسے امیر ارژنگ کی غلامی سے نجات دلائی جائے۔ تم نے اس پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ شریک حیات کا رتبہ دینا تو دور کی بات ہے تم اسے کنیز کا درجہ دینے پر بھی آمادہ نہیں تھے۔ تم لوگوں نے اسے اُس کے وارثوں سے جدا کیا تھا' بچوں سے جدا کیا تھا یہاں تک کہ زندگی کی حقیر خوشیوں سے بھی جدا کر رکھا تھا آج وہ بہت خوش ہے اور زندگی کی آخری سانس تک میرا ساتھ دینا چاہتی ہے۔"

تابان کے کلمات نے ارژنگ کی جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ غرا کر بولا۔ "لے آؤ اس بدبخت کو اوپر۔۔۔۔۔۔۔ یہ جتنی دیر زندہ ہے ہمارے پُرکھوں کی زمین پر بوجھ ہے۔"

نیزہ برداروں نے تابان کے شرابور جسم کو تیز دھارانیوں سے خونی بوسے دیئے اور ارژنگ گھوڑے پر بیٹھا بیٹھا اس کی گردن کی رسی کھینچنے لگا۔ تابان لڑکھڑاتا ہوا گھوڑے کے پیچھے چل دیا۔ یہ ایک توہین آمیز سلوک تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے ذلت ناک بھی کہا جا سکتا تھا لیکن ایسے سلوک کا نشانہ بن کر تابان کے اندر ایک عجیب طرح کا میٹھا میٹھا غضب جاگ اٹھتا تھا۔ ایک سفاکی سی رگ وپے میں دوڑنے لگتی تھی اور وہ کوئی خونی تماشہ دکھانے کے لئے پورے طرح تیار ہو جاتا تھا۔ امیر ارژنگ اسے گھوڑے کے پیچھے گھسیٹتا اور کھینچتا پہاڑی پر لے آیا۔ بارش کی طوفانی بوچھاڑوں میں چیڑ اور اخروٹ کے درخت خاموش کھڑے تھے۔ ان درختوں کے درمیان عمیق کھائیاں منہ کھولے ہوئے تھیں اور چٹانوں کے سائے معمول سے زیادہ ہیبت ناک دکھائی دیتے تھے۔ یکایک زور سے بجلی چمکی۔ تاریک آسمان پر برقی شاخوں کا جال بچھ سا گیا۔ اس روشنی میں تابان نے اپنے سامنے ایک غار کا دہانہ دیکھا۔ دہانہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ غار کشادہ ہے اور دور تک چلا گیا ہے۔ دہانے پر چند گھوڑے بھی بندھے ہوئے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اندر تین یا چار افراد اور موجود ہیں۔ جونہی تابان نیزہ برداروں کے ساتھ اندر داخل ہوا تیز بارش اور برفانی ہوا کی کاٹ سے نجات مل گئی۔ غار میں کچھ فاصلے پر روشنی ہو رہی تھی اور چند سائے متحرک تھے۔ کوئی شخص مدہم

سُروں میں ایک بانسری نما ساز بجا رہا تھا۔ اس ساز کی دُھن غار میں ایک سریلی گونج سی پیدا کرتی تھی لیکن جس آواز نے تابان کو چونکایا اور پوری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیا وہ ایک چیخ تھی جو کہیں قریب سے رہ رہ کر بلند ہوتی تھی اور غار میں دور دور تک گونج جاتی تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں کسی شخص کو دردناک عذاب سے دوچار کیا جا رہا ہے۔

جونہی تابان 'امیر ارژنگ کے پیچھے چلتا آگ کی جانب بڑھا وہاں بیٹھے تین افراد میں سے دو مؤدب کھڑے ہو گئے لیکن تیسرا بدستور ساز بجاتا رہا۔ اس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ تابان نے دیکھا یہاں موجود تینوں افراد کے کانوں میں بھی دھات کے باریک چھلے چمک رہے ہیں۔ غار میں زندگی بخش حرارت تھی اور اس ٹھٹھرے ہوئے ویرانے میں گھر جیسے ماحول کا احساس ہوتا تھا۔ قریب ہی کہیں گوشت بھونا جا رہا تھا یا کباب بنائے جا رہے تھے۔ شراب اور گوشت کی مہک' مدہم روشنی اور موسیقی کی تانوں میں یوں گھل مل گئی تھی کہ تابان کو ایتھنز کے ناچ گھروں کی یاد آ گئی جہاں حسین خوش نما عورتیں خوش پوش مردوں سے قدم ملا کر ناچتی تھیں' شراب کے دور چلتے تھے' لذیذ کھانے کھائے جاتے تھے اور سردی میں

ٹھٹھرے ہوئے فاقہ زدہ بچے کھڑکیوں سے یہ منظر دیکھ کر آہیں بھرتے تھے۔ تابان کو لگا جیسے اس غار میں سب کچھ ایتھنز کے ناچ گھر جیسا ہے سوائے اس چیخ کے جو رہ رہ کر غار کے تاریک حصے سے ابھرتی تھی اور جسم و جاں کو دہلا جاتی تھی۔ آخر کون شخص تھا وہاں اور اس پر کیا گزر رہی تھی؟ تابان یہی سوچ رہا تھا جب اسے دھکیل کر فرش پر گرا دیا گیا۔ پھر دو پہلوان نما افراد نے بڑی چابکدستی سے اس کے پاؤں رسی میں جکڑ دیئے۔ بعد ازاں ہاتھوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اس کارروائی کے دوران نیزہ بردار پوری طرح چوکس کھڑے رہے۔ وہ جیسے پلک جھپکنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔ تابان کی آنکھیں اب قرب و جوار کو اچھی طرح دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ اسے خود سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر ایک خوفناک منظر دکھائی دیا۔ ایک شخص غار کی چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ تھا اور ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سر کے عین نیچے پتھروں کی ایک عارضی انگیٹھی میں بہت سے انگارے دہک رہے تھے۔ آگ کی دہکتی ہوئی زبان لپک لپک کر اس شخص کے سر کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی جیسے وہ آگ نہ ہو کوئی ناگن ہو اور اپنی دُم پر اچھل کر شکار کو ڈسنا چاہ رہی ہو۔ بدقسمت شخص کا چہرہ انگاروں سے اتنا بلند تھا کہ وہ نہ تو جل کر کباب ہو سکتا تھا نہ چین پا سکتا تھا۔ وہ ایک دھیمی آنچ پر پک رہا تھا اور

وقفے وقفے سے کربناک آواز میں چیخ اٹھتا تھا۔ اب تابان پر انکشاف ہو رہا تھا کہ غار میں پھیلی ہوئی سوختہ گوشت کی مہک در حقیقت یہی خوفناک بو تھی۔

شب کا باقی حصہ تابان نے یہی پر ہول چیخیں سنتے ہوئے گزار دیا۔ ان چیخوں کو سنگ فراہم کرنے کے لئے دو آوازیں اور بھی تھیں ایک بارش کی آواز جو مسلسل غار کے دہانے پر برس رہی تھی اور دوسری بانسری کی آواز جو الاؤ کے قریب بیٹھا ہوا ایک شخص پورے انہماک سے بجا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں تابان کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس بانسری کا تعلق اس سزا سے ہے جو الٹا لٹکا ہوا شخص بھگت رہا ہے۔ کوئی ربط ہے اس چیخ اور اس ساز میں۔ تابان کو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ امیر ارژنگ اور اس کے ساتھیوں کو کسی کا انتظار ہے۔ شاید تابان کو کسی کربناک عذاب میں مبتلا کرنے سے پہلے وہ کسی اور تماشائی کو بھی یہاں دیکھنا چاہتے تھے۔

یہ تماشائی اگلے روز دن چڑھے غار میں پہنچا۔ غار کے دہانے پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونجیں پھر چند آوازیں آئیں اور ایک بوڑھا شخص دو دوسرے افراد کے ہمراہ اندر آ گیا۔ اسے پہچاننے میں تابان کو دیر نہیں لگی۔ یہ امیر ارژنگ کا باپ تھا۔ وہی منحنی بوڑھا جو افشاندہ کو بہو کہتا تھا اور جس نے حویلی میں مشتعل افراد کو تابان کے قتل سے روکا تھا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن آج اس کی

آنکھوں میں بھی تابان کے لئے وحشت اور بے رحمی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ جلتی نظروں سے تابان کو گھور رہا تھا اور فرطِ غضب سے اس کا سر دھیرے دھیرے کانپتا چلا جا رہا تھا۔

"کاش 'میرے بس میں ہو اور میں تمہیں دس بار زندہ کر کے مار سکوں۔" وہ پھنکارا۔

"لیکن میرا قصور؟" تابان نے کمال اطمینان سے پوچھا۔

"تمہارا کوئی قصور نہیں۔ قصور اس ناپاک خون کا ہے جو تمہاری رگوں میں دوڑتا ہے۔" وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ "بدقسمت انسان! تُو نے میری عزت پر ہاتھ نہیں ڈالا پورے طہرام قبیلے کی غیرت کو للکارا ہے۔"

تابان نے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔ "غالباً آپ اس لڑکی کے لئے غمزدہ ہیں جسے آپ بہو کہتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن محترم۔۔۔۔۔۔۔ وہ آپ کی بہو نہیں تھی۔ جب آپ کا بیٹا اسے بیوی نہیں سمجھتا تھا تو آپ اسے کیسے یہ رتبہ دے سکتے ہیں۔ وہ آپ کے فرزند کی زر خرید لونڈی تھی۔ آپ کی چھت تلے اس پر مظالم توڑے جا رہے تھے۔ عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا تھا اس پر۔۔۔۔۔۔۔"

"حرامی 'کتے 'سؤر۔۔۔۔۔۔" ارژنگ کے منہ سے گالیوں کی بوچھاڑ نکلی اور وہ بے قابو ہوکر تابان پر ٹوٹ پڑا۔ اسے ٹھوکروں اور مکوں سے مارا پھر گریبان سے پکڑ کر پتھریلی دیوار کے ساتھ پٹخ دیا۔ تابان کی مشکیں کسی ہوئی تھیں وہ لڑکھڑا کر الٹے لٹکے ہوئے معتوب کے قریب جا گرا۔ وہ شخص رات بھر جان کنی کی اذیت سے گزر کر اب قریب المرگ تھا۔ اس کے حلق سے آواز نکلنا اب بند ہوچکی تھی۔ بس کسی وقت ایک خرخراہٹ سی ابھری تھی اور پتہ دیتی تھی کہ تار تار زندگی کی کچھ دھجیاں اب اذیت کے کانٹوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ دن کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ کر تابان جیسا شخص بھی لرز گیا۔ سر کے بال جھلس چکے تھے۔ چہرہ دھیمی آنچ پر پک کر سیاہی مائل سرخ ہوگیا تھا اور جگہ جگہ آبلے پڑ چکے تھے۔ ایک رخسار سے چربی بہہ بہہ کر نیچے انگاروں پر گرتی تھی اور آگ کے اندر سسکیاں سی گونجنے لگتی تھیں ۔تابان جانتا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد اسے بھی اس آگ پر الٹا لٹکایا جائے گا۔ وہ دھیمی آنچ پر ہوگا۔ زندگی اس کے منہ ناک اور کانوں سے بہہ کر قطرہ قطرہ آگ پر گرے گی اور اس ویران غار میں چیخوں اور قہقہوں کے درمیان طہرام قبیلے کے افراد کا انتقام پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ دو افراد نے تابان کو سنگلاخ زمین پر گھسیٹ کر دوبارہ دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ امیر ارژنگ کے اشارے پر ایک جلاد صورت نیم برہنہ شخص آگے بڑھا اور جاں بلب شخص کے نیچے جلتی ہوئی آگ کو اپنے نیزے سے کریدنے لگا۔ بڑے بڑے انگارے متحرک ہوئے اور شعلوں کی لو بلند ہوگئی۔ اب یہ شعلے بدقسمت شخص کے سر کو چھونے لگے تھے۔ اس کے نیم جان جسم میں سر تا پا ایک جھرجھری نمودار ہوئی۔ چہرے اور گردن کے مساموں سے اب نیل سا بہنے لگا۔ آگ کے قریب بیٹھا ہوا سادھو نما شخص بڑے وجد میں بانسری بجا رہا تھا۔ یہ بانسری دراصل ایک انسانی ٹانگ کی ہڈی تھی۔ اس میں مناسب جگہوں پر سوراک کر کے بانسری کی شکل دے دی گئی تھی۔۔۔۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے بدنصیب شخص جان کنی کے عذاب سے نجات پا گیا۔ اب اس کی بے جان لاش سر کے بل جھول رہی تھی اور سر دہکتے کوئلوں کی آنچ پر تڑخ رہا تھا۔ امیر ارژنگ کی ہدایت پر دو افراد آگے بڑھے اور انہوں نے مرنے والے کو چھت سے اتار لیا۔ جب اسے فرش پہ سیدھا لٹایا گیا تو تابان بری طرح چونک اٹھا۔ اسے پہلے ہی کچھ شبہ سا ہو رہا تھا لیکن اب اس نے مقتول کو ٹھیک سے دیکھ لیا تو پہچان لیا۔۔۔۔۔۔ اس کیر گوں میں خون کھول اٹھا تھا۔ اس کے سامنے پڑا ہوا مسخ شدہ چہرہ سکندر کے ذاتی دستے کے سالار بنیاز کا بندہ تھا۔ بنیاز وہی شخص تھا جس نے ہیلی کارنیس میں تابان کی جان بچائی تھی۔ جب تابان 'افشاندہ سے ملنے امیر ارژنگ کی حویلی میں گھسا تھا اور اہل خانہ نے اسے گھیر لیا تھا تو بنیاز ہی چھاپہ مار سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا اور اس نے

تابان کو حویلی سے نکالا تھا۔ یقیناً اسی کارروائی کی پاداش میں وہ آج ناقابل شناخت چہرے کے ساتھ اس سنگلاخ فرش پر پڑا تھا۔ تابان کو امیر ارژنگ کے لمبے ہاتھوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ یہ دیدہ دلیری کی انتہا تھی کہ وہ جذبہ انتقام کی تسکین کے لئے شکار کو مقدونوی فوج کے پڑاؤ سے اٹھالایا تھا۔ معلوم نہیں وہ یہ کام کیسے کر سکا تھا' بہر حال یہ کام ہو چکا تھا اور سکندر کے ذاتی دستے کے سالار کی لاش عبرت نگاہ بنی اس ویران غار میں پڑی تھی۔

ارژنگ بڑے غور سے تابان کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ تابان نے دستہ سالار کو پہچان لیا ہے۔ بڑے زہریلے لہجے میں بولا۔

"اپنے دوست کو پہچان کر یقیناً تمہیں خوشی ہوئی ہو گی۔"

ایک دوسرے شخص نے لقمہ دیا۔ "ہمدم دیرینہ سے ملاقات کس کے لئے باعث مسرت نہیں ہوتی۔"

ارژنگ کی آنکھوں میں سفاکانہ چمک نمایاں ہونے لگی۔ غرا کر بولا۔ "دیکھ غلام زادے اس شخص نے صرف تیری معاونت کی تھی۔ اب اس کے انجام کو سامنے رکھ کر اپنی موت کا نقشہ خود ہی کھینچ لے۔"

تابان کے چہرے پر کوئی تاثر نمودار نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح بے حس و حرکت دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ آنکھوں میں ایک تاؤ دلانے والی لاپرواہی کروٹیں لے رہی تھی۔ جوں جوں صورتِ حال سنگین ہو رہی تھی یہ لاپرواہی اور بے نیازی بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ امیر ارژنگ جھلا کر آگے بڑھا اس نے پہلے تابان کی پسلیوں میں چند زوردار ٹھوکریں لگائیں پھر تلوار کی مدد سے اس کا عسکری لباس کاٹ کر دور پھینک دیا۔ اب اس کے جسم پر ایک زیر جامے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تابان کے بندھے ہوئے پاؤں کے درمیان سے ایک رسہ گزارا گیا' پھر اسے چار افراد نے اٹھالیا اور پانچویں نے ایک گھوڑے پر کھڑے ہو کر یہ رسہ چھت کے آہنی حلقے میں سے گزار دیا۔ یہ حلقہ ایک ٹوٹے ہوئے خم دار نیزے کو چھت میں ٹھونک کر بنایا گیا تھا۔۔۔۔۔۔ پکڑے جانے سے لے کر اب تک تابان کسی خاص تشویش میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ وہ بعض اوقات اس سے بھی بدترین حالات کا سامنا کر چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ جلد ہی بچاؤ کی کوئی نہ کوئی صورت ڈھونڈ لے گا۔ ہاتھ پشت پر بندھواتے ہوئے اس نے بڑی مشاقی کا مظاہرہ کیا۔ اب وہ کوشش کر کے رسی کے بل ڈھیلے کر سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ قطعی غیر مسلح تھا اور غار میں موجود بیشتر افراد کی نگاہ اس پر لگی ہوئی تھی۔

"خطرہ۔۔۔۔۔۔ خطرہ!" اس کے کانوں میں غیر مرئی گھنٹیاں بج رہی تھیں 'اور یہ احساس اس کے لئے لذت بخش تھا۔ جوں جوں خطرہ بڑھتا جا رہا تھا ایک "لذیذ درد" اس کے رگ و پے میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ قویٰ تن رہے تھے 'دماغ روشن تر ہو رہا تھا اور کوئی اس کے اندر بہت گہرائی میں یہ دعویٰ کر رہا تھا کہ میں موت کے اس جال سے نکل جاؤں گا 'یہ طہرامی کچھ بھی کر لیں 'صورتِ حال کتنی بھی بگڑ جائے میں کسی نہ کسی طور اس آفت کا رخ پھر دوں گا۔ یہی یقین تھا جو ان کٹھن لمحوں میں بھی اسے چاق و چوبند رکھے ہوئے تھا اور وہ بڑے انہماک بلکہ دلچسپی سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ موت سے آنکھ مچولی اس کا من پسند کھیل تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس وقت اس کھیل میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی اولین ترجیح کاہن خاتام کا تعاقب تھا۔ اگر اچانک بلندی سے وہ پتھر اس کی پشت پر نہ آن لگتا تو وہ ارژنگ اور اس کے گماشتوں کا بھرپور مقابلہ کرتا اور روشن امکانات تھے کہ انہیں پسپا کر کے اپنا راستہ صاف کر لیتا۔۔۔۔۔۔ بہر حال صورتِ حال مختلف تھی۔ اسے چار و ناچار ان حالات سے گزرنا تھا۔ وہ تادیر یونہی سر کے بل ہوا میں معلق رہا۔ پشت پر اس کے ہاتھ دھیرے دھیرے حرکت کر رہے تھے۔ وہ رسی کھولنے کی کوشش میں تھا۔ دوپہر سے ذرا قبل دہانے پر تیز تیز باتیں کئے جانے کی آواز آئی۔ پھر ارژنگ کے مسلح آدمی کسی شخص کو پکڑ کر اندر لے آئے۔

وہ کوئی آوارہ گرد تھا۔ امیر ارژنگ اس سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ تابان غار کے وسط میں لٹک رہا تھا لہذا دہانے پر ہونے والی گفتگو اسے صاف سنائی نہیں دیتی تھی۔ بس اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ بولنے والا یونانی ہے اور خود کو سکندر کا سپاہی بتا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد امیر کے آدمی تین اور افراد پکڑ لائے۔ ان کا پتہ پہلے پکڑے جانے والے شخص سے چلا تھا۔ جب ان چاروں کو الاؤ کے پاس لایا گیا تو تابان ان کی آوازیں صاف سننے لگا۔ یکایک اس کے دماغ میں ایک پھلجڑی سی چھوٹ گئی۔ نو وارد افراد میں سے ایک شخص کی آواز تابان کو جانی پہچانی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ذہن پر زور دیا اور سناٹے میں رہ گیا۔ یہ ہوشمند کی آواز تھی۔ وہی ہوشمند جسے تابان اور کورا کو سردار شلال کے سپاہیوں سے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ پچھلے چند ماہ میں تابان ہوشمند کی طرف سے اکثر پریشان رہا تھا۔ اس نے واپس جانے والے ایک مقدونوی سالار کے ہاتھ ہوشمند کو پیغام بھی ارسال کیا تھا اور ان دونوں شدت سے اس کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ پیغام بھیجنے کے بجائے ہوشمند خود یہاں آن وارد ہو گا۔ تابان غار کے تاریک حصے میں تھا لہذا ہوشمند کی نگاہ اس تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ وہ امیر ارژنگ سے مصروفِ گفتگو تھا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ طہرامی قبیلے کے ان افراد کو بھی سکندر کے رضاکاروں میں شامل سمجھ رہا ہے۔ غالباً امیر ارژنگ نے اسے جان بوجھ کر

دھوکے میں رکھا ہوا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ وہ دشمنوں میں ہے 'ہوشمند بڑی روانی سے اپنے سفر کے حالات سنانے میں مصروف تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہم سکوپے لاس سے پچھلے ماہ کی آخری تاریخ کو چلے تھے محترم۔۔۔۔۔۔۔ "پیلا" سے آنے والے رضاکاروں کے دو دستے جزیرے پر رکے بغیر آگے نکل گئے تھے لہذا ہم چار دوستوں کو تنہا سفر کرنا پڑا۔ دو تاریخ کو ہم ٹرائے میں پہنچے۔۔ وہاں غضب کی گرمی پڑ رہی تھی۔ صرف ایک شب قیام کرنے کے بعد ہم نے غضب کی تھکاوٹ کے باوجود گرینی کس کا قصد کیا۔ گرینی کس کے قرب و جوار میں غضب کی وبا پھوٹی ہوئی تھی۔ ہر تیسرا شخص ہیضے کا شکار تھا۔ ہم رکے بغیر آگے بڑھ گئے اور غضب کے دشوار راستے پر غضب کی رفتار سے سفر کرتے ہوئے ہیلی کارنیس کی طرف بڑھنے لگے۔۔۔۔۔۔۔"

ہوشمند زور شور سے اپنے تکیہ کلام کا استعمال کر رہا تھا اور مقبوضہ علاقوں کا احوال کھول کھول کر بیان کرتا چلا جا رہا تھا۔ آخر میں اس نے سفر کا اختتامی احوال بتایا۔ اس کی باتوں سے تہ چلا کہ وہ اور اس کے تینوں ساتھی کل شام کوہِ لام کے نواح میں پہنچ چکے تھے اور انہیں توقع تھی کہ اندھیرا اپھیلنے سے پہلے پہلے سکندری فوج کے پڑاؤ میں داخل ہو جائیں گے لیکن اندھیرا اور طوفان ایک ساتھ آیا۔ تند و تیز موسم میں وہ راستہ بھٹک کر اس طرف آ نکلے۔ رات ایک چٹان کے سائبان تلے گزار دی۔ اب موسم بہتر ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ امیر ارژنگ کے ساتھیوں سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔

امیر ارژنگ کرید کرید کر ہوشمند سے اپنے مطلب کے سوال پوچھنے لگا۔ وہ مقبوضہ بستیوں' راستوں اور مقدونوی سپاہ کی آمدورفت کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ غار سے باہر بدستور بادل گرجتے رہے اور بارش برستی رہی۔ غار کے اندر تابان چھت سے لٹکا رہا اور ارژنگ کے ساتھی ساغر و مینا سے دل بہلاتے رہے۔ شواہد سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی امیر ارژنگ کو کچھ اور لوگوں کا انتظار ہے۔ اب معلوم نہیں یہ نئے آنے والے تماشائی تھے یا تماشہ۔ اگر تماشائی تھے تو ان کا تعلق یقیناً امیر ارژنگ سے تھا اور اگر تماشا تھے تو وہ سکندر کے ذاتی دستے کے مزید محافظ ہو سکتے تھے۔ اس تذبذب میں رات ہو گئی۔ سر کے بل جھولتے جھولتے تابان کا نچلا دھڑ سن ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں خون جمع ہو گیا تھا اور کانوں میں جیسے مسلسل سیٹیاں بج رہی تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو لگاتار متحرک رکھا تھا۔ اب وہ بندش کو ایسی حالات میں لا چکا تھا کہ بوقت ضرورت معمولی سی کوشش سے اپنی کلائیاں آزاد کرا سکتا تھا۔

اندھیرا پھیلتے ہی اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ وہ امیر ارژنگ کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا اور یہ واضح کرنے لگا یہ وہ عافیت چاہتا ہے تو اسے یہاں چھوڑ دے۔ اس چیخ و پکار کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ ہوشمند اس کی یہاں موجودگی سے آگاہ ہو جائے۔ ہوشمند کی اس غار میں موجودگی تابان کے لئے جہاں مسرت بخش تھی وہاں نہایت خوش آئند بھی تھی۔ اسے معلوم تھا ہوشمند اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کوئی موزوں رستہ تلاش کر لے گا۔

تابان اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے ہوشمند کی آواز سنائی دی۔ وہ ارژنگ کے والد سے پوچھ رہا تھا۔ "محترم! یہ کون شخص ہے؟"

ارژنگ کا والد بولا۔ "ہے ایک بدبخت۔ شاہِ مقدونیہ سکندر کا معتوب ہے۔"

"کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟" ہوشمند نے دریافت کیا۔

"ہاں دیکھ لو۔" بوڑھے کے بجائے امیر ارژنگ نے خود جواب دیا۔

تابان کو قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر اس نے ہوشمند کا لنگڑاتا ہوا ہیولا دیکھا وہ اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہ عجیب ملاقات تھی۔ وہ ایک دوسرے کو صرف دیکھ سکتے تھے۔ بات کر

سکتے تھے نہ بغل گیر ہو سکتے تھے۔ نہ ایک دوسرے کے رخسار چوم سکتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ کتنی طویل جدائی تھی جس کے بعد یہ گھڑی دیکھی تھی انہوں نے۔۔۔۔۔۔۔ سکوپے لاس کے قائم مقام فرمانروا کے محل میں تابان نے ہوشمند کو ایسی حالت میں پایا تھا کہ اس کے سینے میں ایک خنجر پیوست تھا اور چہرے کی خوفناک زردی اس کی موت کا اعلان کر رہی تھی۔ تابان طیش کی حالت میں محل سے نکلا تھا اور شلال کے تعاقب میں روانہ ہو گیا تھا۔ پھر راستے میں زہریلے دودھ نے اثر دکھانا شروع کیا تھا اور وہ گھوڑے سے گر کر دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ اس دن سے آج تک کم و بیش ڈیڑھ برس گزر چکا تھا۔ بے شمار شب و روز تابان نے ہوشمند کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارے تھے۔۔۔۔۔۔ اس کی شگفتہ باتیں یاد کی تھیں۔ اس کی پُر خلوص محبت کا تصور تھا۔۔۔۔۔۔۔

ہوشمند کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت تھی۔ ہونٹوں پر سوال پھڑک رہے تھے لیکن وہ جانتا تھا اسے خاموش رہنا ہے۔ موت کے اس گھیرے میں خاموشی ہی ان کی سلامتی کی ضامن تھی۔ وہ کچھ دیر تابان کو دیکھتے رہنے کے بعد واپس چلا گیا۔ آگ کے گرد بیٹھے افراد کے قہقہے غار میں گونجتے رہے۔ وہ اس گرجتے برستے موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ موسم ان

کے لئے یوں بھی ساز گا تھا کہ اس غار کی طرف کسی اجنبی کے آنے کا امکان نہیں رہا تھا۔ بس وہ تھے اور ان کا قیدی تھا جسے کربناک موت سے دوچار کرنے کے لئے وہ پوری طرح آزاد تھے۔ ان کی گفتگو سے تابان کو اندازہ ہوا تھا کہ جس شخص کا انتظار ہو رہا ہے وہ ابھی پہنچا نہیں۔ اس کی آمد میں ہونے والی تاخیر ارژنگ کے لئے کچھ زیادہ ہی پریشان کن تھی۔ وہ بار بار اٹھ کر ٹہلنے لگتا تھا۔ کبھی دہانے کی طرف نکل جاتا تھا' کبھی آگ کے سامنے رک کر شعلوں کو گھورنے لگتا تھا۔ ایسے میں آگ کا عکس اس کے چہرے پر پڑتا تھا اور وہ خود بھی ایک شعلہ سا نظر آنے لگتا تھا۔ انسانی ہڈی کا بانسری نما ساز آج یکسر خاموش تھا۔ شاید اس ساز کو اس وقت بجنا تھا جب تابان کا کاسہِ سر شعلوں پر رکھا جاتا۔

شب آہستہ آہستہ رینگتی رہی۔ پانی کی جلترنگ پر اندھیرا رقصاں رہا۔ یہاں تک کہ امیر ارژنگ کی بے قراری عروج پر پہنچ گئی۔ اس نے اپنے چار ساتھی ہمراہ لئے اور وہ سب مومی چادریں اوڑھ کر غار سے نکل گئے۔ اب غار میں ارژنگ کے مخنی باپ سمیت کل پانچ افراد تھے۔ ان میں سے دو نشے کے سبب شام سے اونگھ رہے تھے باقی تین میں سے بھی ایک امیر ارژنگ کے جاتے ہی دیوار کا سہارا لے کر نیم دراز ہو گیا اور جیسا کہ بعد میں پتہ چلا گہری نیند

سو گیا۔ صرف دو افراد چوکس تھے لیکن انہیں دہانے پر متعین رہنا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ ہوشمند کے لئے سنہری موقع تھا۔۔۔۔۔۔ تابان کو اس کی آمد کا پتہ ایک طویل سائے سے چلا۔ وہ دبے قدموں تابان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"تابو!" اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی اور وہ اس کی کمر سے لپٹ گیا۔ کچھ دیر بے حس و حرکت لپٹا رہا پھر سرگوشی میں بولا۔ "کون لوگ ہیں یہ؟

تابان نے کہا۔ "جو تم سمجھ رہے ہو وہ نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"یہ سالارِ اعظم کے سپاہی نہیں' یہاں کے مقامی لوگ ہیں۔ ابھی چار پہر قبل انہوں نے سالار اعظم کے ایک جاں نثار سالار کو بدترین موت سے دوچار کیا ہے اور اب مجھے لٹکا رکھا ہے۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔" ہوشمند نے کہا۔

"تابان بولا۔" یہ سمجھنے سمجھانے کا وقت نہیں۔ یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو عمر بھر پچھتائیں گے بلکہ پچھتانے کے لئے باقی ہی نہیں رہیں گے۔۔۔۔۔۔۔ تم جلدی سے میری یہ رسی کاٹ دو۔ تلوار ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں۔" ہوشمند نے جواب دیا۔ "ہم یہاں بالکل غیر مسلح ہیں۔"

"ہتھیار کہاں ہیں؟"

"ان لوگوں نے آتے ہی لے لئے تھے۔ معلوم نہیں کہاں رکھے ہیں۔"

"یہ تو برا ہوا۔" تابان نے سرگوشی کی۔ کچھ دیر غار کے اس تاریک حصے میں گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ پھر ہوشمند نے پوچھا۔

"یہ افشاندہ کون ہے؟"

تابان چونک گیا۔ "تم کیسے جانتے ہو؟"

" یہاں اسی کا انتظار ہو رہا ہے۔" ہوشمند نے جواب دیا۔ "کچھ لوگ اسے لے کر یہاں آنے والے تھے 'لیکن وہ نہیں آئے۔۔۔۔۔۔۔ سردار ارژنگ اور اس کے کارندے اسی سلسلے میں باہر نکلے ہیں۔"

تابان کا چکرایا ہوا سر اور شدت سے چکرانے لگا۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ اس نے گمان بھی نہیں کیا تھا کہ اس کی سزا کی تاخیر کا سبب افشاندہ ہے۔۔۔۔۔۔۔ امیر ارژنگ سفاکی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ تابان کے ساتھ ساتھ وہ افشاندہ کو بھی انتقام کے دہکتے انگاروں پر نچوڑنا چاہتا تھا۔ افشاندہ نے شاہی دربار میں امیر ارژنگ سے نجات پانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس کی خواہش میں طہرامی اسے بھی عبرت نگاہ بنانا چاہتے تھے۔ تابان نے تصور میں افشاندہ کو سر کے بل انگاروں پر جھولتے اور تڑپتے دیکھا۔ اس کے بے آسرا بچوں کی صورتیں اس کی نگاہوں میں گھومیں اور وہ بے قرار ہو گیا۔ ایک جھٹکے سے اس نے اپنے ہاتھ رسی کی بندش سے آزاد کر لئے۔ ہوشمند محتاط قدموں سے ارژنگ کے باپ کی طرف گیا۔ وہ منحنی بوڑھا جاگ رہا تھا اور دونوں ہاتھ آگ پر پھیلائے گم صم بیٹھا تھا۔ ہوشمند اس کے پہلو سے آیا جھک کر کوئی بات کی اور پلک جھپکتے میں پیش قبض بوڑھے کے کمر بند سے نکال لی۔ پھر وہ لپک کر تابان

کے پاس پہنچا اور اسے چھت سے منسلک کرنے والی رسی کاٹ ڈالی۔ تابان دونوں ہاتھوں کے بل فرش پر گرا اور فوراً سیدھا ہو گیا۔ اس دوران ہوشمند نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو حملے کا حکم دیا۔ وہ انہیں اس سلسلے میں پہلے ہی آگاہ کر چکا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی تینوں افراد دہانے کی طرف بھاگے اور اس سے پہلے کہ وہاں موجود دونوں محافظ تلواریں بے نیام کرتے 'ان پر جا پڑے۔ ہوشمند نے بھاگ کر ارژنگ کے باپ کو پیش قبض کی نوک پر رکھ لیا۔ تابان نے دونوں مدہوش طہرامیوں کی تلواریں نکالیں اور مدہوشی کے عالم میں ہی ان کو عالمِ بالا پہنچا دیا۔ آب دار شمشیر کے دو بھرپور ہاتھوں نے دونوں شرابیوں کے سر کاٹ کر گردنوں سے علیحدہ کر دیئے۔ خون کے فوارے ابلے اور غار کی زمین کو سرخرو کرنے لگے۔۔۔۔۔۔۔

آناً فاناً بازی پلٹ چکی تھی۔

پانچوں طہرامیوں کے پاس بہترین ہتھیار موجود تھے۔ خاص طور پر ایک ہندوستانی کمان بے حد مضبوط اور دور مار تھی۔ اس کمان میں استعمال ہونے والے موٹے تیروں کا پورا ترکش بھی ہاتھ لگا۔ تابان نے یہ کمان اپنے کندھے سے آویزاں کر لی۔ باقی ہتھیار ہوشمند نے حسب مہارت اپنے تینوں ساتھیوں میں تقسیم کر دیئے۔ تابان کی وردی بے کار ہو چکی تھی۔

اپنی برہنگی چھپانے کے لئے اسے لباس کی ضرورت تھی۔ دہانے پر پکڑے جانے والے دو محافظوں میں سے ایک کا قد کاٹھ تابان سے مناسبت رکھتا تھا۔ تابان نے اس کے کپڑے اتروا کر خود پہن لئے پھر ارژنگ کے باپ سمیت دونوں محافظوں کو فرش پر اوندھا لٹایا اور ان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ اس مقصد کے لئے وہی رسی استعمال ہوئی تھی جس کے ذریعے تابان دوپہر سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دہانے پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونجنے لگیں۔ امیر ارژنگ اور اس کے ساتھی واپس آ گئے تھے۔ تابان اور ہوشمند ان کے استقبال کے لئے ذہنی طور پر تیار تھے۔ اپنے تینوں ساتھیوں سمیت وہ تیر کمان سنبھال کر مناسب جگہوں پر چھپ گئے۔ جونہی ارژنگ اور اس کے ساتھی اپنی مومی چادریں جھاڑتے اور آپس میں گفتگو کرتے اندر داخل ہوئے تابان نے للکار کر انہیں ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ ان سب پر جیسے برق گر پڑی۔ امیر ارژنگ نے دھیان سے غار کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہ سر بریدہ لاش پر پڑی پھر اس نے چونک کر چھت کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔ ایک ہی ساعت میں وہ حالات کی سنگینی سے آگاہ ہو گیا۔ اس کے دو ساتھیوں نے تیزی سے تلواریں نکالنا چاہیں لیکن سنسناتے تیر ان سے زیادہ تیز تھے۔ ایک کی گردن اور دوسرے کی چھاتی نشانہ بنی۔ دونوں اچھل کر الاؤ کے پاس گرے اور پھڑکنے لگے۔ امیر اورژنگ کا تلوار کی جانب بڑھا ہوا ہاتھ ساکت رہ گیا۔

"خبر دار!" تابان کی نہایت سفاک آواز نے ماحول کو جھنجھوڑ دیا۔ "اپنے قدموں پر کھڑے رہو اور اپنے ہتھیار کھول کر نیچے پھینک دو۔" کچھ ایسی وحشت تھی اس کی للکار میں کہ ارژنگ اور اس کے چاروں ساتھی مبہوت رہ گئے۔ ان کی نگاہیں اپنے جاں بلب ساتھیوں پر جمی تھیں۔ چند لمحے وہ ان کے شانہ بشانہ چلے آرہے تھے لیکن اب خاک وخون میں لتھڑے ہوئے آخری ہچکیاں لے رہے تھے امیر ارژنگ کا چہرہ سرسوں کی طرح زرد ہو گیا۔ اس کا ہاتھ بہ آہستگی اپنی کمر کی طرف بڑھا اور انگوٹھیوں سے سجی ہوئی انگلیاں نیام کا تسمہ کھولنے لگیں۔

ذرا ہی دیر میں ارژنگ اپنے ساتھیوں سمیت غیر مسلح ہو چکا تھا۔ ہوشمند نے بڑی پھرتی سے ان کے ہاتھ بھی رسیوں سے باندھ دیئے اور ان سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔ ارژنگ قہر آلود نگاہوں سے ہوشمند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ پانسہ ہوشمند کے سبب ہی پلٹ سکا ہے۔

امیر ارژنگ تھوڑی ہی دیر قبل غار سے نکلا تھا تو اس کے ساتھ چار افراد تھے لیکن اب واپس آیا تو چھ تھے۔ اس بات کا امکان تھا کہ یہ دونوں وہ ہیں جو افشاندہ کو یہاں لانے کے ذمہ دار

تھے۔ ان میں سے ایک شخص کی قمیض ادھڑی ہوئی تھی اور دوسرے کے چہرے پر خراشیں نظر آرہی تھیں' لگتا تھا وہ دونوں کسی ہاتھا پائی میں شریک رہے ہیں۔ تابان نے ان دونوں کو علیحدہ کیا اور غار سے باہر لے آیا۔۔۔۔۔۔۔ اب وہ بارش تھم چکی تھی۔ تیز ہوا بادلوں کو تتر بتر کر کے چاند کی کرنوں کو راستہ دے رہی تھی۔ رات کا تیسرا پہر قریباً ختم ہونے والا تھا۔

تابان نے ان دونوں افراد سے افشاندہ کے متعلق پوچھا۔ پہلے تو پس وپیش سے کام لیتے رہے لیکن جب انہیں اندازہ ہوا کہ پوچھنے والے کے سر پر خون سوار ہے اور وہ انہیں راہی عدم کرنے میں زیادہ ہچکچاہٹ سے کام نہیں لے گا تو انہوں نے زبان کھولنے میں ہی عافیت جانی۔

انہوں نے بتایا کہ وہ چند دوسرے طہرامیوں کی طرح پچھلے ایک ماہ سے بطور رضاکار سکندر کے لشکر میں موجود تھے امیر ارژنگ کی ہدایت پر آج وہ افشاندہ کو پڑاؤ سے نکالنے کی کوشش میں تھے کہ محافظوں کو ان پر شک ہوا۔ محافظوں نے انہیں گھیر کر پکڑنا چاہا لیکن وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ پڑاؤ سے کافی دور آنے کے بعد انہیں پتہ چل سکا کہ ان کا تیسرا ساتھی گرفتار ہو گیا ہے۔

صورتِ حال اب واضح ہو چکی تھی۔ تابان نے امیر ارژنگ سمیت تمام قیدیوں کو غار سے نکالا اور بلندی کی طرف لے چلا۔ سب کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ ایک قطار میں چل رہے تھے۔ عقب سے تابان اور ہوشمند نے انہیں تیروں کی زد میں لے رکھا تھا۔ ہوشمند کے تین ساتھی اس قطار کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ کوئی ایک سٹیڈیم فاصلہ طے کر کے وہ چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں ہوا بہت تیز تھی اور بلند و بالا درخت وجد میں جھوم رہے تھے۔ بادلوں کا زور اچانک ہی ٹوٹ گیا تھا بس کہیں کہیں نیلگوں ٹکڑے تیرتے رہ گئے تھے۔ صاف آسمان پر چاند کی تہہ میں پہاڑی نالے کا جھاگ دار پانی سفید اژدھے کی طرح بل کھا رہا تھا۔ چاند آج کئی راتوں کے بعد نکلا تھا لیکن ایسی آب و تاب سے نکلا تھا کہ رات میں دن کا سماں بندھ گیا تھا۔ اس کھائی سے آگے بہت فاصلے پر پہاڑوں کی پیالہ نما گود میں ان گنت جگنو ٹمٹما رہے تھے۔ یہ سکندری فوج کا پڑاؤ تھا، وہ فوج ایک سیلاب بے درماں تھی۔ اور بہت جلد بلند و بالا لہر کی طرح ایرانی پایہ تخت کی اونچی دیواروں سے ٹکرانے والی تھی۔

تابان نے نیچے گہرائی میں جھانکا۔ پھر ایک قیدی پر تیر کمان تانا اور اسے چھلانگ لگانے کا حکم دیا۔ قیدی کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ تابان کا لہجہ خوفناک حد تک فیصلہ کن تھا۔

قیدی ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ اس کی نگاہیں آہنی تیر پر مرکوز تھیں جو اس کے سینے کی جانب بنا ہوا تھا۔ یہ دو انگل موٹا دورمار تیر تھا۔ اسے چھوڑنے کے لئے ہند کی ساختہ ایک کڑی کمان استعمال ہوتی تھی۔ تابان نے اس کمان کی زہ کو دور تک کھینچ رکھا تھا۔ اس کی نگاہیں قیدی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ پھنکارا۔

’’چھلانگ لگا بدبخت۔ ورنہ یہ تیر کھوپڑی توڑ ڈالے گا۔"

قیدی نے وحشت زدہ نظروں سے امیر ارژنگ کی طرف دیکھا۔ امیر ارژنگ کا اپنا چہرہ برباد کھنڈر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہ اپنے کارندے کو کیا حوصلہ دیتا۔ یکایک قیدی کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ اپنی مردانگی اور شجاعت کو خیر باد کہہ کر ملتجی آواز میں بولا۔

"مم۔۔۔۔۔۔۔۔میں مرنا نہیں چاہتا۔۔۔۔۔۔۔۔میں بے گناہ ہوں 'میرا کوئی جرم نہیں۔ میں امیر کا تنخواہ دار ملازم ہوں۔"

تابان نے جیسے اس کی فریاد سنی ہی نہیں۔ وہ خطرناک لہجے میں بولا۔ "میں کہتا ہوں چھلانگ لگاؤ' ورنہ تیر چھوڑ رہا ہوں۔"

قیدی نے کھائی کی طرف دیکھا تب ایک بار پھر فریاد کرنے کے لئے منہ کھولا۔ اسی وقت تیر سرسرایا اور کھلے منہ سے گزر کر قیدی کے تالو میں لگا۔ کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ گئی اور سر کے عقبی جانب سے تیر کا ایک بالشت سرا باہر نکل آیا۔ قیدی ایک آہ کے ساتھ پتھریلی زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔

"تم چھلانگ لگاؤ۔" تابان نے دوسرے قیدی کو حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کمان پر دوسرا تیر چڑھا لیا۔

یہ قیدی پڑاؤ میں تابان کا ذاتی ملازم تھا۔ وہ تڑپ کر تابان کے قدموں میں گر گیا۔

"مجھے۔۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو سردار۔۔۔۔۔۔ میری جان بخشی کرو۔ میں شرمندہ ہوں۔۔۔۔۔۔۔ بہت شرمسار ہوں۔ "

"چھلانگ لگاؤ۔" تابان نے بے لچک آواز میں اپنا حکم دہرایا۔

وہ شخص مناجات کرنے کے انداز میں زمین پر اوندھا لیٹ گیا اور گھگیانے لگا۔۔

تابان نے کہا۔ "ابھی مہلت ہے۔ چھلانگ لگا دو۔ ممکن ہے بچ جاؤ لیکن یہ تیر چل گیا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

اس شخص نے پھر بھی سر نہیں اٹھایا۔ تابان نے چٹکی کھولی۔ تیر اس کے عین سر میں لگا اور بالشت بھر اندر گھس گیا۔ وہ اچھل کر تڑپا اور ایک جھٹکے سے ساکت ہو گیا۔

"تم چھلانگ لگاؤ۔" تابان نے تیسرے قیدی کو حکم دیا۔

اپنے دو ساتھیوں کا دردناک انجام دیکھنے کے بعد یہ شخص حتمی فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک دہشت زدہ نگاہ تابان کی کھنچی ہوئی کمان پر ڈالی۔ پھر آنکھیں بند کیں اور چیخ کر کھائی میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے گرنے کی آواز دو تین لمحوں کی تاخیر سے آئی۔ تابان کے ہونٹوں پر ایک زہرناک مسکان تھی۔ اس نے عمودی کنارے پر جھک کر نیچے دیکھا۔ دور جھاگ اڑاتے پانی کے کنارے ہموار سطح پر ایک بے حرکت دھبہ نظر آ رہا تھا۔ تابان دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن وہ تصور کر سکتا تھا کہ پہاڑی نالے کے کنارے خون میں لتھڑے ہوئے انسانی اعضاء بکھرے ہیں۔ اس کے کانوں میں بدنصیب دستہ سالار بنیاز کی وہ چیخیں گونج رہی تھیں جو اس نے کل شب تین پہر تک سنی تھیں۔ اس کی آہ و پکار فریادیں' التجائیں سب کچھ تابان کے

حافظے میں محفوظ تھا۔ اس گھڑی وہ بے ضرر سا تابان کسی گمنام اندھیرے میں چھپ گیا تھا اس کی جگہ ایک سفاک بے رحم شخص نے لے لی تھی۔ یہ شخص موت کا کھلاڑی تھا۔ قضا کی بساط پر خود کو زندہ رکھنا اور دشمن کو مار دینا ہی اس کا نصب العین تھا۔۔۔۔۔۔ تابان کے قاتل تیر سے ڈر کر دو مزید افراد نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ان میں امیر ارژنگ کا سگا بھائی اور ہیلی کارنیس کا نائب ناظم امیر اعراس بھی تھا۔ اب ارژنگ اور اس کے باپ کے علاوہ صرف ایک شخص زندہ بچا تھا۔ یہ وہی کارندہ تھا جس نے بارش کے دوران امیر ارژنگ کے سر پر چھاتے کا سایہ کئے رکھا تھا۔۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ نیچے چھلانگ لگانے والوں میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔ لہذا اس کی باری آئی تو وہ اوندھے منہ زمین پر گر گیا اور زور زور سے رونے لگا۔ یہ گویا اپنی لاش پر ماتم کناں ہونے کے مترادف تھا۔ تابان نے آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں میں زوردار ٹھوکر لگائی۔

"چھلانگ لگاؤ۔" وہ غیر انسانی آواز میں دھاڑا۔

بدقسمت طہرامی چیخ کر سیدھا ہو گیا۔ ٹھوکر شدید تھی وہ درد سے کراہنے لگا تابان اپنی کمان کا زہ کھینچ چکا تھا۔ وزنی تیر کا رخ طہرامی کے سر کی طرف تھا۔ دفعتاً تابان کی نگاہ اس کے ادھ

کھلے گریبان پر پڑی اور وہ چونک سا گیا۔ اس کے سینے پر کوئی چیز چمک رہی تھی۔ یہ ایک انگوٹھی تھی جسے سیاہ دھاگے میں پرو کر گلے میں آویزاں کر لیا گیا تھا۔ تابان نے جھک کر بڑے غور سے اس طلائی انگوٹھی کو دیکھا۔ اور اس کی رگوں میں خون کی گردش انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ اس بیضوی انگوٹھی کو پہچانتا تھا۔ ایسی ہی ایک انگوٹھی تابان نے اس دوشیزہ کی حنائی انگلی میں دیکھی تھی جو اس روئے زمین پر تابان کے لئے محبوب ترین تھی۔ جس کے تصور سے تابان کی راتیں مہکتی تھیں اور جس کی خوشبو سے اس کے دن سنورتے تھے۔ وہ اس انگوٹھی کو اور اس کی مالکہ کو کیسے بھول سکتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ یہ مارشا کی انگوٹھی تھی۔ تابان نے کمان پھینک کر دونوں ہاتھوں سے طہرامی کا گریبان تھاما اور ایک جھٹکے سے اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی بے قراری تھی۔ وہ انگوٹھی کو گھورتے ہوئے لرزاں آواز میں بولا۔

"یہ انگشتری تم نے کہاں سے لی تھی؟"

طہرامی نے چکراتے ہوئے انداز میں انگوٹھی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "یہ۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ مجھے راستے میں ملی تھی۔"

"بکومت!" تابان کا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر کھڈے کے کنارے پہنچ گیا۔ "بتاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ کب اور کہاں ملی یہ انگوٹھی؟"

ایک ہی تھپڑ میں طھرامی راہ راست پر آگیا۔ وہ ہکلا کر بولا۔ "یہ۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ مجھے۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک لڑکی نے دی تھی۔"

"کون لڑکی؟"

"یونانی لڑکی۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔۔۔۔ بڑی مصیبت میں گرفتار تھی۔ میں نے اس کی مدد کی تھی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"کوئی ڈیڑھ برس پہلے کی۔"

تابان چند لمحے خاموش رہا۔ اس کی سوچتی ہوئی نگاہیں طھرامی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ آخر وہ گھمبیر آواز میں بولا۔ "تمہاری جان بچ سکتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اگر تم اس انگوٹھی کے بارے سب کچھ صاف صاف اگل دو۔"

"میں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ جو مجھے معلوم ہے میں بتا دیتا ہوں۔ مجھے زیوس دیوتا کی قسم۔ اپنے معصوم بچوں کی قسم۔۔۔۔۔۔۔۔ میں کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔" طھرامی کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ موت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں زندگی کی کرن دیکھ کر سرتاپا فریاد والتجا بن گیا تھا۔ تابان اسے کچھ دیر ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے ہوشمند کو اشارہ کیا۔ ہوشمند آگے بڑھا اور اس نے طھرامی کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ ارژنگ اور اس کا باپ اپنی جگہ ساکت وجامد کھڑے تھے۔ چہروں پر موت کی زردی تھی۔ وہ کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ سفاکی، خونریزی اور بے رحمی میں ان کا نام تھا۔ ان کا خاندان اپنے دشمن کو ڈھونڈ کر نیست ونابود کرنے میں شہرت رکھتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اس وقت انہوں نے سفاکی اور ہلاکت کا جو مظاہرہ دیکھا تھا وہ انہیں مبہوت کر گیا تھا۔ اپنے نام ونسب کے گھمنڈ میں دوسروں پر قہر توڑنے والوں کو اپنی موت یقینی نظر آنے لگی تھی تو ان کے تیور قابل رحم ہو گئے تھے۔

تابان نے تلوار کی نوک منحنی بوڑھے کی گردن پر رکھی اور پھنکارا۔ "جاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے، مجھے تمہاری پیرانہ سالی پر ترس آرہا ہے۔"

بوڑھے نے سوالیہ نظروں سے تابان کی طرف دیکھا۔ "کیا تم ہم دونوں کو چھوڑ رہے ہو؟" اس کا اشارہ بیٹے کی طرف تھا۔

"ہاں۔" تابان نے جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟ ہم پہ یہ مہربانی کس لیے؟"

"اس لیے کہ تم اپنے لواحقین کے سامنے جا کر انہیں اپنی بربادی کی داستان سنا سکو۔ انہیں بتا سکو کہ تم اپنے دونوں شجاع بیٹوں کو ایک "غلام زادے" کے ہاتھوں کھو آئے ہو۔ مجھے یقین ہے امیر ارژنگ اور امیر اعراس کے بغیر جب تم مخبوط الحواس عورت کی طرح لڑھکتے ہوئے اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں پہنچو گے تو بڑا دلچسپ منظر ہو گا۔"

"کیا مطلب؟" بوڑھا کراہا۔ "تم۔۔۔۔۔۔۔ تم ارژنگ کو چھوڑنے کا وعدہ کر چکے ہو۔"

تابان بولا۔ "چھوڑنے کا وعدہ کیا ہے۔ ساتھ بھیجنے کا نہیں کیا۔ یہ برفانی ٹٹو میرے ساتھ جائے گا۔۔۔۔۔۔۔ اگر میرے بعد یہاں افشاندہ کے ساتھ کچھ ہوا تو اس ٹٹو کی موت سالار بنیاز کی موت سے کہیں دردناک ہو گی۔"

بوڑھا منہ کھول کر رہ گیا۔ ارژنگ اب تک بہت مشکل سے برداشت کر رہا تھا۔ یہ بے بسی کی انتہا تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے جاں نثار ساتھی حسرت ناک موت سے دوچار ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اس کا نوجوان سگا بھائی چوٹی سے کود کر پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ وہ خود مجرم کی طرح کھڑا تھا اور باپ کے سامنے "برفانی ٹٹو" جیسے خطابات سے نوازا جا رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ جیسے غصے سے پاگل ہو گیا۔ اس نے تڑپ کر تابان پر حملہ کرنا چاہا لیکن عقب میں کھڑا رضا کار پوری طرح چوکس تھا۔ اس نے اپنی کمان ارژنگ کی گردن میں ڈالی اور اسے پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔ وہ توازن کھو کر پتھروں پر گرا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ لہٰذا چہرہ زمین سے ٹکرایا اور لہولہان ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

غار میں پہنچ کر تابان اور ہوشمند نے سب سے پہلے لاشوں کو ٹھکانے لگایا۔ دستہ سالار بنیاز سمیت یہ پانچ لاشیں تھیں۔ بنیاز کے علاوہ باقی ساری لاشیں اٹھا کر تاریک درختوں میں پھینک دی گئیں۔ بنیاز کی لاش کو دو کمبلوں میں لپیٹ کر ایک توانا گھوڑے پر رکھ دیا گیا۔ ہوشمند نے اپنے تینوں ساتھیوں سے کہا کہ وہ اس لاش کے ساتھ پڑاؤ میں پہنچ جائیں اور

سالار اعظم یا کسی دوسرے ذمہ دار سالار سے ملاقات کر کے تمام حالات تفصیل سے بتائیں۔ تابان نے انہیں سالار اعظم کے نام ایک خط بھی تحریر کر دیا۔

یہ لوگ رخصت ہو گئے تو تابان اور ہوشمند نے خود بھی رختِ سفر باندھا۔ تابان نے ہوشمند کو ضروری تفصیلات بتادی تھیں اور اسے سمجھادیا تھا کہ ان کا جلد از جلد روانہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ وہ جتنی دیر کریں گے کاہن خاتام ان سے اتنا ہی دور چلا جائے گا اور جوں جوں یہ فاصلہ بڑھے گا شہزادی مارشا کا کھوج بھی معدوم تر ہوتا چلا جائے گا۔ تابان نے امیر ارژنگ کو نیچے گرا کر اس کی ٹانگیں باندھنا شروع کیں تو وہ بری طرح گرجنے برسنے لگا۔ تابان کے کان پر جُوں تک نہیں رینگی۔ امیر کے ہاتھ پہلے سے بندھے ہوئے تھے۔ تابان نے اسے کندھے پر اٹھا کر اوندھے منہ ایک گھوڑے پر پٹخ دیا۔ مزید احتیاط کے طور پر ایک رسی کے ذریعے اسے زین سے کس دیا گیا۔ تابان کی ہدایت پر ہوشمند نے چھتری بردار ملازم کے ہاتھ کھول کر اسے سواری کے لیے گھوڑا دے دیا مگر گھوڑے کی لگام اس گھوڑے کی زین سے منسلک کر دی جس پر تابان کو سوار ہونا تھا۔ تابان نے ہلاک شدگان کے گھوڑوں میں سے صرف ایک صحت مند گھوڑا رکھا باقی کو تاریک درختوں میں تتر بتر کر دیا۔ اس کے بعد منخنی

بوڑھے کے ہاتھ کھول دیئے گئے۔ وہ خوف اور غصے سے لرز رہا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ کچھ کر نہیں سکتا۔ اس کا ایک بیٹا ہلاک ہو چکا تھا جبکہ دوسرا آنکھوں کے سامنے نامعلوم اندھیرے میں کھو رہا تھا۔ معلوم نہیں اسے واپس لوٹنا نصیب ہونا تھا یا نہیں۔ بوڑھا طہرامی جو بڑے چاؤ سے تابان کا انجام دیکھنے کے لیے یہاں پہنچا تھا، حسرت والم کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اس ویرانے میں اس کا واسطہ ایک ایسے شخص سے پڑ گیا تھا جو سفاکی اور عداوت پروری میں اس کے سورما بیٹوں سے کہیں بڑھ کر تھا۔

گھوڑوں کو ایڑ لگنے سے پہلے تابان کی پاٹ دار آواز تاریک ویرانے میں گونجی۔ "میری بات یاد رکھنا طہرامی! اگر افشاندہ یا اس کے بچوں کو کوئی گزند پہنچا تو تیرے گھرانے کا یہ آخری بدبودار چراغ بھی بجھا ڈالوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" اس کی آواز پہاڑیوں میں گونجی پھر گھوڑوں کو ایڑ لگی اور وہ تلملاتے ہوئے بوڑھے کو چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

جیسا کہ تابان جانتا تھا خاتام اوراز بک شمال مشرق کی طرف گئے تھے۔ راستے میں ملنے والے کچھ شواہد سے بھی اندازہ ہوا کہ انہوں نے اسی رخ پر سفر جاری رکھا ہے۔ راستہ دشوار گزار تھا لیکن تابان اور ہوشمند نے ایک پل کے لیے بھی قیام نہیں کیا۔ یہاں تک کہ مسلسل چھ

پہر سفر میں رہنے کے بعد گھوڑوں کی ٹانگیں جواب دے گئیں اور وہ ڈگمانے لگے۔ مجبوراً انہیں ایک چھوٹے سے کارواں سرائے میں اترنا پڑا۔ ویران پہاڑوں میں یہ سرائے ایک ادھیڑ عمر عورت اور اس کے نابینا شوہر کا تھا۔ ایک ندی کے کنارے لکڑی کے چند ڈربہ نما کمرے تھے۔ تاہم ان کمروں میں مسافر کی ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کے لیے سبز چارہ اور بیمار مسافروں کے لیے جڑی بوٹیوں کے مرکبات بھی موجود تھے۔ کھانا کھاتے ہی ہوشمند اور ارژنگ پیال کے بستر پر خراٹے لینے لگے لیکن تابان جاگتا رہا اور چھتری بردار ملازم جالی کو لے کر ایک کونے میں جا بیٹھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ جلد از جلد جالی کے گلے میں آویزاں انگوٹھی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اسے اس انگوٹھی کی چمک میں مارشا کے بیتے دنوں کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ معلوم نہیں کل سے اب تک اس نے کیسے صبر کر رکھا تھا۔ اب سفر کا سلسلہ منقطع ہوا تھا تو وہ جالی کے ہونٹوں سے کچھ سننے کے لیے بے تاب ہو گیا تھا۔

سرائے کی چوبی دیواروں سے باہر تاریک جنگل کی بھول بھلیوں میں یخ بستہ ہوا سرسرا رہی تھی۔ جالی ایک موٹا کمبل اوڑھے تابان کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں چراغ کی ٹمٹماتی لو پر

تھیں اور خوابناک انداز میں متحرک تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "وہ بہت حسین لڑکی تھی۔ اتنی حسین کہ آنکھوں کو بھروسہ نہیں ہوتا تھا۔ اس سے بھی حسین اس کا اخلاق اور رکھ رکھاؤ تھا۔ یقینا وہ کوئی دیوی تھی جو انسانی قالب میں ڈھل کر اس زمین پر اتر آئی تھی۔ وہ ایتھنز کی رہنے والی تھی۔ اپنے باپ کا نام غارس زنوب بتاتی تھی اور یہ بھی بتاتی تھی کہ وہ شاہی گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ جب ایتھنز پر مقدونوی سپاہ نے چڑھائی کی اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجی تو شہزادی ایک ایرانی غلام کی مدد سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ غلام کے ساتھ شہر سے باہر نکل آئی اور اخروٹ کے ایک گھنے جنگل میں چھپ گئی لیکن یہاں مقدونوی سپاہیوں کے ایک دستے سے ان کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ جاں نثار غلام بڑی بہادری سے لڑا لیکن مارا گیا یا شدید زخمی ہوا۔ شہزادی مزاحمت کرتی ہوئی گرفتار ہوئی۔

فتح کے نشے میں چُور مقدونوی سپاہی اسے ایک غار میں لے گئے۔ وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح اسے گھور رہے تھے اور پلک جھپکتے میں چیر پھاڑ دینا چاہتے تھے۔ اس ویرانے میں، گھنے درختوں میں گھرے ہوئے اس غار کے اندر، شہزادی کو بچانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ قطعی طور پر بے دست و پا تھی لیکن دیوتاؤں کو اس کی آبرو اور زندگی کی حفاظت مقصود تھی

۔۔۔۔۔۔ بے یار و مددگار ہونے کے باوجود وہ وحشی سپاہیوں کے چنگل سے بچ گئی۔ وہ یہاں شہزادی کی ملکیت کے معاملے میں الجھ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تلواریں نکل آئیں اور دونوں سالاروں کے حمایتی ایک دوسرے پر پُل پڑے۔ کم از کم بیس افراد ہلاک و زخمی ہو گئے جب کہ باقی لڑتے ہوئے درختوں میں تتر بتر ہو گئے۔ شہزادی نے یہ موقع غنیمت جانا اور وہاں سے بھاگ نکلی۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کہاں جائے کس طرف کا رخ کرے۔ وہ دشوار گزار جنگل میں برہنہ پا بھاگتی رہی، آخر دو روز بھٹکنے کے بعد ساحل پر جا نکلی۔ یہاں اسے ایک وفادار یونانی سپاہی مل گیا۔ یہ ادھیڑ عمر شخص شاہی محل کے محافظ دستوں میں شامل تھا اور اب سب کچھ برباد ہونے کے بعد براستہ سمندر ایران کا رخ کر رہا تھا۔ اس وفادار محافظ کا نام غارس تھا۔ یعنی وہی نام جو شہزادی کے والد محترم کا تھا۔ غارس کے پاس پہنچ کر شہزادی پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ غار میں اس کی خاطر لڑنے مرنے والے دستے کے کچھ سپاہی ابھی تک اس کے تعاقب میں ہیں اور ساحل پر جگہ جگہ اس کی بُو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ محافظ غارس نے شہزادی کو آمادہ کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ ہی ایران چلی جائے اور جب تک ایتھنز میں حالات سازگار نہیں ہوتے وہ دونوں کسی ایرانی قصبے میں روپوش رہیں۔ غارس نے شہزادی کو بندرگاہ سے نکالنے کے لیے بڑی مہارت سے اسے ایک

بدصورت بڑھیا کا روپ دے دیا۔ اس کے بال سفید کر دیئے۔ رنگت سیاہ کر دی اور "لیس دار" محلول کے ذریعے اس کے چہرے پر جھریاں ڈال دیں۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں جھک کر چلتی ہوئی جب وہ بادبانی جہاز میں سوار ہوئی کسی کو شبہ تک نہیں ہوا کہ وہ ایک حسین یونانی شہزادی ہے۔ ہوا غیر موافق تھی، اس لیے جہاز کو بحیرہ ایجیئن پار کرتے کرتے پورا ایک دن لگ گیا لیکن جب وہ ساحل کے قریب پہنچ چکے تھے اچانک موسم کے تیور بدل گئے۔ تند و تیز ہوا چلی اور آنا فانا سمندر میں طغیانی نمودار ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ جہاز راں کسی قریبی جزیرے کا رخ کرتے بلند لہروں نے جہاز کو کھلونے کی طرح اٹھانا اور پٹخنا شروع کر دیا۔ جہاز بے سمت ہو گیا اور طوفان کی شدت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ جہاز کسی زیر آب چٹان سے ٹکرا کر ٹکڑے ہو گیا۔ یہ حادثہ ٹرائے کے ساحل سے چند کوس کے فاصلے پر پیش آیا تھا۔ درجنوں مرد و زن پانی میں ڈوب گئے۔ ان میں ادھیڑ عمر محافظ غارس بھی تھا۔ شہزادی نے اپنے آنکھوں کے سامنے اسے زخمی ہوتے اور بے ہوشی کی حالت میں موجوں کا لقمہ بنتے دیکھا۔ صدمے کی شدت سے وہ خود بھی حواس کھو بیٹھی۔ تاہم اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے کھلے لبادے میں ہوا بھر گئی اور وہ ڈوبنے سے محفوظ رہی۔ تند و تیز لہروں نے اسے لمحوں میں ساحل پر لا پھینکا۔ یہ ایک ویران ساحل تھا۔ مچھیروں کی ایک چھوٹی سی بستی

کے سوا یہاں اور کچھ نہیں تھا۔ وہ بستی بھی طوفان کی آمد کے سبب خالی پڑی تھی۔ سمندر کے تیور دیکھتے ہی لوگ اپنے قیمتی سامان کے ساتھ ساحل سے دور بھاگ گئے تھے۔ صرف ایک شخص یہاں موجود تھا۔ وہ ساحلی جنگل سے لکڑیاں کاٹنے یہاں پہنچا ہوا تھا اور اسے طوفان کا خطرہ بھانپنے میں کچھ تاخیر ہو گئی تھی۔ تاہم اب وہ بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہ فرار اختیار کر رہا تھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ ساحل پر پڑی جہاں ایک عورت لہروں پر ڈوب ابھر رہی تھی۔ بڑھئی کچھ دیر سوچتا رہا، طوفانی لہریں کسی بھی لمحے ان درختوں تک پہنچنے والی تھیں عورت کو بچانے کی کوشش میں اسے اپنی زندگی کے لالے پڑ سکتے تھے لیکن یوں ایک انسان کو موت کے منہ میں چھوڑ کر بھاگنا اسے منظور نہ ہوا۔ وہ بھاگتا ہوا ساحل پر پہنچا۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چل کر عورت کو کندھے پر اٹھایا اور دیو ہیکل لہروں کا ایک نیا ریلا پہنچنے سے پہلے پہلے سمندر سے نکل آیا۔ ساحلی جنگل طوفان کی آمد سے کانپ رہا تھا۔ لہریں اچھل اچھل کر درختوں کو ہڑپ رہی تھیں۔۔۔۔۔۔۔اور بڑھئی شہزادی کو کندھے پر اٹھا کر بھاگ رہا تھا۔ اس کے لیے وہ ایک مفلوک الحال بڑھیا تھی۔۔۔۔۔۔۔ لیکن کچھ بھی تھی، ایک انسان تھی۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ ایک انسان کو بچا رہا تھا۔ اس نے بیسیوں اسٹیڈیم کا فاصلہ اسی طرح بھاگتے اور ہانپتے ہوئے طے کیا۔ آخر محفوظ علاقے میں پہنچ گیا۔ اس نے شہزادی کو ایک جگہ لٹا کر اس کے شکم

سے پانی نکالا، اس کے سانسوں کی آمد و رفت بحال کی اور پھر ایک گھوڑا گاڑی میں ڈال کر اسے گھر لے آیا۔ یہاں اس کی بیوی اور چار بچے موجود تھے۔ شہزادی ہوش میں آ کر حیران نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ بڑھئی اور اس کی بیوی کو معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ جان چکے تھے کہ یہ بڑھیا ایک حسین دوشیزہ ہے جس نے کسی سبب یہ بہروپ بھر رکھا ہے۔"

یہاں تک بتا کر جالی نے سر جھکایا اور کھوئی ہوئی نظروں سے گلے میں آویزاں انگوٹھی کو دیکھنے لگا جیسے ڈیڑھ برس پرانی یادوں کو کریدنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "۔۔۔۔۔۔۔وہ بڑھئی میں ہی ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ شہزادی میرے گھر میں قریباً ایک ماہ رہی۔ میں نے اسے سات پردوں میں رکھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دی لیکن اس بے چاری کے ساتھ سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ یہ خوبصورتی سات پردوں میں سے بھی چھلک گئی۔ پڑوس کی ایک عورت نے اسے دیکھ لیا اور بستی بھر میں یہ بات پھیل گئی کہ بڑھئی کے گھر میں ایک حسین لڑکی موجود ہے۔ جلد ہی یہ خبر باجل شیرازی تک بھی پہنچ گئی۔ باجل شیرازی، ٹرائے کے علاقے کا سب سے ثروت مند اور با

رسوخ شخص ہے۔ وہ ماہی گیری کی کشتیاں بنواتا اور فروخت کرتا ہے۔ میرے جیسے کئی بڑھئی اس کے تنخواہ دار ملازم ہیں۔ باجل شیرازی کے بیٹوں میں وہ تمام بدعادتیں موجود ہیں جو امیر اور بارسوخ باپوں کی اولاد میں ہوتی ہیں۔ باجل شیرازی کا سب سے چھوٹا بیٹا بن دیکھے ہی شہزادی پر فریفتہ ہو گیا اور مجھے اپنے راستے پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ لڑکی ایتھنز کے شاہی گھرانے کی فرد ہے اور یہ کوئی معمولی شاہی گھرانہ نہیں ہے۔ اسے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس پر اسے بعد میں پچھتانا پڑے۔ بگڑے امیر زادے کے کان پر جوں تک نہیں رینگی اور وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ ایک روز جب وہ بڑی شان و شوکت سے میرے گھر کی طرف آ رہا تھا، گھوڑے سے گر کر شدید زخمی ہوا اور اس کا زیریں دھڑ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ اس حادثے سے پیشتر ہی کچھ لوگ یہ کہنے لگے تھے کہ یہ لڑکی انسانی شکل میں کوئی دیوی ہے جو بحیرہ ایجیئن کے کسی مقدس جزیرے سے سمندری لہروں پر سوار ہو کر یہاں آئی ہے۔ اس واقعے کے بعد ان کا یقین اور پختہ ہو گیا۔ وہ واشگاف الفاظ میں اسے دیوی کہنے لگے اور اپنے موقف کے حق میں دلیلیں پیش کرنے لگے۔ وہ اس کے منہ سے یونانی زبان کے الفاظ سنتے۔ بیشتر لوگ اس زبان سے آگاہ نہیں تھے لہٰذا وہ اسے الہامی سمجھنے لگے۔

"چھوٹے بیٹے کے بعد باجل شیرازی کے منجھلے بیٹے نے شہزادی پر آنکھ رکھ لی۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ ضد اور ہٹ دھرمی میں ہو رہا تھا۔ باجل کے بیٹے ثابت کرنا چاہتے تھے کہ جسے لوگ مقدس دیوی قرار دے کر عزت اور احترام کا حقدار سمجھ رہے ہیں، وہ کسی یونانی گھرانے کی لاوارث لڑکی ہے اور اس کا مقدر کسی امیر زادے کے بستر کی زینت بننا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بے وطن شہزادی کے گرد ہوس کاروں کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت تھی اور نہ میں اس حیثیت کا مالک تھا کہ اسے اس مصیبت سے بچا سکتا، لہٰذا میں نے بستی کے اتروان (آتش کدے کا محافظ) سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ مجھے دوشیزہ کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں اس پر دیوتاؤں کا سایہ ہے اور دیوتا خود اس کی حفاظت کریں گے۔ میں جا کر آرام سے سو جاؤں۔ باجل شیرازی کے بیٹے مہمان دوشیزہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ میں اتروان کی بات سن کر گھر آ گیا لیکن دل کو سکون نصیب نہیں ہوا۔ میں جانتا تھا آسمانی قوتیں اسی وقت مدد کرتی ہیں جب انسان اپنی مدد آپ کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ اگلے روز میں نے ٹرائے کے ایک اور اتروان سے رابطہ قائم کیا۔ اس نے پوری روئیداد سننے کے بعد میری دلجوئی کی۔ پھر مجھے ایک خواب آور محلول دیا اور کہا کہ میں یہ محلول شہزادی کو پلانے کے بعد اسے ایک صندوق میں بند کروں اور دریائے گرینی کس کی لہروں پر بہا دوں۔

اگر اس پر دیوتاؤں کا سایہ ہے تو وہ کسی نہ کسی مقام پر محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جائے گی ۔۔۔۔۔۔۔ ورنہ اس کی موت اس کی عزت و آبرو کا پردہ بن جائے گی۔۔۔۔۔۔۔ میں نے اسی رات شاہ بلوط کی لکڑی سے ایک صندوق تیار کیا اور خوابیدہ شہزادی کو اس میں لیٹا دیا۔ پھر اس صندوق کو ایک بند گھوڑا گاڑی میں رکھا اور دریائے گرینی کس کے کنارے پہنچ گیا۔ رات کا وہ آخری پہر مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ میری آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ ایک ماہ پہلے میں نے جس جسم کو پانی سے نکالا تھا آج پھر اسے پانی کے حوالے کر رہا تھا۔ میری ساری بھاگ دوڑ، ساری محنت اور کوشش بیکار گئی تھی۔ میرا دل روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اے اجنبی سرزمین کی معزز شہزادی! میں تیری حفاظت کے لائق نہیں تھا، مجھے معاف کر دینا۔ اپنے غریب میزبان کو معاف کر دینا۔" اور پھر میں نے شہزادی کو گرینی کس کے تاریک پانیوں میں بہا دیا۔۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد آج تک مجھے شہزادی کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ زندہ بھی ہے یا نہیں؟"

بات کہتے کہتے جالی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے تھے۔ اس نے کمبل کے کونے سے آنسو پونچھے اور آنکھیں کمرے کی اکلوتی کھڑکی پر گاڑ دیں۔ برفانی ہوا در و دیوار سے سر پٹخ رہی

تھی۔ کچھ جھونکے راہ تلاش کر کے کمرے میں بھی در آتے تھے اور ان کی خنکی سے چراغ کی لو کپکپانے لگی تھی۔

تابان نے پوچھا۔ "تم ٹرائے سے یہاں کیسے پہنچے؟"

جالی بولا۔ "شہزادی کے بعد میرا ٹرائے میں رہنا ناممکن تھا۔ باجل شیرازی کے بیٹے مجھ سے خوفناک انتقام لینا چاہتے تھے۔ میں نے ان کے منہ سے نوالہ چھینا تھا، وہ مجھے معاف کیسے کر سکتے تھے! ایک اندھیری شب میں نے چپکے سے بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور ٹرائے سے نکل آیا۔ ہیلی کارنیس ایک وسیع شہر ہے۔ ایسے شہروں میں کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے بھی باجل شیرازی کے بیٹوں سے بچنے کے لیے ہیلی کارنیس کو چنا۔ وہاں میں بالکل بے آسرا تھا۔ نیا شہر تھا، نئے لوگ، کوئی روزگار بھی نہیں مل رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ امیر ارژنگ، طھرامی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں اور شہر میں ان کا بہت نام ہے۔ میں بھی طھرامی قبیلے کا تھا لہٰذا ملازمت کی آس میں ان کے پاس پہنچ گیا۔"

تابان نے کہا۔ "تم نے ابھی تک اس انگوٹھی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"یہ انگوٹھی مجھے شہزادی نے دی تھی۔" جالی نے جواب دیا۔ "وہ یہ جان کر بے حد حیران ہوئی تھی کہ میں اسے اٹھا کر کئی کوس پیدل چلا ہوں اور میں نے یہ سب کچھ اس وقت کیا جب شہزادی میرے نزدیک شہزادی نہیں تھی بلکہ ایک مفلوک الحال بڑھیا تھی۔ شہزادی میرے اس جذبے سے بہت متاثر تھی۔ اس نے مجھے یہ انگوٹھی دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں اسے اپنے پاس سنبھال کر رکھوں۔ میں جب کبھی بھی ایتھنز جاؤں گا اس انگوٹھی کے سبب مجھے وہاں شاہی مہمان کا درجہ حاصل ہو گا اور ہر طرح کا تعاون ملے گا۔۔۔۔۔۔ یہ انگوٹھی میری کسی بھی انگلی میں نہیں آتی تھی لہٰذا میں نے اسے دھاگے میں پرو کے گلے میں آویزاں کر لیا۔"

کوئی وجہ نہیں تھی کہ تابان، جالی کی باتوں پر یقین نہ کرتا۔ اس نے جو روئیداد سنائی تھی اس کی تصدیق آتش کدے سے ملنے والی چرمی کتاب سے بھی ہو چکی تھی۔ آتش کدے کے سب سے بڑے اتروان روہتاس نے لکھا تھا کہ وہ حسین و جمیل دوشیزہ ایک چوبی صندوق میں بہتی ہوئی ملی تھی اور بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اس کے چہرے پر دیویوں کا سا جاہ و جلال

تھا۔ تابان نے جالی سے پوچھا۔ "تمہارے سوا اور کسے خبر تھی کہ تم نے شہزادی کو دریا میں بہا دیا ہے؟"

جالی بولا۔ "صرف میری بیوی کو یا اس اتروان کو جس نے مجھے مشورہ دیا تھا۔"

"کیا تم نے شہزادی کے ساتھ کوئی ایسی چیز بھی صندوق میں رکھی تھی جس سے اس کی شناخت ہو سکتی، یا یہ معلوم ہو سکتا کہ اسے کیوں بہایا گیا ہے؟"

"ہاں صندوق میں پتھر کا ایک ننھا سا کتبہ رکھا گیا تھا۔ یہ کتبہ مجھے اتروان ہی نے دیا تھا اس پر فارسی میں تحریر کیا تھا۔ "پانیوں کے دیوتا، پوسیڈن کے حوالے۔ جو جانتا ہے کون انسان ہے اور کون انسان سے بالاتر۔ جو انسان سے بالاتر ہے اسکی حفاظت خود حوادث کرتے ہیں ۔۔۔۔۔۔"

تابان انہماک سے جالی کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے لیے اب یہ سمجھنا چنداں مشکل نہیں تھا کہ شہزادی مارشا دریائے گرینی کس سے نکلنے کے بعد ہیلی کارنیس کے عظیم الشان آتش کدے میں کیسے پہنچی اور اسے کیوں اتنی جلدی ایک عالی مرتبت دیوی کے طور پر قبول کر لیا گیا؟ در حقیقت شہزادی کو دیوی کا رتبہ دلانے میں اس کتبے کا بہت عمل دخل تھا جو اتروان

نے اس کے چوبی صندوق میں رکھوایا تھا۔۔۔۔۔۔۔ تابان سپیدہ سحر نمودار ہونے تک جالی سے مصروف گفتگو رہا۔ ایک رات تو کیا وہ ہزار راتیں جالی کی باتیں سنتے ہوئے گزار سکتا تھا۔ ان باتوں کا تعلق مارشا سے تھا۔ اس کے شب و روز سے اس کے حالات سے۔۔۔۔۔۔۔ وہ ان باتوں سے کیونکر اکتا سکتا تھا۔

علی الصبح تابان نے ہوشمند اور امیر ارژنگ کو بھی بیدار کر دیا۔ وہ کھانا کھا کر جلد از جلد نکل جانا چاہتے تھے۔ تابان سرائے کی مالکن کو بیدار کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکلا تو اچانک ٹھٹک گیا۔ سامنے کھلی جگہ پر گھوڑوں کے قریب دو آدمی نظر آرہے تھے، وہ بھی مسافر تھے اور صبح سویرے سرائے سے روانہ ہو رہے تھے۔ تابان ان کی صورتیں دیکھتے ہی تڑپ کر ایک دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس کی یہ کارروائی بروقت تھی، ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوتی تو کاہن خاتام اسے دیکھ چکا تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ کاہن خاتام ہی تھا اور اس کا ساتھی ازبک کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ گھوڑوں پر زین وغیرہ کس رہے تھے اور ساتھ ساتھ گفتگو بھی کر رہے تھے۔ تابان تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ رات بھر کاہن خاتام اور ازبک ان کے اتنا نزدیک رہے ہیں۔ غالباً وہ ساتھ والے کمرے میں مقیم تھے۔ تابان لپک کر واپس کمرے میں آیا۔

ہوشمند، امیر ارژنگ کی بندشیں وغیرہ دیکھ رہا تھا۔ تابان نے اسے کھڑکی کے پاس بلایا۔ پھر کھڑکی کے پٹ تھوڑے سے وا کیے اور ہوشمند سے باہر دیکھنے کو کہا۔ ہوشمند نے گردن لمبی کر کے باہر جھانکا۔ تابان نے غائبانہ تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہی ہے کاہن خاتام اور ساتھ میں اس کا ازبک نامی چیلا ہے۔"

ہوشمند بڑے غور سے باہر دیکھ رہا تھا۔ آخر اس نے کھڑکی بند کی اور سنسنی خیز نظروں سے تابان کی طرف دیکھا۔ "خاتام کے ساتھی کا کیا نام بتایا ہے تم نے؟"

"ازبک!" تابان نے جواب دیا۔

"کیا کرتا ہے یہ شخص؟"

"بس چیلا ہے خاتام کا۔ خاتام نے اسے شاہی کاتبوں میں شامل کرا رکھا ہے۔ خط و کتابت و نامہ و پیام کا کام کرتا ہے۔"

"پھر تم اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" ہوشمند نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس شخص کا نام ازبک نہیں بوز کرت ہے۔ یہ تھسلی کا وہ مشہور و معروف امیر زادہ ہے جس کی شادی شہزادی مارشا سے ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔ میں تمہیں اس کے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔"

تابان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس نے جلدی سے کھڑکی کھول کر دوبارہ باہر جھانکا ۔۔۔۔۔۔ گھوڑے موجود تھے لیکن خاتام اور اس کا ساتھی واپس جا چکے تھے۔ شاید ابھی انہیں کھانا وغیرہ کھانا تھا۔

تابان نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں یقین ہے؟"

"غضب کے بیوقوف ہو تم۔" ہوشمند نے مخصوص انداز میں کہا۔ "مجھے شک ہوتا تو اتنے یقین سے بات کیوں کرتا۔ میں نے اس شخص کو صرف ایک دفعہ دیکھا ہے لیکن بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ بوز کرت ہی ہے۔"

وہیں کھڑے کھڑے تابان کا ذہن دور دراز کی خاک چھاننے لگا۔ اگر یہ شخص تھسلی کا امیر زادہ ہی تھا تو اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ کسی سازش کے تحت سکندر کی فوج میں ملازم ہوا تھا۔ اب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا اور خاتام کے ساتھ اس مقام

کی طرف رواں تھا جہاں مارشا موجود تھی۔ رقابت کی آگ سے تابان کا تن بدن سلگ اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ ابھی جائے اور اس بہروپیے کے ایک ہزار ٹکڑے کر کے ان پہاڑوں میں بکھیر دے۔ اسے کیا حق تھا مارشا کو ڈھونڈنے کا، اس کے بارے میں سوچنے کا، اس کا نام زبان پر لانے کا، کوئی حق نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ کسی کا کوئی حق نہیں تھا۔ مارشا اب اس کی تھی، اسی کو زیب دیتا تھا کہ اس کے لیے رستوں کی خاک چھانے، دربدر بھٹکے، جنگ و جدال کرے اور خاک و خون میں لوٹے۔

کھڑکی پھر خود بخود کھل گئی تھی۔ ادھ کھلی کھڑکی میں سے تابان کی نگاہیں خاتام اور ازبک کے گھوڑوں پر مرکوز تھیں۔ وہ خالی نظروں سے ان گھوڑوں کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ دفعتاً ان نگاہوں کا خالی پن ایک تیز روشنی سے بھر گیا۔ تابان کے ذہن میں کوئی نئی بات آئی تھی۔ اس نے بڑے غور سے ان خرجینوں کی طرف دیکھا جو دونوں گھوڑوں کے دونوں جانب لٹکی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے ہوشمند کی طرف رخ کیا اور بولا۔

"ہوشمند۔۔۔۔۔۔ بوز کرت تمہیں پہچانتا ہے؟"

"نہیں۔" ہوشمند نے پورے وثوق سے جواب دیا۔

"خاتام بھی نہیں جانتا۔" تابان نے تیزی سے کہا۔ "تم جا کر دیکھ سکتے ہو کہ وہ دونوں اس وقت کیا کر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ اگر۔۔۔۔۔۔ اگر وہ کھانے میں مشغول ہیں تو میں بوزکرت کے سامان کی تلاشی لے سکتا ہوں۔۔۔۔۔۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"خیال تو بڑے غضب کا ہے۔" ہوشمند کی آنکھیں بھی چمک اٹھیں۔ "لیکن۔۔۔۔۔۔ لیکن ان دونوں برفانی ٹٹوؤں کا کیا کرو گے؟" اس کا اشارہ جالی اور امیر ارژنگ کی طرف تھا۔ وہ بے حد دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے اور جالی اور امیر اس گفتگو سے بے خبر تھے۔

تابان نے کہا۔ "جالی کی طرف سے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔۔ میں ارژنگ کے منہ میں تمہارے موزے ٹھونس دیتا ہوں۔ زیادہ بدبودار تو نہیں ہیں؟"

"اس کے منہ سے نکل کر ہو جائیں گے۔" ہوشمند مسکرایا۔

تابان نے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے، تم جاؤ۔۔۔۔۔۔ ذرا جائزہ لو ان کا اور آکر مجھے بتاؤ کہ کیا کر رہے ہیں؟"

ہوشمند نے کہا۔ "کھانے پر غضب ڈھا رہے ہوں گے اور اس وقت کیا کرنا ہے انہوں نے؟" پھر اس نے پیش قبض کمر سے لگائی۔ منہ، سر اونی کمبل میں لپیٹا اور باہر نکل گیا۔ اس کی چال میں ہمیشہ کی طرح چستی اور امنگ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کچھ دیر بعد ہوشمند نے واپس آکر اطلاع دی کہ کاہن خاتام اور بوزکرت سرائے کے نعمت خانے میں ہیں اور کھانا کھا رہے ہیں۔

تابان نے کہا۔ "تم ان پر نگاہ رکھو، میں باہر جا رہا ہوں۔"

تابان کی بات سمجھتے ہوئے ہوشمند نعمت خانے کی جانب چلا گیا۔ تابان تیزی سے باہر آیا اور ان خرجینوں کی تلاشی لینے لگا جو بوزکرت کے گھوڑے سے جھول رہی تھی۔ ان میں خشک راشن تھا۔ دو جوڑے کپڑوں کے تھے، کچھ رسیاں تھیں، شراب کی ایک بوتل، دو گرم ٹوپیاں، ایک ترکش، تلوار کا ایک اکھڑا ہوا دستہ اور اسی طرح کی کئی ایک اشیاء تھیں۔ تابان کو چرمی کاغذوں کا ایک چھوٹا سا پلندہ نظر آیا۔ اسے گول لپیٹا گیا تھا۔ تابان نے دیکھا، ان چرمی کاغذوں میں دو نقشے اور کچھ خطوط تھے۔ اس نے دھیان سے دیکھا نقشوں پر کہیں نشان وغیرہ

نہیں لگائے گئے تھے۔ خطوط میں سے چند پر تھسلی کی مہر لگی ہوئی تھی، یہ خط بوز کرت کے اہل خانہ کی طرف سے تھے لیکن ایک خط تھسلی کی بجائے دمشق سے آیا تھا اور اسے لکھنے والی کوئی عورت تھی۔ تابان اس خط کو دیکھ کر چونکا۔ دمشق سے آنے والا یہ خط یونانی زبان میں تھا اور یہی امر تابان کے لیے زیادہ حیرت کا باعث تھا۔ اس نے جلدی جلدی خط کے مضمون پر نگاہ دوڑائی۔ جوں جوں وہ پڑھتا گیا اس کی آنکھیں پھیلی گئیں اور رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہوتی گئی۔ لکھا تھا۔

"سالار اعظم سکندر مقدونوی کے نام۔۔۔۔۔۔۔ یونان کی ایک بیٹی کا پیغام

"سالار اعظم! ہم ایتھنز کے رہنے والے ہیں، ہمارا نام مارشا ہے اور ہم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج سے قریباً دو برس پہلے مقدونوی فوج نے ایتھنز پر حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کر دیا۔ ایتھنز کی سینکڑوں خواتین کی طرح ہم بھی اپنی آبرو اور جان کی حفاظت کے لیے شہر چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ ہمارے ساتھ ایک غلام تھا جو ہماری حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا یا شدید زخمی ہو کر گرفتار ہوا۔ ایک وفادار یونانی سپاہی کی مدد سے ہم ایران سے ساحل سے پہنچے لیکن یہاں سمندری طوفان کے سبب ہمارا جہاز تباہ ہوا اور ایک ایرانی بڑھئی نے ہماری جان بچائی۔ اس ایرانی بڑھئی نے بڑی حفاظت سے ہمیں اپنے گھر میں رکھا لیکن ہمیں یہاں بھی تا دیر پناہ نہیں مل سکی۔ ہم کئی مشکل مراحل سے گزر کر ہیلی کارنیس کے سب سے بڑے آتش کدے میں پہنچ گئے۔ آتش کدے کے پجاریوں نے ہمیں کسی ناہید دیوی کا پرتو قرار دیا اور ایک زندہ مورتی کی طرح اپنے معبد میں سجا لیا۔ یہ عظیم الشان معبد ہمارے لیے ایک طلائی پنجرے سے کم نہیں تھا۔ ہم اس میں پھڑ پھڑا تو سکتے تھے لیکن اس کی دیواریں توڑ کر باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ان گنت شب و روز ہم نے قید اور غریب الوطنی کے کرب میں گزار دیئے۔ پھر ایک روز ہمارے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ سکندر مقدونوی جواب متحدہ جمیعت یونان کا سالار اعظم ہے، ہیلی کارنیس کا محاصرہ کر چکا ہے۔ اس خبر سے ہمارے دل میں امید کی شمع روشن ہوئی۔ ہماری آنکھوں میں آزادی کے خواب سجنے لگے۔ ہم شب و روز دعا کرنے لگے کہ شہر فتح ہو جمیعت یونان کے سپاہی دندناتے ہوئے اس عبادت گاہ میں گھس آئیں اور ہمیں ایرانیوں کے چنگل سے نکال لیں۔۔۔۔۔۔۔ محصور فوج کو شکست ہوئی شہر بھی فتح ہوا لیکن ہماری تمام امیدیں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ یونانی فوج کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی آتش کدے کے پجاری ہمیں وہاں سے نکال لے گئے۔

"سالار اعظم! اب ہم دمشق میں ہیں۔ ہمیں ایک بہت بڑے آتش کدے میں زندہ مورتی کی طرح سجا دیا گیا ہے۔ یہ آتش کدہ شہر کے شمال میں ایک بلند مقام پر واقع ہے۔ ہمارے گرد بلند و بالا دیواریں ہیں جن کے اندر سے روشنی پھوٹتی ہے۔ ریشم و کمخواب کے دبیز پردے ہیں، یہاں لوبان سلگتی ہے اور زعفران کی مٹھیاں بھر بھر کر آگ میں پھینکی جاتی ہیں۔ عجیب و غریب لوگ ہمارے ارد گرد سجدہ ریز رہتے ہیں اور ان سے بھی بڑھ کر عجیب لوگ وہ ہیں جو ہر وقت ہمیں اپنے حصار میں رکھتے ہیں۔ اس ناقابل شکست حصار میں ہمارا دم گھٹ رہا ہے۔ اگر یہ سب کچھ جوں کا توں رہا تو شاہد ہم زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکیں۔ یہاں پُراسرار آنکھیں ہر وقت ہم پر نگران رہتی ہیں۔ ہم نے یہ خط بہت دشواری سے لکھا ہے اور ایک یونانی غلام کے ذریعے آپ کو ارسال کر رہے ہیں۔ دیوتا کریں یہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔۔۔۔۔۔ سالار اعظم۔۔۔۔۔۔ اب آپ صرف مقدونیہ کے نہیں متحدہ یونان کے سالار ہیں۔ یونان کی ایک بے آسرا بیٹی نے آپ تک اپنی فریاد پہنچا دی ہے۔۔۔۔۔۔ وہ مذہبی جنونیوں کے چنگل میں آپ کی منتظر ہے اور آخری سانس تک رہے گی۔۔۔۔۔۔"

تابان کا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ خط ختم کرتے کرتے وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ یہ خط جو مارشا نے دمشق کے کسی معبد سے لکھا تھا سالار اعظم سکندر تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ یہ خط سکندر تک پہنچانے کا ذمے دار ازبک یعنی بوز کرت تھا۔ وہ خط و کتابت کے شعبے میں تھا اور شاہی خطوط کو چھانٹنے اور ترتیب دینے کا کام جن دو افراد کے سپرد تھا ان میں سے ایک بوز کرت تھا۔ اس نے اپنی سابقہ منگیتر کا خط موصول ہوتے ہی دمشق کا رخ کر لیا تھا اور اب کاہن خاتام کے ہمراہ عازم سفر تھا۔ تابان کے سینے میں لو دیتی ہوئی رقابت کی آگ ایک دم بھڑک کر الاؤ بن گئی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ایک فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ جتنا فوری تھا اتنا ہی برمحل بھی تھا۔ اس نے خط اپنی صدری میں رکھا۔ کمرے کے دریچے میں سے ایرانی بڑھئی جالی باہر جھانک رہا تھا۔ تابان نے اسے اشارہ کیا کہ وہ ہوشمند اور ارژنگ کو لے کر فورا باہر آ جائے۔ جالی نے اس حکم کی تعمیل کی۔ ذرا ہی دیر بعد ہوشمند امیر ارژنگ کو کندھے پر لادے باہر نکلا۔ ساتھ ساتھ جالی آ رہا تھا۔ انہوں نے جلدی جلدی گھوڑے سنبھالے تابان نے بوز کرت اور خاتام کے گھوڑوں کی راسیں کھول کر اپنے ہاتھ میں لے لیں۔۔۔۔۔۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب جنگل میں روپوش ہو گئے۔

انہوں نے شام تک تیز رفتاری سے سفر کیا اور سرائے سے قریباً ایک منزل کی دوری پر پہنچ گئے۔ یہاں مختصر وقفے کے لیے ٹھہر کر انہوں نے کھانا وغیرہ کھایا اور ایک بار پھر گھوڑوں کی پیٹھ سنبھال لی۔ اس دفعہ دو تھکے ہوئے گھوڑوں کی جگہ خاتام اور بوزکرت کے گھوڑے استعمال کیے گئے۔ تابان کو یقین تھا کہ خاتام اور بوزکرت بوکھلاہٹ میں ناچ کر رہ گئے ہوں گے۔ نہ صرف یہ کہ وہ سواری کے جانوروں سے محروم ہوئے تھے بلکہ رخت سفر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ یقینی بات تھی کہ وہ ایک دو دن تو گمشدہ گھوڑوں کو ڈھونڈنے میں گزار دیں گے۔ پھر تھک ہار کر بیٹھیں گے اور متبادل انتظام کا سوچیں گے۔ رخت سفر تو وہ کسی نہ کسی طرح جمع کر ہی لیں گے لیکن اس ویرانے میں سواری کا بندوبست کرنا آسان نہیں ہوگا۔ شاید انہیں کسی مسافر سے زبردستی کرنا پڑے یا پھر کسی بستی میں پیدل پہنچ کر وہاں سے گھوڑے خریدنا پڑیں۔ درحقیقت تابان ان دونوں کو گوناگوں مسائل میں یہ گھرا چھوڑ آیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تابان اپنے ساتھیوں کے ساتھ حتی المقدور رفتار سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ شب کو ایک مختصر وقفے کے لیے آرام کرتے۔ اب ان کے سامنے جنوبی حصوں کی زمینیں تھیں۔ راستہ دشوار گزار تھا۔ گھاٹیوں اور درختوں سے اٹا ہوا اور پیچ در پیچ۔ بعض مقامات پر گزرگاہ اتنی تنگ تھی کہ اس میں سے بمشکل ایک گھوڑا گاڑی گزر سکتی تھی۔ تابان اس فکر میں غلطاں آگے بڑھ رہا تھا کہ چند روز بعد جب سکندر اپنے لاؤ لشکر اور بھاری گاڑیوں کے ساتھ یہاں سے گزرے گا تو اسے کسی قدر دشواری پیش آئے گی۔ تابان اور اس کے ساتھی جلد ہی میدانی علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں زمین کا رنگ سرخی مائل تھا اور ہر طرف گرد و غبار دکھائی دیتا تھا۔ کہیں کہیں گرم علاقوں میں پائے جانے والے درختوں کے جھنڈ بھی نظر آتے تھے، اب ان کے سامنے ایک جانب سیاہی مائل پہاڑ تھے جن کی چوٹیاں برف پوش تھیں اور موسم گرما میں بھی ان کے اندر برفانی ہوا چل رہی تھی جبکہ سامنے وہ میدان پھیلا ہوا تھا جسے انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ راہگیروں سے اس علاقے کا نام باب سیلشیا معلوم ہوا۔ تابان اور ہوشمند رستے میں پڑنے والی ایرانی فوجی چوکیوں سے کترا کر سفر کر رہے تھے لیکن ایک شام ان کا سامنا ایرانی سپاہیوں سے ہو ہی گیا۔ یہ چوکی ایک غیر معروف راستے پر واقع تھی اور یوں بھی درختوں کی اوٹ میں تھی۔ تابان اور ہوشمند کو اس وقت علم ہوا جب انہوں نے ایرانی

سپاہیوں کو ناکہ بندی کیے دیکھا۔ اب بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ وہ واپس بھی نہیں لوٹ سکتے تھے۔ ایرانی سپاہی قریباً سو قدم دور تھے ان کی تعداد خاصی تھی۔ تابان اور ہوشمند بھاگنے کی کوشش کرتے تو پکڑا جانا لازمی تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اب گھوڑوں کو رواں رکھا جائے۔ تابان کے علاقہ ہوشمند اور جالی بھی مقامی لباس میں تھے۔ جالی فارسی روانی سے بول سکتا تھا جبکہ ہوشمند اور تابان بھی اس قابل تھے کہ مختصر سوالوں کے مختصر جواب دے سکیں۔ اصل مسئلہ امیر ارژنگ کا تھا۔ اس کی مشکیں کسی ہوئی تھیں اور وہ خواب آور دوا کے زیر اثر گھوڑے پر اوندھا پڑا تھا۔ اسے گھوڑے کی پشت پر سیدھا رکھنے کے لیے زین کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ سپاہیوں کو ارژنگ کے سلسلے میں مطمئن کرنا خاصا دشوار کام تھا۔ بہر طور اب اس مشکل سے تو گزرنا ہی تھا۔ تابان اور ہوشمند جالی کے پیچھے پیچھے گھوڑوں کو دلکی چال چلاتے رہے آخر ناکہ بندی پر پہنچ گئے۔ ایک زرہ پوش ایرانی سالار آگے آیا۔ اس نے تیز نظروں سے تینوں کو سر تا پا گھورا اور پھر جالی سے سوال وجواب کرنے لگا۔ جالی نے مناسب جوابات دیئے۔ تابان اور ہوشمند کو امید پیدا ہونے لگی کہ شاید وہ عافیت سے گزر جائیں لیکن اچانک ایک سپاہی امیر ارژنگ کی طرف بڑھا۔ سپاہی کے بال لمبے اور کانوں میں دھات کے باریک چھلے چمک رہے تھے۔۔۔۔۔۔ وہ طھرامی قبیلے سے تھا۔ پلک جھپکتے میں اس نے امیر ارژنگ کو پہچان لیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت آمیز طیش دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے سالار کی طرف جھک کر اس نے کان میں کھسر پھسر کی۔ پلک جھپکتے میں ایک درجن تلواریں نیاموں سے باہر نکل آئیں۔

"بھاگو!" تابان نے چلا کر کہا اور اپنے سامنے کھڑے دستہ سالار پر گھوڑا چڑھا دیا۔ دستہ سالار گھوڑے تلے روندا گیا جبکہ اس کے دائیں پہلو پر کھڑا برچھی بردار تابان کی قاتل تلوار کا لقمہ بنا۔ بجلی سی لپکی اور اس کا سر شانوں سے اچھل کر دور جا گرا۔ دوسری طرف ہوشمند نے بھی گھوڑا دو زرہ پوش کے درمیان سے یوں گزارا کہ وہ دھکے سے پتھریلی زمین پر گر گئے۔ جالی اور امیر ارژنگ کے گھوڑے بھی ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے۔ چند لمحوں کے لیے یوں لگا جیسے تابان اور اس کے ساتھی یہ ناکہ توڑ کر نکل جائیں گے مگر پھر ایک تیر سب سے پچھلے گھوڑے کی ٹانگ پر لگا۔ اس پر امیر ارژنگ لدا ہوا تھا۔ گھوڑا لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ ارژنگ کو سنبھالنے والی رسیاں ٹوٹ گئیں اور وہ لڑھک کر پتھریلی زمین پر جا گرا۔ ابھی تابان اور ہوشمند یہ منظر دیکھ ہی رہے تھے کہ پہلو کی ترائی سے درجنوں گھوڑوں کے سر نمودار ہوئے۔ تابان اور ہوشمند نے اپنے روبرو ایک زرہ پوش ایرانی رسالہ دیکھا۔ اب

بھاگنے کی کوشش بے سود تھی۔ وہ تین اطراف سے گھر چکے تھے اور انہیں گھیرنے والے تعداد میں ان سے کہیں زیادہ تھے۔

"تلواریں پھینک دو۔" دستہ سالار نے گرج دار آواز میں کہا۔

تابان، ہوشمند اور جالی نے تلواریں پتھریلی زمین پر پھینک دیں۔ دستہ سالار آگے بڑھا۔ آہنی خود کے اندر سے اس کی آنکھیں بغور تابان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ تابان کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ تابان کی نگاہیں سالار کے تلوار بدست بازو پر جمی تھیں۔ وہ کسی بھی حملے سے خود کو بچانے کے لیے پوری طرح چوکس تھا۔ سالار نے تابان کے سامنے پہنچ کر اپنا خود اتار دیا۔ تابان دیکھتا رہ گیا۔ اس کے سامنے آتش کدے کا منتظم اعلیٰ روہتاس کھڑا تھا۔ وہی پجاری جو آگ کی پوجا کرتا کرتا ایک زندہ دیوی کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا اور پھر بدنامی و رسوائی کے خوف سے خودکشی کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔ تابان سے اس کی آخری ملاقات آتش کدے کی ویران سیڑھیوں پر ہوئی تھی۔ تابان کو اس کے الفاظ ابھی تک یاد تھے۔ اس نے کہا تھا۔ "جب کوئی شخص اپنی جان لینے کی سوچ لیتا ہے تو اکثر تقدیر بھی اس کے راستے سے ہٹ جاتی ہے۔ میں شہر میں گشت کرتے ہوئے کسی بھی مقدونوی دستے پر ٹوٹ پڑوں گا اور لڑتے ہوئے جان دے دوں گا۔" لیکن آج قریباً تین ماہ گزر جانے کے بعد وہ تابان کے سامنے زندہ و سلامت کھڑا تھا۔ نہ صرف زندہ تھا بلکہ زندگی سے بھرپور نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے کے بال صاف تھے۔ سر کے بال سلیقے سے ترشے ہوئے تھے۔ جسم پر فوجی وردی تھی اور وہ کسی جواں سال سپاہی کی طرح سینہ تانے تابان کے سامنے کھڑا تھا۔

"آپ یہاں؟" تابان نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں، تم نے ٹھیک پہچانا ہے۔" روہتاس کا لہجہ غیر جذباتی تھا۔ اس کے حکم پر تابان کو گری ہوئی تلوار واپس تھما دی گئی پھر روہتاس ان تینوں کو لے کر چوکی کی طرف بڑھا۔ چوکی کے قریب ہی چھوٹا سا پڑاؤ تھا۔ گھنے درختوں کے نیچے خیمے ایستادہ تھے اور چھکڑے وغیرہ کھڑے تھے۔

اب شام ہونے والی تھی۔ روہتاس کے اونی خیمے میں شمعدان روشن کر دیئے گئے۔ کہیں قریب سے گرما گرم کھانے کی بھاپ بلند ہو رہی تھی۔ خیمے کے دروازے پر مسلح پہریدار موجود تھے۔ تابان یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس خیمے میں قیدی ہے یا مہمان۔ اس کو تلوار واپس کر دی گئی تھی مگر ہوشمند اور جالی کے ہتھیار واپس نہیں کیے گئے تھے۔ ویسے بھی

انہیں کسی دوسرے خیمے میں رکھا گیا تھا۔ تابان گہری نظروں سے روہتاس کا جائزہ لینے لگا وہ ایک قطعی مختلف شخص نظر آرہا تھا۔ آج اس کے چہرے پر اداسی کی چمگادڑیں نہیں لٹک رہی تھیں، آنکھوں میں امنگ کے رنگین پرندے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ مکمل طور پر ایک دنیادار شخص دکھائی دیتا تھا۔۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد جب کھانا ان کے سامنے آیا تو اس میں شراب سرخ بھی شامل تھی۔ کھانا لانے والی دو خوبرو لڑکیاں تھیں۔ ان کے تھرکتے جسموں کی ہر جنبش دل دھڑکا دینے والی تھی۔ تابان اس کا یاپلٹ پر حیران ہو رہا تھا۔ کہاں وہ زاہد خشک کہ جسے زندہ رہنا بھی بار محسوس ہوتا تھا اور کہاں یہ رنگیلا جوشیلا سالار جو اس ویران پڑاؤ میں ہر سامان عشرت جمع کیے بیٹھا تھا۔

مرغن کھانے کے بعد روہتاس نے ڈٹ کر شراب پی اور گاؤ تکیے کے سہارے ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔ تاثرات سے لگتا تھا کہ وہ تابان کی حیرت سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ کہنے لگا۔

"تمہاری حیرت بجا ہے نوجوان۔ آتش کدے کے روہتاس اور اس پڑاؤ کے روہتاس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جانتے ہو یہ فرق کیوں ہے؟ یہ فرق اس لیے ہے کہ آتش کدے میں، میں ایک کمزور انسان تھا۔۔۔۔۔۔ کمزوری اور مجبوری سے انسان میں قناعت،

سادگی اور صبر و شکر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ کنویں کے اندر سے نظر آنے والے آسمان کو کائنات سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دنیا کی رنگینیوں و لذتوں سے منہ موڑتا ہے اور پارسائی کا چولا پہن کر بیٹھ جاتا ہے لیکن طاقت انسان کو جینا سکھاتی ہے۔ وہ حوادث کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے۔ محرومیوں سے نبرد آزما ہوتا ہے اور اس دنیا میں ہی وہ سب خوشیاں حاصل کر لیتا ہے۔ جس کے وعدے دیوتاؤں نے اگلی دنیا کے لیے کر رکھے ہیں ۔۔۔۔۔۔ نیکی اور پارسائی اور کچھ نہیں میرے دوست صرف پسپائی کا نام ہے، اس شکست کا نام جو انسانی فطرت کو "حصول مسرت کے معرکے" میں ہوتی ہے۔"

تابان نے کہا۔ "محترم! میں آپ کی تمام باتیں سمجھ نہیں پارہا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ نیکی کو کمزوری کا نام دینا کسی طور درست نہیں۔ دنیا میں بے شمار ایسے طاقتور اور بااختیار لوگ گزرے ہیں جو نیک نام تھے اور انہوں نے ہر آسائش پر دسترس رکھتے ہوئے بھی اپنی خواہشوں کو محدود رکھا۔"

روہتاس نے بلوری پیالے سے شراب کا ایک جرعہ لیا اور بولا۔ "میں انہیں بدنصیب لوگ سمجھتا ہوں۔ اگر تم ان کی زندگیوں کو قابل تقلید سمجھ رہے ہو تو یاد رکھو ان کی زندگیاں پُر

مسرت نہیں، پُر سکون تھیں۔ پُر مسرت اور پُر سکون زندگی میں بہت فرق ہوتا ہے میرے دوست۔"

تابان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "جب آپ ہیلی کارنیس کے آتش کدے سے روانہ ہوئے تو زندگی سے بیزار تھے۔ مجھے خدشہ تھا کہ میں آپ کو پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا لیکن آج نہ صرف آپ کو سلامت دیکھ رہا ہوں، بلکہ۔۔۔۔۔۔"

"یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔" روہتاس نے اس کی بات کاٹی۔ "میں ہیلی کارنیس کے آتش کدے سے مرنے کے لیے ہی نکلا تھا لیکن بہت جلد اس نتیجے پر پہنچا کہ موت ان لوگوں کو آتی ہے جو زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ جو موت کی طرف بڑھتے ہیں موت اس نے فاصلہ رکھتی ہے۔ میں موت کا متلاشی تھا۔ میرے ہاتھ میں عریاں تلوار تھی۔ اس رات مقبوضہ شہر میں داخل ہوتے ہی میں نے یونانی سپاہیوں کے ایک جتھے پر دھاوا بول دیا۔ وہ ایک خیمے کے گرد بیٹھے قہوہ پی رہے تھے۔ ان میں سے پانچ افراد کے لیے قہوے کی پیالیاں آخری ثابت ہوئیں۔ میری تلوار نے ان کو خاک و خون میں لوٹا دیا اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ مجھے موت کے حصول میں ناکامی ہوئی لیکن میں ناکامی سے دلبرداشتہ ہونے والا نہیں تھا۔ اس شب میں نے

ہیلی کارنیس میں کم از کم چھ مقامات پر شب خون مارا لیکن تم حیران ہو گے کہ اس جنگ و جدل میں میرے جسم پر صرف دو قابل ذکر زخم آئے۔"

روہتاس نے بازو سے آستین اٹھا کر تابان کو دو زخم دکھائے اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یقین کرو اس شب میں نے دو درجن سے زائد سپاہیوں کو ہلاک کیا۔۔۔۔۔۔ میری تلوار خون آلود تھی، لباس خون آلود تھا، میرے سر پر بھی خون سوار ہو چکا تھا، زندگی میں پہلی بار مجھے معلوم ہوا تھا کہ جب ہاتھ میں پکڑی ہوئی تیز دھار تلوار دشمن کے گوشت میں اترتی ہے تو کیسی راحت نصیب ہوتی ہے۔ اس شب میں آگے بڑھ بڑھ کر موت سے بغل گیر ہونا چاہتا تھا لیکن وہ کسی نا کتخدا دوشیزہ کی طرح مجھ سے بدن چرا رہی تھی۔ میری بانہوں کے سائے سے بدک رہی تھی۔ مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہوتا چلا جا رہا تھا۔ یہ کشت و خون کا نشہ تھا۔۔۔۔۔۔ اس رات کے بعد کئی راتیں ایسی آئیں جب میں تلوار بدست اپنی موت کی تلاش میں نکلا اور اپنے پاؤں پر چل کر واپس آیا۔ ہیلی کارنیس سے ایک منزل کے فاصلے پر جو یونانی مقدونوی فوج خیمہ زن تھی اس پر میری دہشت سوار ہوتی جا رہی تھی۔ سپاہی ایک ایسی پرچھائیں سے خوف زدہ تھے جو اچانک ان پر جھپٹتی تھی اور ایسی دیوانگی سے نبرد آزما

ہوتی تھی کہ وہ مبہوت ہو کر رہ جاتے تھے۔ ایک روز میری ان کارروائیوں کی اطلاع شہنشاہ ایران دارا کے ایک معتمد سالار راسپ تک جا پہنچی۔ اس نے ایک دستہ بھیجا جو مجھے تلاش کر کے راسپ کے پاس اسوس شہر میں لے گیا۔ راسپ نے بصد اصرار مجھے پنج صدی سالار کا منصب بخش دیا اور کہا کہ اس وقت مملکت ایران کو میرے جیسے جری بازوؤں کی ضرورت ہے۔"

روہتاس نے سلسلہ کلام منقطع کر کے قہقہہ لگایا۔۔۔۔۔۔ پھر قریب کھڑی خدمتگار لڑکی کو بغل میں دبوچ کر بولا۔ "کیا دو ماہ پہلے کوئی تصور کر سکتا تھا کہ میری توصیف میں ایسے کلمات کہے جائیں گے۔ یہ سب تقدیر کا الٹ پھیر ہے۔ اب میں پنج ہزاری سردار ہوں۔ دنیا کی ہر نعمت اور آسائش مجھے میسر ہے۔ میں جانتا ہوں میری زندگی اب طویل نہیں ہو گی لیکن جتنی بھی ہو گی خوب مزے کی ہو گی۔"

تابان نے کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس ویرانے میں آپ کیا کر رہے ہیں۔"

روہتاس نے خدمت گار لڑکی کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے کہا۔ "تم دشمن فوج کے سپاہی ہو لیکن میرے دل میں تمہارا مقام دوست کا ہے۔ میں تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں

سمجھتا۔ ہمیں معلوم ہے کہ سکندر بہت جلد دمشق کی طرف بڑھنے والا ہے اور حملے کی تیاری کے سلسلے میں اس کے طلایہ گرد سوار علاقے میں گھوم رہے ہیں۔ انہی کی پکڑ دھکڑ کے لیے اس ویران علاقے میں یہ چوکی قائم کی گئی ہے۔"

تابان نے کہا۔ "تو کیا ہم خود کو قیدی سمجھیں۔"

"نہیں" روہتاس نے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم اس وقت کسی عسکری مہم پر نہیں ہو۔ کوئی نجی معاملہ ہے جو تمہیں اس دشت میں کھینچ لایا ہے۔ یہ میرے دل کی گواہی ہے اور میں دل کی گواہی کو کبھی رد نہیں کرتا۔"

تابان نے کہا۔ "آپ کے دل کی آواز معتبر ہے، یہ حقیقی ہے کہ میری یہاں موجودگی کے کوئی فوجی مقاصد نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔"

روہتاس نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے غلط بیانی نہیں کرو گے، لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کس مقصد سے یہاں آئے ہو؟"

تابان نے بے خیالی میں اپنی نگاہیں خدمت گار لڑکی کے چہرے پر جمائیں، اس کے شگفتہ رخساروں پر مومی شمعوں کی روشنی منعکس ہو رہی تھی۔ وہ روہتاس کے شانے سے لگی

سکڑی سمٹی خاموش بیٹھی تھی۔ تابان ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں سالار۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ یونانی ہے اور حالات کے دھارے پر بہتی ہوئی ایتھنز سے دمشق جا پہنچی ہے۔ مجھے ہر صورت اس تک پہنچنا ہے۔ اس کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔"

روہتاس نے مسکراتی نظروں سے تابان کو دیکھا اور بولا۔ "تمہاری حیثیت یہاں مہمان کی ہے۔ جب چاہو اور جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ جب تک میدان کارزار گرم نہیں ہوتا اور جنگ کا بگل نہیں بجتا تم مجھے اپنا دوست و خیر خواہ سمجھ سکتے ہو۔"

روہتاس کی فراخدلی اور صاف گوئی نے تابان کو متاثر کیا۔ وہ بولا۔ "میں آپ کا قدردان ہوں اور یہ دعا کرتا ہوں کہ میدان جنگ میں کبھی ہمارا آمنا سامنا نہ ہو۔"

روہتاس کی آنکھوں میں شراب کی سرخی تیر رہی تھی۔ وہ پہلو میں بیٹھی ہوئی دوشیزہ کو عجیب بے قراری سے دیکھ رہا تھا۔ تابان سے بولا۔ "تم جب چاہو دمشق روانہ ہو سکتے ہو لیکن بہتر یہی ہے کہ آج کی رات آرام کر لو۔ موسم کے آثار اچھے نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے طوفان باد و باراں کا خطرہ ہے۔"

تابان نے جھک کر خیمے کے جالی دار روزن سے باہر جھانکا۔ مطلع بالکل صاف تھا۔ چاند ستارے آب و تاب سے روشن تھے۔ اس نے کہا۔ "محترم سالار! میں اس مہمان نوازی کے لیے شکر گزار ہوں۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں جلد از جلد روانہ ہونا چاہوں گا۔"

روہتاس نے کہا۔ "اگر کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو بلا تکلف کہو۔ عسکری معاملات سے ہٹ کر میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔"

تابان نے ایک بار پھر شکریہ ادا کیا، وہ اٹھنا چاہتا تھا لیکن ایک سوال بار بار اس کے ذہن میں کلبلا جاتا تھا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا، کہنے لگا۔ "محترم روہتاس! آپ کو یاد ہے آپ نے مجھ سے ایک انتہائی حسین چہرے کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ اس چہرے نے آپ کی زندگی بھر کی ریاضتوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ آپ اسی حسین و جمیل نسوانی چہرے کے سحر میں گرفتار ہو گئے تھے اور اس "گرفتاری" کو اپنی بہت بڑی شکست تصور کر رہے تھے۔ درحقیقت یہی احساس پشیمانی تھا جو آپ کو اپنی جان لینے پر اکسا رہا تھا۔ آپ اپنے سر سے زیست کا بوجھ اتارنے کے لیے بے تاب نظر آ رہے تھے لیکن آج میں آپ کو ایک بالکل مختلف روپ میں

دیکھ رہا ہوں۔ اس حسین چہرے کا غم آپ کے قرب وجوار میں نظر نہیں آتا، اس کی جگہ دنیاوی لذتوں کے جھمگٹے نظر آرہے ہیں۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ وہ چہرہ اور اس سے محرومی کا کرب آپ کی زندگی سے نکل چکا ہے۔"

روہتاس غور سے تابان کی بات سن رہا تھا۔ تابان چپ ہوا تو وہ اپنا سر اثبات میں ہلانے لگا۔

"ہاں میرے دوست! وہ چہرہ میری زندگی سے نکل چکا ہے لیکن وہ خود سے نہیں نکلا، میں نے اسے زبردستی نکالا ہے اور میں ایسا صرف اس لیے کر سکا ہوں کہ میں ہیلی کارنیس کے سب سے بڑے آتش کدے کا اتروان اعظم ہوں۔ میں نے ایک عمر کڑی ریاضتوں کی نذر کر کے اور نفس کشی کے خارزاروں سے گزر کر کچھ ماورائی قوتیں حاصل کر رکھی ہیں۔ ان قوتوں ہی کے سبب میں اپنے سرکش جذبے کا رخ موڑنے میں کامیاب ہوا ہوں لیکن جس طرح طوفانی دھاروں کا رخ تو موڑا جا سکتا ہے انہیں الٹی سمت میں نہیں چلایا جا سکتا، اسی طرح میں بھی دوبارہ نیکی و پارسائی کی دنیا میں داخل نہیں ہو سکا۔"

تابان نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر مجھے صاف گوئی کی اجازت ہے تو میں کہوں گا کہ مجھے آپ کی باتوں کی سمجھ نہیں آرہی۔"

روہتاس نے قدح میں سے چند گھونٹ نشہ آور مشروب کے لیے اور بولا۔ "دیکھو دوست! میں ساحری یا غیب دانی کا دعویدار نہیں اور نہ ہی یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں کسی غیر انسانی صلاحیت کا مالک ہوں۔ میرا دعویٰ صرف یہ ہے کہ برسوں کی ریاضت اور نفس کشی نے میرے اندر کچھ روحانی طاقتیں بیدار کی ہیں۔ میری نگاہ معاملات اور حالات کی تہہ تک پہنچتی ہے، میں ان پر بے پناہ غور و فکر کرتا ہوں اور بعض اوقات کوئی واقعہ رونما ہونے سے پیشتر ہی میرا ذہن اس کی پیش گوئی کر دیتا ہے۔۔۔۔۔۔۔اور یہ پیش گوئی کبھی غلط ثابت نہیں ہوتی پھر اس پیش گوئی کی روشنی میں، میں آمدہ حالات کا سامنا کرنے کی تیاری کرتا ہوں اور اپنی مضبوط قوت ارادی کے سبب خود کو صورت حال کے مطابق ڈھال لیتا ہوں۔ وہ حسین و جمیل چہرہ جس کا تم ذکر کر رہے ہو، اس وقت دمشق میں ہی ہے۔ وہ ایک زندہ دیوی ہے جو سرزمین دمشق کے ایک قدیم ترین معبد میں سجی ہوئی ہے۔ میں اس دیوی کو حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن مستقبل کے آئینے میں، میں دیکھ رہا تھا کہ اس گوہر نایاب کے حصول کی راہ میں اب گنت رکاوٹیں ہیں، برسوں کی تڑپن ہے۔ زخموں کے انبار ہیں اور وہی ریاضتیں ہیں جو خون جگر پیتی ہیں، لحم دل کھاتی ہیں اور امر بیل کی طرح زندگی کی ہر کونپل کو ڈھانپتی چلی جاتی ہیں۔ میں اس حسن بے مثال کو حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن میرے

پاس اتنا خون جگر نہیں تھا کہ عشق کے عفریت کو پلا سکتا اور نہ اتنی زندگی تھی کہ اس حسن کی دیوی پر مر مٹنے کا حق ادا کر سکتا۔ لہٰذا میں نے اپنی تھوڑی سی زندگی کو ہجر میں کاٹنے کی بجائے وصل سے ہمکنار کیا ہے اور دنیاوی لذتیں سمیٹنے کے لیے اپنا دامن پھیلا دیا ہے۔"

تابان کے لیے اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ روہتاس، مارشاہی کا ذکر کر رہا ہے۔ مارشا جو دمشق میں تھی اور جس کی پوجا کسی عظیم دیوی کی طرح کی جا رہی تھی۔

روہتاس بتا رہا تھا کہ اس دیوی کے حصول میں ان گنت رکاوٹیں ہیں۔ اس کی تمنا خون جگر کی قربانی مانگتی ہے اور اس کا عشق جان کنی کے مسلسل عذاب کے سوا اور کچھ نہیں۔ نہ جانے کیوں یہ باتیں سن کر تابان کی رگ وپے میں سنسنی سی پھیل گئی۔ ایک امنگ سی اس کے سینے میں لہریں لینے لگی، ایک مستی سی دل و دماغ پر چھانے لگی۔ اپنے بے مثال و یکتا محبوب کی راہ میں اذیتیں سہنے اور کرب جھیلنے کا تصور اس کے لیے اتنا دلکش تھا کہ وہ جھوم کر رہ گیا۔ وہ دل ہی دل میں پکارا۔ "تیری زبان مبارک ہو اتروان! کاش مجھ پر وہ سب کچھ بیتے جو تیری مستقبل بیں آنکھ نے دیکھا ہے۔ مارشا کی خاطر میرا جسم جان لیوا اذیتیں سہے۔ میں اپنے ہی لہو

میں تیر کر اس کے قدموں تک پہنچوں اور وہ اپنے غلام کو ایسی دگرگوں حالت میں دیکھے کہ اس پر مہربان ہوئے بغیر رہ ہی نہ سکے۔"

تابان جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر ابھی وہ روہتاس سے کہنے کے لیے الوداعی کلمات مرتب ہی کر رہا تھا کہ اس کی نگاہ خیمے کے دروازے سے باہر گئی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ آسمان پر تاروں کی قندیلیں تیزی سے بجھ رہی ہیں۔ ایک تند و تیز آندھی افق کو ڈھانپتی چلی آ رہی تھی۔۔۔۔۔۔ روہتاس کی پیش گوئی، تابان کے کانوں میں گونجنے لگی۔ یہ پیش گوئی روہتاس نے اس وقت کی تھی جب فلک پر باد و باراں کا شائبہ تک نہیں تھا۔ روہتاس تیکھی نظروں سے تابان کے چہرے کی حیرت پڑھ رہا تھا۔ آہستگی سے بولا۔ "میرا خیال ہے یہ طوفان، باد و باراں بہت زور پکڑے گا، تم تین روز سے پیشتر یہاں سے روانہ نہیں ہو سکو گے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

روہتاس کا کہا بالکل درست ثابت ہوا۔ شب بھر شدید بارش اور ژالہ باری ہوئی۔ ہواؤں نے بھی اودھم مچائے رکھا۔ عموری پہاڑوں سے نکلنے والا واحد راستہ تودے گرنے سے بند ہو

گیا۔ اگلی شب تابان نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک طویل چکر کاٹ کر شمال مشرق کی طرف سے نکل جائیں گے لیکن اسی شب ہوشمند کو تیز بخار نے آلیا اور وہ پورے دو روز نیم بے ہوش پڑا رہا۔ روہتاس کی یہ پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی تھی۔ وہ چار روز سے پہلے اس فوجی چوکی سے روانہ نہیں ہو سکے۔

وہ ایک چمکیلا دن تھا۔ تودوں سے رک جانے والی پہاڑی گزرگاہ صاف کی جا چکی تھی۔ ہوشمند کی طبیعت بھی اب بحال تھی۔ وہ تابان اور جالی تازہ دم گھوڑوں پر سوار تیزی سے جنوب کی سمت بڑھتے جا رہے تھے۔ ان کا سفر اب نسبتاً سہل تھا، کیونکہ امیر ارژنگ کے بوجھ سے انہیں چھٹکارا مل چکا تھا۔ تابان نے بطور امانت اسے سالار روہتاس کے پاس جمع کرا دیا تھا۔ روہتاس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ امیر ارژنگ کو کسی محفوظ جگہ پر پابند رکھے گا اور تابان جب چاہے گا اسے واپس حاصل کر سکے گا۔ ایک طویل اور کٹھن سفر کے بعد آخر وہ تینوں دمشق کے نواح میں پہنچ گئے۔ مضافات دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک عظیم شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ شہر جس کی کہانیاں چار دانگ دہر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ علم و فضل کا گہوارہ، عالموں اور ساحروں کا مسکن، تجار و رؤسا کا وطن، فنون حرب کی تربیت گاہ، جاہ و

حشمت کا نشاں، معبدوں، فواروں، حوضوں اور دلکش عمارتوں کا شہر دمشق، جہاں زندگی اپنے چمکتے دمکتے رنگوں کے ساتھ جلوہ گر تھی اور وقت اپنی حسین ترین چال میں رواں دواں تھا۔۔۔۔۔۔۔ دمشق پہنچ کر تابان اور ہوشمند کو معلوم ہوا کہ وہ قدیم آتش کدہ جس کا ذکر مارشا کے خط میں تھا اور جس کا تذکرہ بعد میں روہتاس نے بھی کیا، شہر کے جنوبی مضافات میں واقع ہے۔ بے حد گھنے جنگل میں تین اطراف سے پانی میں گھری ہوئی یہ ایک جزیزہ نما جگہ ہے، جہاں بلند و بالا درختوں اور اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان ایک پُر خطر ڈھلوان واقع ہے۔ یہ آتش کدہ اس ڈھلوان کے بالائی سرے پر ہے۔ مہینے میں صرف تین مرتبہ اس آتش کدے کو عبادت کے لیے کھولا جاتا ہے۔ ملک کے دور دراز حصوں سے عقیدت مند یہاں پہنچتے ہیں اور اس پُر خطر ڈھلوان کو پا پیادہ طے کر کے آتش کدے میں عبادت کرتے ہیں۔ جو بوڑھے اور کمزور عقیدت مند اس پُر خطر ڈھلوان پر ہیں چڑھ سکتے اور گہری کھائیوں میں گر کر جان ہارتے ہیں، ان کی موت کو متبرک خیال کیا جاتا ہے اور ان کی لاشیں آتش کدے کے اس مقدس چبوترے پر رکھی جاتی ہیں جہاں چار آنکھوں والا نگران دیوتا صدیوں سے پہرہ دے رہا ہے۔ اس دیوتا کی دو آنکھیں سوتی ہیں اور دو جاگتی ہیں۔ جب جاگتی ہوئی آنکھوں میں نیند بھر آتی ہے تو سوئی ہوئی آنکھیں جاگ کر نگرانی کا کام سنبھال لیتی ہیں۔ یہ

آنکھیں دیکھتی رہتی ہیں کہ کوئی ایسا پرندہ ان متبرک لاشوں کا گوشت نہ نوچ سکے جسے دیوتاؤں کی آشیر باد حاصل نہ ہو۔ اس آتش کدے میں ایسے سن رسیدہ بوڑھوں کی حکومت ہے جن کی عمریں ہزاروں سال پر محیط ہیں۔ جو کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، سوتے ہیں، نہ بے مقصد زبان کھولتے ہیں۔ وہ بوڑھے نیکی کے دیوتا رمزد سے براہ راست ہم کلام ہوتے ہیں۔ وہ ہمہ وقت ایک پُراسرار دھند میں چھپے رہتے ہیں اور اسی دھند کے اندر ضرورت مندوں کی حاجات سنتے ہیں۔ یہ ایسی بہت سی افسانوی باتیں تابان نے اس آتش کدے کے بارے میں سنیں اور اس مقام کو دیکھنے کی خواہش اس کے اندر شدید تر ہو گئی۔

ایک شب دمشق کی ایک مسافر سرائے میں بسر کرنے کے بعد وہ اس قدیم آتش کدے کی جانب چل دیئے۔ یہ ایک حسین اتفاق تھا کہ نوروز کی بندش کے بعد آج ہی آتش کدے کے دروازے کھلنا تھے۔ وہ چلتے رہے، آخر ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر انہوں نے عام لوگوں کی طرح سواری کے جانور چھوڑ دیئے، جوتے اتار دیئے اور ننگے پاؤں و ننگے سر آتش کدے کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھنے درختوں کے اندر ایک بل کھاتا، نیم پختہ راستہ دور تک چلا گیا تھا۔ اس راستے کے آخر میں لکڑی کا ایک پُل جھیل نما مقام سے گزرتا تھا۔ جھیل کے

فوراً بعد وہ پُرخطر ڈھلوان شروع ہو جاتی تھی جو اب تک نہ جانے کتنے آتش پرستوں کی بھینٹ لے چکی تھی۔ یہاں تابان نے پتھروں اور چٹانوں پر جابجا انسانوں اور جانوروں کی اشکال کندہ دیکھیں۔ ان میں سے بعض مناظر دلچسپ تھے بعض خوفناک اور بعض شرمناک۔ آخر انہیں بھورے پتھر سے بنی ہوئی ایک وسیع عریض عمارت کی جھلکیاں دکھائی دینے لگیں۔ اس عمارت کے بلند و بالا دروازوں کے سامنے، منڈے ہوئے سروں اور گیروا چغوں والے لٹھ بردار محافظ کھڑے تھے۔ وہ اپنی تیز تیکھی نگاہوں سے ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں تابان کو محسوس ہوا کہ اس عمارت میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آچکا ہے۔ کوئی ایسا واقعہ جس کے رونما ہونے کے بعد ان در و دیوار سے ایک طرح کی کرختگی ٹپک رہی ہے اور یہاں کی نگران نگاہیں برمے کی طرح ہر زائر کے بدن میں گھس رہی ہیں۔ تابان اور ہوشمند زائرین کی ایک ٹولی میں شامل ہو کر بہ آسانی آتش کدے میں پہنچ گئے۔ ان دونوں کے خدوخال ایرانی تھے لہٰذا کسی کو شبہ تک نہیں ہوا۔ آتش کدے کے وسیع و عریض احاطے میں پجاریوں اور زائرین کا ہجوم تھا۔ احاطے کے وسط میں ایک بلند ستون پر آگ کا الاؤ روشن تھا۔ آتش پرست اس آگ کے نیچے مختلف مذہبی رسومات ادا کر رہے تھے۔ جالی بھی آتش پرست تھا اور ان تمام رسومات کے متعلق جانتا تھا۔

تابان اور ہوشمند خاموشی سے اس کی تقلید کرنے لگے۔ فیروزی پتھر سے بنی ہوئی ایک طویل راہداری میں لوگ تیزی سے قدم اٹھاتے اندرونی حصے میں جا رہے تھے۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی مقام پر بروقت پہنچنا چاہتے ہیں۔ شاید کوئی عبادت ہونے والی تھی۔ تابان نے سرگوشیوں میں جالی سے پوچھا۔ جالی نے بتایا کہ جب سورج نصف النہار پر آئے گا اور سطح زمین پر ہر چیز کا سایہ مختصر ترین رہ جائے گا تو معبد کے عمر رسیدہ کاہن، معبد کے مرکزی ایوان میں عقیدت مندوں کو دیدار کا شرف بخشیں گے۔ ان کے ساتھ معبد کی سرکردہ دیوی بھی ہو گی۔

سرکردہ دیوی کا سن کر تابان کا دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ جیسے پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر آ جائے گا۔۔۔۔۔۔۔ تو کیا وہ ابھی تھوڑی دیر بعد شہزادی مارشا کو دیکھ سکے گا؟ یہ سوال اس کے ذہن میں ابھرا اور سرتاپا سنسنی کی تند و تیز لہر دوڑ گئی۔ اس نے جالی سے پوچھا۔

"تم جانتے ہو سرکردہ دیوی کون ہے؟"

"میں اس معبد میں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔" جالی نے جواب دیا۔

تابان نے پوچھا۔ "کیا ہر معبد میں اس طرح دیویاں لوگوں کے سامنے آتی ہیں؟"

جالی کا جواب نفی میں تھا، وہ بولا۔ "بنیادی طور پر آتش پرستی میں دیوی دیوتاؤں کی پوجا نہیں ہوتی لیکن اب ہمارے اندر بہت سے فرقے بن چکے ہیں۔ ہمارے پیشوائے اعلیٰ زرتشت نے مقدس کتاب گاتھا چھوڑی تھی۔ اب اس کتاب میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں اور بعض فرقے آگ کے علاوہ بتوں اور اجرام فلکی کی پرستش بھی کرتے ہیں"

اچانک جالی کو سلسلہ کلام منقطع کرنا پڑا، طویل راہداری کی جانب سے گھنٹیوں کی مدھم آواز ابھری تھی۔ یہ آواز دھیمی ہونے کے باوجود اپنے اندر گونج رکھتی تھی اور یوں لگتا تھا معبد کے ہر پتھر سے پھوٹ رہی ہے۔ جالی نے کہا۔ "جلدی چلئے ورنہ پھر ایوان کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔" وہ تینوں تیزی سے راہداری میں پہنچے۔ اب لوگ چکنے فرش پر ننگے پاؤں بھاگنے لگے تھے، وہ بھی دوڑ پڑے۔ انہیں اپنے سامنے ایک بہت بڑا محرابی دروازہ نظر آیا۔ یہ دروازہ اخروٹ کی لکڑی کا تھا اور اس پر ہاتھی دانت سے دیدہ زیب گلکاری کی گئی تھی۔ وہ اس دروازے سے اندر گئے تو اپنے سامنے ایک وسیع و عریض ایوان پایا۔ اس کی بے ستون چھت جیسے آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ دیواروں سے رنگین روشنی پھوٹتی تھی اور طاقدانوں میں خوشبو چراغ چل رہے تھے۔ ایوان کی مشرقی جانب ایک مستطیل حوض ایک

دیوار سے دوسری دیوار تک چلا گیا تھا۔ اس حوض کے پانی میں پھول تیر رہے تھے اور رنگین مچھلیاں تھیں۔ ایوان میں موجود ہر شخص نہایت خاموشی اور احترام سے حوض کے اس پار ہموار دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایوان میں موجود روشنیاں گل ہو گئیں۔ فقط طاقدانوں میں مہکتے چراغوں کی مدھم روشنی باقی رہ گئی۔ یہ روشنی خوابناک تھی اور اس کے سبب ایوان کی قدیم دیواروں پر حاضرین کے سائے نمودار ہو گئے تھے۔

ہوشمند نے کہا۔ "کچھ ہونے والا ہے غالباً۔۔۔۔۔۔۔اس سیاہ دیوار کے اندر سے یا غالباً پیچھے سے کچھ برآمد ہو گا۔ "ان دنوں ہوشمند کا تکیہ کلام "غالباً" تھا۔ اس کے تکیہ کلام کی بڑی صفت یہی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا تھا۔ جب سننے والے ایک لفظ سے مانوس ہونے لگتے تھے کوئی دوسرا لفظ اس کی زبان پر چڑھ جاتا تھا۔ روشنیاں گل ہوتے ہی گھنٹیوں کی آواز تھم گئی اور اس کے بعد ایکا ایکی ایوان کی سیاہ دیوار درمیان سے شق ہو گئی۔ ایک مہیب آواز کے ساتھ دیوار کے دونوں حصے مہین پردوں کی طرح اطراف میں گم ہو گیے۔ تابان کو اپنے سامنے ایک بلند چبوترہ دکھائی دیا۔ اس چبوترے کے ارد گرد گلابی دھند کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دھند کے اندر سے ایک بارعب آواز ابھری۔

"روئے زمین کے تاریک غاروں اور نمناک گپھاؤں میں زندگی اور نیکی کی جوت جگانے والے دیوتا رمزد کا شکر ادا کرو جس نے اپنے خاص بندوں کو دانائی کے خزینے سونپے ہیں۔"

اس آواز کو سنتے ہی لوگ سجدے میں گر پڑے اور مناجات پڑھنے لگے۔ کتنی ہی دیر اسی عالم میں گزر گئی۔ تابان کے پہلو میں ہوشمند تھا۔ وہ سجدے میں گرا ہوا بے قراری سے پہلو بدل رہا تھا۔ تب ایک دوسری آواز ایوان میں ابھری اور بلند چھت سے ٹکرا کر دیر تک گونجی رہی۔ یہ فارسی کی کوئی منظوم دعا تھی۔ تابان کو اس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا۔ تاہم آواز کے ابھرتے ہی سجدہ ریز زائرین کی گریہ وزاری تھم گئی اور انہوں نے سر اٹھا کر چبوترے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہاں لمبی سفید داڑھیوں اور منڈے ہوئے سروں والے چند بوڑھے براجمان تھے۔ ان کے جسموں پر زرتار گیروا چغے تھے گلے میں عجیب و غریب مالائیں تھیں اور ان سب نے ایک ہی آسن جمار کھا تھا۔ بوڑھوں کے عقب میں ایک زرنگار نشست پر معبد کی سب سے بڑی دیوی براجمان تھی۔ اسے دیکھ کر تابان کے دل کا دیا بجھ گیا اور سینہ کسی ویران مرقد کی طرح اداس رہ گیا۔ وہ دیوی "مارشا" نہیں تھی۔ وہ کوئی نہایت حسین و جمیل ایرانی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے کی رعنائیوں پر شاعر قصیدوں کے انبار لگا سکتے تھے

اور مصور رنگوں کے دریا بہا سکتے تھے۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ مارشا نہیں تھی۔ اس کا پر تو بھی نہیں تھی۔ وہ کسی مورتی کی طرح ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ اس کی پُر کشش نگاہیں دھند کے رنگین مرغولوں میں سے گزرتی ہوئی زائرین کے ہجوم کو دیکھ رہی تھیں، جیسے ہر مرد و زن کے چہرے کو جانچ رہی ہوں۔ پھر تابان کو محسوس ہوا کہ وہ اس کی طرف دیکھ رہی ہے، اس کی آنکھوں میں جھانک رہی ہے۔ شاید یہ اس کا وہم تھا۔ وہ کتنی ہی دیر ابہام اور یقین کے دھندلکے میں بھٹکتا رہا۔ پھر اچانک اسے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ یہ ہوشمند تھا، سرگوشی میں بولا۔

"نگاہیں نیچی رکھو۔ یوں بے باکی سے دیکھنا مصیبت کا باعث بن سکتا ہے غالباً۔"

تابان نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور انہماک سے چبوترے کا جائزہ لیتا رہا۔ آتش پرستوں نے چند رسوم ادا کیں۔ اس کے بعد دیوار پھر متحرک ہو کر بند ہو گئی۔ رنگین روشنیاں جگمگا اٹھیں اور گھنٹیوں کی صدا ایوان میں گونجنے لگیں۔ ایوان کے محرابی دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ لوگ جوق در جوق مختلف دروازوں سے گزرنے لگے۔ ایک دروازے پر خاص طور پر بہت ہجوم تھا۔ تابان، ہوشمند اور جالی بھی اس کی طرف

بڑھے۔ ایک بل کھاتی راہداری سے گزر کر وہ ایک کھلے احاطے میں نکل آئے۔ یہاں پتھر کی بڑی بڑی سلوں کا فرش تھا۔ ایک طرف تھوڑی تھوڑی فاصلے پر تین قربان گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے قریب ہی ایک پھانسی گھاٹ تھا۔ پھانسی گھاٹ پر ایک زخم خوردہ لاش جھول رہی تھی۔ لاش کی دونوں آنکھوں میں دو نیزے یوں پیوست تھے کہ کھوپڑی توڑ کر عقب سے باہر نکل آئے تھے۔ لاش کے ہاتھ، پاؤں کٹے ہوئے تھے اور پیٹ چاک تھا۔ وہ مردار خود گدھ پھانسی گھاٹ کے چوبی شہتیر پر بیٹھے جھک جھک کر بدنصیب شخص کے سر کو ٹھکور رہے تھے۔ کچھ گوشت خور پرندے قریبی درختوں پر بھی موجود تھے۔ تابان اور ہوشمند یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ یہ لاش کاہن خاتام کی ہے۔۔۔۔۔۔۔ وہی خاتام جسے چند روز پیشتر وہ بوزکرت سمیت اسی پہاڑی سرائے میں چھوڑ آئے تھے۔ ان دونوں کے گھوڑے ابھی تک تابان اور ہوشمند کے پاس تھے۔ تابان کو یقین نہیں آیا کہ یہ خاتام ہے جو نہ صرف یہاں پہنچ چکا ہے بلکہ کسی سانحے کا شکار ہو کر راہی عدم بھی ہو چکا ہے۔ ہوشمند کی حیرت زدہ نگاہیں کبھی تابان اور کبھی لاش کی طرف اٹھتی تھیں۔ وہ سرگوشی میں بولا۔

"غالباً تم بھی وہی دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں۔"

تابان نے اثبات میں سر ہلایا، پھر اس نے سرگوشی میں ایک قریب کھڑے شخص سے پوچھا، "یہ کون ہے؟" وہ نفی میں سر ہلانے لگا، تابان کی طرح وہ بھی لاعلم تھا لیکن جب ہوشمند نے ایک دوسرے شخص سے پوچھا تو اس نے مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔ اس نے کہا۔

"یہ طلایہ گرد (فوجی جاسوس) ہے۔ پرسوں شام یہ اور اس کا ایک ساتھی آتش کدے کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ محافظوں نے مشکوک جان کر انہیں للکارا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ کوشش بسیار کے بعد محافظوں نے اسے شدید زخمی حالت میں پکڑ لیا جبکہ اس کا ساتھی بھاگنے میں کامیاب رہا۔ جرم ثابت ہونے پر اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے اور آنکھوں میں نیزے گاڑ کر یہاں لٹکا دیا گیا۔ دوسرے شخص کی تلاش جاری ہے۔"

اب تابان کی سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ آتش کدے کے گیرواچغوں والے چوکیدار اتنے چوکس کیوں نظر آ رہے ہیں۔ یقیناً انہیں مزید طلایہ گردوں کا خدشہ تھا۔ تابان نے دیکھا، تنومند چوکیدار لمبے لمبے ڈگ بھرتے یہاں وہاں چکرا رہے تھے۔ ان کی تیز نگاہیں ہر چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہوشمند نے تابان کے کان میں سرگوشی کی۔

"غالباً تم دیکھ ہی رہے ہو، یہاں غالباً بڑی کڑی نگرانی ہو رہی ہے۔ بہتر ہے کہ فی الحال یہاں سے نکل چلیں۔"

تابان کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک عجیب وضع کا نقارہ بجنے لگا۔ اس آواز کے ساتھ ہی ہجوم میں جنبش پیدا ہوئی۔ جالی نے سرگوشی کی۔ "عبادت اور زیارت کا وقت ختم ہوا، اب ہمیں واپس جانا ہوگا۔"

واپسی کا سن کر تابان کے سینے میں گھونسہ سا لگا۔۔۔۔۔۔ وہ کیسے واپس جا سکتا تھا۔ وہ ان در و دیوار سے۔۔۔۔۔۔ اس مقام سے کیسے واپس جا سکتا تھا؟ زندگی میں پہلی بار تابان کو احساس ہوا کہ محبوب سے وابستہ ہر شے محبوب ہو جاتی ہے۔ اس نے یہاں آ کر شہزادی مارشا کا دیدار نہیں کیا تھا، اس کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس کی جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ صرف اسے اتنا معلوم تھا کہ مارشا ان در و دیوار میں موجود ہے۔ اس گل بدن کی مہک ان فضاؤں میں چکرا رہی ہے۔ اس آگاہی کے سبب یہ در و دیوار اور یہ فضائیں اس کے لیے دنیا کی ہر متاع سے قیمتی ہو گئی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ اس نے گریزاں نظروں سے آتش کدے کے بیرونی دروازوں کی طرف دیکھا۔ ایک آواز بے اختیار اس کے ہونٹوں سے نکلی۔

"نہیں ہوشمند! میں واپس نہیں جا سکتا۔"

ہوشمند نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔ "تابو! غالباً تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"یہی سمجھ لو۔" تابان نے جواب دیا۔ "اگر تم جانا چاہتے ہو، چلے جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے یہیں رہنا ہے۔" عقیدت مند احاطے سے نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ ہوشمند نے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو اتنے جلد باز مت بنو، ایک جلد باز شخص کا انجام تم دیکھ ہی چکے ہو۔ کل ہم میں سے کسی ایک کی لاش اس چوبی شہتیر سے جھول سکتی ہے۔ ہمیں یہاں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہو گا۔" وہ تادیر تابان سے سر کھپائی کرتا رہا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ تابان کے ساتھ ساتھ وہ بھی پکڑا جائے گا اور دونوں بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔ ایک گھبرائی ہوئی طیش آمیز نگاہ تابان پر ڈال کر وہ بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔ تابان بڑے اطمینان سے پتھریلی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔ ایک عجب بے خودی سی اس پر طاری ہو رہی تھی۔ وہ ہر فکر سے آزاد تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک محافظ نے اسے اپنے وزنی لٹھ سے ٹہوکا دیا۔ "کیا بات ہے، کیوں بیٹھے ہو یہاں؟" وہ فارسی میں ترش روئی سے بولا۔

تابان نے کہا۔ "میں بڑی دور سے اور بہت مشکلوں سے یہاں پہنچا ہوں اب اس دہلیز کو چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔"

محافظ نے آنکھیں نکالیں۔ "کیا کہا تم نے!" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا لٹھ دونوں ہاتھوں میں بلند کر لیا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ تابان کا سر کھول دے گا۔ ایک دوسرا محافظ لپک کر آگے آیا اور اس نے پہلے کو لٹھ چلانے سے روک دیا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے ذرا تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

پہلا محافظ بولا۔ "کہتا ہے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میرے ٹکڑے بھی کر دو گے تو یہیں بیٹھا رہوں گا۔" محافظ نے چند الفاظ اپنی طرف سے بھی جوڑ دیئے تھے۔

دوسرے محافظ نے تابان سے پوچھا۔ "کیا تم نے ایسا کہا ہے؟"

"ہاں۔۔۔۔۔۔۔ کہا ہے" تابان نے جواب دیا۔ "اس معبد سے باہر دنیا میرے لیے ویران ہے۔ میں ایک ادنیٰ خدمت گار بن کر اس چار دیواری میں رہنا چاہتا ہوں۔"

"بکواس بند کرو۔" نووارد محافظ غرایا۔ "اس معبد کی "خدمت" کوئی گری پڑی چیز نہیں کہ اٹھا کر ہر سوالی کو سونپ دی جائے۔ اس اعزاز کو پانے کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے اور کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

"میں ہر آزمائش کے لیے تیار ہوں۔" تابان نے جواب دیا۔

"مجھے تو کوئی دیوانہ لگتا ہے۔" ایک محافظ نے تابان کی ہٹ دھرمی پر تبصرہ کیا۔

"یہ یوں نہیں مانے گا۔" پہلے محافظ نے غرا کر کہا اور لٹھ گھما کر زور سے تابان کی پیٹھ پر رسید کیا۔ تابان کے ہونٹوں سے کراہ نکلی لیکن وہ اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔ اس کی ثابت قدمی دیکھ کر محافظ طیش میں آ گئے۔ وہ سب تابان پر پل پڑے اور ہر دستیاب شے سے اسے پیٹنے لگے۔ احاطے میں کھلبلی مچ گئی۔ جو لوگ احاطے سے نکل چکے تھے وہ بھاگ بھاگ کر واپس آنے لگے۔ محافظ ان پر برس پڑے اور لاٹھیوں سے انہیں باہر دھکیلنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں تابان بے سُدھ ہو گیا۔ اس کے چہرے اور جسم کے کئی حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ محافظوں نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کر کسی غلیظ جانور کی طرح گھسیٹنا شروع کیا اور معبد سے باہر لا پھینکا۔

شاید وہ جھنجھلاہٹ کے زیر اثر اسے کسی کھائی ہی میں دھکیل دیتے لیکن سردار محافظ نے انہیں منع کیا اور وہ اسے زندہ چھوڑ کر چلے گئے۔

تابان بے ہوش تو نہیں تھا لیکن کچھ ایسا ہوش میں بھی نہیں تھا۔ اس کے سر پر لٹھ کی چند شدید ضربیں آئی تھیں اور دماغ میں اب تک ستارے جھلملا رہے تھے۔ لہو کے ذائقے سے منہ نمکین ہو چکا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اطراف کا جائزہ لیا۔ سورج کا سرخ گولا دور مغربی پہاڑیوں کے عقب میں چھپ رہا تھا۔ اطراف میں درختوں اور جھاڑیوں کے سائے طویل تھے۔ قریباً سو قدم دور اس پھانسی گھاٹ کا بالائی حصہ نظر آ رہا تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے کاہن خاتام کی لاش جھول رہی تھی۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ تابان نے اپنی دکھتی گردن پر زور ڈال کر عقب میں دیکھا اور اسے معلوم ہوا کہ پھانسی گھاٹ خالی کیوں ہے۔ خاتام کی لاش عام ملاحظے کے بعد ان درختوں میں پھینک دی گئی تھی۔ اب مردار خور پرندے بڑے آزادی سے اسے نوچ گھسوٹ رہے تھے۔ تابان کے دیکھتے ہی دیکھتے چند جنگلی کتے بھی نشیب سے نمودار ہوئے اور اس دعوتِ شیراز میں شریک ہو گئے۔

تابان آنکھیں نیم وا کیے عجب محویت سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی خاتام تھا جسے صرف ایک ماہ پیشتر تابان نے بڑی شان سے چلہ کشی کرتے اور عقیدت مندوں پر رعب گانٹھتے دیکھا تھا۔ جب وہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتا تھا تو کھلی آستینوں میں سے جلی ہوئی خزاں رسیدہ بانہیں نمودار ہو کر عجب دہشت انگیز منظر پیش کرتی تھیں۔ اس دہشت ناک شخص کا انجام جتنا اچانک تھا اتنا ہی عبرتناک بھی تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ اور بوزکرت، مارشا کی جستجو میں اس معبد تک پہنچے تھے۔ اپنے یونانی خدوخال کی وجہ سے وہ فوراً محافظوں کی نگاہ میں آ گئے۔ انہیں طلایہ گرد سمجھا گیا اور اسی جرم میں خاتام کو سزائے موت دے دی گئی۔

سورج غروب ہونے کے تھوڑی دیر بعد قرب وجوار میں اندھیرا اتر آیا اور معبد کی بلند و بالا برجیوں اور پُراسرار گنبدوں کے جھروکوں سے روشنی نظر آنے لگی۔ تابان اٹھا اور ایک تناور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا رخ معبد ہی کی طرف تھا۔ یخ بستہ ہوا اس کے بدن کو چھیدتی گزر رہی تھی اور زخموں سے اٹھنے والی ٹیسیں شدید تر ہو رہی تھیں لیکن وہ اس سردی سے بچنا چاہتا تھا اور نہ اسے ان زخموں کے لیے مرہم درکار تھا۔ وہ ہواؤں میں مارشا کے بدن کی مہک سونگھ رہا تھا اور بے خود ہوتا چلا جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ دھیرے دھیرے

وقت کی رفتار اور حرکت اس کے لیے غیر اہم ہوتی جا رہی تھی۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوا کب شب ڈھلی، کب دن نکل آیا اور کب اگلی شب کا اندھیرا پھر نشیب و فراز کو ڈھانپنے لگا۔ وہ عجب طرح کی ضد اوڑھے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔۔۔۔۔۔۔ تیسرے روز محافظوں نے آکر اسے پھر مارا پیٹا اور اٹھا کر آتش کدے سے نصف کوس نیچے نیم پختہ راستے پر پھینک آئے۔ اس مرتبہ تابان کو واقعی شدید چوٹیں آئی تھیں۔ اس کے لیے الٹی ٹانگ کو حرکت دینا خاصا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ پورے آٹھ پہر اسی راستے کے کنارے بھوکا پیاسا پڑا رہا۔ زخموں سے خون رستا رہا اور چیونٹے اس کے جسم پر چلتے رہے۔ آخر وہ پھر اٹھا اور ہمت کر کے معبد کے سامنے پہنچ گیا۔ کوئی مقناطیسی کشش اسے ان دیواروں کی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ چاہتا بھی تو واپس نہیں جا سکتا تھا۔ وہ چار یوم سے بھوکا تھا۔ رات ہوتے ہی اس پر نقاہت غالب آ گئی اور وہ معبد کے جھروکوں سے پھوٹتی رنگین روشنیوں کو دیکھتے دیکھتے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ خواب میں اس نے خود کو معبد پر یلغار کرتے دیکھا۔ اس کے ساتھ سالارِ اعظم سکندر تھا، ہوشمند تھا اور سینکڑوں جنگجو سپاہی تھے۔ وہ بلند معبد کی فصیل پر کمند ڈالے اوپر چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے جسم پر تیر لگ کر پھلوں کی طرح نیچے گر رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔ پھر اچانک اس نے خود کو برف کے سمندر میں دیکھا۔ "برف بدن" دیوہیکل مچھلیاں اس پر جھپٹ رہی تھیں وہ ان

سے بر سر پیکار تھا۔ اور کورا کو صدائیں دے رہا تھا جو ابھی ابھی اس سمندر میں او جھل ہو گئی تھی۔ پھر اس نے ایک زرہ پوش جنگجو کو دیکھا۔ وہ ایک ایسے جانور پر بیٹھا تھا جس کا چہرہ عورت کا دھڑ گھوڑے کا تھا۔ اس جنگجو کے جلو میں ایک ٹڈی دل لشکر تھا۔ سینکڑوں پھریرے اڑاتا، دریاؤں اور صحراؤں کو طے کرتا وہ کسی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ کسی شخص نے تابان کو بتایا کہ یہ شہنشاہ ایران دارا ہے اور سکندر کی سپاہ کو تہ تیغ کرنے کے لیے جا رہا ہے۔

نہ جانے کب تک تابان خوابوں کی اس بے ربط، نیم روشن دنیا میں گھومتا رہا، یکایک اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایک ہیولا سا اس پر جھکا ہوا اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ تابان کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ ہوشمند ہے، جو اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے چھپ چھپا کر یہاں تک پہنچا ہے لیکن جلد ہی اسے اپنا خیال ترک کرنا پڑا۔ اسے کنگنوں کی مدھم کھنک سنائی دے رہی تھی۔ اس پر جھکا ہوا ہیولا کسی عورت کا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں سکوڑ کر غور سے اس نے دیکھا۔ اس کے سامنے ایک کنیز صورت لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر معبد کا مخصوص گیروا لباس تھا اور کھلے ریشمی بال ہولے ہولے ہوا میں لہرا رہے تھے۔

"کون ہو تم؟" تابان نے پوچھا۔

"آیئے میرے ساتھ، آپ کو دیوی بلا رہی ہیں۔" ایک رسیلی آواز تابان کے کانوں میں پڑی اور اس کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔

"کون دیوی؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"مجھے صرف آپ کو لے جانے کا حکم ہے۔" کنیز بولی۔ "باقی سب کچھ آپ کو وہاں جا کر معلوم ہو گا۔"

تابان بلا ارادہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اسے اپنی ٹانگ کی شدید چوٹ بھی بھول گئی تھی۔ کنیز نے اپنے بازوؤں پر رکھا ہوا ایک تہہ شدہ کمبل کھولا اور تابان کے کندھوں پر ڈال دیا۔ "آیئے میرے ساتھ" اس نے دل پذیر آواز میں کہا اور تابان کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"میں، میں چل سکتا ہوں۔" تابان بولا اور متوازن قدموں سے کنیز کے ساتھ ہو لیا۔ کنیز اسے عبادت گاہ کے صدر دروازے کی طرف لے جانے کی بجائے، دوسری سمت لے کر گئی۔ منقش تصویروں والی چند چٹانوں کے درمیان سے گزر کر وہ معبد کے پہلو میں آ گئے۔ یہاں پہنچ کر کنیز نے تابان کے شانوں پر رکھا ہوا کمبل اٹھا کر اس کا سر بھی ڈھانپ دیا۔ وہ

ایک چھوٹے سے دروازے میں سے گزر کر معبد کے احاطے میں آ گئے۔ یہاں چند محافظ موجود تھے لیکن مشعلوں کی روشنی میں کنیز کا چہرہ دیکھنے کے بعد انہوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ کنیز تابان کو پھانسی گھاٹ کے عقب سے گزارتی ہوئی ایک تنگ و تاریک زینے پر لے آئی۔ یہ زینہ بل کھاتا اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ تابان کو لگا جیسے وہ کسی مینار پر چڑھ رہا ہے۔ آخر وہ ایک غلام گردش میں نکلے اور طویل فاصلہ طے کر کے اچانک ایک نہایت آراستہ و پیراستہ کمرے میں پہنچ گئے۔ تابان نے دیکھا، اس کے آلودہ پاؤں تلے دبیز قالین تھا۔ چھت پر فانوس تھے اور دیواروں سے غیر مرئی روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ کمرے میں سجاوٹ کے لیے سونے چاندی کے ظروف رکھے تھے اور ہیروں سے مرصع پایوں والی نشستیں رنگین روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔ یہ کمرے نشست گاہ کے طور پر سجا ہوا تھا۔ تنگ و تاریک بوسیدہ راستوں سے گزر کر دفعتاً اس آراستہ کمرے میں پہنچنا تابان کو ایسے ہی لگا جیسے کوئی ٹٹو سوار مسافر اچانک اڑن کھٹولے میں بیٹھ جائے۔ کمرے میں کئی حسین و جمیل دوشیزائیں موجود تھیں۔ ان کے چہرے شاداں اور ہونٹوں پر دلنشیں مسکراہٹیں تھیں۔ وہ سب معبد کے چغہ لباس میں تھیں لیکن یہ لباس قیمتی کپڑے کا تیار کردہ تھا اور اس پر حسبِ مراتب سنہری تاروں سے کام بھی کیا گیا تھا۔ تابان کو یہاں لانے والی دوشیزہ کا لباس بھی

کا مدار تھا۔ گو ان دوشیزاؤں کے چہرے بناؤ سنگھار سے محروم تھے لیکن بیشتر صورتوں پر سادگی کا حسن ٹوٹ کر برس رہا تھا۔ انہوں نے تابان کو ایک آرام دہ نشست پر بٹھایا۔ اس کے بالائی جسم سے پھٹا پرانا خون آلود لباس اتار دیا گیا۔ بھیگے ہوئے نرم و گداز کپڑوں سے اس کے چہرے اور جسم سے میل کچیل ایسی ملائمت سے صاف کی گئی کہ زخموں کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ اسے ایک نیا لباس پہنایا گیا اور بال وغیرہ سنوار کر کسی کی خدمت میں حاضر کرنے کے لیے تیار کر دیا گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد تابان ایک ایسے عالیشان کمرے میں کھڑا تھا جس کے ماحول پر کسی رنگین خواب کا گمان ہوتا تھا۔ اس کمرے کی آرائش نشست گاہ کی آرائش سے کئی گنا بڑھ کر تھی۔ گلابی رنگ کی ایک خوشبودار دھند کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسی طرح کی دھند تابان نے چار روز پہلے ایوان خاص کے پُراسرار چبوترے پر دیکھی تھی۔ یہ دھند اتنی گہری نہیں تھی جتنی دور نے نظر آئی تھی۔ اس میں سانس لیتے ہوئے ایک طرح فرحت کا احساس ہوتا تھا اور آنکھوں میں خوشگوار ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ تابان نے بغور دیکھا تو سامنے ایک زرنگار تخت پر کوئی بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ کوئی حسین دوشیزہ تھی۔ دھند کے لطیف مرغولوں میں وہ یوں ڈوب

ابھر رہی تھی کہ ایک پل میں حقیقت اور دوسرے میں وہم دکھائی دینے لگتی تھی۔ یہ وہی دیوی تھی جو چند روز پہلے "دیدار عام" کے لیے زائرین کے سامنے آئی تھی۔ اس کا حسن آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا تھا۔ سرتاپا دلکشی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی، گل بدن، پری چہرہ، آہو چشم، وہ مصور کائنات کا حسین شاہکار دکھائی دیتی تھی۔

"بیٹھ جاؤ اجنبی۔" اس کے یاقوتی لبوں نے حرکت کی اور تابان کی سماعت میں جیسے سینکڑوں جلترنگ بج اٹھے۔ وہ جھجکتا ہوا جھکا اور قالین پر دوزانو بیٹھ گیا۔ دیوی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "پچھلی عبادت میں ہم نے تمہیں ایوان عام میں دیکھا تھا۔ تم سب سے نمایاں نظر آتے تھے، کیونکہ سر اٹھائے کھڑے تھے اور ہماری جانب دیکھ رہے تھے۔ ہمیں تمہاری یہ جرات مندی اچھی لگی۔۔۔۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔۔۔۔ اور کہاں سے آئے ہو؟"

یہ سوال تابان کے لیے خاصا کٹھن تھا۔ وہ اس معبد کی اہم ترین شخصیت کے روبرو کھڑا تھا۔ زبان کی ایک لغزش اسے تخت سے تختے پر لا سکتی تھی۔ "کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو؟" دیوی کے سوال کی بازگشت تابان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ سوال پوچھنے کے انداز سے

عیاں تھا کہ تابان کی ظاہری حالت اور حیثیت کو تسلیم نہیں کیا جا رہا۔ چند لمحے شدید تذبذب میں رہنے کے بعد تابان نے سچ آمیز جھوٹ بولنے کا فیصلہ کیا، وہ بولا۔

"اے مقدس دیوی! میں یونان سے آیا ہوں۔ ایتھنز کے جنگجو مجھے بچپن میں غلام بنا کر سمندر پار لے گئے تھے۔ ایک طویل عرصہ تک میں نے یونانیوں کا ظلم و ستم سہا ہے۔ میں نے ان گنت مرتبہ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی آخر کوئی ایک برس پیشتر اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا اور ایک بحری جہاز پر چھپ کر یہاں تک پہنچ گیا۔ اب شہر شہر و قریہ قریہ اپنے وارثوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔۔۔۔۔۔"

تابان کی بات سننے کے بعد دیوی نے کہا۔ "ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ تم طویل عرصہ کسی کی غلامی میں رہے ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے خادمائیں جب تمہارا بدن صاف کر رہی تھیں تو انہیں تمہاری گردن کے عقب میں طوق کا گہرا نشان نظر آیا تھا۔"

تابان کے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہوئی۔ خود کو یونانی غلام تسلیم کر کے وہ نہ صرف ایک بڑی الجھن سے بچ گیا تھا بلکہ دیوی کی نگاہوں میں اس کا اعتماد بھی بحال ہوا تھا۔

دیوی اپنی خوبصورت جادوئی آواز میں گویا ہوئی۔ "ہمیں افسوس ہے کہ معبد کے خدمتگاروں نے تم سے ناروا سلوک کیا اور جنگلی جانوروں کا لقمہ بننے کے لیے ویرانے میں پھینک دیا۔ ذمے دار لوگوں کو قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ ہم معبد کے لیے تمہاری والہانہ عقیدت سے متاثر ہوئے ہیں۔ تم منظور نظر پجاری کی حیثیت سے اب معبد کے اسی حصے میں رہو گے۔ اپنے لیے تم جس قسم کی خدمت چاہو چن سکتے ہو لیکن فی الحال تمہیں آرام اور اچھی خوراک کی ضرورت ہے۔ ہم نے خادماؤں کو ہدایت کر دی ہے، وہ ہر طرح تمہارا خیال رکھیں گی۔"

دیوی دیوتاؤں پر تابان کو یقین نہیں تھا۔ وہ بیشتر مذہبی رسومات کو خرافات جان کر ان پر ہزار بار لعنت بھیجتا تھا۔ تاہم اس وقت دیوی کی خوشنودی اس کی ضرورت تھی۔ اس نے ہاتھ ناف پر باندھ کر سر دیوی کے حضور جھکایا اور بولا۔

"غلام کی زبان اظہار تشکر سے عاجز ہے۔ اس معذوری کے لیے اسے معاف کیا جائے۔" دیوی کی مہربان آنکھوں سے کچھ اور ملائمت جھانکنے لگی۔ تابان نے لہجے میں عقیدتیں سمیٹ کر کہا۔ "دیوتا گواہ ہیں، میں اس قابل نہیں تھا کہ آپ جیسی عظیم المرتبت دیوی مجھے خاک

سے اٹھا کر اپنے قدموں میں جگہ دیتی اور اپنی پاک نگاہوں سے میرے چہرے کی دید سے آلودہ کرتی۔۔۔۔۔۔"

دیوی نے کہا۔ "اس کے لیے تمہیں ہم سے زیادہ مہادیوی مارشا کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔"

مارشا کا نام تابان کے کانوں میں سماعت شکن دھماکے کی طرح گونجا۔ سینے کے اندر سے ایک سرد لہر اٹھی اور سنسنی بن کر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ "مم۔۔۔۔۔۔مارشا!" اس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں، مہادیوی مارشا۔ انہی کی ہدایت پر تمہیں معبد کے اندر لایا گیا ہے۔ وہ تمہاری حالت زار دیکھ چکی تھیں اور تمہاری دلجوئی چاہتی تھیں۔"

تابان پر شادی مرگ کی کیفیت طوری تھی۔ ذہن میں تند و تیز آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ جیسے خواب میں گویا ہوا۔ "لیکن۔۔۔۔۔۔۔مہادیوی نے مجھے کیسے دیکھا؟"

دیوی بولی۔ "جو انسان سے بالاتر ہوتا ہے اس کی نگاہ بھی وہاں تک دیکھتی ہے جہاں تک انسان نہیں دیکھ سکتا۔"

"کیا۔۔۔۔۔ کیا میں مہادیوی کو دیکھ سکتا ہوں؟" تابان گھگھیایا۔

"ہاں، لیکن۔۔۔۔۔۔ چھ چاندوں کے بعد۔ جب بہار کے آغاز میں سالانہ عبادت کے موقع پر مہادیوی عام لوگوں کے سامنے آئیں گی۔"

"کیا۔۔۔۔۔۔ اس سے پیشتر یہ ممکن نہیں۔"

"نہیں۔۔۔۔۔۔" دیوی نے جواب دیا۔ "صرف ایک صورت ہو سکتی ہے، کسی خاص سبب سے مہادیوی تمہیں خود اپنے حضور طلب کر لیں۔"

"اے قابل صد احترام دیوی! کیا میری درخواست کسی طور مہادیوی کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے؟"

یکایک زرنگار تخت پر بیٹھی اور گلابی مرغولوں میں ڈوبتی ابھرتی دیوی کے تیور بدل گئے۔ وہ ترش آواز میں بولی۔ "ہم تمہاری آنکھوں میں نادانی کی چمک دیکھ رہے ہیں۔ تمہارے لہجے سے ایک پجاری کی بجائے ایک مرد کے لہجے کی بو آ رہی ہے۔ اپنی زبان کو حرکت دیتے ہوئے یہ مت بھولو کہ تم جس ہستی کے بارے میں بات کر رہے ہو وہ تمہارے تصورات

سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔ وہ نہ صرف اس معبد میں محترم ترین ہے بلکہ دیوتاؤں کی مجلس میں بھی اسے ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔۔۔۔۔۔"

تابان کو دیوی کی پُر پیچ دھمکی سمجھ میں نہیں آئی لیکن دیوی کے چہرے کی جلالی کیفیت اس کے لیے ناقابل فہم نہیں تھی۔ درحقیقت تابان کے دل کا چور پکڑا گیا تھا۔ دیوی نے جو ردعمل ظاہر کیا، وہ درست تھا۔ شہزادی مارشا کے بارے بات کرتے ہوئے تابان کے ذہن میں ایک مقدس دیوی کا نہیں ایک ایسی دوشیزہ کا تصور تھا جو اس کے لیے روئے زمین پر محبوب ترین تھی اور جس کی قربت کی خاطر وہ آگ اور خون کے سمندروں میں سے رواں دواں گزر سکتا تھا۔ شاید یہی جذبات اس کی آنکھوں میں بھی چھلک گئے تھے۔ دیوی کی تلخ نوائی نے تابان کو ہونٹ سینے پر مجبور کر دیا۔ اس نے صورت پر ندامت طاری کی اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں تھوڑی دیر ایک نہایت بوجھل خاموشی طاری رہی۔ ایسی خاموشی جس میں دھڑکن سنائی دے اور سانس کی آمد و رفت صدا بن جائے۔ یوں لگا جیسے کائنات میں ہر شے تھم گئی ہے۔ اگر کوئی چیز متحرک ہے تو وہ گلابی دھند کے خوشبودار مرغولے ہیں یا دیوی کی وہ مرمریں انگلیاں ہیں جنہیں وہ دھیرے دھیرے اپنی ایک انگشتری پر حرکت دے رہی

ہے۔ تابان کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ وہ ایک بہادر اور بے خوف شخص تھا لیکن جس ماحول میں آگیا تھا، یہاں اجنبیت اور پراسراریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کچھ معلوم نہیں تھا کس لمحے کیا ہو جائے۔ کس غلطی کی سزا میں آنکھوں سے نیزے گزار دیئے جائیں اور کس بات پر خوش ہو کر دیوتاؤں کا مقرب بنا دیا جائے۔ چند لمحے کے جاں گسل انتظار کے بعد دیوی کی نقرئی گھنٹیوں جیسی آواز ابھری۔ اس کا لہجہ ایک بار پھر نرم اور دھیما تھا۔ وہ گفتگو کا موضوع بھی بدل چکی تھی۔ اس نے کہا۔

"باہر کی دنیا کا کچھ حال اپنی زبان سے سناؤ۔ کہا جاتا ہے کچھ لوگ سکندر کو دیوتاؤں کا درجہ دے رہے ہیں کیونکہ اس نے گورڈیم کے مندر میں کھڑی گاڑی کا جوا کھولا ہے؟"

تابان نے کہا۔ "اے مقدس دیوی! بے شک ایسا ہوا ہے۔ غلام کسی اور رائے کا اظہار تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہے کہ سکندر مقدونوی تیزی سے پیش قدمی کر رہا ہے اور مفتوحہ علاقوں میں لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں وہ اب باب سلیشیا سے گزرنے والا ہے۔ اس کا مطلب ہے بہت جلد ایرانی سپاہ سے اس کا بڑا معرکہ ہونے والا ہے۔"

تابان کو دیوی کے چہرے پر عجیب سا رنگ نظر آیا۔ بے حد حسین و جمیل اور بارعب ہونے کے باوجود اس گھڑی وہ تابان کو ایک عام سی دوشیزہ لگی، جو تابان سے اس چار دیواری کے باہر کے حالات پوچھ رہی تھی اور مستقبل سے آگاہی کی خواہشمند نظر آتی تھی۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ پتہ نہیں یہ کون لڑکی ہے جسے مذہب کے خود ساختہ آقاؤں نے زرتار لباس پہنا کر اور بھاری بھرکم زیورات سے لاد کر دیوی کی مسند پر بٹھا دیا ہے اور اس کی معصوم فطرت کے گرد عزت و احترام کی اونچی دیواریں چن دی ہیں۔ اس گھڑی تابان کو دمشق کے اس عظیم معبد کی یہ عظیم دیوی قابل رحم نظر آئی۔ اپنے ماحول میں گھٹی ہوئی، سمٹی ہوئی اور گمراہ عقیدوں کی گلابی دھند میں کھینچ کھینچ کر سانس لیتی ہوئی۔

دیوی نے تابان سے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا واقعی سکندر یونانی دیوتا زیوس کا بیٹا ہے؟"

تابان نے کہا "آپ کو میرا خیال جان کر یقینا مایوسی ہو گی، کیونکہ میں دیوی دیوتاؤں کو مانتا ہی نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔۔ ہاں میں نے یونان اور ایران میں عام لوگوں کو یہ ضرور کہتے سنا ہے کہ سکندر اوتار ہے اور وہ ایک روز پوری دنیا پر حکمرانی کرے گا۔"

دیوی اب بڑے غور سے تابان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "تم دیوی دیوتاؤں کو کیوں نہیں مانتے؟ کیا تمہیں دیوتاؤں کے مظاہر نظر نہیں آتے؟ کیا اس معبد میں جو کچھ تمہیں نظر آرہا ہے وہ غیر معمولی نہیں؟ یہ نقرئی گھنٹیاں، یہ دیواروں سے پھوٹتی ہوئی روشنی، یہ گلابی دھند، یہ دیواروں کا شق ہونا، یہ پُراسرار خوشبوؤں کا چکرانا ۔۔۔۔۔۔"

تابان نے اطمینان سے کہا۔ "اگر آپ مجھے معاف کریں تو میں انہیں شعبدے کہوں گا۔ یہ مظاہر نہیں ہیں کیونکہ اس کے پیچھے انسانی ہاتھ کارفرما ہے۔"

دیوی کے چہرے پر عجیب سا رنگ بکھر گیا، جیسے تابان نے اسکے دل کی گہرائی میں کسی چیز کو چھولیا ہو لیکن اگلے ہی لمحے یہ رنگ اس کے شاہانہ تیوروں میں چھپ گیا۔ وہ برہمی سے بولی۔ "اے نادان شخص! تجھے ان در و دیار میں زبان کھولتے ہوئے احتیاط سے کام لینا ہوگا ۔۔۔۔۔۔۔ یہاں کی موت بہت اذیت ناک ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تابان کے شب و روز اسی چھت تلے حسیناؤں کے جھرمٹ میں بسر ہونے لگے۔ وہ بحیرہ ایجئین کے سواحل پر بھٹکتا بھٹکتا اچانک ایک دیومالائی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ یہ اس وسیع و عریض معبد اور یہاں کی پُراسرار بھول بھلیوں کی دنیا تھی۔ وہ بہت کچھ دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس کی حیرتوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک عجب "دورنگے" ماحول میں آگیا تھا۔ یہ ماحول اوپر سے جتنا روشن اور مقدس تھا اندر سے اتنا ہی تاریک اور گناہ آلود تھا۔ تابان دھیرے دھیرے معاملات کی تہہ تک پہنچتا جا رہا تھا۔ اس معبد کے اصل منتظم وہ پانچ بوڑھے تھے جنہیں یہاں مقدس ارواح کا نام دیا جاتا تھا۔ ہر مقدس روح کے زیر سایہ تین کاہن تھے۔ ہر کاہن دس پجاریوں پر حکم رکھتا تھا۔ ان سب لوگوں کے دو چہرے تھے۔ ایک وہ پارسا چہرہ جو دسویں روز لوگوں کے سامنے آتا تھا اور دوسرا وہ جس کے ساتھ وہ نو روز لہو و لعب میں رہتے تھے۔ لوگوں کے سامنے جو کی نمکین روٹی پانی میں بھگو کر کھانے والے پس پردہ مرغن غذائیں کھاتے تھے۔ نشہ آور مشروبات پیتے تھے اور نرم و گداز بستروں پر سوتے تھے۔ معبد کی خدمتگار دوشیزائیں ان کے سر مونڈتی تھیں، ان کے چربائے جسموں پر زیتون کی مالش کرتی تھیں اور ان کی خوابگاہوں کو مہکاتی تھیں ۔۔۔۔۔۔۔ عبادات کے نام پر رقص و سرور کی محفلیں جمانا اور ملک کے دور

دراز حصوں سے آئی ہوئی خدمتگار دوشیزاؤں کی نمائش لگا کر انہیں اپنی خلوتوں کے لیے چننا یہاں کے کاہنوں کے محبوب مشاغل تھے۔ پانچوں "مقدس ارواح" اس معبد کے تمام امور پر کڑی نگاہ رکھتی تھیں اور ضوابط کی خلاف ورزی کرنے والے کاہنوں وپجاریوں کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ یہ دیویاں بھی مقدس ارواح کے زیر اثر رہتی تھیں۔

تابان کو معلوم ہوا کہ مقدس ارواح یعنی وہ پانچ سفید ریش بوڑھے اس وقت معبد میں نہیں ہیں بقول دیوی انگبیں وہ لبنان کے ایک ساحلی جزیرے میں مصروف عبادت تھے اور اگلے ماہ تک انہیں وہیں رہنا تھا۔ یہ ان مقدس ارواح کی غیر موجودگی تھی جس سے حوصلہ پا کر مہادیوی نے تابان کو معبد میں بلوا لیا تھا اور ایک پجاری کی حیثیت سے یہاں رکھا ہوا تھا۔ تابان کے ذہن میں شب وروز ایک ہی سوال کلبلا رہا تھا۔ مہادیوی اسے کب شرف ملاقات بخشے گی، وہ کب اسے اپنے حضور طلب کرے گی؟ شاید آج۔۔۔۔۔۔۔ شاید آج۔ ہر دن اسی امید سے طلوع ہوتا تھا اور مایوسی کا اندھیرا اوڑھ کر شب کے غار میں اتر جاتا تھا۔ وہ شاید اس پر ایک نظر کرم ڈالنے کے بعد بھول ہی گئی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ کوئی اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کیسے اور کب سے تڑپ رہا ہے۔ شب وروز کا ہر ایک پل ایک بھاری

پتھر تھا جو تابان کے سینے کو روندتا ہوا اس پر سے گزر رہا تھا۔ کبھی کبھی بے قراری حد سے بڑھتی تو وہ دل سے پکار اٹھتا۔۔۔۔۔۔۔ "تم کہاں ہو مارشا، کیوں مجھے نیم بسمل چھوڑ دیا، اگر مجھے اپنی دید کا سزاوار نہیں ٹھہرانا تھا تو یہاں لانے کی مہربانی بھی کیوں کی؟ مجھے انہی اندھیروں میں غرق رہنے دیا ہوتا جہاں امید کی کوئی کرن میرے سینے کو چھلنی نہیں کرتی تھی۔ مجھ پر رحم کر شہزادی، میں تھک گیا ہوں، میں ٹوٹ رہا ہوں، میرا اور امتحان مت لے۔"

کبھی جب وہ بہت اداس اپنی خوابگاہ کے گداز بستر پر چت لیٹا ہوتا اچانک کانوں میں نقرئی قہقہے گونج اٹھتے۔ وہ دیکھتا حسین دوشیزاؤں کا کوئی پرا اس کے روبرو ہے۔ وہ اپنی خوبصورت اداؤں سے اس کا دل بہلاتیں، اسے سرور آور مشروب پلاتیں، بہترین میوہ جات طلائی طشتوں میں سجا کر اس کے سامنے رکھتیں۔ ان کی آنکھوں میں تابان کے لیے پھول کھلے رہتے۔ ان کے ہر انداز سے عیاں رہتا کہ وہ تابان کی تنہائیاں دور کرنے کی آرزومند ہیں۔ ایسے میں تابان شدید الجھن کا شکار ہو جاتا۔ کبھی وہ سوچتا اسے ان حسیناؤں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ سلطنت حسن وجمال کی اس عظیم ملکہ کی موجودگی میں ان دوشیزاؤں کی طرف

رجوع توہین حسن کے مترادف ہے لیکن کبھی اس کی سوچ مختلف رخ اختیار کر لیتی۔ وہ سوچتا شاید یہاں یہ سب کچھ مہمان نوازی کے زمرے میں آتا ہے، وہ اس خاطر مدارات کو ٹھکرا کر اپنے میزبان کو ناراض کر لے گا۔ وہ پہروں اس الجھن میں گرفتار رہتا۔ آخر فیصلہ "رفاقت" کی بجائے "تنہائی" کے حق میں ہوتا۔ وہ میزبان دوشیزاؤں کو واپس بھیجتا اور تصور میں ایک من موہنی صورت سجا کر آنکھیں موند لیتا۔

کسی وقت ایسا بھی ہوتا کہ اچانک کمرے میں ایک خوشبو پھیلتی اور گلابی دھند بھرنا شروع ہو جاتی۔ پھر ایکا ایکی اس دھند میں دیوی انگبین نمودار ہوتی۔ وہ تابان کا ہاتھ تھامتی اور اسے لے کر کمرے کے ایک گوشے میں مرمریں تخت پر جا بیٹھتی۔ اس تخت کے عقب سے ہفت رنگ پانی کا فوارہ پھوٹتا تھا اور جلترنگ کی مدھم آواز سنائی دیتی رہتی تھی۔ وہ دیر تک تابان کے پاس بیٹھتی اور باتیں کرتی۔ تابان کی بے باکی اور بے خوفی اسے متاثر کرتی تھی۔ تابان اسے متبرک دیوی کی بجائے عام عورت کی حیثیت سے مخاطب کرتا تو وہ جز بز ہوتی لیکن دلی طور پر اسے یہ سب کچھ اچھا لگتا اور وہ ایک بار پھر بے ادبی و بے تکلفی سے مخاطب ہونے کی خواہشمند رہتی۔ لگتا تھا وہ مدتوں سے شدید گھٹن کا شکار ہے اور "مقدس ارواح" کے جانے

سے اسے کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع ملا ہے۔ وہ اس ساری تازہ ہوا کو سینے میں بھر کر جسم و جاں میں سمو لینا چاہتی تھی۔ کبھی کبھی تابان کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی جھلک نظر آتی، ایسے میں وہ تابان کے کھردرے ہاتھ اپنے نرم ہاتھوں میں لیتی اور اس کے حساس ہونٹ شدت سے لرزاں ہو جاتے۔

ایک روز ایسے ہی موقعے پر جب تابان کے ہاتھ دیوی انگبین کے ہاتھوں میں تھے اور ہفت رنگ پانی کی پھوار موسیقی بکھیر رہی تھی۔ اچانک ایک قد آدم کھڑکی کا شیشہ چھناکے سے چکنا چور ہو گیا۔ گلابی دھند کے مرغولے تیزی سے راہداری میں پہنچنے لگے۔ وہاں موجود خادماؤں اور کنیزوں نے ہذیانی انداز میں چلانا شروع کر دیا۔ جیسے یہ گلابی دھند نہ ہو، موت کا بادل ہو۔ تابان نے دیکھا دیوی انگبین کا چہرہ سرسوں کی طرح زرد ہو گیا ہے۔ وہ ہراساں نگاہوں سے کھڑکی کے خلاء کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور مخصوص دروازہ کھول کر کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے دھند خارج ہوتی رہی اور آخر کمرہ دھند سے خالی ہو گیا۔ تابان اپنی جگہ حیران کھڑا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی انہونا واقعہ ہوا ہے۔

اگلے دو تین یوم اسے انگبیں دیوی کہیں دکھائی نہیں دی۔ ہاں خدمتگار دوشیزائیں گاہے بگاہے جھلک دکھاتی رہیں۔ نہ جانے کیوں تابان کو محسوس ہو رہا تھا کہ ان در و دیوار میں شہزادی مارشا اسے دیکھتی ہے۔ اس کی حسین و جمیل آنکھیں ہر گھڑی اس کی نگران رہتی ہیں۔ اسے یقین ہوتا چلا جا رہا تھا کہ ان کمروں اور دالانوں میں ضرور کچھ ایسی جگہیں ہیں جہاں سے اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ شاید اس روز بھی کوئی اسے دیکھ رہا تھا اور انگبیں دیوی سے اس کی قربت برداشت نہیں کر سکا تھا۔ نتیجے میں کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا تھا اور راہداری میں چیخم دھاڑ مچی تھی۔ کیا اس واقعے کا سبب شہزادی مارشا تھی؟ یہ سوال تابان کے ذہن میں ابھرتا تو کیف کی ایک لہر اس کے سر سے پاؤں تک دوڑ جاتی۔ یہ تصور اس کے لیے اتنا خوبصورت تھا کہ وہ خمار آلود ہواؤں میں پرواز کرنے لگتا۔ شہزادی مارشا نے یہ بات ناپسند کی تھی کہ انگبیں دیوی اس سے میل جول بڑھائے۔ اس نے ایسا کیوں سوچا تھا؟ کیا وہ کسی رقیبانہ جذبے کا شکار ہوئی تھی؟ تابان جانتا تھا، رقیبانہ جذبات، محبت اور وابستگی میں شدت پیدا کرتے ہیں۔ اس

کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر انگبیں سے ملے، پھر انگبیں کے ہاتھ اس کے ہاتھوں میں ہوں۔ پھر وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں کھو جائیں، اور پھر کسی کی "جھلاہٹ" رنگین شیشے کو چکنا چور کر دے۔

کافی انتظار کے باوجود جب انگبیں دیوی نے دوبارہ اپنی صورت نہیں دکھائی تو تابان نے خدمت گار دوشیزاؤں کے سامنے مدعا بیان کیا۔ وہ سنتی رہی اور کھلکھلا کر ہنستی رہیں۔ ان کی شوخ نگاہیں تابان کے دل کا حال جاننے کے لیے بے قرار تھیں۔ تابان کو معبد کے باہر سے اس طلسم کدے میں لانے والی کنیز بھی ان دوشیزاؤں میں موجود تھی۔ وہ مرتبے اور حیثیت میں دوسری دوشیزاؤں سے ممتاز تھی۔ اس نے تابان کی بات دھیان سے سنی اور کہا کہ وہ یہ پیغام ابھی انگبیں دیوی تک پہنچا دے گی۔

اسی روز شام کو انگبیں دیوی پھر اس کے روبرو تھی۔ گلابی دھند میں لپٹی، گھنٹیوں کی صدائیں ڈوبتی ابھرتی، معطر جھونکے اسے حصار میں لیے ہوئے تھے۔ آج وہ تابان کو خاموش اور متفکر نظر آئی۔ اس کی گفتگو میں پہلے سی بے باکی تھی اور نہ آنکھوں میں پیغام رسانی کی کیفیت۔

"تم نے ہمیں کیوں بلایا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تنہائی سے گھبرا کر، آپ کو دیکھنے اور آپ سے گفتگو کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔" تابان نے روانی سے جواب دیا۔

"تم یہاں تنہا نہیں ہو۔ تمہاری خدمت کے لیے حسین دوشیزائیں موجود ہیں۔ خوش گفتار کنیزیں ہیں، موسیقی ہے، بہترین کھانے ہیں، آرام دہ ماحول ہے، اب اور تمہیں کیا چاہیے؟"

"سب کچھ ہے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ آپ نہیں ہیں۔ اس سے تو بہتر تھا کہ مجھے اس ویرانے میں ہی پڑا رہنے دیا ہوتا، جنگلی جانور مجھے لقمہ بنا لیتے۔ آپ کو دیکھنے کے بعد، آپ کو نہ دیکھنے کا عذاب تو نہ سہنا پڑتا۔ کاش۔۔۔۔۔۔۔ اے کاش میری زبان کو اتنی سکت ہو کہ میں آپ کے حسن کی تعریف کر سکوں۔ اس درد کا ماجرا بیان کر سکوں جو آپ کی من موہنی صورت دیکھنے کے بعد میرے دل میں جاگ اٹھا ہے۔۔۔۔۔۔۔"

اس نے خوش گفتاری کے دریا بہا دیئے۔ حسن و عشق سے متعلق بہترین الفاظ کو فقروں میں موتیوں کی طرح پرو کر انگبیں دیوی کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ متزلزل ہونے لگی۔ اس کی

حسین آنکھوں میں اضطراب تھا۔ یہ آنکھیں گاہے گاہے بے قراری سے دائیں بائیں دیکھنے لگتی تھیں۔ وہ تھکے تھکے انداز میں سنگ مرمر کے تخت پر بیٹھ گئی۔ دھیمی آواز میں بولی۔

"گفتگو کرتے ہوئے تمہارے لیے لازم ہے کہ زبان کو قابو میں رکھو۔ اس جگہ کی اہمیت اور ہماری حیثیت کو پہچانو۔ ہم کوئی عام دوشیزہ نہیں ہیں جو تم قصیدہ گوئی سے ہماری سوچوں کی طنابیں اپنے ہاتھ میں لے لوگے۔"

تابان بولا۔ "یہ قصیدہ گوئی نہیں۔ میرے دل کی صدا ہے۔ میں اس بات کو فراموش نہیں کر رہا کہ آپ یہاں ایک معتبر و مقدس ہستی ہیں لیکن آپ بھی یہ مت بھولیں کہ آپ انسان ہیں۔۔۔۔۔۔۔ آپ کو دیوی کہہ کر جو عزت و احترام بخشا جا رہا ہے، اس نے آپ کو یکسر تنہا کر دیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی کی طرح جو عظمت کا نشان ہوتی ہے لیکن اکیلی ہوتی ہے۔"

انگبیں دیوی کے چہرے پر مد و جزر تھا۔ تابان کی باتیں اس کے دل پر اثر کر رہی تھیں۔ تابان نے حوصلہ پا کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ اپنے لہجے میں بے پناہ عاجزی سمیٹ کر بولا۔ "اپنے خول سے نکلیے، سونے چاندی کی ان منقش دیواروں کو اپنے اطراف سے ہٹا دیجیئے۔ کھلی فضا

میں سانس لیجیے۔۔۔۔۔۔۔ ان دیواروں سے باہر ابھی دنیا حسین ہے۔ پھولوں پر بھنورے منڈلاتے ہیں، چشموں میں پانی گنگناتا ہے اور پرندے مسرت و شادمانی کے گیت گاتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔"

"خاموش ہو جاؤ مہمان۔" انگبین دیوی نے بے قراری سے کہا۔ "تم یہاں کے دستور سے واقف نہیں، تمہیں معلوم نہیں یہاں بغاوت کرنے والوں سے کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کا احسان مانو کہ مقدس ارواح اس وقت معبد سے دور ہیں، ورنہ اب تک تم جل کر راکھ ہو گئے ہوتے یا آدم خور چونٹیوں سے بھرے ہوئے کسی غار میں پھینک دیئے گئے ہوتے۔"

تابان نے انگبین دیوی کے ہاتھوں پر اپنی گرفت اور مستحکم کر دی۔ "مجھے مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا مت کرو دیوی۔ حال کی بات کرو۔ اس وقت کی بات کرو، بیت جانے والی صدیوں سے ہمارا کوئی واسطہ ہے نہ آنے والے زمانوں سے کوئی تعلق۔ جو کچھ ہے، بس یہی ایک لمحہ ہے جو میری اور تمہاری مٹھی میں ہے۔"

تابان نے دیوی کو آپ کی بجائے، تم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس واشگاف گستاخی نے اسے برہم کر دیا لیکن یہ برہمی اس کی زبان تک نہیں آ سکی۔ وہ کسمسا کر رہ گئی۔ تابان نے بے باکی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "مجھ سے دور مت جانا دیوی، تم دور جاتی ہو تو موت میرے ارد گرد منڈلانے لگتی ہے۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔"

انگبین دیوی نے شدید الجھن میں اپنا زیریں ہونٹ کاٹا پھر دھیمی آواز میں بولی۔ "اس وقت میرا جانا ضروری ہے، میں پھر آؤں گی۔"

"کب؟" تابان نے بے تابی سے کہا۔

"معلوم نہیں" وہ بولی اور تابان پر ایک گداز نگاہ ڈالتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اس کے بعد وہ اکثر تابان کے پاس آنے لگی۔ کسی وقت تابان کی خلوت گاہ کا دروازہ بے آواز کھلتا اور دھندلے مرغولے فرش سے چھت تک ہر شے کو ڈھانپنے لگتے۔ جب یہ دھند ایک خاص حد تک گہری ہو جاتی تو انگبین دیوی خوابناک انداز میں تابان کے پاس آ بیٹھتی۔ وہ تابان کی زبان سے اپنے حسن کے قصیدے سن کر لطف اندوز ہوتی۔ تابان کی بے باک گفتگو سے

ایک ایسی تازگی کا احساس دلاتی جس کا کبھی اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس کے اندر بھی عورت کی یہ ازلی خواہش موجود تھی کہ اس کی مدح کی جائے، اسے یہ باور کرایا جائے کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورتوں میں سے ایک ہے۔ تابان اس کی یہ خواہش بہ احسن طریق پوری کرتا تھا۔ وہ بولتا اور وہ ایک ادائے دلربائی سے بیٹھی رہتی۔ گاہے گاہے اسے ٹوکتی، گاہے حوصلہ دیتی۔ جب تابان کا کوئی توصیفی فقرہ اس کے دل کو چھوتا تو اس کی آنکھوں میں غرور حسن کچھ اور نمایاں ہو جاتا۔

ایک شام تابان اسی طرح اس کے قدموں میں بیٹھا مدح سرائی میں مصروف تھا کہ اچانک خلوت گاہ میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ روشنی جو آئینہ دیواروں سے پھوٹتی تھی ایک دم ہی گم ہو گئی تھی۔ "انگبیں کہاں ہو تم؟" تابان نے پکار کر کہا۔ لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

اس نے انگبیں کو چھونے کے لیے ادھر اُدھر ہاتھ لہرائے لیکن صرف اس کے دامن کو چھو سکا۔ پھر یہ دامن بھی اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔

"انگبیں!" اس نے دوبارہ آواز بلند کی۔

ایک شدید دھکا اسے لگا اور وہ جیسے اڑتا ہوا ایک دیوار سے جا ٹکرایا۔ سر کے عقبی حصے میں شدید چوٹ آئی۔ وہ لڑکھڑا کر قالین پر گرا لیکن پھر فورا سنبھل گیا۔ اس کے اندر کا تربیت یافتہ لڑاکا لمحوں میں بیدار ہو گیا تھا۔ "کون ہے؟" اس نے چلا کر پوچھا۔ تب اسے دوبارہ دھکیلا گیا۔ یہ وار پہلے سے بھی شدید تھا۔ یوں لگا جیسے کئی آدمیوں نے بیک وقت اسے دھکا دیا ہو۔ اس مرتبہ وہ ہفت رنگ پانی کے فوارے سے ٹکرایا اور اس کا بالائی حصہ توڑتے ہوئے نیچے گر گیا۔ چند لمحوں بعد کمرا پھر روشنی سے بھر گیا۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ نہ انگبیں دیوی، نہ اسے دھکیلنے والا، اور نہ وہ شخص جس نے روشنی کو اندھیرے میں اور پھر اندھیرے کو روشنی میں بدلا تھا۔ شکستہ فوارے کی منتشر پھوار قالین کو دور تک بھگو رہی تھی ------ کمرے میں رنگین دھند اب بھی موجود تھی لیکن مرغولے تحلیل ہوتے چلے جا رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسی روز شام کو ایک حسین و جمیل کنیز تابان کی خلوت گاہ میں داخل ہوئی۔ ایسی خوش لباس اور آن بان والی عورت تابان نے اس معبد میں پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ وہ ہر لحاظ سے منفرد

اور ممتاز نظر آتی تھی۔ اس نے اپنی دلنشین آواز میں تابان کو اطلاع دی کہ آج رات ٹھیک دوسرے پہر اس کی ملاقات معبد کی سب سے اہم شخصیت سے ہو گی۔

"کون ہے وہ؟" تابان نے بے ساختہ دریافت کیا۔

"مہادیوی!" جواب ملا۔

تابان کے لیے یہ لمحہ شادی مرگ کا تھا۔ اسے لگا کہ وہ کوئی حسین خواب دیکھ رہا ہے۔ ابھی آنکھ کھلے گی اور "بیداری" کی کمان سے نکل کر "حقیقت" کا سنسناتا تیر اس کے جگر سے پار ہو جائے گا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں خوش لباس و خوش اندام کنیز کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ پھر بے پناہ کوشش سے اس نے ہونٹوں کو جنبش دی۔ "کہاں ہو گی یہ ملاقات؟"

"قصر نور میں۔" مختصر جواب ملا۔ اس کے ساتھ ہی کنیز نے رخ پھیرا اور کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی تابان کی خدمت گار دوشیزائیں بھرا مار کر اندر گھس آئیں۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کے علاوہ حیرت کے جذبات تھے۔ وہ تابان کو یوں دیکھ رہی تھیں جیسے پہلی بار

دیکھا ہو۔ تابان کو اس معبد میں لانے والی کنیز کا نام درمانہ تھا۔ اس نے تابان کو مبارکباد دی۔ اس کے بعد سب مبارکباد دینے لگیں۔

درمانہ نے کہا۔ "مہادیوی مارشا نے آپ کو ملاقات کا شرف بخشا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آج کے بعد آپ اس معبد میں ایک اہم پجاری کی حیثیت سے پہچانے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے آپ کو کاہن کا درجہ دے دیا جائے۔"

پھر درمانہ، تابان کو مہادیوی کے حضور پیش ہونے کے آداب سمجھانے لگی۔ یہ بہت لمبی چوڑی روئیداد تھی۔ ایک ایک رسم اور دستور سے تابان کو روشناس کرایا گیا۔ قصر نور میں پہلا قدم کیسے رکھنا ہو گا۔ مہادیوی کے حضور کس انداز میں تعظیم پیش کرنا ہو گی، دوران گفتگو کیا القاب استعمال کرنا ہوں گے۔ نگاہ کہاں رکھنا ہو گی۔ ہاتھ کہاں رکھنا ہوں گے۔ یہ ساری باتیں اس شخص کو سمجھائی جا رہی تھیں جس نے آج تک کسی قاعدے اور ضابطے کی پرواہ نہیں کی تھی، جو ہر محفل میں اپنے ہی قاعدے سے داخل ہو کر اپنے ہی انداز سے رخصت ہوا تھا لیکن آج وہ خود بھی ان قواعد و ضوابط کو دھیان سے سن رہا تھا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا یہ انمول موقع کسی وجہ سے اور کسی قیمت پر ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا جب دو کنیزیں تابان کے پاس پہنچیں۔ یہ قصرِ نور کی انتہائی خوش لباس اور عطر بیز کنیزیں تھیں۔ اس وقت تک تابان کو ایک سفید لباس پہنا کر تیار کیا جا چکا تھا اور تر و تازہ پھولوں کا ایک نہایت خوبصورت دستہ سجا کر اس کے پاس رکھ دیا گیا تھا۔ دونوں کنیزوں کی معیت میں وہ قصرِ نور کی طرف روانہ ہوا۔ چند طویل راہداریوں سے گزر کر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں عمارت کی تعمیر میں صرف سفید پتھر استعمال کیا گیا تھا۔ یہاں ہر چیز سے بلا کی نفاست ٹپکتی تھی۔ راہداریوں میں بھی سفید رنگ کے بیش قیمت قالین بچھے تھے اور اطراف میں خوبصورت فانوس جگمگا رہے تھے۔ معبد کے اس حصے میں کنیزوں اور خادماؤں کے لباس سفید تھے اور ان پر سفید چمکیلے دھاگوں سے قصرِ نور کے الفاظ کڑھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ مذہبی عبارات ایسی خوبصورتی سے تحریر کی گئی تھیں کہ انہوں نے دیدہ زیب پھول بوٹوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تابان کے ہاتھ میں جو گلدستہ تھمایا گیا تھا اس میں بھی تمام تر پھول سفید تھے۔ یوں لگتا تھا معبد کے اس اہم ترین حصے میں سفید رنگ کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ایک وسیع و عریض ایوان میں پہنچ کر کنیزیں اس سے جدا ہو گئیں۔ ایک بہت بڑے محرابی دروازے میں سفید ریشم کا دبیز پردہ جھول رہا تھا۔ یہاں دو قوی ہیکل سیاہ فام افراد کھڑے تھے۔ وہ غیر معمولی طور پر دراز قد

اور چوڑے چکلے تھے۔ ان کے بدن پر مختصر سا سفید لباس تھا۔ ان کی غیر انسانی آنکھوں میں جھانک کر تابان جیسے شخص کو بھی جھرجھری آ گئی۔ وہ سو فیصد دو خون آشام جانوروں کی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی تھی۔ یہ پہلے مرد تھے جو تابان نے ان در و دیوار میں دیکھے تھے۔ نہ جانے کیوں تابان کی چھٹی حس گواہی دینے لگی کہ آج تاریک کمرے میں اسے زوردار طریقے سے دھکیلنے والے حملہ آور یہی تھے۔ ممکن تھا وہ دونوں ہوں یا ان میں سے کوئی ایک ہو۔ وہ دونوں حبشی کچھ دیر تابان کو گھورتے رہے پھر ان میں سے ایک نے سر جھکا کر کہا۔

"خوش آمدید معزز مہمان! مہادیوی آپ کو شرف ملاقات بخشنا چاہتی ہیں۔" حبشی کا لہجہ بے لچک اور چہرہ چٹان کی طرح سخت تھا۔

تابان نے قدم آگے بڑھایا۔ دونوں حبشی حرکت میں آئے۔ اس وقت تابان پر یہ عجیب انکشاف ہوا کہ وہ دونوں دراصل ایک ہی جسم کا حصہ ہیں۔ وہ توامی تھے، ان کے پہلو ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ وہ ایک ساتھ حرکت کرتے تھے اور اکٹھے ہی قدم اٹھاتے تھے۔ محرابی دروازے میں داخل ہونے سے پہلے وہ دونوں جھکے اور گھٹنوں اور ہتھیلیوں پر

چوپایوں کی طرح چلنے لگے۔ وہ تابان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تابان ان کی منشاء سمجھ گیا۔ وہ بھی گھٹنوں اور ہتھیلیوں پر جھک گیا۔ دبیز پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوئے۔ یہاں کامل سکوت تھا۔ سفید دیواروں سے سفید روشنی پھوٹتی تھی اور گھنٹیوں کی مدہم صدا مسلسل آرہی تھی۔ طویل راہداری میں توامی بھائیوں کے ساتھ گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے تابان کو عجب بے ڈھنگے پن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ بدستور موجود تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور محرابی دروازہ ان کی راہ میں حائل ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر توامی بھائی رک گئے۔ آنکھوں آنکھوں میں انہوں نے تابان کو سمجھایا کہ اس سے آگے وہ تنہا جائے گا۔ تابان کا سینہ عجب طرح کے جوش اور ولولے سے بھر گیا۔ وہ محرابی دروازے سے اندر داخل ہوا تو سامنے ایک وسیع ایوان تھا۔ ایوان کا ہر منظر دودھیا دھند میں دھندلایا ہوا تھا۔ فرش سے نیم دائرے کی شکل میں سفید سیڑھیاں اٹھتی تھیں اور قد آدم بلندی پر جا کر اوجھل ہو جاتی تھیں۔ تابان کو ہدایت تھی کہ جب تک دیوی کی طرف سے اجازت نہ ہو وہ سر اٹھائے اور نہ سیدھا کھڑا ہونے کی کوشش کرے۔ تابان سیدھا تو کھڑا نہیں ہوا لیکن سر اٹھانے سے باز نہیں رہ سکا۔

تھوڑی دیر بعد کوئی سیڑھیوں کے بالائی سرے پر براجمان ہو گیا۔ وہاں کوئی تخت یا تخت نما چیز تھی جو تابان کو نظر نہیں آرہی تھی۔

"سر اٹھاؤ۔"

ایک آواز تابان کے کانوں سے ٹکرائی اور اس کی روح میں ہزار ہا سفید گلاب کھلا گئی۔ یہ مارشا کی آواز تھی۔ وہ اس آواز کو کیونکر بھول سکتا تھا۔ وہ دوزانو بیٹھ گیا اور اپنی "طلب" کی ساری شدتیں آنکھوں میں سمیٹ کر اس سفید ہیولے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک چمکیلے سفید لبادے میں تھی۔ اس کے سر پر ایک سفید تاج تھا جس میں سے شعاعیں پھوٹتی تھیں اور آنکھوں کو پتھرا دیتی تھیں۔ تابان نے اس کا چہرہ دیکھا اور دیکھتا چلا گیا۔ اس کا جی چاہا، اس کی آنکھیں پھیل جائیں۔۔۔۔۔۔۔ بہت وسیع و عریض ہو جائیں۔ پھر وہ ان آنکھوں کو پورا کھول دے اور اپنے محبوب ترین چہرے کا سارا حسن اپنی پتلیوں میں سمیٹنے کی کوشش کرے۔ ان دو معمولی آنکھوں سے وہ ایسی بے پایاں خوبصورتی کہاں دیکھ سکتا تھا۔ اسے اپنی بصارت کی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا۔ اسے لگا اس کی کنپٹیاں پھٹ جائیں گی اور وہ خود بھی ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر جائے گا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن بکھرنے اور مر مٹنے کے ڈر سے وہ اپنی نظریں نہیں پھیر سکتا تھا۔ ایسا کرنا اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔ وہ دیکھتا رہا اور کم ظرف آنکھوں پر خیرہ کن جلوؤں کا عذاب سہتا رہا۔ پھر ایکا ایکی نہ جانے اسے کیا ہوا۔ وہ درمانہ کی

ساری ہدایات بھول کر اور تمام قاعدوں ضابطوں کو پس پشت ڈال کر اٹھا۔۔۔۔۔۔۔ اور شفاف سیڑھیاں چڑھتا ہوا مارشا کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ پھولوں کے دستے اور اس کے ہاتھوں نے ایک ساتھ دو مرمریں پاؤں کو چھوا۔ یہ قیامت کا لمس تھا۔ تابان کو اپنے ہاتھوں پر رشک آنے لگا، کتنے خوش قسمت تھے اس کے ہاتھ اور کتنا بانصیب تھا وہ خود۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر مارشا کی طرف دیکھا، اس کی شفاف جھیل جیسی آنکھوں میں خفگی کا تلاطم تھا۔

"غلام!" اس کی شعلہ شبنم آواز ایوان میں گونجی۔ "کیا تمہیں ان آداب سے آگاہ نہیں کیا گیا جنہیں قصرِ نور میں ملحوظ رکھنا لازم ہے؟"

"آگاہ کیا گیا تھا دیوی۔۔۔۔۔۔ لیکن میں بھول گیا۔ میرے حواس کو اتنی مجال کہاں کہ آپ کے جلووں کے سامنے معطل نہ ہوں۔ میری یادداشت کو اتنا یارہ نہیں کہ آپ کو روبرو دیکھ کر بھی میرا ساتھ دے۔ مجھے معاف کریں دیوی۔ اپنے کم نگاہ غلام کو اپنے بے بہا حسن کے صدقے معاف کریں۔"

"ان زینوں سے نیچے اترو اور سیاہ دائرے سے باہر دوزانو بیٹھو۔" تابان نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

تھوڑی دیر ایوان میں ایک جان لیوا سکوت طاری رہا۔ تابان کو محسوس ہو رہا تھا وہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہے۔ کشش ثقل اثر دکھائے گی تو وہ کہیں بھی جا گرے گا۔ کسی پہاڑ پر، کسی سمندر میں، کسی جنگل میں یا بچھوؤں اور زہریلے حشرات سے بھرے ہوئے کسی غار میں۔ وہ ایک گستاخی کر چکا تھا اور اس کی سزا کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ آخر مارشا کی آواز ایوان میں گونجی۔

"ہمیں معلوم ہوا تھا کہ تم اس معبد کے ایک ادنیٰ خادم بن کر یہاں رہنا چاہتے تھے لیکن ایک پجاری اور چند خادمین کی طرف سے تمہارے ساتھ ناروا سلوک ہوا اور تمہیں جسمانی اذیت پہنچا کر معبد سے باہر پھینک دیا گیا۔ ہم نے تمہیں بے چارگی کی حالت میں دیکھا تو اس معبد میں بلا لیا لیکن۔۔۔۔۔۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تم ایسے اخلاقی دیوالیہ پن کا ثبوت دو گے۔ ہم تمہیں یہاں بلوا کر شرمندہ ہیں۔"

تابان نے اپنے دل کی تمام چاہت اور لگن لہجے میں سمیٹتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسا ہی ہے تو مجھے سزا سنائیے۔ مجھے یہاں کے سفاک ترین جلادوں کے سپرد کر دیجیے۔ آپ کی دل شکنی کے

بعد مجھے بھی اب زندہ رہنا قبول نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔۔۔ آپ کو اپنے ہی حسن سلوک کا واسطہ مجھے میری خطا ضرور بتا دیجیے۔"

"ہم بتانا ضروری نہیں سمجھتے۔ تم خود بھی جانتے ہو کہ یہاں آنے کے بعد تمہاری مصروفیات کیا رہی ہیں۔ یہ بات مت بھولو کہ اس معبد میں کچھ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے ۔۔۔۔۔۔۔ تم اب یہاں نہیں رہ سکتے۔ جتنی جلد ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔"

تابان نے کہا۔ "مجھے کڑی سے کڑی سزا دیجیے لیکن ان در و بام سے جدا نہ کیجیے۔ اس چار دیواری سے باہر دنیا میرے لیے ایک لق و دق ریگستان ہے۔" اس کی آواز میں ٹھہراؤ اور آنکھوں میں التجا تھی۔

"یہ فیصلہ اٹل ہے۔" مارشا کی بارعب آواز گونجی۔ "تمہیں ہر صورت یہ معبد چھوڑنا ہو گا لیکن آج شب تمہیں اس معبد میں رکھنا ہماری مجبوری ہے۔ کل سورج طلوع ہونے کے فورا بعد تم یہاں سے چلے جاؤ گے۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

تابان نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے لیکن اس وقت شہزادی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اس نے ایک چھوٹا سا نقرئی عصاء کسی ٹھوس شے پر مارا۔ جلترنگ کی آواز ابھری۔ تابان کے

عقب میں ایوان کا در وا ہوا اور دونوں عجیب الخلقت حبشی چوپایوں کی طرح چلتے اندر داخل ہو گئے۔

"چلئے معزز مہمان۔" ان میں سے ایک نے تابان سے کہا۔

تابان نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ یہ فیصلہ اٹل ہے اور اگر تابان نے تعمیل نہیں کی تو اس سے تعمیل کرائی جائے گی۔ اس نے ایک طویل سرد آہ کھینچی۔ ان زینوں کی طرف دیکھا جہاں تھوڑی دیر قبل اس کے جان و دل کی ملکہ مجسم شباب و رعنائی کی ایک شان بے نیازی سے بیٹھی تھی۔۔۔۔۔۔۔ اب وہاں سفید دھند کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے عجیب الخلقت حبشیوں کے ہمراہ ہو لیا۔

تابان کا خیال تھا کہ اسے واپس انگبیں کے قصر میں پہنچا دیا جائے گا، جہاں شب گزارنے کے بعد صبح سویرے اسے معبد سے نکلنا ہو گا لیکن اسے ایک خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا جب توامی حبشی اسے لے کر قصرِ نورہی کے ایک آرام دہ کمرے میں پہنچ گئے۔ خوبصورت انداز میں سجا ہوا یہ کمرہ کسی شاہی محل کا حصہ لگتا تھا۔ قالین ایسا گداز کہ پاؤں دھنس جائیں۔ فانوس اور غالیچے ایسے خوبصورت کہ نگاہیں دھنس اور مسہری ایسی آرام دہ کہ لیٹنے والا سرتاپا دھنس

جائے۔ ایک بھینی سی خوشبو نے ہر چیز کو لپیٹ میں لے رکھا تھا اس خوشبو جیسی لطیف اور مسحور کن ایک دوشیزہ بھی اس جگہ موجود تھی۔

تابان کے ذہن پر مختلف خیالات کی یورش تھی۔ وہ اس وقت مکمل تنہائی چاہتا تھا۔ اس نے اپنی حرکات و سکنات سے خدمت گار دوشیزہ کو احساس دلایا کہ وہ اب آرام کرنا چاہتا ہے لہٰذا اب وہ خوابگاہ سے رخصت ہو جائے لیکن وہ بدستور اس کے سرہانے جمی کھڑی رہی۔ آخر تابان کو اس سے تخلیئے کا کہنا پڑا۔ وہ اپنی دلنشین آواز میں بولی۔

"آپ کے پاس موجود رہنے کا مجھے حکم ہے۔"

تابان نے کہا۔ "لیکن اب میں سونا چاہتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "میری ذمے داری یہی ہے کہ آپ کو محو خواب نہ ہونے دیا جائے۔"

"لیکن کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ یہاں صرف آرام کر سکتے ہیں، سو نہیں سکتے۔"

"اس کی وجہ؟"

خادمہ چند لمحے تذبذب میں رہی۔۔۔۔۔۔ پھر بولی۔ "اس کی وجہ وہ گفتگو ہے جو آپ سوتے میں کرتے ہیں۔ قصرِ نور میں ایسی گفتگو کی گنجائش موجود نہیں ہے۔"

تابان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ "گفتگو؟ کیسی گفتگو؟" اس نے پوچھا۔

وہ بولی۔ "شاید آپ ابھی تک بے خبر ہیں، آپ ہر رات مہادیوی کو پکارتے ہیں لیکن انہیں دیوی کہنے کے بجائے شہزادی کہتے ہیں اور اس کے ساتھ ان کا نام بھی لیتے ہیں۔ یہ قصرِ نور ہے یہاں کوئی شخص مہادیوی یا پانچ مقدس ارواح کو ان کے نام سے پکارنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔"

تابان سٹپٹا کر رہ گیا۔ یہ اطلاع تابان کے لیے بالکل نئی تھی۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ اس کے دل کا چور اسے غافل پا کر رات کی تاریکی میں باہر نکلتا ہے اور اس کی محبت کا ڈھنڈورا پیٹنے لگتا ہے لیکن فوراً ہی اسے ایک خوشگوار احساس بھی ہوا۔ ایک مسرت بھری لہر اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ اس کا مطلب تھا شہزادی مارشا اس کی بے قراریوں سے آگاہ تھی ۔۔۔۔۔۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کس مرض میں گرفتار ہے اور اس کی دوا کیا ہے ۔۔۔۔۔۔ یہ کوئی معمولی پیش رفت نہیں تھی۔ تابان کو خود یہ بات کہتے ہوئے شاید ایک

مدت لگ جاتی۔ معلوم نہیں کب تک وہ یوں اظہار محبت کا حوصلہ نہ کر پاتا لیکن اسکے جذبے کی شدت نے آپوں آپ اس کی راہیں آسان کر دی تھیں۔ اس کے سینے میں موجزن سمندر نے اچھل کر ایک لہر کناروں سے باہر پھینک دی تھی۔ یہ لہر دور تک گئی تھی اور اب اس معبد میں بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ دیوانہ کس کا "دیوانہ" ہے۔

تابان خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کی رگ رگ میں مسرت ناچ اٹھی۔ وہ دیر تک اس خیال میں مست کمرے میں چکراتا رہا کہ شہزادی مارشا پر اس کی وحشتوں کا راز کھل چکا ہے۔ اب واقعات کا بہاؤ اس کی سمجھ میں آرہا تھا۔ اس کا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ شہزادی مارشا نہ صرف اسے دیکھتی رہی ہے بلکہ دیوی انگبیں کی طرف اس کا جھکاؤ بھی اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہا۔ اب تابان اس جاں افزاء خیال کو دل میں جگہ دے سکتا تھا کہ اسے قصرِ نور میں طلب کیے جانے کا سبب جذبہ رقابت ہے۔ یعنی شہزادی مارشا نے اپنے دیوانے کو کسی اور کی "دیوانگی" میں مبتلا پا کر جبیں پر شکن نمودار کی تھی اور اسے یہاں بلا بھیجا تھا۔

تابان حیرت کے دریا میں بہتا رہا اور اپنی گوناگوں سوچوں میں کھویا رہا۔ وہ سوچنے لگا یونانی افواج کے ساتھ مشرقی ساحلوں پر گشت کرتے کرتے وہ کسی طلسم خانے میں آنکلا ہے۔ وہ جو

کچھ یہاں دیکھ چکا تھا اور دیکھ رہا تھا سب ایک واہمے کی مانند تھا۔ ایک اسرار کے بعد دوسرا اسرار سامنے آرہا تھا۔ اس معبد کی شکستہ دیواروں کے اندر پیچ در پیچ راہداریوں اور ایوانوں میں ایسی رنگین دنیا آباد ہو گی کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ نڈھال ہو کر گداز مسہری پر گر گیا اور سوچنے لگا۔ اگر وہ اس معبد سے واپس گیا اور اس نے جا کر اپنے ساتھیوں کو یہاں کے حالات بتائے تو کیا وہ اس پر یقین کریں گے، اسے فاترالعقل تو نہیں سمجھا جائے گا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ شہزادی مارشا نے اسے یہاں صبح تک رکھنے کو اپنی مجبوری بتایا تھا۔ یہ کیا مجبوری تھی؟ اس نے یہ سوال سرہانے کھڑی خدمت گار دوشیزہ سے پوچھا تو وہ خاموش رہی۔ شاید اس کا قیاس تھا کہ تابان بھی خاموش ہو جائے گا لیکن وہ اتنی جلدی ہتھیار پھینکنے والا نہیں تھا۔ اس نے بار بار اصرار کیا، یہاں تک کہ خادمہ ہراساں نظر آنے لگی۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"معزز مہمان! آپ یہاں دھیمے لہجے میں بات کریں۔ مقدس ارواح جو کچھ عرصے سے عبادت میں مصروف تھیں، معبد میں واپس آچکی ہیں۔ ان کا ٹھکانہ اسی قصرِ نور میں ہے۔

مقدس ارواح رات بھر جاگتی ہیں، اسی سبب آپ کو فی الحال قصرِ نور سے باہر نہیں نکالا جا سکتا۔"

تابان خدمتگار دوشیزہ سے "ارواح" کے بارے میں مختلف سوال کرنے لگا۔ ارواح کہاں رہتی ہیں؟ وہ مہادیوی سے کب ملتی ہیں؟ کیا واقعی وہ ہزاروں سال سے زندہ ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالوں نے خدمت گار دوشیزہ کو سخت پریشان کر دیا۔ وہ تابان سے بار بار خاموش رہنے کی التجا کر رہی تھی۔ آخر تابان نے اس کے حال پر رحم کیا اور خاموشی اختیار کرتے ہوئے بستر پر نیم دراز ہو گیا۔

نہ جانے شب کی وہ کون سی گھڑی تھی جب اس کے کمرے میں تعینات خادمہ اچانک اٹھ کر باہر نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی کوئی اندر داخل ہوا۔ آنے والے کو دیکھ کر تابان کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ایک بار پھر اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ شہزادی مارشا تھی۔ اس وقت بھی وہ سفید لبادے میں تھی تاہم یہ لباس پہلے لباس سے مختلف تھا۔ حسن اس کے بدن سے شعاعوں کی طرح پھوٹ رہا تھا اور سب سے خوش کن امر یہ تھا کہ اس وقت وہ دیوی کی بجائے ایک عام انسان نظر آتی تھی۔ نہ گھنٹیوں کی صدا اس کی ہمرکاب تھی

اور نہ دھند کے مرغولے اسے گھیرے ہوئے تھے، وہ یوں آہستگی سے اندر داخل ہوئی تھی جیسے روئی کے ڈھیر پر کوئی دمکتا موتی بے آواز گر جائے۔ تابان اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس کا قوی ہیکل جسم حیرت اور مسرت کے طوفان میں تنکے کی طرح ڈول رہا تھا۔ رعب حسن نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ گھٹنوں کے بل گر جائے۔ شہزادی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اس نے سفید آنچل سے چہرہ اس طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ نقاب سے اوپر صرف آنکھیں دکھائی دیتی تھیں، وہ بغیر کسی تمہید کے بولی۔

"ہم تم سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں غلام"

تابان نے محسوس کیا کہ اب شہزادی کے لہجے میں بناوٹ نہیں ہے۔ وہ مہادیوی کے زینوں سے نیچے اتر کر شہزادی مارشا کے مقام پر آن کھڑی ہوئی ہے اور اب اسی حیثیت سے اس سے مخاطب ہے۔

تابان نے کہا۔ "غلام ہمہ تن گوش ہے شہزادی۔"

اس نے پہلی بار شہزادی کو "شہزادی" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ شہزادی نے اسے یہ لقب استعمال کرنے سے ٹوکا نہیں۔ اس کا مطلب تھا اس مقام پر ان کی گفتگو زینوں والے ایوان کی نسبت کہیں محفوظ ہے۔

شہزادی بولی۔ "تمہارا نام۔۔۔۔۔۔۔ شاید تابان ہے۔ تم نے مقدونوی حملے کے وقت ایتھنز سے نکلنے میں ہماری مدد کی تھی۔ ہمیں تمہارا وہ احسان یاد تھا اسی لیے جب ہم نے تمہیں معبد سے باہر ذلت و خواری کی حالت میں دیکھا تو یہاں بلوالیا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا تم ایسے گرے ہوئے انسان ثابت ہو گے۔ انگبیں دیوی کے قصر میں تم جسے تخلیہ سمجھتے تھے وہ تخلیہ نہیں تھا۔ تم انگبیں دیوی سے جو گفتگو کرتے تھے وہ ہمارے کانوں تک پہنچتی تھی۔ تمہاری چرب زبانی، قصیدہ گوئی، خوشامد سب کچھ ہمارے لیے طشت از بام تھا۔"

شہزادی مارشا کے "الزامات" نے تابان کی روح میں طربیہ نغمے بکھیر دیئے۔ شہزادی کے لہجے میں جھلکتی تلخی اسے شہد اور امرت سے شیریں محسوس ہوئی۔ یہ تلخی اس بات کی گواہ تھی کہ شہزادی اس کے بارے میں سوچتی ہے۔ ناراضگی کا سہی لیکن ایک تعلق ان دونوں کے درمیان موجود ہے۔

تابان سراپا عجز و انکسار ہو کر بولا۔ "شہزادی معظمہ! غلام اپنا جرم تسلیم کرتا ہے۔ میں نے بے شک مدح سرائی کی ہے۔ بہت قصیدے پڑھے ہیں اور تعریفیں کی ہیں لیکن دیوتا گواہ ہیں مخاطب وہ نہیں تھا جو سامنے تھا۔"

"تو کون تھا مخاطب؟" شہزادی نے پوچھا۔

"وہ جو سامنے نہیں تھا۔ جو اوجھل تھا لیکن سب کچھ جانتا تھا۔ میرے سارے قصیدے، میری ساری تعریفیں، میرا سارا اخراج عقیدت اسی کے لیے تھا۔"

تابان نے دیکھا شہزادی مارشا کی آنکھوں میں بے چینی نے کروٹ لی۔ اس کے مرمریں ہاتھوں کی مومی شمعوں جیسی انگلیاں ایک دوسرے سے الجھنے لگیں۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے پوچھا۔

"وہی مطلب ہے شہزادی، جو آپ سمجھ رہی ہیں۔" تابان نے عجب جراتِ رندانہ سے جواب دیا۔ "غلام حاضر ہے، سر خم ہے۔ جو چاہے سزا دیجیے۔ اس جگہ دفن کرا دیجیے۔ معبد کے گوشت خور پرندوں سے نچوا دیجیے یا ٹکڑے کروا کر جنگل میں پھینکوا دیجیے۔ جو سچ تھا وہ میں نے بیان کر دیا ہے شہزادی۔۔۔۔۔۔۔ اب مجھے کسی انجام کی پرواہ نہیں۔ موت اور موت

سے پہلے کا ہر عذاب میرے سر آنکھوں پر۔ وہ سب تعریفیں آپ کے لیے تھیں شہزادی ۔۔۔۔۔۔ وہ سارے حقیر الفاظ آپ کے حسن کو بیان کرنے کی ادنیٰ کوشش تھے، مجھے کہنے دیجیے شہزادی حضور، کہ پھر شاید کچھ کہنے سننے کا موقع نہ ملے۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا معلوم، آپ کی سماعت اور میرے نطق کے درمیان ہزارہا فلک بوس دیواریں حائل ہو جائیں، میرے مقدر کی آندھی مجھے دھکیل کر آپ سے صدیوں کے فاصلے پرلے جا پھینکے، آپ کے نصیب کے ستارے آپ کو اڑا کر کہکشاؤں کی دنیا میں لے جائیں۔۔۔۔۔۔۔ لہٰذا مجھے کہنے دیجیے شہزادی۔ وہ ساری تعریفیں آپ کے لیے تھیں۔ لفظوں کے وہ سارے نذرانے آپ کی نذر تھے۔۔۔۔۔۔ میں آپ کا مریض ہوں، میں آپ کے حسن کا گرفتار ہوں۔۔۔۔۔۔ میں دیوانہ ہوں اور میری جسارت دیکھیے، جس کے قدموں کی خاک ہوں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اسی کے عشق کا دم بھرتا ہوں۔ ہاں شہزادی! میں عشق کرتا ہوں آپ سے۔ میں نے کہا تھا ناں کہ گزرے زمانوں اور آنے والی صدیوں پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ جو کچھ بھی ہے یہی لمحے ہیں۔ میں نے ان لمحوں میں جی لیا ہے شہزادی۔ اب موت میرے لیے ایک کروٹ کے سوا اور کچھ نہیں۔ مجھے آپ ہی کی قسم آپ مجھے حکم دیجیے، میں اسی جگہ سانس روک کر خود کو ختم کر سکتا ہوں۔"

نہ جانے تابان میں اتنی جرات کہاں سے آگئی تھی کہ وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔ ایک ہی جست میں آگ اور برف کے سات سمندر پار کر گیا۔ شہزادی مبہوت کھڑی تھی۔ ششدر۔۔۔۔۔۔۔۔ بے حس و حرکت۔

آخر وہ بولی۔ اس کے بارعب لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اس نے کہا۔ "ہماری سمجھ میں اس کے سوا اور کوئی بات نہیں آتی کہ تم سچ مچ دیوانے ہو۔ ایسی ہرزہ سرائی کی جرات ایک دیوانہ ہی کر سکتا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے مخصوص انداز میں تالی بجائی۔ دروازہ کھلا، پہلے وہ کنیز داخل ہوئی جو اب تک تابان کے سرہانے موجود رہی تھی۔ پھر وہ عجیب الخلقت حبشی اندر گھس آئے۔ اس وقت وہ گھٹنوں پر نہیں چل رہے تھے، اپنے پاؤں پر کھڑے تھے۔ ان کی پُر ہیبت نگاہیں تابان پر تھیں۔

"لے جاؤ اسے اور معبد کی حدود سے باہر پھینک دو۔" شہزادی غضبناک آواز میں بولی۔

توامی پہریداروں نے تڑپ کر تابان کو گرفت میں لے لیا۔ تابان کو لگا اس کے بازو آہنی شکنجوں میں کس لیے گئے ہیں۔ وہ حیوانی طاقت کے مالک تھے۔ تابان کو سو فیصد یقین ہو گیا

کہ انگبین دیوی کے قصر میں اسے دھکیلنے والے یہی عجیب الخلقت حبشی تھے۔ انہوں نے تابان کو دروازے کی طرف کھینچا تو وہ خود کو چھڑانے کے لیے زور مارنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ پکار رہا تھا۔

"شہزادی حضور! میری بات سنیں۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میری بات بہت اہم ہے شہزادی۔"

شہزادی مارشا اس کی طرف سے رخ پھیر چکی تھی۔ توامی بھائی اسے گھسیٹتے ہوئے دروازے تک لے گئے۔ تابان نے آخری بار کوشش کی۔ "شہزادی! میں آپ سے ایک خط کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔"

خط کے ذکر پر شہزادی چونکی۔ اس نے گھوم کر تابان کی طرف دیکھا۔ "رکو!" اس نے توامی بھائیوں کو حکم دیا۔ وہ رک گئے۔ شہزادی کی ناراض آنکھیں تابان کی آنکھوں میں گڑی تھیں۔ ان شفاف آنکھوں میں حیا آلود غضب کی سرخی تھی۔ تابان ان پر ہزار جان سے فدا ہو گیا۔ وہ بولی۔ "کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" پھر اچانک جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس

نے توامی بھائیوں کو اشارہ کیا کہ وہ باہر جائیں۔ کنیز پہلے ہی باہر جا چکی تھی۔ اب تابان اور شہزادی ایک بار پھر ان دیواروں میں اکیلے تھے۔

شہزادی نے پوچھا۔ "تم کس خط کی بات کر رہے ہو؟"

تابان دھیمی آواز میں بولا۔ "وہی خط شہزادی! جو آپ نے متحدہ یونان کے سپہ سالار اعظم محترم سکندر کو لکھا تھا۔"

یہ اطلاع شہزادی کے لیے سنسنی خیز تھی۔ وہ کتنی ہی دیر بغیر پلکیں جھپکائے تابان کی طرف دیکھتی رہی۔ آخر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم اس خط کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

تابان نے کہا۔ "آپ کا خط میرے پاس موجود ہے شہزادی اور میں اسی کے سبب یہاں تک پہنچ سکا ہوں۔"

شہزادی کی سانسوں کا زیر و بم اس کے اندرونی ہیجان کا غماز تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر تابان سے کچھ اور نزدیک ہو گئی۔ اس کے "گل بدن" سے اٹھنے والی مہک تابان کے ہوش اڑا رہی تھی۔ شہزادی نے پوچھا۔ "تو تمہیں سالارِ اعظم سکندر نے بھیجا ہے؟"

"ہاں شہزادی!" تابان نے سوچا سمجھا جھوٹ بولا۔ "میں آپ کو یہاں سے نکالنے کے لیے آیا ہوں۔"

"اور کون ہے تمہارے ساتھ؟"

"میں اکیلا ہوں لیکن آپ گھبرائیں مت۔ قدرت میرا ساتھ دیتی ہے۔ میں نے آج تک ناکامی کا منہ نہیں دیکھا۔ میرا وعدہ ہے کہ میں آپ کو یہاں سے بہ آسانی نکال لے جاؤں گا۔"

"لیکن ہمارا خیال مختلف ہے۔" شہزادی نے جواب دیا۔ اگر واقعی تمہیں سالارِ اعظم نے بھیجا ہے تو ان سے اندازہ لگانے میں سخت غلطی ہوئی ہے۔ وہ اس معبد کے اسرار و رموز سے واقف نہیں۔ ہمارا یہاں سے زندہ بچ نکلنا ناممکن ہے۔"

"میں ناممکن کو ممکن بنا دوں گا شہزادی۔ میں جانتا ہوں یہ سب عیار ذہنوں کی شعبدہ بازی ہے تاکہ معبد میں آنے والے زائرین کو مرعوب کیا جا سکے۔ یقین رکھیں، آپ میری ہم رکاب ہوں گی تو کوئی شعبدہ میرا راستہ نہ روک سکے گا۔ آپ مجھے ایک موقع دیں۔"

"جو ہم دیکھ رہے ہیں، وہ تم نہیں دیکھ رہے۔ ہمارا فیصلہ اٹل ہے۔"

تابان کچھ دیر حیرت سے شہزادی کا چہرہ دیکھتا رہا۔ رعب حسن نے اس کی زبان بند کر دی تھی ۔۔۔۔۔۔۔ آخر وہ پسپائی کے انداز میں گویا ہوا۔ "تو پھر مجھے اپنے قدموں میں رہنے دیں شہزادی۔ میں آپ کو یہاں چھوڑ کر آزاد فضاؤں میں سانس لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

شہزادی نے کہا۔ "یہ کوئی مردانگی نہیں۔ ہماری آزادی چاہتے ہو تو اس معرکے میں حصہ لو جو یونانی اور ایرانی افواج کے درمیان لڑا جانے والا ہے۔ اسوس کے مقام پر دونوں افواج صف آراء ہو چکی ہیں۔ ہماری آزادی یا غلامی کا فیصلہ یہاں نہیں اسوس کے میدان میں ہو گا۔ یونانی فوج فتح یاب ہوئی تو ہم بھی آزاد ہو جائیں گے، ورنہ اس معبد کی دیواریں ہمیں مرتے دم تک رستہ نہیں دیں گی۔۔۔۔۔۔"

شہزادی کی اطلاع تابان کے لیے انکشاف انگیز تھی۔ اسے معلوم تھا عنقریب یونانی اور ایرانی افواج میں فیصلہ کن جنگ ہونے والی ہے۔ لیکن یہ جنگ سر پر آن پہنچی ہے، اسے معلوم نہیں تھا۔ اس کے سینے میں جوش لہریں لینے لگا، وہ بولا۔ "شہزادی! مجھے آپ کے حکم سے سرتابی کی جرات نہیں۔ اگر آپ مجھے میدان جنگ میں بھیجنا چاہتی ہیں تو میں سر کے بل وہاں پہنچوں گا اور آپ کا تصور نگاہوں میں سجا کر اس وقت تک برسرپیکار رہوں گا جب تک فتح

نہیں ہوتی یا زندگی میرا ساتھ نہیں چھوڑتی لیکن اس سے پہلے میری ایک درخواست ہے ۔۔۔۔۔۔ مجھے میرے انجام سے آگاہ کر دیجیے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" شہزادی کی آنکھوں میں ناگواری کا تاثر ابھرا۔

تابان نے اپنے جسم کے ہر رگ وریشے سے توانائی مجتمع کی اور نگاہیں جھکا کر بولا۔

"آپ سب کچھ سمجھ رہی ہیں شہزادی۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں اس سے زیادہ کہنے کی مجھ میں تاب نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میں ایک بدبخت عاشق ہوں اور میرے جیسے لوگ ازل سے بے نیل ومرام رہے ہیں لیکن دل پر کسی کا اختیار نہیں اور میرے بے اختیار دل میں امید کی ایک کرن روشن ہے۔ آپ ہی بتا سکتی ہیں کہ یہ کرن زندہ رہے گی یا تاریکیاں اسے نگل جائیں گی۔"

شہزادی کی آنکھوں میں ایک بار پھر حیا آلود غضب امڈ آیا۔ وہ نہایت سرد لہجے میں بولی۔

"غلام! تم ایک بے معنی سوال پوچھ رہے ہو۔ ہم اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔"

تابان نے کہا۔ "آپ جواب دیجیے، غلام ہر صدمہ سہنے کے لیے تیار ہے۔ آپ کو اپنے پیارے دیوتاؤں کا واسطہ، غلام کو جواب سے محروم نہ کیجیے۔"

شہزادی کا لہجہ کچھ اور سرد ہو گیا۔ وہ بولی۔ "تم حد سے تجاوز کر رہے ہو غلام۔۔۔۔۔۔۔ اس حد تک مت جاؤ کہ تمہاری دیوانگی بھی تمہاری سزا کے سامنے ڈھال نہ بن سکے۔"

یک لخت تابان کے سینے میں ٹمٹماتے ہوئے سینکڑوں قمقمے ایک ساتھ بجھ گئے۔ زندگی ایک بیکراں تیرگی کے سوا اور کچھ نہ رہ گئی۔ وہ کچھ دیر عجیب خود فراموشی کے عالم میں شہزادی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس گھڑی اسے شہزادی کے قدموں میں جان ہارنا اتنا سہل لگ رہا تھا کہ وہ ہزار بار "جان ہارنے" کے عمل سے گزر سکتا تھا۔ سمندر جیسے گہرے اور لق ودق صحرا جیسے ویران لہجے میں وہ بولا۔

"اگر آپ کا جواب یہی ہے شہزادی۔۔۔۔۔۔ تو پھر میں زندگی کا بوجھ اٹھائے پھرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں یہ بار گراں یہیں۔۔۔۔۔۔ اسی مقام پر اتار دینا چاہتا ہوں۔"

وہ عجب وجدانی کیفیت میں دیوار کی طرف بڑھا جہاں منقش نیاموں میں خوبصورت دستوں والی دو تلواریں آویزاں تھیں۔ اس نے بلا تامل ایک نیام کھینچ لی۔ اس دوران شہزادی مخصوص انداز میں تالی بجا چکی تھی۔ دونوں توامی حبشی تند بگولوں کی طرح اندر داخل ہوئے۔

اس سے پیشتر کہ تابان تلوار نیام سے برآمد کرتا، وہ اسے عقب سے اپنے آہنی بازوؤں میں جکڑ چکے تھے۔ تابان کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے جنونی انداز میں خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن وہ اس حیوانی گرفت سے چھٹکارا نہ پاسکا۔ اس کی گردن پر بے رحمی سے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ یکا یک تکلیف اس کے لیے نا قابل برداشت ہوگئی اور اس کا ذہن اتھاہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دوبارہ ہوش آیا تو اس نے خود کو ویرانے میں پایا۔ سر پر کھلا آسمان تھا۔ چاروں طرف جھاڑ جھنکار تھا اور وہ نہ جانے کب سے فرش خاک پر بے سدھ پڑا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے ایک زیتون پر بیٹھا جنگلی کبوتروں کا جوڑا اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ درخت کے تنے کے پاس پانی گرا ہوا تھا اور قدموں کے تازہ نشان تھے۔ تابان کو شبہ ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کوئی یہاں موجود تھا۔ وہ سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کہاں گیا وہ قصر نور؟ وہ شیشہ در و دیوار، وہ رنگین دھند کے مرغولے، وہ دوشیزاؤں کے پرے، وہ عجیب الخلقت حبشی اور ہزار سالہ بوڑھے؟ کیا وہ اب تک کوئی خواب دیکھ رہا تھا؟ اس نے اپنے جسم پر نگاہ دوڑانے کے

لیے سر جھکایا تو گردن میں شدید ٹیسیں اٹھیں۔ اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔ وہ شہزادی مارشا کے روبرو خودکشی کا ارادہ کر چکا تھا، جب آدمی پہریداروں نے اسے عقب سے دبوچ لیا تھا ۔۔۔۔۔۔ اور پھر فوراً ہی وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اسے شہزادی کا حسین سراپا یاد آیا۔ اس کے مرمریں پاؤں کا لمس، اس کے بدن سے اڈنے والی مہک، وہ دیوانہ سا ہو گیا۔ کسی غیر مرئی طاقت نے اسے جھٹکے سے اپنے پاؤں پر ایستادہ کر دیا۔ وہ کہاں تھا؟ معبد سے کتنے فاصلے پر تھا؟ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ سورج دور مغرب میں ڈوب رہا تھا۔ تابان کو لگا کہ اگر سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے اس نے اپنی محبوب کو دوبارہ نہ دیکھا تو وہ بھی موت کے اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔ وہ حرکت میں آیا اور دیوانہ وار ایک جانب بڑھنے لگا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اسے کمر پر بوجھ سا محسوس ہوا۔ اس نے دیکھا ایک تلوار اس کی کمر سے بندھی ہوئی ہے اور ڈھال اس کے کندھے سے جھول رہی ہے۔ یہ تلوار اور ڈھال اس کی تو نہیں تھی۔ تو پھر کہاں سے آئی تھی؟ کیا یہ ہتھیار اسے قصرِ نور میں باندھے گئے تھے؟ کون تھا باندھنے والا؟ کیا۔۔۔۔۔۔ کیا ایسا شہزادی مارشا کی ہدایت پر کیا گیا تھا۔ ایکا ایکی تابان کے اندر جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا اور مسرت و شادمانی کا منہ زور ریلا سینے کے ویران صحرا کو سیراب کرنے کے لیے بہہ نکلا۔۔۔۔۔۔ اگر یہ تلوار اس کی کمر

سے شہزادی مارشا کی ہدایت پر باندھی گئی تھی تو کتنا خوبصورت، کتنا دلفریب اشارہ تھا یہ ۔۔۔۔۔۔ تابان کا جی چاہا وہ اسی جگہ مر مٹے۔ اس خوبصورت کنائے پر قربان ہو جائے ۔۔۔۔۔۔ اس نے تلوار نیام سے کھینچی اور آبدیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس کی چھٹی حس گواہی دینے لگی کہ شہزادی نے اس کے بے باک سوالات کا مبہم سا جواب اس تلوار کی صورت میں دیا ہے، اس کی ساری خطائیں اور گستاخیاں معاف کر کے اس نے اسے میدان جنگ کا رستہ دکھایا ہے ۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے دل میں پکار کر بولا۔

"اے شہزادی! اے میرے دل و جان کی ملکہ! تیرے مرمریں ہاتھوں کی قسم میں اس تلوار کا حق ادا کروں گا۔ میں اس تلوار کو دشمن کا اتنا لہو پلاؤں گا کہ ہزار برس اس کے لوہے کی سرخی برقرار رہے گی ۔۔۔۔۔۔۔ یہ میرا وعدہ ہے شہزادی، تیرے ادنٰی غلام کا وعدہ ہے۔" اس نے تلوار کو بار بار بوسہ دیا۔ پھر ایک سمت کا تعین کر کے بھاگنے لگا۔ ابھی وہ سو پچاس قدم ہی دور گیا تھا کہ عقب سے اسے پکارا جانے لگا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ یہ ہوشمند کی آواز تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ہوشمند ایک اصیل جنگی گھوڑے پر سوار تیزی سے اس کی طرف

چلا آ رہا تھا۔ جلد ہی گھوڑا تابان کے قریب پہنچ گیا۔ ہوشمند چھلانگ لگا کر نیچے اترا، پھر بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔ فرطِ جذبات میں وہ بار بار تابان کی گردن کو بوسے دے رہا تھا۔

"دیوتاؤں کا شکر ہے، تمہیں ہوش آ گیا۔" وہ آبدیدہ لہجے میں بولا۔ "میں تمہارے لیے پانی ڈھونڈنے گیا تھا، واپس آ کر دیکھا تو تم غائب تھے۔"

"کیا مطلب؟" تابان نے پوچھا۔

"بتاتا ہوں، سب کچھ بتاتا ہوں۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔ وہ سامنے دھوپ میں بیٹھتے ہیں۔"

تابان ہوشمند کے ساتھ چلتا زردی مائل گھاس پر آ بیٹھا۔ قریب سے ایک خشک آب جو گزرتی تھی۔ جنگی گھوڑا ہوشمند نے ایک درخت سے باندھ دیا تھا۔ تابان نے گھوڑے کے بارے پوچھا۔ ہوشمند نے جواب دیا۔ "یہ تمہارے پاس ہی بندھا ہوا تھا"

"کس نے باندھا تھا؟"

"مجھے بھی اس بارے میں کچھ علم نہیں"

"یہ کون سی جگہ ہے؟" تابان نے پوچھا۔

"اسے "راسی کا جنگل" کہتے ہیں۔ جس معبد میں تم بچھڑ گئے تھے وہ یہاں سے دو کوس جنوب کی طرف ہے۔"

"تم یہاں کیسے پہنچے؟"

"تم پہنچے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم نہیں پہنچے۔ ہم تو تھے ہی یہاں۔ میں اور جالی اس روز سے اسی ویرانے میں بھٹک رہے ہیں۔ تمہیں کھو کر کس دل سے واپس جاتے۔۔۔۔۔۔۔ تمہاری فکر میں کتنی مرتبہ معبد کی طرف بھی گئے لیکن "عبادت کے دن" کے سوا وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ ہم دونوں روزانہ مختلف اطراف میں بھٹکنے کے لیے نکل جاتے تھے کہ شاید کہیں تمہارا سراغ ملے۔ آج میں تھکا ہارا یہاں سے گزر رہا تھا کہ گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ یہاں پہنچا تو تمہیں درخت کے نیچے بے سُدھ پڑے پایا۔ لگتا تھا تم کسی دوا کے زیر اثر ہو۔ بہت کوشش کرتا رہا لیکن تمہیں ہوش نہیں آیا۔ میرے پاس تھوڑا سا پانی تھا، وہ ختم ہو گیا۔ اب مزید پانی لینے کے لیے نکلا تھا۔ کافی دور جانا پڑا۔ واپس آیا تو تم ناپید تھے۔"

اب تابان کی سمجھ میں آیا کہ اس کے ارد گرد کس کے قدموں کے نشان تھے۔

"جالی اب کہاں ہے؟" اس نے ہوشمند سے پوچھا۔

"وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا ہو گا اور میرے انتظار میں سوکھ رہا ہو گا غالباً۔۔۔۔۔۔ چلو اب اٹھ جاؤ، باقی باتیں وہیں جا کر ہوں گی غالباً۔"

تابان جنگی گھوڑے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس گھوڑے کا تعلق بھی تلوار اور ڈھال سے ہے۔ اس کے سینے میں جوش کا طوفان گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ شدت پکڑ رہا تھا۔ اس نے ہوشمند سے پوچھا۔ "یونانی فوج کے بارے میں کچھ خبر ہے تمہیں؟"

ہوشمند کے چہرے پر بھی دبا دبا جوش نظر آنے لگا، وہ بولا۔ "یونانی فوج یہاں سے صرف ایک پہر کے سفر پر ہے، کسی بھی وقت بڑی لڑائی چھڑ سکتی ہے۔"

تابان کے چہرے پر اضطرابی کیفیت نمودار ہو گئی۔ اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر تلوار کے دستے پر گردش کر رہا تھا۔ وہ اٹھتا ہوا بولا۔ "چلو ہوشمند! جالی کی طرف چلتے ہیں۔ شاید ہمیں ابھی میدان جنگ کی طرف روانہ ہونا پڑے۔"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"ہے ایک بات۔"

"تابو! غالباً تم بہت جلدی میں ہو، کہ اپنی روئیداد بھی غالباً۔۔۔۔۔ لیکن غالباً غالباً ۔۔۔۔۔۔" ہوشمند گڑبڑا کر رہ گیا۔

تابان نے اس کا بازو پکڑا اور کھینچتا ہوا گھوڑے تک لے آیا۔ چند ہی لمحے بعد ان کا گھوڑا "راسی کے جنگل" میں سرپٹ بھاگا چلا جا رہا تھا۔

قریباً دو کوس فاصلے طے کر کے وہ ایک خشک ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں لمبی گھاس تھی اور جھاڑیاں کثرت سے اگی ہوئی تھیں۔ ایک بلند درخت پر ہوشمند اور جالی نے مچان سی تیار کر رکھی تھی۔ مچان میں آمد و رفت کے لیے رسی کی ایک سیڑھی بھی جھول رہی تھی۔ مچان تعمیر کرنے والا یقینا "بڑھئی جالی" ہی تھا۔ ہوشمند کے اندازے کے عین مطابق وہ اس وقت ہوشمند کے انتظار میں سوکھ رہا تھا۔ اس نے ہوشمند کے ساتھ تابان کو بھی دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سورج غروب ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد تابان، ہوشمند اور جالی اسوس کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ مقامی لباس میں تھے لہٰذا کسی کی نگاہ میں آنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ انہوں نے

اسوس شہر کو جانے والے راستے پر زبردست سرگرمیاں دیکھیں۔ فوجی دستے اور سامان رسد کشاں کشاں اسوس کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ایرانی سپاہی بے حد پُراعتماد اور چاق و چوبند دکھائی دیتے تھے۔ تابان، ہوشمند اور جالی ایک ہی گھوڑے پر سوار تھے۔ لہٰذا سفر سست روی سے طے ہو رہا تھا۔ وہ شہر اسوس کو اپنی طرف دائیں جانب چھوڑتے ہوئے ساحل کی طرف نکل آئے اور ایک طویل چکر کاٹ کر یونانی افواج کے جھنڈوں تک پہنچ گئے۔ حد نگاہ تک عسکری سرگرمیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یونانی و مقدونوی سپاہیوں کے حوصلے بلند تھے اور وہ جلد از جلد دشمن سے نبرد آزما ہو جانا چاہتے تھے۔

جلد ہی تابان اور ہوشمند سپہ سالار اعظم کے تجربہ کار اور معمر ترین جرنیل پارمینو تک جا پہنچے۔ پارمینو، تابان کو ذاتی طور پر گرینی کس کی جنگ میں اس کی جوانمردی کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر چکا تھا۔ اس مشاہدے کے بعد پارمینو کو یقین ہو گیا تھا کہ تابان کی بابت تین جنگجو سرداروں کو قتل کرنے کا جو واقعہ مشہور ہے وہ غلط نہیں ہو گا۔۔۔۔۔۔ اس وقت تابان کو روبرو دیکھ کر پارمینو کی بوڑھی آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک نمودار ہو گئی۔

وہ گرم جوشی سے بولا۔ "تم کہاں تھے نوجوان؟ ایسے موقعوں پر تمہارے جیسے شمشیر زنوں کو لشکر میں موجود ہونا چاہیے۔۔۔۔۔۔۔ مجھے سالارِ اعظم کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ تم اسے بتائے بغیر کہیں چلے گئے ہو۔"

تابان نے کہا۔ "محترم سردار! مجھے ہنگامی طور پر جانا پڑ گیا تھا۔ سالار اعظم کے نائب محترم بطلیموس اس سارے واقعے سے آگاہ ہیں۔ میں ان سے اجازت لے کر گیا تھا۔"

"بہر حال۔۔۔۔۔۔۔ تم فوراً اپنے دستے کی قیادت سنبھالو اور میرے اگلے حکم کا انتظار کرو۔ تمہارا دستہ اس وقت میری کمان میں ہے۔"

تابان نے سر تسلیم خم کیا اور کورنش بجا کر پارمینو کے خیمے سے باہر نکل آیا۔

تابان کا دستہ بلندی پر متعین تھا۔ یہاں سے میدان جنگ کا بیشتر حصہ ان کی نظروں کے سامنے تھا۔ یہ میدان جنگ ایک وادی کی مانند تھا۔ جس میں شمال اور جنوب سے داخل ہونے والے دونوں راستے بہت تنگ تھے۔ ایک راستے کے سرے پر شہر اسوس کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں جبکہ دوسرے راستے پر یونانی فوج اپنے پاؤں جما رہی تھی۔ دو بڑی افواج کے مقابلے کے لیے اس میدان جنگ کی وسعت بہت کم تھی۔ خاص طور پر ایرانی فوج کے لیے

یہ میدان کسی طرح بھی سازگار نہیں تھا۔۔۔۔۔۔۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ تابان کو اس کے ساتھیوں نے بتایا کہ ایرانی تین لاکھ سواروں اور بیس ہزار پیادوں کے ساتھ میدان جنگ میں آئے ہیں۔ اس کے علاوہ ساٹھ ہزار منتخب ایرانی اور تیس ہزار تنخواہ دار یونانی دریا کے دائیں کنارے پر تیار کھڑے ہیں۔ بلاشبہ یہ مرعوب کن اعداد و شمار تھے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق ایرانی فوج متحدہ یونانی فوج سے تین چار گنا بڑی تھی۔ یہ مصدقہ اطلاعات بھی موجود تھیں کہ ایرانی فوج کے پاس آتش بازی کی زبردست قوت موجود ہے اور ایرانی سالار میدان جنگ کو یونانیوں کے لیے جہنم زار بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھتے ہوئے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ شہنشاہ ایران دارا نے اپنی فوج کو اس وادی میں لا کر اپنی عددی برتری خود ہی ختم کر لی ہے۔ اب یہ امید بھی کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی آتش بازی کی قوت سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔

وہ شب جنگ کی تیاریوں میں گزری۔ علی الصبح تابان نے سکندر اور پارمینو کو دور ایک اونچی چٹان پر کھڑے پایا۔ دونوں سالار محویت سے میدان جنگ کا جائزہ لے رہے تھے۔ اندھیرے کی چادر چاک ہوتے ہی سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ اب دشمن کی صفیں اور مورچہ

بندیاں پوری طرح یونانیوں کے سامنے تھیں۔ ہلال نما خلیج پر نظر ڈالتے ہی دور تک ایرانی لشکروں کے جھنڈ اور ان کے پھڑ پھڑاتے پرچم دکھائی دیتے تھے۔ آہن پوش سواروں کی قطاریں، جنگی رتھیں اور چمکدار برچھیوں کے ہلکورے لیتے سمندر۔ ایرانی فوج میں لڑنے کے لیے دور دراز علاقوں کے لوگ جمع تھے۔ اپنی شکل وصورت اور رنگ ڈھنگ کے سبب وہ علیحدہ علیحدہ پہچانے جاتے تھے۔ ان میں تنخواہ دار یونانی حبشی اور کردستان کے پیادے نمایاں نظر آرہے تھے۔ پاس ہی صحرائی فوج کا ایک برق رفتار رسالہ اس انتظار میں کھڑا تھا کہ مقدونوی فوج قدم بڑھائے تو وہ حملہ کردے۔ میدان جنگ کے عقب میں بھی اسوس کے شہر تک ایشیائی فوج ہی نظر آرہی تھی۔

سکندر کی ہدایت پر پارمینو کے دستے بلندی سے اترے اور ساحل کے ساتھ ساتھ صفیں باندھ لیں۔ اس چال کا اثر زائل کرنے کے لیے ایرانی گھڑ سوار فوج کا ایک بڑا حصہ متحرک ہو کر پارمینو کے سامنے آگیا۔ صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ اس مقام پر یونانیوں کے مقابلے میں ایرانیوں کا پلڑا ایک دم بھاری ہو گیا ہے۔ سکندر نے تھریس کے سواروں کو اپنے پاس سے ہٹا کر پارمینو کی کمان میں بھیج دیا۔ ساتھ ہی تاکید کر دی کہ ان کی نقل و حرکت دشمن

سے خفیہ رہنی چاہیے۔ پھر علاقہ کریٹ کے تیر انداز بھی وہیں بھیج دیئے۔ سکندر کو معلوم تھا کہ اگر دوران جنگ ساحلی زمین سے پارمینو کے قدم اکھڑ گئے تو پوری یونانی فوج شکست سے دوچار ہو گی۔ تھریس اور سسلی کے شاہ سواروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس مقام پر یونانی فوج کو پیچھے نہ ہٹنے دیں اور اگر انہیں کمر کمر پانی میں مقابلہ کرنا پڑے تو بھی کریں۔ اس مقام کی اہمیت ایرانیوں پر بھی واضح تھی۔ لہٰذا وہ مسلسل اپنی قوت یہاں جھونک رہے تھے۔ تابان اپنے دستے کے ساتھ ساحل سمندر سے کوئی سو قدم کی دوری پر تعینات تھا۔ شہر دمشق کی جانب سے آنے والی ہوا اس کے لمبے بالوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ اس ہوا میں کسی کا لمس تھا، کسی کے سانسوں کی مہک تھی۔ تابان کو لگا جیسے ریشمی نقاب کے اوپر سے جھانکتی ہوئی شہزادی کی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہیں۔۔۔۔۔۔ تابان کا حوصلہ اچھل کر بے کنار ہو گیا۔ اسے دشمن کے صف بستہ جنگجو چیونٹیوں کی طرح دکھائی دیئے۔ اسے لگا دو انسانوں کے نہیں حشرات الارض کے مقابل کھڑا ہے۔

سامنے پہاڑ کی ڈھلوان پر تابان کو یونانی فوج کے قلب کا پرچم بردار نظر آرہا تھا۔ یہ لمبے گھونگریالے بالوں والا ایک دراز قد وجیہہ نوجوان تھا۔ تابان نے پہلے اس نوجوان کو نہیں

دیکھا تھا (اس سے پہلے ایک یونانی پرچم بردار تھا اور تابان اسے اچھی طرح جانتا تھا)۔ تابان نے اپنا گھوڑا بڑھا کر سالار پارمینو کے قریب کیا اور احترام سے پوچھا۔

"محترم سالار! کیا قلب کا پرچم بردار بدل دیا گیا ہے؟"

"ہاں!" پارمینو نے مختصر جواب دیا۔

"یہ نیا پرچم بردار کون ہے؟"

"اس کا نام فرال ہے۔ یہ تھسلی کا ایک بہادر جنگجو ہے۔ اس سے پہلے یہ بطلیموس کی کمان میں تھا۔"

تابان اس غیر متوقع تبدیلی پر حیران کھڑا تھا جب حبشی سردار یرغا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ وہی یرغا تھا جسے سکندر کے والد فیلقوس کا معتمد سمجھا جاتا تھا اور جس نے پہلی بار ہیلی کارنیس میں مارشا کا سراغ لگایا تھا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں تابان کے لیے محبت تھی۔ تابان نے اس کا حال احوال دریافت کیا اور کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ یرغا نے کہا۔

"اس نئے پرچم بردار کا نام فرال روز ہے۔ آج کل سالارِ اعظم سکندر اس پر بہت بھروسہ کر رہا ہے۔ سنا ہے گرینی کس کی جنگ میں جب سکندر دریا کے کنارے گر گیا تھا فرال نے سکندر پر آنے والے تین ایسے وار اپنی ڈھال پر روکے تھے جن سے سکندر کا جانبر ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ اس دن سکندر نے خوش ہو کر کہا تھا کہ وہ فرال کی تین جائز خواہشات پوری کرے گا۔ یہ جو تم فرال کے ہاتھ میں قلب کا پرچم دیکھ رہے ہو یہ اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دو ہفتے پہلے فرال نے سکندر سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ میدان جنگ میں "یونانی قلب" کا پرچم تھامنا چاہتا ہے۔ دو اور سالار بھی عرصے سے اس منصب کے خواہشمند تھے لیکن سکندر نے ان دونوں پر ترجیح دے کر فرال کو پرچم بردار بنایا ہے۔"

تابان کو اب کچھ کچھ یاد آ رہا تھا کہ اس نے فرال نامی اس نوجوان کو پہلے بھی دیکھا ہوا ہے۔ گرینی کس کی جنگ کے نازک ترین لمحات تابان کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ شاید یرغا نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔ جب سکندر دریا کے کنارے گرا تھا اور ایرانی سپاہی اس پر جھپٹے تھے تو یہ نوجوان آس پاس ہی موجود تھا۔ اس کی غیر معمولی طور پر مضبوط اور لمبی گردن سب سے جدا نظر آتی تھی۔

تابان، سردار یرغا کے پہلو میں کھڑا غور سے فرال کی حرکات و سکنات دیکھنے لگا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک مضبوط اور دلیر جنگجو نظر آتا تھا۔ اب جنگ کا طبل بس بجنے ہی والا تھا۔ ایسے لمحوں میں تجربہ کار لشکریوں کے چہرے بھی اضطراب کی آماجگاہ بن جاتے ہیں لیکن فرال بڑے اطمینان سے اپنے دستے کے ارکان سے بات چیت میں مصروف تھا۔ گاہے گاہے وہ سکندر سے ضروری ہدایات بھی لے لیتا تھا۔ سکندر اور فرال سے تابان کافی فاصلے پر تھا لہٰذا اس بات کا امکان نہیں تھا کہ سکندر تابان کو دیکھ سکے گا۔ تابان نے دمشق سے واپس آ کر ابھی تک سکندر کا سامنا نہیں کیا تھا اور ابھی کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا سالارِ اعظم اس سے خفا ہے وہ اس "خفگی" کو میدان جنگ میں اپنی شجاعت اور ہنر مندی کے مظاہرے سے کم کرنا چاہتا تھا۔ جنگ میں فتح ہو جاتی تو سالار اعظم کا سامنا کرنا اور بھی آسان ہو جاتا۔ کیونکہ ایسی صورت میں سالارِ اعظم کا مزاج خوشگوار ہوتا اور وہ تابان کی اچانک غیر حاضری کو زیادہ اہمیت نہ دیتے اور عین ممکن تھا کہ بازپرس کی نوبت ہی نہ آتی۔

دور سے تابان نے دیکھا کہ سکندر نے جنگ کی ابتدائی کارروائی کے طور پر اپنے چند گھڑ سوار دستوں کو حرکت دی اور وہ منظم طریقے سے گھوڑے بھگاتے ان ڈھلوانوں کی طرف

بڑھے جہاں ایرانی فوج کے دستے ٹولیوں کی صورت میں جمے کھڑے تھے۔ یہ ایرانی جنگی ترتیب میں نہیں تھے۔ لگتا تھا کہ وہ جنگ کی بجائے دھوپ سینکنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ سکندر کے بھیجے ہوئے گھڑ سواروں نے ان پر حملہ کیا اور معمولی جھڑپوں کے بعد ان سے ڈھلوانیں خالی کرا لیں۔ ڈھلوانیں خالی ہوتے ہی سکندر نے اپنی فوج کے بہترین حصے کو حرکت دی اور چند سو گز آگے بڑھ گیا۔ اس کی یہ پیش قدمی بظاہر غیر اہم لیکن حقیقت میں دوررس نتائج کی حامل تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب اصل جنگ کا آغاز ہوا۔ ایرانی فوج نے سب سے پہلے وہی قدم اٹھایا جس کا اندیشہ سکندر اور اس کے مشیروں کو کل سے پریشان کر رہا تھا۔ ہزاروں گھڑ سواروں پر مشتمل بھاری ہتھیاروں والے ایرانی رسالے نے دریا میں اتر کر حملہ کر دیا۔ وہ بے پناہ تیزی کے ساتھ تِھسلی و تھریس کے سواروں پر آ گرے۔ یہاں یونانی فوج کی قیادت بوڑھے مقدونوی سالار پارمینو کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے بڑی دانشمندی سے صف بند کر رکھی تھی۔ ہر سپاہی اپنی جگہ چٹان کی طرح جم گیا۔ یونانی فوج کے برچھی بردار پیادے اپنی مخصوص حکمت عملی سے لڑ رہے تھے۔ برچھی برداروں کی کئی صفیں آگے پیچھے کھڑی

تھیں۔ سب سے اگلی قطار کی برچھیاں چھوٹی اور ہلکی پھلکی تھیں۔ دوسری قطار کی برچھیاں نسبتاً طویل اور وزنی تھیں۔ اسی طرح آخری قطار کی برچھیاں قریباً ساڑھے پانچ گز طویل تھیں۔ یہ تمام قطاریں جب یکجا ہو کر سامنے آتی تھیں تو دشمن کے پسینے چھوٹ جاتے تھے ۔۔۔۔۔ لمحوں میں دریا کا پانی انسانی خون سے سرخ ہو گیا۔ سر پکی فصل کی طرح گرنے لگے اور ہتھیاروں کی جھنکار زخمیوں کی چیخ و پکار سے ہم آہنگ ہو کر قیامت خیز ہو گئی۔ ایرانی گھڑ سواروں کے لبِ ساحل آ جانے سے ایرانی لشکر کے ایک حصے میں خلا سا نمودار ہو گیا تھا۔ یہ خلا سکندر کی نگاہ میں تھا۔ وہ اپنے تند و تیز گھڑ سوار دستوں کے ساتھ لڑائی میں کودنے کو بالکل تیار تھا۔ جو ڈھلوانیں اس نے ایرانی سپاہیوں سے خالی کروائی تھیں اور جنہیں انہوں نے بغیر کسی خاص مزاحمت کے خالی بھی کر دیا تھا اس وقت سکندر کے لیے بے حد سود مند ثابت ہو سکتی تھیں۔

جب لبِ ساحل لڑائی جم کر ہونے لگی اور یونانی سپاہیوں نے ایرانی رسالے کے سامنے خم ٹھونک لیا تو سکندر نے اپنے ہزاروں گھڑ سواروں کے ساتھ گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور اس خلا کی طرف بڑھا جسے وہ دیر سے للچائی نگاہوں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ یونانی رسالے کی رفتار بے حد

تباہ کن تھی اور اس کا سبب وہ ڈھلوان تھی جس پر سکندر کے گھوڑے فراٹے بھرتے ہوئے جا رہے تھے۔ جب سکندر ایرانی فوج سے ٹکرایا تو اس کے زرہ پوش سواروں کی ہراول صفیں کئی سو قدم تک ایرانی لشکر کو چیرتی اور ادھیڑتی چلی گئیں۔ ان کی حیثیت پہاڑ کے ایک ایسے حصے کی تھی جو شدید بارشوں سے منہدم ہو کر اچانک نشیبی بستیوں پر جا پڑے۔ ایرانی فوج میں دور تک گھسنے کے بعد یونانی فوج نے اچانک رخ پھیرا اور بائیں پہلو سے ایرانیوں پر شدید حملہ کر دیا۔ یہ فیصلہ کن معرکہ تھا۔ سکندر کی ولولہ انگیز قیادت اس کے جانبازوں میں ایک نئی روح پھونک رہی تھی اور یہ روح غیر محسوس طور پر پورے لشکر میں سرایت کر چکی تھی۔ فتح سے پہلے ہی انہیں یقین ہو رہا تھا کہ وہ فتح مند ہوں گے۔ خون کے اچھلتے فواروں، کٹے سروں اور پھڑکتے لاشوں کے درمیان یونانی آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ عقب میں موجود پیادہ فوج تک جا پہنچے۔

دوسری طرف ساحل کے ہموار میدان میں لڑائی اپنے عروج پر تھی۔ پارمینو جانتا تھا کہ اگر اس مقام سے یونانی فوج پیچھے ہٹ گئی تو دلیری سے آگے بڑھتا ہوا سکندر گھر کر رہ جائے گا۔ وہ اپنے سرداروں اور جوانوں سے بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ "ہر شخص اپنی جگہ ایک قلعہ

کی طرح جم جائے۔ ہم نے یہاں دشمن کا راستہ روک لیا تو سمجھو نصف فتح حاصل کرلی۔"

ایرانی رسالے کا حملہ بے حد شدید تھا۔ تابان اور اس کے ساتھیوں کی ڈھالیں خزاں رسیدہ پتوں کی مانند لرز رہی تھیں۔ وہ قدم قدم پیچھے ہٹ رہے تھے اور ہر قدم پر مزاحمت کر رہے تھے۔ آخر تابان نے خود کو گھٹنوں گھٹنوں پانی میں پایا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے سپاہی چند قدم مزید پیچھے ہٹے تو دریا کا بہاؤ ان کے پاؤں اکھاڑ دے گا۔ قریباً دس ایرانی حملہ آوروں کی ایک ٹولی خطرناک حد تک آگے آچکی تھی۔ تابان کے دل نے گواہی دی کہ حملے کی شدت کو کم کرنے کے لیے اس ٹولی کو روکنا ہو گا۔ اس نے پار مینو کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا پھر دو جانباز سپاہیوں کے ساتھ پانی میں غوطہ زن ہو گیا۔ غوطہ زن ہونے سے پہلے ان تینوں نے ڈھالیں اور خود وغیرہ جسموں سے علیحدہ کر دیئے تھے۔ اب ان کے ہاتھوں میں تیز دھار خنجر تھے۔ زیر آب تیرتے ہوئے وہ تینوں اس ٹولی کے قریب پہنچ گئے اور یک لخت حملہ کر کے کم از کم پانچ ایرانیوں کو قتل کر ڈالا۔ باقی خوفزدہ ہو کر ادھر اُدھر بکھر گئے۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ اچانک کیا افتار آن پڑی ہے۔ اس کامیابی سے تابان اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے بلند ہوئے۔ انہوں نے پانی کے نیچے ہی نیچے تیر کر ایرانی سپاہیوں پر چند

اور جان لیوا حملے کئے۔ ایرانی حملے کی شدت ذرا کم ہوئی تو پار مینو نے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر بھرپور جوابی ہلہ بول دیا اور دریا کے عین وسط میں قدم جما لیے۔

قریباً یہی وقت تھا جب میدان جنگ کے مرکزی جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ سکندر کے طوفانی دستوں نے زبردست آہنگ اور تال میل کے ساتھ ایرانیوں پر فیصلہ کن ضرب لگائی۔ ہزاروں آزمودہ کار لشکری فردِ واحد کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے مقابلے میں ایرانی کسی خاص نظم وضبط اور مزاحمت کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ زبردست دباؤ کے سامنے وہ منتشر ہونا شروع ہوئے۔ شہنشاہ ایران دارا اپنے رتھ میں سوار تھا۔ اس کی بہترین فوج کا بڑا حصہ ابھی تک محفوظ تھا۔ وہ اس وقت تدبر اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیتا تو شاید یونانیوں کو اتنی جلدی یہ تاریخی فتح نصیب نہ ہوتی۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن بڑھتے ہوئے دباؤ کے سامنے دارا کے اعصاب اچانک چکنا چور ہو گئے۔۔۔۔۔۔۔ اس نے رتھ بان کو رتھ موڑنے کا حکم دیا اور میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر افواج کے زیروزبر حوصلے دفعتاً مسمار ہو گئے۔ ایکا ایکی بھگدڑ مچ گئی۔ اس بھگدڑ میں دارا کا رتھ بھی پھنس گیا۔ اس نے گھبرا کر رتھ سے چھلانگ لگائی اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا۔ ذرا ہی دیر بعد اپنے بادشاہ کے نقش قدم پر

چلتی ہوئی ایرانی فوج وادی کے تنگ راستے میں پھنس کر رہ گئی۔ سکندر کے لشکری خون آشام عفریتوں کی طرح ان کے تعاقب میں تھے۔ تنگ درے میں ایرانی فوج کا زبردست جانی نقصان ہوا۔ تیر اور نیزے اس پھنسی ہوئی فوج پر موسلا دھار بارش کی طرح برسے۔ یونانی تلواروں نے انہیں گاجر، مولی کی طرح کاٹا اور لمحوں میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ سکندر نے اپنے گھڑ سوار دستوں کو بھاگتے دشمن کے تعاقب کا حکم دیا۔ پار مینو نے بھی اپنے کچھ دستوں کو اس تعاقب میں شریک کر دیا۔ ان میں تابان کا دستہ بھی شامل تھا۔

اونچی نیچی گھاٹیوں اور غیر ہموار میدانوں میں یہ ایک پُر جوش تعاقب تھا۔ تابان اپنے آگے سینکڑوں بھگوڑے سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جان بچانے کے لیے پورا زور لگا رہے تھے۔ انہیں نیزوں میں پرونا اور تیروں سے چھلنی کر کے گھوڑوں تلے روند جانا جنگ کا حصہ تھا اور سنسنی خیز تجربہ بھی۔ شہزادی مارشا کی دی ہوئی تلوار تابان کے ہاتھ میں تھی اور وہ اس تلوار کو انسانی خون سے سیراب کر رہا تھا۔ ایک عجیب وحشت سی اس پر طاری تھی۔ دشمن کے گوشت میں دھنستی ہوئی تلوار اسکے بازو کو عجب فرحت بخش رہی تھی۔ سکندر کا حکم تھا کہ تعاقب اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک ایرانی تباہ و برباد ہو کر منتشر نہیں ہو جاتے۔

لٰہذا یہ ایک طویل سفر ثابت ہوا۔ پہاڑی بھول بھلیوں میں، جنگلوں میں، دشوار راستوں پر ہر جگہ غنیم کا پیچھا کر کے اسے نیست و نابود کیا گیا۔

مشرقی افواج کو ایسے سخت تعاقب سے پہلی مرتبہ پالا پڑا تھا لٰہذا وہ بری طرح پٹ رہی تھیں۔ ان کا نظم و ضبط پارہ پارہ ہو چکا تھا اور اب وہ خود پارہ پارہ ہو رہے تھے۔

تابان کو پیچھے کا بھی خیال تھا۔ اس کا دھیان رہ رہ کر دمشق کی طرف جا رہا تھا معلوم نہیں وہاں کیا صورت حال پیش آئی تھی۔ معبد پر قبضہ ہوا تھا یا نہیں؟ وہ جلد از جلد وہاں پہنچنا چاہتا تھا لیکن سکندر کی مزید ناراضگی مول لینا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا، اسے جو فرائض سونپے گئے ہیں بہ احسن طریق انجام دے۔ قریباً تین روز تعاقب کی سنسنی خیزی اور بھاگ دوڑ میں گزر گئے۔ تابان اپنے دستے کے ساتھ ایک ساحلی جنگل میں دور تک نکل گیا تھا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے اسے ڈیڑھ دن مزید لگ گیا۔ وہ واپس اسوس پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ جنگ کے بعد کے ضروری امور انجام دیئے جا چکے ہیں۔ زخمی شفاخانوں میں پہنچ چکے ہیں، مرنے والے یونانیوں و مقدونیوں کی آخری رسوم ادا ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ نئی تقرریاں بھی عمل میں آ چکی ہیں۔ اب متحدہ یونانی فوج جشن فتح منا رہی تھی۔ دارا کی شاہی

خیمہ گاہ فاتح سالاروں کے قبضے میں تھی۔ یہ ایک شاندار خیمہ گاہ تھی۔ شامیانوں میں رنگین فانوسوں کے اندر چراغ جھلملا رہے تھے۔ فرش پر اعلیٰ درجے کے قالین تھے۔ یہاں تابان نے سنگِ سلیمانی کے چھوٹے چھوٹے حوض دیکھے، جن میں خوشبودار پانی بھرا تھا۔ حوضوں کے کنارے چاندے کے آفتابے تھے اور منقش طلائی ڈبوں میں ابٹنار کھا تھا۔ پوری خواب گاہ میں پکوانوں کی مہک تھی اور نشہ آور مشروب کے جام چکرا رہے تھے۔

یہیں ایک جگہ تابان کو خوبصورت ڈھال اور بہت مضبوط کمان رکھی نظر آئی۔ اسے بتایا گیا کہ یہ شہنشاہ ایران کے ہتھیار ہیں اور نمائش کے لیے رکھے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دارا یہ اشیاء رتھ میں ہی چھوڑ بھاگا تھا۔ شاہی خواتین بھی اب یونانیوں کے قبضے میں تھیں۔ ان خواتین میں دارا کی والدہ اور حسین ملکہ سٹریڑا بھی تھیں۔ اس کے علاوہ دارا کی دو بیٹیاں اور ایک شیر خوار بچہ بھی قیدیوں میں شامل تھے۔ سکندر نے ان معزز خواتین سے احترام کا سلوک کیا تھا اور اپنے سپاہیوں کو بھی ہدایت کی تھی کہ وہ ایرانی خواتین سے دور رہیں۔ کچھ سردار جو اس جشن فتح کو ہر طرح "مکمل" کرنا چاہتے تھے، سکندر کے اس فیصلے پر ناخوش تھے لیکن سردار کے حکم سے سرتابی کی انہیں جرات نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ سکندر نے خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے

ہوئے اس جشن میں اسوس کے شہریوں کو بھی شامل کر لیا تھا اور ان کے لیے خراج میں کئی رعایتوں کا اعلان کیا تھا۔ تابان اب سکندر سے ملنا چاہتا تھا لیکن سکندر کے ارد گرد بہت بھیڑ تھی اور کوشش کے باوجود اسے شاہی خیمے میں باریابی کا موقعہ نہیں مل سکا۔ سکندر سے ملاقات کے خواہشمند افراد کی ایک لمبی قطار خیمے سے باہر موجود تھی۔ تابان کچھ دیر اس قطار میں بیٹھا رہا لیکن جب قطار کی طوالت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تو اٹھ کر واپس آ گیا۔ لڑائی میں ہوشمند زخمی ہو گیا تھا۔ یہ زخم ظاہری نہیں اندرونی تھا۔ اس کی گردن کا پٹھا جو اکثر چڑھ جاتا تھا، پھر چڑھ گیا تھا اور وہ بڑی مشکل سے دائیں بائیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے تابان کو بتایا کہ سالارِ اعظم نے تِھسلی کے کچھ دستوں کو دمشق روانہ کیا ہے۔ ان دستوں کی قیادت جہاندیدہ پار مینو کے سپرد ہے۔۔۔۔۔۔ دراصل سکندر کو معلوم ہوا تھا کہ دمشق میں دارا کا خاصا بڑا خزانہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ نوکر چاکر ہیں اور نادر اشیاء کے ذخیرے ہیں۔ سالار پار مینو انہی چیزوں کو تحویل میں لینے گیا تھا۔ تابان کے اضطراب میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اگر اسے بھاگتی ہوئی فوج کے تعاقب میں نہ بھیجا جاتا تو اس وقت وہ بھی پار مینو کے ساتھ دمشق میں ہوتا اور شہزادی مارشا کو اپنے ہاتھوں سے رہائی دلاتا۔

تابان اپنے خیمے میں پہنچا تو کئی سردار اور سپاہی اس کے پاس آ بیٹھے۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو اسے میدان جنگ میں انتہائی بے جگری سے لڑتے دیکھ چکے تھے۔ وہ اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ اس کے لیے توصیفی جملے کہنے لگے۔ یہ سب کچھ بے انتہا خلوص سے کہا جا رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں تابان کو بُرا لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا جب وہ ہی موجود نہیں جس کے لیے یہ سب کچھ کیا تھا تو پھر کیا حاصل ان تعریفوں سے۔ وہ حسین لب اس کی نگاہوں سے اوجھل ہیں اب ہزارہا لب بھی اس کی مدح میں متحرک ہو جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے جلد از جلد اپنے پرستاروں سے چھٹکارا حاصل کر لیا اور خیمے کے بچھونے پر چت لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ ہر گھڑی اس کے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مارشا کا تصور لمحہ بہ لمحہ اس کی نگاہ میں تھا۔ نصف شب تک اس نے سینکڑوں ہی کروٹیں بدل ڈالیں۔ آخر ہوشمند کو اٹھ کر مشعل دان روشن کرنا پڑا۔ وہ تابان کو گھورتے ہوئے بولا۔

"غالباً۔۔۔۔۔۔ سو جانا تمہارے بس میں نہیں ہے!"

"ہاں۔" تابان نے صاف گوئی سے کہا۔ اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔

"اور سکندر سے ملاقات بھی ممکن نہیں!"

"ہاں۔" تابان نے مختصر جواب دیا۔

"پھر کیسے گزرے گی یہ پہاڑ سی رات؟"

"مجھے خود معلوم نہیں" تابان نے کہا۔

"تو اٹھو پھر۔" ہوشمند اپنے مخصوص جوشیلے انداز میں بولا۔ "گھوڑا سنبھالو، دمشق چلتے ہیں۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے شہر۔ کوشش کریں تو کل کسی وقت وہاں پہنچ سکتے ہیں۔"

ہوشمند نے جیسے تابان کے دل کی بات کہی تھی۔ اس کے سلگتے سینے میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

رات پچھلے پہر ہوشمند اور تابان پڑاؤ سے نکلے اور مشرقی رخ پر دمشق کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہوں نے یہ سفر خاصی تیز رفتاری سے طے کیا اور اگلے روز دمشق پہنچ گئے۔ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ عظیم الشان شہر کے گلی کوچوں میں روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ سڑکوں اور راستوں پر ابھی گہما گہمی تھی لیکن ایک طرح کی سوگوار سنجیدگی ہر شخص کے

چہرے سے چپکی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اس سنجیدگی اور سوگواری کا تعلق ایرانی فوج کی عبرتناک شکست سے تھا۔ تابان اور ہوشمند کو جگہ جگہ یونانی سپاہیوں کی ٹولیاں نظر آئیں۔ یہ زرہ پوش مسلح سپاہی چوراہوں اور شہر کی اہم عمارتوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ تابان اور ہوشمند بھی وردیاں پہنے ہوئے تھے لہٰذا کئی سپاہیوں نے ان دونوں کو پہچانا اور پُرجوش انداز میں ہاتھ ہلائے۔ تابان جانتا تھا، سالار پارمینو اس وقت شاہی محل میں ہوں گے لیکن وہ پارمینو سے بھی پہلے شہزادی سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں گھوڑے دوڑاتے شہر کے بیچوں بیچ سے گزرے اور دوسری طرف نکل گئے۔ مضافات سے آگے "راسی" کا وسیع جنگل تھا۔ یہیں ایک بلند ٹیلے پر وہ معبد تھا جہاں تابان کئی ہفتے ایک انجانی دنیا کے سحر میں مگن رہا تھا۔

تابان نے راستے میں کئی یونانی و مقدونوی سپاہیوں سے معبد کے بارے پوچھا لیکن کوئی بھی معلومات افزا جواب نہیں دے سکا۔ آخر وہ دونوں جنگل سے گزر کر اس پُرخطر ڈھلوان کے دامن میں پہنچ گئے جہاں گھوڑے پر سفر جاری رکھنا ناممکن تھا۔ دفعتاً تابان کی نگاہیں بلندی کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے ڈھلوان کے اس پار دھوئیں کے گہرے مرغولے دیکھے۔

چاندنی رات میں یہ سیاہ دھواں اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ جس جگہ وہ کھڑے تھے وہاں بھی دھوئیں کے اثرات صاف محسوس کیے جا سکتے تھے۔ تابان کو احساس ہوا کہ معبد میں کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ وہ ہوشمند کے ساتھ حتی الامکان تیز رفتار سے ڈھلوان طے کرنے لگا۔ آخر بلندی سے معبد کے در و دیوار ابھر کر ان کے سامنے آ گئے۔ تابان ششدر رہ گیا۔ اس قدیم اور عظیم الشان معبد کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ بیرونی دیواریں کئی جگہ سے مسمار تھیں اور اندر مختلف مقامات سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ تابان کو جگہ جگہ کاہنوں، پجاریوں اور کنیزوں کی لاشیں بھی دکھائی دیں۔ یونانی فوج کے قریباً تین سو مسلح سپاہی یہاں موجود تھے۔ لگتا تھا معبد کو تاخت و تاراج ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ شاید یہ آج صبح یا دوپہر کا واقعہ تھا۔ تابان اور ہوشمند یونانی سپاہیوں کے پاس پہنچ گئے۔ ان میں سے کئی سپاہی تابان کو بطور یک ہزاری سردار پہچان گئے۔ وہ اس کے گرد جمع ہو گئے۔

تابان نے پوچھا۔ "یہاں حملہ کب ہوا؟"

"آج دوپہر۔" ایک صدی یونانی سوار نے ادب سے جواب دیا۔

"کس نے حکم دیا تھا؟"

سپاہیوں نے تِھسلی کے ایک سردار کا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ محترم سالار پارمینو سے اس حملے کی باقاعدہ اجازت لی گئی تھی۔ سکندر کی افواج عبادت گاہوں اور مندروں سے اکثر کترا

کر گزر جاتی تھیں تاہم کبھی کبھی جنگی نقطہ نظر سے ان عبادت گاہوں میں داخل ہونا ضروری ہو جاتا تھا۔ تابان کے استفسار پر یک صدی سردار نے بتایا۔

"تین روز پہلے جب متحدہ یونانی فوج پار مینو کی زیرِ کمان دمشق میں داخل ہوئی تو تین ایرانی سردار بھاگ کر اس معبد میں آ چھپے۔ یہ تینوں سردار جنگی مجرم تھے اور سالار پار مینو کو ہر صورت میں مطلوب تھے۔ ان سرداروں نے کچھ عرصہ پہلے بحیرہ ایجیئن سے ایک تجارتی کشتی اغوا کی تھی۔ کشتی میں موجود بے ضرر شہریوں کو قیدی بنایا تھا اور پانچ خواتین کی عصمت دری کر کے ان کی لاشیں یونانی ساحل پر پھینک دی تھیں۔ یہاں پہنچ کر جب یونانی سپاہیوں نے معبد کے منتظمین سے مفرور سرداروں کو طلب کیا تو معبد کے دروازے بند کر دیئے گئے اور سپاہیوں پر تیر زنی و خشت باری کی گئی۔ معبد کے کاہنوں کو پُرامن طریقے سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی جاتی رہی لیکن دو دنوں میں ایک مرتبہ بھی انہوں نے کوئی ڈھنگ کا جواب نہیں دیا۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ ایرانی سپاہ کو شکست فاش ہو چکی ہے اور اب اس معبد سمیت پورا دمشق یونانی فوج کے رحم و کرم پر ہے وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور سپاہیوں کو اپنے "پانچ مقدس کاہنوں" کا نام لے لے کر ڈراتے رہے۔ پار مینو نے انہیں

آج دوپہر تک کی مہلت دے رکھی تھی۔ یہ مہلت ختم ہو گئی تو معبد پر ہلہ بول دیا گیا۔ اس حملے میں دو یک ہزاری دستوں نے حصہ لیا۔ معبد کے اندر سے غیر متوقع طور پر زبردست مزاحمت کی گئی۔ مردوں کے ساتھ ساتھ معبد کی بیشتر عورتوں نے بھی اس لڑائی میں حصہ لیا۔ تاہم یونانی فوج کے تربیت یافتہ دستے دروازے توڑ کر اندر گھس گئے۔ زبردست لڑائی کے بعد معبد پر قبضہ کر لیا گیا اور مطلوبہ افراد پکڑ لئے گئے۔"

یک صدی سردار نے بتایا کہ اس لڑائی میں یونانی فوج کا زبردست نقصان ہوا ہے۔ معبد کی خفیہ کمین گاہوں سے زبردست تیر اندازی کی گئی جس سے کم و بیش چار صد یونانی فوجی ہلاک ہوئے۔ اس کے بعد معبد کی چھت کے پُراسرار سوراخوں سے زہریلے حشرات الارض کی بارش کر دی گئی۔ مٹی کی ہانڈیوں میں سانپ، بچھو اور دیگر موذی کیڑے بھر کر لشکر پر پھینکے گئے۔ اس سے لشکریوں میں ہراس پھیل گیا اور کئی افراد ڈسے بھی گئے۔ سالار کے حکم پر معبد کو چاروں طرف سے آگ لگا دی گئی تاکہ حشرات کی یہ فوج اندر ہی جل کر بھسم ہو جائے۔ تابان کو بتایا گیا کہ معبد سے کم و بیش پچاس عورتوں اور بیس پجاریوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ صد محافظ اس کے علاوہ ہیں۔ عورتوں میں چند ایسی عورتیں بھی تھیں جنہیں دیویاں

کہا جاتا تھا اور وہ خاص لباس پہنے ہوئے تھیں۔ تابان کی تمام تر پریشانیاں مارشا کے لیے تھیں۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ مارشا زندہ سلامت یہاں سے نکل سکی تھی یا نہیں اور اگر نکلی تھی تو اب کہاں تھی۔ وہاں موجود سپاہیوں نے بتایا کہ گرفتار شدہ عورتوں اور مردوں کو دوپہر ہی دمشق کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔

تابان نے دو مشعل برداروں کو ساتھ لیا اور معبد کے ایوان عام کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہوتے ہی بائیں جانب اسے ایک مسمار دیوار نظر آئی۔ اس دیوار کی دوسری جانب پھانسی گھاٹ نظر آ رہا تھا۔ وہی پھانسی گھاٹ جہاں کچھ روز پہلے کاہن خاتام کی لاش جھولتی نظر آئی تھی۔ آج وہاں کچھ اور لاشیں جھول رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر تابان کا لہو رگوں میں جمنے لگا۔ اس نے ایک مشعل بردار کے ہاتھ سے مشعل لے کر بلند کی اور پھانسی گھاٹ کے قریب پہنچ گیا۔ اب اسے پھانسی پانے والوں کی صورتیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہ وہی پانچ مقدس بوڑھے تھے جن کی ہیبت اس معبد میں اور معبد سے باہر دور تک طاری تھی۔ ایک خلقت کو انہوں نے اپنے سحر میں گرفتار کر رکھا تھا اور ایک زمانہ ان کی شعبدہ بازوں سے مبہوت تھا۔ وہ خود کو مقدس ارواح کہلاتے تھے اور اس معبد میں سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ آج وہ اپنے

ہی قائم کردہ پھانسی گھاٹ پر عبرت نگاہ بنے جھول رہے تھے۔ ان کے گلے میں ابھی تک رنگ برنگی مالائیں موجود تھیں۔ زرتار گیروا چغے ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ پھولے ہوئے پیٹ، کھچی ہوئی گردنیں، کسی کی آنکھیں حلقوں سے ابل رہی تھیں اور کسی کی زبان ٹھوڑی پر لٹکی ہوئی تھی۔ تابان آگے بڑھا تو برباد شدہ ایوان عام کے مختلف حصے نظر آئے۔ رنگین مچھلیوں والے ایوان میں کئی لاشیں تیر رہی تھیں اور ان میں سے اکثر یونانی سپاہیوں کی تھیں۔ لگتا تھا ان پر تیروں کی بارش کی گئی ہے۔ تالاب کو پار کر کے تابان اس چبوترے پر چڑھ گیا جہاں اس نے پہلی بار "مقدس ارواح" کا دیدار کیا تھا۔ چبوترے کے اطراف میں دو دیواریں مسمار ہو چکی تھیں اور ملبہ سلگ رہا تھا۔ یہاں چھت میں بھی ایک بہت بڑا شگاف نظر آیا۔ مشعل برداروں نے بتایا کہ اسی شگاف سے گزر کر مقدونوی جانبازوں نے معبد کے تیر اندازوں پر قابو پایا تھا۔ یہاں تابان کو دیواروں میں خفیہ سوراخ نظر آئے۔ انہی سوراخوں سے گلابی دھند نکل کر چبوترے کا احاطہ کر لیتی تھی۔ اس کے علاوہ تابان نے تانبے اور پیتل کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں دیکھیں۔ یہ گھنٹیاں دیواروں کے اندر پوشیدہ خانوں میں چن دی گئی تھیں اور انہیں ڈوریوں کے ذریعے حرکت دے کر پُراسرار آواز پیدا کی جاتی تھی۔

معبد کے مختلف جلتے اور سلگتے ہوئے حصوں سے گزر کر تابان بالائی منزلوں پر آ گیا۔ یہاں بھی دوپہر کو ہونے والی شدید لڑائی کے آثار ہویدا تھے۔ تابان کو یہاں چند برہنہ دوشیزاؤں کی لاشیں بھی دکھائی دیں۔ یہ ان عورتوں کی لاشیں تھیں جنہوں نے کبھی کسی جنگ میں حصہ نہیں لیا لیکن ہر زمانے اور ہر خطے میں وہ جنگ کی بھینٹ چڑھی ہیں۔ جشنِ فتح ہو یا شکست کی سوگواری۔ انہیں ہر موقع پر تختہ مشق بنایا گیا ہے، جنگ نے ان کی گودیں اجاڑیں ہیں، سہاگ چھینے ہیں، بے آسرا کیا ہے اور موردِ الزام بھی انہی کو ٹھہرایا ہے۔ یہ عورتیں بھی جنگ کی ہیجان خیزی کا شکار ہوئی تھیں۔ اپنے بے پناہ جانی نقصان سے سٹپٹائے ہوئے یونانی سپاہی ان عورتوں پر پل پڑتے تھے۔ یقیناً اگر مخالف فریق بھی کسی موقعے پر ایسی صورت حال سے دوچار ہوتا تو یہی کرتا۔ یہ نصاب جنگ تھا، یہی کہنہ زمانوں سے رائج دستور تھا۔ تابان آگے بڑھا تو اس قصر کے در و دیوار نظر آئے جہاں دیوی انگبیں رہتی تھی۔ نہ آج گلابی دھند کے مرغولے تھے، نہ گھنٹیوں کی صدا، نہ دیواروں سے پھوٹتی روشنیاں۔ یہ سب کچھ برباد ہو چکا تھا۔ جیسے وہ پانچ بوڑھے نہیں تھے، پانچ ساحر تھے جن کے مرتے ہی جادو نگری ناپید ہو گئی تھی۔ قصرِ انگبیں میں تابان کو ملازمہ خاص درمانہ کی لاش نظر آئی۔ وہ ایک بالکونی سے گر کر مر گئی تھی۔ اب معلوم نہیں اسے پھینکا گیا تھا یا اس نے چھلانگ لگائی تھی۔

تابان اس پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتا ہوا قصرِ نور کی طرف بڑھ گیا۔ یہ اس وسیع و عریض عمارت کا ایک اہم ترین حصہ تھا۔ معبد کے سرکردہ افراد بھی یہاں قدم رکھنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے لیکن آج یہ قصرِ نور تباہی و بربادی کی تصویر تھا۔ یوں لگتا تھا یہاں جنگلی گھوڑوں کا غولِ بیابانی چکر اتار رہا ہے۔ در و دیوار پر خون کے چھینٹے تھے اور بلند و بالا آبنوسی دروازے کوئلہ ہو چکے تھے یا سلگ رہے تھے۔ تابان دیوانوں کی طرح قصرِ نور میں چکر اتار رہا اور شہزادی مارشا کو آوازیں دیتا رہا لیکن قصرِ نور، قصرِ ظلمات بنا ہوا تھا، یہاں خاموشی تھی، ادھ جلی لاشیں تھیں یا دھواں تھا۔ ہر لاش کا چہرہ دیکھنے سے پہلے تابان کو درد و کرب کے لامتناہی صحرا سے گزرنا پڑتا تھا۔ اگر مارشا کو کچھ ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔؟ اس سے آگے اس کی سوچ کام نہیں کرتی تھی۔ یوں لگتا تھا دماغ اور جسم کا رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔ مشعل بردار تابان کے ساتھ ساتھ تھے۔ در و بام کی ہیبت ناک خاموشی نے انہیں سہار کھا تھا۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ ابھی کسی سلگتے دروازے کے عقب سے پانچوں مقدس بوڑھوں کی روحیں برآمد ہوں گی یا کوئی مقتول دیوی خون میں نہائی ہوئی اور سر کے بوجھ سے آزاد، چھم سے ان کے سامنے آ جائے گی۔

"واپس چلیں؟" ایک مشعل بردار نے قصر کے خونچکاں در و دیوار کو گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں چلو" تابان نے جواب دیا۔

دونوں مشعل بردار مڑے اور تیز قدموں سے سرنگ نمار اہداری کی طرف چل دیئے۔ یہی وقت تھا جب سلگتے ملبے کے عقب سے ایک لرزہ خیز چنگھاڑ بلند ہوئی اور ایک سایہ سا مشعل برداروں پر جھپٹا۔ تابان نے ایک مشعل بردار کو اچھل کر دیوار سے ٹکراتے اور پھر انگاروں کے ایک ڈھیر پر گرتے دیکھا۔ دوسرا مشعل بردار مشعل پھینک کر دیوانوں کی طرح چلتا ہوا سرنگ نمار اہداری کی طرف بھاگا۔ تابان نے حملہ آور کو غور سے دیکھا اور لرز گیا، یہ جڑواں حبشی تھے، وہی چار ٹانگوں اور چار ہاتھوں والی "انتہائی طاقتور بلا" جو قصرِ نور میں کسی آسیب کی طرح چکراتی تھی اور ہر شے کو اپنی تیز چمکیلی نگاہوں کی زد میں رکھتی تھی۔ توامی حبشی تیزی سے آگے بڑھے، شاید وہ تابان کو اپنے آہنی بازوؤں میں بھینچ کر مار دینا چاہتے تھے لیکن تابان پوری طرح ہوشیار تھا۔ وہ ان بازوؤں کی حیوانی قوت سے بھی آگاہ تھا، اسے معلوم تھا کہ ایک بار وہ اس شکنجے میں آگیا تو جیتے جی نکل نہیں سکے گا۔ اس نے تیزی سے پہلو بدل کر خود کو حبشیوں کی زد سے بچایا اور مشعل کا بھرپور وار ایک حبشی کے چہرے پر کیا۔ وہ درد سے چیخا، دوسرے حبشی نے لپک کر تابان کی کلائی پکڑ لی۔ تابان اس وقت تک مشعل پھینک کر اپنا ہاتھ تلوار کے دستے کی طرف بڑھا چکا تھا۔ اس نے تلوار نکالی اور اس سے پیشتر کہ مشعل کی ضرب سہنے والا حبشی اس کی گردن دبوچ لیتا، تلوار پوری قوت سے اس کے سینے میں گھونپ دی۔ یہ ایک نہایت زوردار اور ماہرانہ وار تھا۔ تلوار توامی حبشی کی زیریں پسلیوں سے داخل ہوئی اور پشت کی جانب سے نکل آئی۔ حبشی نے دہشت ناک نظروں سے تابان کو دیکھا، پھر اپنے سینے کی جانب نگاہ کی۔ اس کے دونوں ہاتھ خود بخود تلوار کے دستے پر آ گئے۔ ایک وحیشانہ جھٹکے سے اس نے تلوار سینے سے برآمد کی اور بے پناہ زور سے اس کا رخ تابان کی گردن کی طرف موڑنے لگا۔ دوسرے حبشی نے تابان کی کلائی چھوڑ کر اس کی گردن دبوچ لی اور پوری قوت سے دبانے لگا۔ تابان کو موت آنکھوں کے روبرو دکھائی دی۔ اس سے پہلے بھی اس کی گردن ایک توامی حبشی کی زد میں آچکی تھی، دباؤ ایسا بے پناہ تھا کہ وہ چند لمحوں سے زیادہ ہوش میں نہیں رہ سکا تھا۔ اب ایک بار پھر اسے ویسے ہی دباؤ کا سامنا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ تلوار بدست حبشی سے برسرپیکار تھے۔ وہ اپنی گردن پر بے پناہ دباؤ کم کرنے کے لیے معمولی سی کوشش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ زخمی حبشی کے سینے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا مگر اس کی طاقت میں ذرہ بھر کمی واقعی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تابان کی تلوار موڑ کر اس کے جسم

میں داخل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن پھر یکایک اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ تابان کے ہاتھوں سے علیحدہ ہو کر نیچے گر گئے اور سر ایک جانب ڈھلک گیا۔ وہ مر چکا تھا، تابان کی گردن دبانے والے حبشی نے چونک کر اپنے توامی بھائی کی طرف دیکھا، وہ مر چکا تھا اور ایک بیکار بوجھ کی طرح اس کے جسم سے پیوست تھا۔ حبشی کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اس کے جسم کا ایک حصہ مر چکا تھا اور اپنا بوجھ سہارنے سے قاصر تھا۔ اس نئی صورت حال کا شکار ہو کر حبشی کی توجہ چند ساعتوں کے لیے تابان کی طرف سے منعطف ہوئی۔ تابان جیسے جنگجو کے لیے یہ مہلت بہت تھی۔ اس نے اپنی ٹانگ کی ایک نہایت شدید ضرب حبشی کی ناف میں رسید کی۔ وہ لڑکھڑایا اور اپنے مردہ حصے کے بوجھ کو سنبھالنے کی کوشش میں چاروں شانے چت گرا۔

یہ عجب صورت حال تھی۔ وہ جڑواں جسم جو زندگی بھر اس کی قوت میں بے پناہ اضافے کا سبب رہا تھا اب اس کے لیے وبال جان بنا ہوا تھا۔ زندہ حبشی نے بے حد جھلاہٹ کے عالم میں اپنے مردہ حصے کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔۔ پھر ایک وحشیانہ چنگھاڑ کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ بے جان حبشی اس کے ساتھ جھول رہا تھا۔ یہ ایک دہشت ناک منظر تھا۔ تابان کو اب حبشی کے

ہاتھ میں ایک تیز کٹار نظر آئی۔ یہ کٹار اس نے فرش پر پڑے ملبے سے اٹھائی تھی۔ کٹار کے لوہے کا سبزی مائل رنگ بتا رہا تھا کہ وہ زہر میں بجھی ہوئی ہے۔ اس کٹار کا ایک چر کہ بھی کسی شخص کی موت کا باعث بن سکتا تھا۔ تابان پوری طرح چوکس ہو گیا۔ کٹار کے پہلے دو وار اس نے اپنی تلوار پر روکے، پھر تیزی سے پہلو بچا گیا۔ حبشی اپنی جھونک میں ایک طرف جھکا اور مردہ حبشی کے سبب لڑکھڑا کر اوندھے منہ گر گیا۔ تابان نے تلوار کو خنجر کی طرح دونوں ہاتھوں میں تھاما اور سر سے بلند کر کے حبشی کی پشت میں گھونپ دیا۔ حبشی جان کنی کے عالم میں تڑپنے لگا۔ یہی وہ وقت تھا جب تابان کو اپنی پنڈلی پر سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے جھک کر دیکھا اور لرز گیا۔ ایک سانپ اس کی ٹانگ سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کی دو شاخہ زبان تیزی سے حرکت کر رہی تھی اور وہ اپنا مہلک زہر کسی بھی وقت تابان کے جسم میں اتار سکتا تھا۔ یہ علاقے میں پایا جانے والا خطرناک ترین سانپ تھا اور اس کا کاٹا دوسرا سانس نہیں لیتا تھا۔ تابان اپنی جگہ بے حرکت کھڑا رہا۔ پنڈلی پر حرکت کرتے ہوئے جب سانپ نے اپنا ایک بل کھولا تو تابان نے پھرتی سے اسے پکڑا اور فرش پر کھینچ مارا۔ توامی حبشی آخری ہچکی لے کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ تابان نے اس کی پشت سے خون آلود تلوار کھینچی اور اپنے مشعل بردار ساتھی کی طرف مڑا۔ اسے ایک حبشی نے اٹھا کر دیوار سے دے مارا تھا۔ یہ ضرب مشعل

بردار کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔ تابان نے جھک کر دیکھا مشعل کی روشنی میں بد نصیب شخص کا سر دو حصوں میں منقسم نظر آیا۔ انگاروں پر گرنے سے اس کا سینہ جھلس گیا تھا۔ اب وہ دنیا کے ہر غم سے آزاد پڑا تھا اور تین خاکستری بچھو اس کے پاؤں پر رینگ رہے تھے۔ تابان نے افسوس میں سر ہلایا اور مشعل کی روشنی میں سرنگ نما راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ خون آلود تلوار بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

معبد سے تابان کو مایوسی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوا۔ وہ ہوشمند کے ساتھ واپس دمشق پہنچا اور سیدھا شاہی محل کا رخ کیا۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ اس وقت سالار پار مینو سے ملاقات ناممکن تھی۔ دن چڑھے تک وہ دونوں محل کے دروازے پر موجود رہے۔ آخر تابان نے چوبداروں کے ذریعے اپنا پیغام اندر پہنچایا۔ سالار پار مینو نے اسے فوراً بلا لیا۔ شاہی محل کی شان و شوکت مرعوب کن تھی۔ یہاں کا ذرہ ذرہ شہنشاہ ایران کے کروفر کا گواہ تھا لیکن اب یہ سب کچھ متحدہ یونان کے قدموں کی خاک تھا۔ سالار پار مینو نے ایک عالیشان نشست گاہ میں تابان سے ملاقات کی۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور خدمت گار دو

شیزائیں اطراف میں موجود تھیں۔ پار مینو نے تابان کو یہ خوشخبری سنائی کہ معبد سے گرفتار ہونے والی خواتین میں ایتھنز کی شہزادی مارشا بھی موجود تھی۔ اسے بڑے احترام کے ساتھ اسوس روانہ کر دیا گیا ہے۔ جہاں ابھی سکندر کچھ روز قیام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔۔ یہ اطلاع سننے کے بعد تابان کے لیے ایک پل بھی دمشق میں رکنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے افراتفری میں سالار پار مینو سے اجازت طلب کی اور ہوشمند کے ساتھ شاہی محل سے باہر آ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں گھوڑوں پر سوار اسوس جانے والے راستے پر اڑے جا رہے تھے۔

اسوس واپس پہنچ کر تابان کو پتہ چلا کہ سالارِ اعظم سکندر شکار پر نکلے ہوئے ہیں اور شہزادی مارشا اس وقت سردار فرال کی تحویل میں ہیں۔ وہی انہیں دمشق سے لے کر یہاں پہنچے ہیں۔ سردار فرال کا نام سن کر تابان چونکا۔ اس کی نگاہوں میں وہی خوبرو چاق و چوبند نوجوان گھوم گیا جو جنگ اسوس سے قبل یونانی قلب کا پرچم تھامے نظر آیا تھا اور جس کے بارے میں سردار یرغا نے بتایا تھا کہ وہ سالارِ اعظم کا خاص قرب حاصل کر رہا ہے۔ ایک واقف حال سردار نے تابان کو یہ بتا کر مزید پریشان کر دیا کہ شہزادی مارشا اس وقت فرال کی ذاتی تحویل میں ہے اور سکندر کی اجازت سے فرال نے اسے اپنے خیمے میں رکھا ہوا ہے۔

تابان کے تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ وہ اسی وقت پڑاؤ کے اس حصے کی جانب بڑھا جہاں تِھسلی کے جنگجوؤں کے خیمے تھے۔ فرال کا خیمہ بھی وہیں تھا۔ وہ راستے کو پاؤں تلے روندتا، راہ گیروں سے ٹکراتا، تند بگولے کی مانند فرال کے خیمے کی طرف بڑھا ہی چلا جا رہا تھا۔ ہوشمند ہانپا ہوا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ تابان کے ساتھ رہنے کے لیے اسے کبھی کبھی بھاگنا بھی پڑ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ آخر وہ دونوں سردار فرال روز کی خیمہ گاہ کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ ساتھ ساتھ ملے ہوئے تین خیمے تھے۔ یہاں بالکل قریب قریب چار ایک ہی جیسے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ یہ پرچم بردار کی خیمہ گاہ ہے۔ ان شاندار خیموں کے باہر دو مسلح محافظ چوکس کھڑے تھے۔ تابان دندناتا ہوا ان محافظوں تک پہنچ جانا چاہتا تھا کہ ایک جانب سے سردار یرغا نمودار ہوا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ غالباً تابان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے تابان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"نہیں تابان۔۔۔۔۔۔ اس وقت تمہیں سردار فرال سے کوئی جھگڑا مول نہیں لینا چاہیے۔ شہزادی مارشا اس کی تحویل میں ہے اور سکندر پڑاؤ سے باہر ہے۔۔۔۔۔۔۔"

"لیکن میں کوئی جھگڑا کرنے نہیں جا رہا۔۔۔۔۔۔۔ میں تو صرف شہزادی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری یہی خواہش جھگڑے کا باعث بن سکتی ہے۔" سردار یرغا نے کہا۔

"کیا مطلب؟" تابان کے سینے میں کلبلاتے ہوئے اندیشے لمحوں میں پل کر جوان ہو گئے۔

سردار یرغا نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "آؤ۔۔۔۔۔۔۔ میرے ساتھ میں تمہیں بتاتا ہوں سب کچھ۔"

"لیکن شہزادی مارشا۔۔۔۔۔۔۔" تابان نے خیموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شہزادی مارشا یہاں بالکل محفوظ ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

عمر رسیدہ سردار یرغا، تابان کو سمجھا بجھا کر وہاں سے اپنے خیمے میں لے آیا۔ ہوشمند بھی ساتھ تھا۔ تابان کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی تشویش کے گہرے سائے تھے۔ سردار یرغا نے ان دونوں کی مشروب سے تواضع کی۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور دیوتاؤں نے چاہا تو آئندہ بھی رہوں گا۔ یہی سبب ہے کہ میں تمہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دینا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ کل شام فرال اپنے ساتھ مارشا کو لے کر سکندر سے ملنے آیا تھا۔ پھر مارشا تو جلد ہی واپس چلی گئی تھی لیکن فرال دیر تک سکندر کے خیمے میں موجود رہا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ فرال نے سکندر سے مارشا کے بارے میں بات کی ہے لیکن تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر ایسا ہوا بھی ہے تو فرال کو اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ میں نے اسے سکندر کے خیمے سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ خلاف معمول بہت خاموش اور سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ میں سکندر سے اس بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن صبح سویرے وہ شکار کے لیے نکل گیا۔ میرا خیال ہے شام سے پہلے وہ واپس آ جائے گا اس کے بعد ساری بات صاف ہو جائے گی۔"

شام تک کا وقت تابان نے شدید بے قراری کے عالم میں گزارا۔ اس کی زندگی، اس کی کائنات چند سو قدم کے فاصلے پر ایک خیمے میں موجود تھی اور وہ اس سے مل نہیں سکتا تھا۔ وہ کسی اور کی تحویل میں تھی۔ اس کے حسن کو کوئی دوسرا تعریفی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید

سردار یرغا اس کے سرہانے موجود نہ ہوتا تو وہ دندناتا ہوا تِھسلی کے پڑاؤ میں گھس جاتا اور پرچم بردار سردار کے خیمے چاک کر کے شہزادی مارشا کے روبرو پہنچ جاتا۔

سکندر اپنے شکاری قافلے کے ساتھ شام سے کچھ دیر بعد پڑاؤ میں پہنچا۔ ایک چھکڑا شکار کیے ہوئے جانوروں اور پرندوں سے لدا ہوا تھا۔ چھکڑے کے ساتھ ساتھ دو مقدونوی سوار محافظوں کی طرح چلے آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک سردار کا تعلق سکندر کے ذاتی محافظ دستے سے تھا۔ اس نے تابان کو دیکھا تو چھلانگ لگا کر گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔

"تابان۔۔۔۔۔۔۔ کہاں تھے تم؟" اس نے تابان کو کندھوں سے تھام کر بے تکلفی سے سوال کیا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" تابان نے دریافت کیا۔

"تمہیں سالارِ اعظم یاد کر رہے تھے۔ آج صبح ہی انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہیں ڈھونڈا جائے اور فوراً ان کے پاس لایا جائے۔"

"لیکن میں تو یہیں موجود تھا۔ نہ صرف جنگ میں حصہ لیا بلکہ دو روز تک بھاگنے والی ایرانی فوج کے تعاقب میں بھی شریک رہا ہوں۔ جنگ کے بعد میں نے سالارِ اعظم سے ملنے کی

بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ کیا سالار پارمینو نے سالارِ اعظم سے میرا ذکر نہیں کیا؟"

"شاید وہ بھی بھول گئے ہوں کیونکہ انہیں بہت عجلت میں عازم دمشق ہونا پڑا تھا۔ بہر طور اب تم فوراً سالارِ اعظم کے خیمے میں پہنچو۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ میرے ساتھ ہی چلے آؤ، میں ابھی تمہیں سالار کے سامنے پیش کرتا ہوں۔"

کچھ ہی دیر بعد تابان سکندر کے شاندار خیمے میں موجود تھا۔ یہ خیمہ گاہ چند روز پہلے تک دارا کی ملکیت تھی لیکن اب اس کی ہر شے پر سکندر کو تصرف حاصل تھا۔ سکندر چاہتا تو وہ دنیا کا ہر سامان عشرت اس خیمہ گاہ میں جمع کر سکتا تھا لیکن وہ فطرتاً قناعت پسند شخص تھا۔ بلکہ کبھی کبھی تو اس پر رہبانیت سی طاری ہونے لگتی تھی۔ لذیذ غذاؤں، معطر عورتوں اور سیم وزر کی بہتات اسے قطعی متاثر نہیں کر پائی تھی۔ دمشق سے ملنے والے سونے اور جواہرات کے ذخیروں کو وہ جوں کا توں یونان بھیجنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ تابان خیمے میں پہنچا تو سکندر حسبِ عادت ہاتھ پشت پر باندھے چہل قدمی کر رہا تھا۔ پہلی ہی نظر میں وہ تابان کو از حد پریشان نظر آیا۔ تابان نے جھک کر تعظیم پیش کی اور مودب کھڑا ہو گیا۔ تابان کا خیال تھا کہ وہ اس سے بلا

اجازت دمشق جانے کے بارے میں باز پرس کرے گا یا جنگ اسوس کے حوالے سے اس کی کارکردگی سننا چاہے گا لیکن سکندر نے ان میں سے کوئی موضوع نہیں چھیڑا۔ وہ کچھ دیر گہری نظروں سے تابان کی سمت دیکھتا رہا پھر گھمبیر لہجے میں بولا۔

"تابان! ہم کل سے ایک سخت الجھن میں گرفتار ہیں۔ شاید تم ہماری کچھ مدد کر سکو۔"

تابان نے انکساری سے کہا۔ "اگر آپ نے غلام کو کسی مشورے کے قابل سمجھا ہے تو یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔"

سکندر نے گہری سانس بھر کر کہا۔ "سردار تابان! ہم نے ایک شخص سے قول کر رکھا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب گرینی کس کی لڑائی ہوئی تھی اور دوران جنگ ہم زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑے تھے۔۔۔۔۔۔۔ اس شخص نے جان پر کھیل کر ہماری حفاظت کی تھی۔ ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی تین جائز خواہشات پوری کریں گے اور دل میں زیوس دیوتا کی قسم کھائی تھی کہ اپنے عہد پر قائم رہیں گے۔ اب یہی قسم ہمارے گلے کا پھندا بنی ہوئی ہے اور ہر لحظہ ہمیں اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔"

تابان نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔ "غلام کو حکم دیجیے، وہ اپنی جان بھی آپ کے قدموں میں نچھاور کر سکتا ہے۔"

سکندر نے طلائی جام میں سے نشہ آور مشروب کا ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور خیمے کے دور افتادہ حصے کو گمشدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہمارا قیاس ہے کہ تمہیں شہزادی مارشا کے متعلق پتہ چل گیا ہو گا۔ اسے دمشق کے ایک معبد سے برآمد کر لیا گیا ہے اور وہ اس وقت پڑاؤ ہی میں موجود ہے۔"

تابان نے کہا۔ "ہاں۔ سالارِ اعظم! میں جانتا ہوں۔"

سکندر بولا۔ "شہزادی مارشا کل ایک فوجی سالار کے ساتھ ہمارے خیمے میں آئی تھی۔ یہ وہی سالار ہے جو شہزادی کو معبد سے چھڑا کر لایا ہے۔ اس کا نام فرال روز ہے اور اس کا تعلق تِھسلی کے دستوں سے ہے۔"

تابان نے کہا۔ "میرا خیال ہے آپ اسی سالار کی بات کر رہے ہیں جو قلب کا پرچم بردار بھی ہے۔"

سکندر نے اثبات میں جواب دیا اور کہا۔ "تم نے درست پہچانا ہے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن فرال کے بارے میں ایک بات شاید تمہیں معلوم نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔ یہی وہ سالار ہے جسے ہم نے جنگ گرینی کس کے بعد قول دیا تھا۔ قول دیتے وقت ہمیں گمان نہیں تھا کہ کسی وقت یہ ہمارے لیے اتنی بڑی مشکل کا باعث بن جائے گا۔"

تابان سب کچھ سمجھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ اس کی سوالیہ نظریں سکندر کے چہرے کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ سکندر نے خیمے کے روزن پر نگاہیں گاڑے ہوئے کہا۔ "کل فرال روز نے ہم سے شہزادی مارشا کا ہاتھ مانگا تھا۔۔۔۔۔۔۔ ہم نے اسے بتایا کہ شہزادی مارشا کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ شہزادی ہمارے ایک وفادار سردار کی آرزو ہے اور وہ اس کی خاطر عرصے سے سرگرداں ہے۔ فرال روز نے ہمارے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور بولا کہ اب وہ شہزادی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے ہمیں ہمارا قول یاد دلایا اور اس قول کے صدقے سے شہزادی کا ہاتھ مانگا۔۔۔۔۔۔۔" سکندر نے ایک لمحے کے لیے رک کر تابان کا چہرہ دیکھا اور نیم دلی سے مسکرا کر بولا۔ "لیکن تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے فرال روز کی کسی درخواست کا جواب ابھی تک نہیں دیا۔ ہم نے اسے

یہ کہہ کر واپس بھیج دیا تھا کہ یہ معاملہ اتنا سہل نہیں جتنا وہ سمجھ رہا ہے۔ ۔۔۔۔۔۔ اب ہم نے تمہیں اسی لیے طلب کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں تمہارا مشورہ درکار ہے۔ دیوتا گواہ ہیں ہم شہزادی مارشا کو تم سے منسوب دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ تم نے اس کے لیے تکالیف سہی ہیں اور صبر آزما انتظار کیا ہے لیکن ہمیں اس قول سے جان چھڑانے کا کوئی راستہ نہیں سوجھ رہا۔"

تابان یکسر خاموش تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس موقعے پر اسے کیا کہنا چاہیے اور کچھ کہنا بھی چاہیے یا نہیں۔ اس کے سینے میں آگ دہک رہی تھی اور رہ رہ کر فرال کا حسین و جمیل چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگتا تھا۔ یہ چہرہ دو دن سے ایک پھانس بن کر اس کے سینے میں چبھا ہوا تھا۔ ۔۔۔۔۔ رہ رہ کر ایک خیال اس کے دل میں ابھرتا تھا اور پورے جسم میں کرب کا زہر بھر دیتا تھا۔ کہیں شہزادی مارشا بھی تو اس وجیہہ سالار کی شخصیت میں نہیں الجھ گئی تھی؟ فرال اسے اپنے ہمراہ سکندر کے پاس کیوں لایا تھا۔ کیا وہ سکندر پر شہزادی کی آمادگی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ ان گنت وسوسے اسے گھیرے میں لے رہے تھے۔ دفعتاً شاہی چوبدار نے خیمے میں

آنے کی اجازت طلب کی۔ سکندر نے تابان کے مضطرب چہرے سے نگاہیں ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھا اور چوبدار کو اجازت مرحمت کی۔ اندر آ کر چوبدار نے کہا۔

"عزت ماب، سالارِ اعظم، شاہ مقدونیہ! تِھسلی کے سردار فرال روز بازیابی کی اجازت چاہتے ہیں۔"

سکندر کے چہرے پر بیزاری کے آثار نمودار ہوئے، پھر یہ بیزاری غصے میں ڈھل گئی۔ وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "اس سے کہا جائے کہ ہم مصروف ہیں۔ اگر ہمیں اس کی ضرورت ہو گی تو خود طلب کریں گے۔" چوبدار جلدی سے واپس گھوما۔ "اور سنو۔" سکندر کی تحکمانہ آواز گونجی۔ "سردار سے کہو کہ ہم اس بے وقت کی مداخلت سے خفا ہوئے ہیں۔"

چوبدار کانپتا ہوا باہر نکل گیا۔

سکندر کا مزاج اچانک ہی برہم ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر منہ میں بڑبڑاتا رہا پھر نشہ آور مشروب کے بڑے بڑے گھونٹ لینے لگا۔ اب وہ تابان کی طرف سے بھی لاتعلق سا ہو گیا تھا۔ تابان اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔ پتھر کی طرح ساکت و جامد۔ اس کی نگاہیں اپنے سائے پر مرکوز تھیں۔

سکندر نے تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔ "ٹھیک ہے، میں تم سے بعد میں بات کروں گا، اب تم جا سکتے ہو۔"

تابان تعظیمات پیش کر کے خیمے سے باہر نکل آیا۔ اس کے پاؤں منوں وزنی تھے۔ معلوم نہیں کاتب تقدیر نے اس کے لیے کیا لکھ رکھا تھا۔ پہلے منزل اس کی نگاہوں سے اوجھل تھی اب منزل سامنے تھی اور اس میں قدم بڑھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ شاہوں کے شاہ سکندر نے دیوتاؤں کے دیوتا زیوس کی قسم کھائی تھی اور یہ قسم تابان کے پاؤں کی زنجیر بنتی جا رہی تھی۔

اپنے خیمے میں پہنچ کر تابان بستر پر بے سدھ لیٹ گیا۔ اس کے سینے میں جیسے کوئی دہکتا ہوا انگارہ رکھا گیا تھا۔ شہزادی مارشا کے لیے اس نے کیا کیا مصائب نہیں جھیلے تھے اور اب جب وہ اس کے قریب پہنچ چکا تھا ایک بلند و بالا دیوار ان کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ پورے دو دن تابان نے سخت کرب کے عالم میں گزارے۔ وہ خیمے سے باہر گیا اور نہ کسی کو خیمے میں آنے دیا۔ شمعدان بجھے رہے اور وہ بھوکا پیاسا اپنی سوچوں کے جہنم میں جلتا رہا۔ تیسرے روز اسے خیمے کے دروازے پر کورا کا چہرہ نظر آیا۔ غالباً وہ پہریدار کو زبردستی راستے سے ہٹا کر اندر

چلی آئی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو تابان اس پر پھٹ پڑتا لیکن کورا کے سامنے زبان کھولنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ کچھ عجب سی احترام آمیز انسیت تھی اسے کورا سے۔ کورا نے اس کے قریب پہنچ کر اپنی حنائی انگلیاں اس کے الجھے بالوں میں پھیریں۔

"تابان! یہ کیا حالت بنائی ہے تم نے؟"

تابان نے بے ساختہ اپنا سر اس کی آغوش میں پھینک دیا اور اپنے آنسو روکنے کی جدوجہد کرنے لگا لیکن دریا تو کناروں سے بہہ نکلا تھا اب ریت کے بند کون بچا سکتا تھا۔ کورا کی آغوش تر ہونے لگی۔ ایک جری سردار رو رہا تھا تو اس میں حیرانی کی بات نہیں تھی۔ تناور درخت روتے ہیں، پہاڑ روتے ہیں، یہاں تک کہ آسمان بھی روتا ہے۔ نہ جانے کیوں تابان کو محسوس ہو رہا تھا کہ ماہ و سال الٹے قدموں چلتے بہت پیچھے نکل گئے ہیں۔ ابھی وہ غلام نہیں بنا، ابھی اسے بہن بھائیوں اور والدین سے جدا نہیں کیا گیا، ابھی وہ اپنے ہی گھر کے ایک نیم تاریک کمرے میں بیٹھا ایک مہربان آغوش میں سر رکھے سو رہا ہے۔ یہ کس کی آغوش ہے؟ شاید اس کی ماں کی، شاید بڑی بہن کی، یا پھر کسی اور مہربان ہستی کی۔ بہت دیر کورا کی آغوش میں سر چھپائے رکھنے سے اس کے کھولتے ہوئے دماغ کا درجہ حرارت کچھ کم ہو گیا۔ اس نے نیم

تیرگی میں کورا کی طرف دیکھا، اس کی حسین غمزدہ آنکھیں تابان پر لگی تھیں۔ تابان کو یاد آیا کہ ابھی تو اسے کورا سے معافی بھی مانگنا ہے۔ اس نے کورا کو بہت دکھ دیا تھا۔ اس کی مخلص ذات کو کئی طرح کے شکوک کا نشانہ بنایا تھا۔

یہاں تک کہ اس پر اپنی جان لینے کا شبہ بھی کیا تھا۔ تابان کو یاد آیا کہ کس طرح وہ سانپ لے کر اس کے خیمے کے سامنے منڈلاتی رہی تھی اور پھر نشیب کی طرف بھاگ گئی تھی۔ نشیب میں جا کر تابان نے اس سے ناروا سلوک کیا اور اس کے معصوم دل پر سخت چرکے لگائے تھے۔ بعدازاں کورا نے اسے جھوٹ اور سچ کے چہرے دکھائے اور وہ مارشا کی طلب میں دیوانہ ہو کر کاہن خاتام کے تعاقب میں نکل بھاگا۔ اسے کورا سے معافی طلب کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔۔۔۔۔۔۔ آج کئی ماہ بعد کورا پھر اس کے سامنے آئی تھی۔ اسی مہربان اور شفیق روپ میں، جو ہمیشہ تابان کے زخموں پر مرہم رکھتا تھا۔ تابان اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کھوئی نگاہوں سے کورا کا پُرشباب چہرہ دیکھتا رہا، پھر نرم آواز میں بولا۔

"کورا! میں نے تمہارے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔ بہت توہین کی ہے تمہاری ۔۔۔۔۔۔"

کورا نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کچھ مت کہو تابان، کچھ بھی مت کہو، جہاں دل کی بات دل سمجھتا ہو، وہاں الفاظ کی ضرورت نہیں رہتی۔۔۔۔۔۔۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ کوئی ملال نہیں ہے میرے دل میں۔"

تابان نے اپنے ہونٹوں سے اس کے ہاتھ ہٹانا چاہے، وہ عاجزی سے بولی۔ "نہیں تابان، پہلے وعدہ کرو تم رسمی لفظوں سے میری سماعت کو مجروح نہیں کرو گے۔ کچھ نہیں کہو گے۔"

تابان نے نگاہیں جھکا لیں۔ کورا نے اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹایا اور بے اختیار اس کا سر تھام کر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ کتنی ہی دیر وہ اسی طرح گم صم بیٹھی رہی۔ آنسو اس کے رخسار پر ڈھلک رہے تھے۔ آخر وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ "تابان! کل سردار پارمینو مجھ سے ملے تھے۔" تابان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"وہ تو دمشق میں تھے۔"

"وہاں سے وہ لوٹ آئے ہیں۔"

"لیکن۔۔۔۔۔۔۔ لیکن، وہ تم سے کیوں ملے؟"

"یہی بات تو میں تمہیں بتانے جا رہی ہوں۔ سالار پار مینو کو معلوم ہوا ہے کہ تم میری بات بہت مانتے ہو۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں سمجھاؤں۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ کہتے ہیں کہ یوں کھانا پینا چھوڑ کر بند خیمے میں بیٹھ رہنا دانشمندی نہیں ہے۔ آنکھیں بند کر لینے سے معاملات الجھتے ہیں، سلجھتے نہیں۔ وہ تمہاری جانب سے بہت فکر مند ہیں۔ انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ جیسے بھی ہو تمہیں کھانا کھلاؤں۔" پھر کورا نے دروازے کی طرف رخ پھیر کر آواز دی۔ پردہ اٹھا اور دو خدام ہاتھوں میں خوان لیے اندر آئے۔ خیمہ گرما گرم کھانوں کی مہک سے بھر گیا۔ بھنے ہوئے گوشت کے پارچے سبزی ملے مصالحے دار چاول، کباب اور کلیجے۔ دوسرے خوان میں مختلف اقسام کے میوہ جات تھے۔ تابان کا پیٹ خالی تھا لیکن دل بھرا ہوا تھا۔ غم سے معمور اور اداسی سے لبریز۔ اس نے کھانے کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھائی۔ کورا اسے چند لقمے لینے کے لیے مجبور کرنے لگی۔ تابان نے واضح الفاظ میں معذرت کر لی۔ اسی دوران سالار پار مینو بنفس نفیس خیمے میں پہنچ گئے۔ انہیں دیکھ کر تابان اور کورا احترام سے کھڑے ہو گئے۔ پار مینو نے جھریوں بھرے چہرے پر ملائمت کے آثار تھے۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کورا کو اشارہ کیا۔ وہ خیمے سے باہر نکل گئی۔ پار مینو کی

ہدایت پر خدام نے خوان اٹھا کر ایک جانب رکھ دیئے اور باہر چلے گئے۔ پار مینو نے لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھی اور جلد ہی اصل موضوع پر آ گئے۔ انہوں نے تابان سے کہا۔

"سالارِ اعظم چند روز سے بہت پریشان ہیں تابان! ان کی الجھن صرف ایک شخص کی نہیں پوری یونانی فوج کی الجھن ہے۔ ہم اس وقت حالت جنگ میں ہیں اور اگر سالارِ اعظم اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہ دے سکے تو اس کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ لٰہذا ہمارا فرض ہے کہ انہیں ہر قسم کے تفکر سے آزاد رکھیں۔ سالارِ اعظم نے زیوس دیوتا کی قسم کھا کر جو قول کر رکھا ہے وہ ان کے لیے شدید الجھن کا باعث بنا ہوا ہے۔۔۔۔۔۔۔ انہیں اگر اس الجھن سے کوئی نکال سکتا ہے تو وہ تم ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ سالارِ اعظم کی عمر میرے بیٹوں سے بھی کم ہے، میں ان کی طبع اچھی طرح جانتا ہوں اگر انہیں اپنے قول سے پھرنا پڑا تو یہ ان کے لیے زبردست روحانی دھچکے کا باعث بنے گا۔۔۔۔۔۔۔"

تابان نے دبے لفظوں میں کہا۔ "محترم سالار! آپ کا کہا سر آنکھوں پر لیکن آپ یہ باتیں فرال روز سے بھی تو کہہ سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ فرال ایک وجیہہ، پُرکشش شخص ہے۔ اسے حسن و شباب کی کمی کبھی رہی ہے اور نہ رہے گی لیکن میری زندگی میں شہزادی مارشا کے بعد

اور کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔۔ وہ میری محبت ہوتی تو میں اسے سالارِ اعظم کے فرمان پر قربان کر دیتا لیکن وہ تو میری کائنات ہے اور کائنات کی حدود سے انسان مر کر بھی نہیں نکل سکتا۔ مجھ سے وہ چیز مت طلب کیجیے جو میں نہیں دے سکتا۔۔۔۔۔۔۔"

سالار پار مینو تادیر تابان کے پاس بیٹھے رہے۔ بظاہر وہ مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے لیکن گھما پھرا کر بات شہزادی مارشا کی طرف ہی لے آتے تھے۔ ان کے بزرگانہ لہجے میں تابان کے لیے پند و نصائح کے انبار تھے لیکن تابان کے لیے یہ سب بے اثر تھا۔۔۔۔۔۔۔ پار مینو ہی کی زبانی تابان کو معلوم ہوا کہ شہزادی مارشاب فرال کے خیمے میں نہیں ہے۔ سکندر کے حکم پر اسے خواتین کے پڑاؤ میں پہنچا دیا گیا ہے اور حتمی فیصلہ ہونے تک وہ وہیں رہے گی۔

دو تین روز اسی کشمکش میں گزر گئے۔ پھر ایک دن صبح سویرے تابان کو سالار پار مینو کی طرف سے حکم ملا کہ وہ کچھ ایرانی قیدیوں کو لے کر تفریح گاہ میں پہنچے۔ یہ تفریح گاہ فوج کے پڑاؤ سے چند کوس دور ایک جھیل کے کنارے ہموار میدان میں بنائی گئی تھی۔ یہاں ہر روز اولمپک کی طرز پر کھیل ہوتے تھے۔ سرکس میں بازی گر کرتب دکھاتے تھے، پتلیوں کے

تماشے ہوتے تھے، ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے اور نشانہ بازی کی جاتی تھی۔ لیکن ایک اسٹیڈیم نما جگہ پر مجرم قیدیوں کو سزائے موت دی جاتی تھی۔ اس سزا کا نظارہ بھی کسی دلچسپ تفریح سے کم نہیں تھا۔ روتے بلکتے اور رحم کی بھیک مانگتے مرد و زن کو بھوکے درندوں کے آگے پھینک دیا جاتا تھا۔ وہ انہیں چیر پھاڑ کر اپنی غذا بناتے تھے اور پُرجوش تماشائی چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتے تھے۔

تابان کو جو قیدی تفریح گاہ میں پہنچانے کا حکم دیا گیا تھا وہ بھی ایسے ہی بدنصیب افراد تھے انہیں ایک بند گھوڑا گاڑی میں سوار کرا کے تابان کے حوالے کر دیا گیا اور تابان انہیں لے کر جھیل کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھوڑا گاڑی میں دس کے قریب مرد اور چار عورتیں تھیں۔ وہ اپنے انجام سے بے خبر تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ انہیں ایک بندی خانے سے دوسرے میں منتقل کیا جا رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔ تفریح گاہ میں پہنچ کر انہیں اسٹیڈیم نما جگہ پر اتارا گیا تو وہ صورت حال سے باخبر ہو گئے۔ اسٹیڈیم کے وسط میں پڑے ہوئے خونخوار درندوں کے آہنی پنجرے انہیں سب کچھ سمجھا رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔ پہلے قیدیوں کے رنگ زرد ہوئے پھر وہ رونے چلانے لگے۔ وہ تابان کے قدموں میں گر کر اس سے رحم کی بھیک مانگنے لگے۔

انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کی زندگی اور موت کی ڈور کہیں اور سے ہلائی جا رہی تھی۔ جس کے قدموں میں وہ گڑگڑا رہے ہیں اس کی حیثیت صرف ایک کارندے کی سی ہے۔

اسٹیڈیم میں سینکڑوں کی تعداد میں تماشائی جمع ہو چکے تھے۔ یہ سب کے سب متحدہ جمعیت کے فوجی اور ان کے اہل خانہ تھے۔ پارمینو بھی یہیں موجود تھا۔ اس نے تابان کو اپنے قریب بیٹھنے کے لیے جگہ دی اور ملائمت سے گفتگو کرتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد انسانیت سوز مظاہرے کی شروعات ہو گئی۔ رواج کے مطابق قیدیوں کو سفید لباس پہنائے گئے تھے تاکہ خون کی سرخی نمایاں طور پر نظر آ سکے۔ سپاہیوں نے طویل رسیوں کی مدد سے آہنی پنجروں کے در کھول دیئے۔ بھوکے شیر دھاڑتے ہوئے نکلے اور قیدیوں پر پل پڑے۔ یہ کل پانچ قیدی تھے۔ ان میں سے ایک عورت تھی جو غش کھا کر گر چکی تھی۔ وہ فوراً درندوں کا لقمہ بنی۔ باقی قیدی چیخ رہے تھے اور بھاگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک توانا جسم والا قیدی آہنی جنگلے پر چڑھ گیا لیکن اس جنگلے کو پار کر آنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کسی کے لیے موت کی سرحد پار کر کے زندگی کی طرف واپس آ جانا۔ یکے بعد دیگرے سارے قیدی اپنے انجام کو پہنچے۔ ایک ایک کر کے ان کی آہ و بکا دم توڑ گئی اور ان کے پارچے درندوں میں چھینا جھپٹی کا باعث بننے

لگے۔ پھر یہ چھینا جھپٹی بھی ختم ہو گئی۔ آہنی جنگلے کے اندر خون آلود دھجیوں اور گرد آلود انسانی چیتھڑوں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ گیا۔ خون آلود پنجوں والے درندے بے قراری سے آہنی جنگلے کے قریب ٹہلنے لگے۔ اب انہیں مزید قیدیوں کا انتظار تھا۔

پانچ پانچ کی ٹکڑیوں میں چار مرتبہ قیدیوں کو اندر بھیجا گیا اور ان کی لرزہ خیز موت کا تماشا دیکھا گیا۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ پارمینو، تابان کو اپنے ساتھ لے کر تفریح گاہ کے وسطی حصے میں آ گیا۔ یہاں ایک وسیع حمام بنایا گیا تھا۔ اس حمام میں بھاپ دینے والے پتھر تھے اور سنگ سلیمانی کا ایک بڑا حوض تھا۔ اس حوض میں ہر وقت نیم گرم پانی موجود رہتا تھا۔ فوج کے صرف اعلیٰ ترین عہدیدار ہی اس حمام کو استعمال کر سکتے تھے۔ تابان پہلی مرتبہ حمام میں داخل ہو رہا تھا، وہ اندرونی مناظر دیکھ کر حیران ہوا۔ سخت سردی کے باوجود حمام کا اندرونی درجہ حرارت خوشگوار تھا۔ سنگِ سلیمانی کی حوض میں بھاپ دیتا پانی تھا۔ حوض کے ارد گرد شفاف فرش پر بڑے بڑے مستطیل پتھر رکھے تھے۔ ان پتھروں کو آگ پر گرم کیا گیا تھا۔ چاندی کے چھوٹے چھوٹے نلوں سے ان پتھروں پر پانی کی پھوار سی گرتی تھی اور بھاپ پیدا ہو کر حمام میں چکرانے لگتی تھی۔ غسل میں مدد دینے کے لیے وہاں چاق و چوبند خادم اور

خوش رُو خادمائیں موجود تھیں۔ ایک بھینی بھینی سی خوشبو پورے ماحول میں رچی بسی تھی۔

اس حمام میں غسل کے بعد تابان کو عجیب سی تازگی کا احساس ہوا۔ اسے محسوس ہوا کہ بھوک لگ رہی ہے۔ پارمینو نے اپنے ساتھ اسے شاندار کھانا کھلایا۔ کھانے کے بعد وہ اسے کھیل تماشے کی ایک خصوصی محفل میں لے آیا۔ یہاں بازی گری کے نام پر حسین و جمیل ایرانی لڑکیاں اپنے ہیجان خیز جسمانی خطوط کی نمائش میں مصروف تھیں۔ بازی گر حسیناؤں کا یہ طائفہ دمشق سے لایا گیا تھا اور ان میں چند بے انتہا خوبصورت چہرے موجود تھے۔ نصف شب کے بعد یہ تماشا ختم ہوا تو پارمینو کے حکم پر دو انتہائی جاذب نظر لڑکیاں تابان کے ساتھ کر دی گئیں۔ پارمینو نے تابان سے کہا کہ وہ چند دن یہیں قیام کرے تاکہ اسے تفریح میسر ہو اور ذہن پر چھائے ہوئے تفکرات کم ہو سکیں۔ جھیل کے کنارے لکڑی کے ایک خوبصورت دو منزلہ مکان میں تابان کو رہائش فراہم کی گئی۔ اس مکان میں چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر پارمینو کی اپنی رہائش تھی۔ پارمینو نے تابان کو بتایا کہ وہ بھی چند دن آرام کرنا چاہتا ہے۔

تابان صاف محسوس کر رہا تھا کہ پارمینو اسے کھلونے دے کر بہلا رہا ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن تابان کا غم ایسا نہیں تھا کہ کھلونوں سے بہل سکتا۔ اس کے سینے میں شعلے نہیں تھے جو پانی سے بجھ جاتے، اس کے سینے میں لاوا تھا جو پانی کو بھاپ بنا کر اڑا دیتا ہے۔ اس نے ایرانی دوشیزاوں کے زہد شکن حسن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ نہ ہی دیگر تفریحات میں اسے کوئی دلچسپی محسوس ہوئی۔ وہ پورے دو روز تفریح گاہ میں رہا اور ہوا کی زد میں آئے ہوئے خشک پتے کی مانند ادھر اُدھر اڑتا پھرا۔ تیسرے دن کی بات ہے، وہ ایک جگہ دھوپ میں بیٹھا تھا۔ اس کی خالی نگاہیں سامنے اسٹیڈیم میں جمی ہوئی تھیں جہاں کھلاڑی ایک طویل بانس کی مدد سے اونچی اونچی رکاوٹیں پھلانگنے میں مصروف تھے۔ تابان خود بھی ایسی چھلانگ کا ماہر تھا۔ اسے یاد آیا کہ وہ غارس زنوب کے قید خانے سے بھی اپنی اسی مہارت کے سبب نکل سکا تھا۔ تاہم غارس زنوب کے قید خانے سے رہائی اس کے لیے عمر قید کا سبب بن گئی تھی۔ وہ مارشا کے تیر بہدف حسن سے گھائل ہوا تھا اور اپنی کاٹی ہوئی زنجیریں خود اپنے ہاتھوں سے پہننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ دفعتاً تابان کو اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ اس کی نگاہ ہوشمند پر پڑی تھی۔ وہ کوئی سو قدم کی دوری پر کھڑا ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی گردن کا پٹھا ابھی تک "اترا" نہیں تھا لہٰذا اس کے دائیں بائیں دیکھنے کا انداز عجب مضحکہ خیز تھا۔ گردن

گھمانے کی بجائے وہ پورا گھومتا تھا اور اوپر نیچے دیکھنے میں سخت اذیت محسوس کرتا تھا۔ تابان کو فوراً خیال گزرا کہ ہوشمند اسے تلاش کر رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ہوشمند کے پاس پہنچ گیا۔ تابان کو دیکھ کر ہوشمند کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"غالباً میری کوئی نیکی کام آگئی ہے، ورنہ تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر میری گردن کا جھٹکا ہو جانا تھا۔"

"کیوں خیریت ہے؟" تابان نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

ہوشمند کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی غالب آگئی۔ وہ بولا "غالباً تم نے دماغ سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔ خیریت ہوتی تو یوں اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ تمہیں ڈھونڈنے کیوں نکل کھڑا ہوتا۔ میرے بھائی خیریت نہیں ہے غالباً۔ میں نے آج صبح پڑاؤ میں ایک شخص کو دیکھا ہے اور اسے دیکھ کر سیدھا تمہاری طرف دوڑ آیا ہوں غالباً۔"

"کس کو دیکھ لیا ہے؟" تابان نے پوچھا۔

ہوشمند نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کیا۔ "سردار شلال کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ میرا مطلب ہے آخری بار تم اسے کب ملے تھے۔۔۔۔۔۔ غالباً؟"

تابان نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ملا تو اسی وقت تھا جب کورا کو اس کے چنگل سے چھڑایا تھا اور اسے پکڑ کر سالارِ اعظم کے حوالے کر دیا تھا۔"

ہوشمند بولا۔ "اس کے بعد شلال کے ساتھ کیا ہوا؟ تمہیں کچھ معلوم ہے؟"

"ہاں۔۔۔۔۔۔ دمشق سے روانہ ہونے سے چند روز پہلے میں نے سردار بطلیموس سے معلوم کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ شلال کی جان بخشی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی موت کا فیصلہ اٹل ہے۔ چند روز تک اسے کسی عبرت ناک طریقے سے سزائے موت دے دی جائے گی۔"

"یعنی تمہارا خیال ہے کہ شلال اس وقت تک کیفرِ کردار کو پہنچ چکا ہے؟"

"یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ وہ ایک باغی اور مفرور قاتل تھا۔"

ہوشمند نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ "میں اس باغی اور مفرور قاتل کو ابھی زندہ سلامت دیکھ کر آیا ہوں۔ وہ سالارِ اعظم کی ہدایت پر دمشق گیا ہوا تھا، وہاں کے آہن گروں سے جنگی گھوڑوں کی دس ہزار نعلیں بنوا کر لایا ہے۔۔۔۔۔۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" تابان کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"غالباً میں فارسی ہی بول رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ اور غالباً تمہارے کان بھی بہرے نہیں ہیں، اور نہ ہی غالباً میری نگاہ کمزور ہے۔۔۔۔۔۔۔ تمہارا اور کورا کا خطرناک ترین دشمن اس وقت زندہ سلامت پڑاؤ میں موجود ہے۔"

"یہ کیسے ہو گیا؟" تابان کی بے پناہ حیرت برقرار تھی۔

"تابو! یہ غالباً کوئی بہت گہری سازش ہے۔ مجھے جو سب سے اہم بات معلوم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ سالار اعظم سکندر سے شلال کی جان بخشی کروانے والا وہی تھسیلی سردار فرال روز ہے۔ سکندر نے اسے موقع دیا تھا کہ وہ تین بار اپنی بات منوا سکتا ہے۔ اس نے سکندر سے جو پہلی درخواست کی وہ شلال ہی کے بارے میں تھی۔ اس کی کوشش سے شلال جو موت کے منہ میں پہنچ چکا تھا، واپس پلٹ آیا اور اب وہ بڑے طمطراق سے لشکر میں دندنا رہا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سردار شلال اور فرال روز میں پرانی شناسائی ہے۔ جنگِ کائی رونیا کے موقعے پر وہ دونوں ایک ہی دستے میں تھے اور اس سے پہلے غالباً ایتھنز میں بھی انہوں نے کافی وقت ایک ساتھ گزارا ہے۔"

تابان کے ذہن میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ ہوشمند نے جس سازش کا تانا بانا اس کے سامنے بکھیرا تھا وہ اب کچھ کچھ تابان کی سمجھ میں آ رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔ اس کا مطلب تھا کہ شہزادی مارشا سے اس کی دوری کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا۔ یہ ایک سوچی سمجھی سازش کا حصہ تھا۔ یہ دشمنی کی وہ امر بیل تھی جو ایک ننگی کونپل سے پروان چڑھی تھی اور اب ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ اس کا جسم جوالا مکھی کی زد میں آ گیا۔ آنکھوں میں وہی برق کوندنے لگی جو اسے انسانیت سے دور اور حیوانیت سے قریب تر لے آتی تھی۔ ہوشمند بغور اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ اس نے تابان کا بازو تھام لیا۔ تابان نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑایا اور تیزی سے سالار پار مینو کے مکان کی طرف بڑھا۔ وہ سالار پار مینو سے کیا کہے گا اور اس کے بعد کیا کرے گا؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا، بس اتنا معلوم تھا کہ آج سردار شلال زندہ رہے گا اور نہ سکندر کا چہیتا فرال روز جس نے شہزادی مارشا کے چہرے پر میلی نگاہ ڈالی تھی اور اس کے سراپا کو اپنی ناپاک سوچوں کے جال میں جکڑا تھا۔

جونہی وہ جھیل کے کنارے پہنچا اس نے سالار پار مینو کو دیکھا۔ وہ اپنے تین گھڑ سواروں کے ساتھ بڑی تیزی سے پڑاؤ کی طرف جا رہا تھا۔ تابان اس سے کافی فاصلے پر تھا۔ پھر بھی پار مینو

کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی اور بدحواسی اس سے چھپی نہ رہ سکی۔ تابان کی چھٹی حس نے پکار کر کہا کہ یونانی فوج کے پڑاؤ میں یقیناً کوئی انہونی ہو چکی ہے۔ وہ چند لمحے اپنی جگہ متذبذب کھڑا رہا پھر اس نے قریب کھڑے ایک گھوڑے کی راسیں کھولیں اور چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو گیا۔ جونہی ایڑ لگی گھوڑا تیزی سے آگے بڑھا۔ ہوشمند زور زور سے چلانے لگا۔ "تابو! رک جاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔رک جاؤ۔"

تابان نے پکار کر کہا۔ "میرے پیچھے آؤ ہوشمند۔۔۔۔۔۔۔۔"

"لیکن میرا گھوڑا۔۔۔۔۔۔۔" ہوشمند نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

پارمینو اور اس کے ساتھی بہت تیز رفتاری سے جا رہے تھے۔ تابان بمشکل ان کا تعاقب کر پا رہا تھا۔ جھیل سے قریباً دس اسٹیڈیم آگے آ کر پارمینو دریا کی جانب مڑ گیا۔ تابان نے بھی اپنے گھوڑے کا رخ دریا کی طرف پھیر دیا۔ جلد ہی انہیں دریا کا چمکتا دمکتا شفاف پانی دکھائی دینے لگا۔ تابان نے دیکھا دریا کے کنارے گھنے درختوں میں چھوٹا سا مجمع نظر آ رہا ہے۔ چند فوجی گھوڑا گاڑیاں کھڑی تھیں اور مسلح پہریدار تلواریں عریاں کیے یہاں وہاں گھوم رہے تھے۔ تابان نے پہلے تو گھوڑا روک لینے کا سوچا لیکن پھر ارادہ بدل کر پارمینو وغیرہ کے ساتھ ہی

موقعہ پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک لرزہ خیز نظارہ ان کا منتظر تھا۔ دریا کے عین کنارے زمین پر چند لاشیں پڑی تھیں۔ لاشوں کو چادروں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ چادروں پر خون کے بڑے بڑے دھبے تھے، جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے والوں کو تیز دھار آلوں سے قتل کیا گیا ہے۔ قریبی درختوں پر مرنے والوں کے لباس اسی طرح ٹنگے ہوئے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ بدنصیب افراد دریا میں نہانے کے لیے اترے ہوئے تھے وہ قطعی غیر مسلح تھے۔ لہٰذا جب گھڑ سوار حملہ آور ان پر جھپٹے تو وہ لقمہ تر ثابت ہوئے۔ ابھی دریا میں مزید لاشوں کی تلاش جاری تھی۔ یونانی فوج کے تربیت یافتہ غوطہ خور یہاں وہاں ہاتھ پاؤں چلا رہے تھے۔

سالار پارمینو گھوڑے سے اتر کر تیزی سے لاشوں کی جانب گیا۔ اس نے قریب کھڑے شخص سے چند باتیں کیں، پھر جھک کر ایک لاش کے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ چہرہ سامنے آیا تو تابان بُری طرح چونک گیا۔ وہ لاش سے قریباً بیس قدم کے فاصلے پر تھا لیکن اسے اپنی نگاہ پر پورا بھروسہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ مرنے والا فرال روز ہی تھا۔ اس کی پیشانی پر تلوار کا ایک گہرا گھاؤ نظر آ رہا تھا اور خون اس کے بھیگے بالوں کے نیچے سے بہتا ہوا رخساروں اور گردن پر جم گیا تھا۔ تابان حیران کھڑا رہ گیا۔ فرال جو چند دن پہلے تک زندگی کی امنگوں سے بھرپور ایک

جو شیلا نوجوان تھا اس وقت اپنے ہی خون میں نہایا ہوا فرش خاک پر بے سُدھ پڑا تھا۔ فرال پر اور اس کے ساتھیوں پر کیا سانحہ گزرا تھا، فوری طور پر تابان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے دیکھا کہ فوج کے ماہر کھوجی موقعے سے شہادتیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں سے پوچھ گچھ بھی کی جا رہی تھی۔ یہ زیادہ تر مقامی افراد دھوبی اور مچھیرے وغیرہ تھے اور واردات کے بعد یہاں جمع ہو گئے تھے۔ سالار پار مینو نے فرال کے بعد دوسری لاشوں کے چہرے بھی دیکھے۔ وہ کچھ دیر کھوجیوں سے اس بارے میں گفتگو کرتا رہا پھر اپنے تیز رفتار گھوڑے پر بیٹھ کر موقع سے روانہ ہو گیا۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ غم آمیز فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ تابان ہجوم کے درمیان کھڑا تھا لہٰذا پار مینو کی نگاہ اس پر نہیں پڑ سکی تھی۔ ایک طرح سے یہ بہتر ہی ہوا تھا۔ پار مینو کی روانگی کے بعد تابان لوگوں میں راستہ بناتا ہوا لاشوں کی جانب بڑھا۔ اس نے فرال روز کا چہرہ قریب سے دیکھا۔ زخم تازہ تھا۔ لگتا تھا اس واقعے کو زیادہ دیر نہیں گزری۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تابان کے تصور میں یہ چہرہ انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ وہ اس انگارے کو اپنے غضب کی لہروں میں بہا لے جانا چاہتا تھا لیکن اب اس چہرے کو دیکھ کر اس کے دل پر مردنی سی چھا رہی تھی۔ زندگی کی بے ثباتی کا احساس بے حد شدت سے ہو رہا تھا۔ اس دوران ہوشمند بھی اس کا پیچھا کرتے ہوئے موقع پر پہنچ گیا۔ فرال

کی لاش دیکھ کر اسے بھی زبردست دھچکا لگا۔ تابان نے موقعے پر موجود ایک شخص سے واقعے کی تفصیل پوچھی۔ یہ شخص تابان کو بطور یک ہزاری سردار اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس نے تابان کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ اس نے انکشاف کیا کہ آج سردار فرال روز کی شادی تھی۔ بعد از شام ان کی رسم عروسی ادا ہونے والی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ دریا پر غسل کے لیے آئے ہوئے تھے کہ شقی القلب قاتلوں کی تلواروں کا نشانہ بنے۔

تابان نے بے ساختہ پوچھا۔ "کس سے ہو رہی تھی سردار کی شادی؟"

"وہ ایتھنز کی کوئی شہزادی ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "تھوڑے ہی دن پہلے سردار فرال اسے دمشق کے کسی آتش کدے سے آزاد کرا کے لائے تھے۔"

تابان کا دماغ سنسنا اٹھا۔۔۔۔۔۔۔۔ "تو کیا اس سے دھوکا کیا جا رہا تھا؟" یہ سوال سنسناتے تیر کی طرح اس کے دل میں پیوست ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کا مطلب تھا سالار پار مینو اسے یہاں بہلانے میں مصروف تھا اور وہاں پڑاؤ میں شہزادی مارشا کو فرال روز کی سیج پر بٹھایا جا رہا تھا۔ کتنا بڑا فریب تھا یہ۔ کیا سالار اعظم سکندر بھی اس فریب میں شامل تھا؟ یہ سوال تابان

کے لیے سب سے اذیت ناک تھا۔ موقعے پر موجود لوگوں سے تابان کو پتہ چلا کہ حملہ آور اپنے حلیے سے کسی عبادت گاہ کے خدام نظر آتے تھے۔ انہوں نے ایک جیسے گیروا لباس پہن رکھے تھے اور چہروں پر اسی رنگ کے نقاب تھے۔ فرال روز اور اس کے ساتھیوں کو مارنے کے بعد وہ کافی دیر موقعہ واردات پر اپنی تلواریں لہراتے رہے اور نعرہ زنی کرتے رہے۔ ایک شخص بار بار چلا رہا تھا۔ "ہمارے دیوی دیوتاؤں کی بے حرمتی کرنے والے اسی طرح خاک و خون میں لوٹیں گے۔ جو ہمارا مجرم ہوگا ہم اسے یونانی لشکر کے اندر سے بھی کھینچ لائیں گے۔"

تابان کا دھیان فورا دمشق کے معبد اور "پانچ مقدس ارواح" کے پیروکاروں کی طرف گیا۔ آج سے چند روز پہلے تک مارشا وہاں "مہادیوی" کی حیثیت سے موجود تھی۔ اس کے تصور کی پرستش ہوتی تھی اور اس کے قدموں میں جبینیں جھکتی تھیں۔ آج وہی مارشا ایک فوجی سالار کی بیوی بنائی جا رہی تھی۔ یقیناً مقدس ارواح کے پیروکاروں کو یہ صورتِ حال قبول نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے گھات لگا کر حملہ کیا تھا اور اس شخص کو دردناک موت سے دوچار کر دیا تھا جو "مہادیوی" کا شوہر بننے جا رہا تھا۔

تابان اسے قسمت کی یاوری ہی کہہ سکتا تھا۔ اس کے ایک دشمن نے اس کے دوسرے دشمن کا خاتمہ کر ڈالا تھا۔ اگر ان دونوں دشمنوں کا ٹکراؤ نہ ہوتا تو یقیناً اب تک تابان اپنی زندگی کے سب سے بڑے المیے کا شکار ہو چکا ہوتا۔۔۔۔۔۔۔ وہ اس تفریح گاہ میں بیٹھا جھیل کے اندر تیرتی بطخوں کو دیکھتا رہتا اور یہاں اسوس میں شہزادی مارشا کسی کی دلہن بن جاتی۔ اس کے سینے میں غضب کا سمندر ہلکورے لینے لگا۔ ان لمحوں میں فرال روز، شلال، پارمینو، سکندر ۔۔۔۔۔۔۔ سب اسے ایک صف میں کھڑے نظر آئے۔ سب اس کے دشمن تھے۔ اس کے خلاف ہونے والی ایک سازش کے حصے دار تھے۔ تابان نے ایک آخری نگاہ فرال روز کی لاش پر ڈالی اور تیزی سے اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ آیا۔۔۔۔۔۔۔ اب وہ جلد از جلد سالارِ اعظم سکندر تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس کے سامنے سراپا احتجاج بن کر پوچھ سکے کہ اسے جرم وفاداری کی اتنی بڑی سزا کیوں دی جا رہی تھی؟ وہ آندھی اور طوفان کی طرح پڑاؤ کی جانب روانہ ہوا لیکن تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک گھڑ سوار نے اس کا راستہ روک لیا۔ عمر رسیدہ گھڑ سوار کے چہرے پر راستوں کی گرد تھی۔ اس کی گھنی بھنویں سفید ہو رہی تھیں اور زرد آنکھیں تابان کے چہرے پر گڑی تھیں۔ اسے پہچاننے میں تابان کو زیادہ دیر نہیں لگی، وہ روہتاس تھا۔ سب سے پہلے وہ تابان کو ایک کاہن کے روپ میں ملا تھا، پھر تابان نے اسے

ایک ایسے سالار کے روپ میں دیکھا تھا جو زندگی کے چھتے سے مسرتوں کا شہد نچوڑ رہا تھا۔ اس کے بدن پر جنگ کا لباس تھا اور ہاتھوں میں ساغر و مینا۔۔۔۔۔۔ اور آج وہ تابان کو ایک چرواہے کے بھیس میں نظر آرہا تھا۔ دفعتاً تابان کو احساس ہوا کہ روہتاس چرواہے کے بھیس میں کافی دیر سے اس کے تعاقب میں ہے۔

روہتاس نے پوچھا۔ "کہاں جارہے ہو؟"

تابان بولا۔ "ایک ضروری کام سے"

روہتاس بولا۔ "مت جاؤ اس ضروری کام سے۔ وہاں تمہاری جان کے لیے خطرہ ہے۔"

تابان چونک گیا۔ روہتاس کا انداز کہہ رہا تھا کہ وہ صورتِ حال کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے۔

تابان بولا۔ "آپ کو کیا معلوم، میں کہاں جارہا ہوں؟"

روہتاس نے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے اور وہ بھی معلوم ہے جو تم نہیں جانتے ۔۔۔۔۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں سکندر کے دربار میں تمہارے ساتھ کیا پیش آسکتا ہے۔"

روہتاس کے لب و لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ تابان نے اس کے سامنے خود کو بے بس محسوس کیا۔ اس دوران ہوشمند بھی گھوڑا بھگاتا وہاں پہنچ چکا تھا۔ روہتاس ان دونوں کو ساتھ لے کر درختوں کے جھنڈ میں لے آیا اور وہاں سے ایک تنگ راستہ اختیار کرکے آگے بڑھنے لگا۔۔۔۔۔۔۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک چراگاہ میں پہنچے۔ اونچے نیچے ٹیلوں پر بھیڑ بکریوں کے کئی ریوڑ گھوم رہے تھے۔ کہیں کہیں خیمے بھی تھے۔ ان خیموں سے باہر چرواہے اور چرواہیاں ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے تھے۔ روہتاس، تابان اور ہوشمند کو لے کر ایک ٹیلے پر واقع الگ تھلگ خیمے میں آگیا۔ تابان نے دیکھا اس خیمے میں ایک چرواہا ناکافی لباس پہنے ایک کونے میں سکڑا سمٹا بیٹھا ہے اور سردی کے سبب تھر تھر کانپ رہا ہے۔ روہتاس کے جسم پر یقیناً اسی چرواہے کا لباس تھا۔ روہتاس کا اپنا جنگی لباس ایک محفوظ گوشے میں رکھا تھا۔

اس خیمے میں تابان اور روہتاس کے درمیان تادیر گفتگو ہوئی۔ مٹی کی انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے۔ روزن میں سے دور دور تک دھواں دھواں چراہ گاہ کے مناظر نظر آتے تھے۔

روہتاس کہنے لگا۔ "تم ٹھیک نتیجے پر پہنچے ہو تابان! یہ ایک گہری سازش ہے۔ سردار شلال سے تم دشمنی مول لے چکے ہو اور سردار شلال، فرال روز کا دیرینہ دوست تھا۔ اس نے نہ

صرف سالارِ اعظم سے شلال کی جاں بخشی کروائی بلکہ تمہیں نیچا دکھانے کے لیے شہزادی مارشا کے حقوق بھی تم سے چھین لیے۔ سالارِ اعظم سکندر سب کچھ جانتا تھا اس کے باوجود اس نے تم پر فرال روز کو ترجیح دی۔ پارمینو کو اس کام پر لگا دیا گیا کہ وہ تمہیں تفریحات میں الجھائے رکھے اور دوسری طرف شہزادی مارشا، فرال روز کو سونپ دی گئی۔۔۔۔۔۔۔

اب بھی یہ مت سمجھو کہ سکندر، مارشا کو بہ آسانی تمہارے حوالے کردے گا اور اگر وہ ایسا کر بھی دے تو کیا فائدہ؟ مارشا کی حیثیت روٹی کے اس ٹکڑے کی سی ہوگی جسے بھوک نہ ہونے کے سبب فقیر کے کشکول میں پھینک دیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے تم مارشا کو سکندر سے بھیک میں لینا قبول نہیں کرو گے۔"

روہتاس کی باتیں تابان کے دل پر اثر کر رہی تھیں۔ وہ جہاندیدہ شخص اپنی نرم انگلیوں سے تابان کے دل کے تاروں کو چھو رہا تھا۔ اس نے کھوئی ہوئی آواز میں کہا۔

"تابان! کبھی تم نے سوچا ہے، تم کون ہو؟ تمہاری رگوں میں کس کا خون دوڑ رہا ہے؟ تمہارا خمیر کس مٹی سے اٹھا ہے؟ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ تم ایک ایرانی ہو۔ تمہیں برسوں پہلے تمہارے والدین سے جدا کیا گیا اور غلام بنا کر لبنان لے جایا گیا۔ کیا تم نے کبھی سوچا ہے

کہ آج تمہاری تلوار انہی لوگوں کے حق میں بلند ہو رہی ہے جو تم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے رہے ہیں۔ تمہیں برہنہ پا بھوکے کتوں کے آگے دوڑاتے رہے ہیں اور تم سے مویشیوں کی طرح بیگار لیتے رہے ہیں۔ یہ سکندر کوئی اور نہیں انہی یونانیوں و مقدونیوں میں سے ایک ہے۔۔۔۔۔۔ آج یہ لوگ پھر ہمارے بچوں کو غلام بنانے اور ہماری عزتوں کو تار تار کرنے اس سرزمین پر آ دھمکے ہیں۔ اب پھر سینکڑوں تابان ماؤں کی گود سے چھینے جا رہے ہیں اور ان گنت والدین اپنے بچوں کے لیے خون کے آنسو بہا رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ کبھی غور کیا ہے تم نے ان سب باتوں پر؟"

تابان بولا۔ "محترم روہتاس! سکندر یونانی نہیں مقدونوی ہے۔ میں اسے ظالم کیسے کہہ سکتا ہوں اس نے تو مجھے مظالم سے بچایا تھا۔ میں اور میرے جیسے ہزاروں مرد و زن غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ایتھنز کی بلند فصیلوں کے اندر سسک رہے تھے۔ غارس زنوب جیسے آقاؤں نے ہم پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ سکندر ہمارا نجات دہندہ بن کر ایتھنز میں وارد ہوا تھا۔"

روہتاس نے کہا۔ "تم بہت پرانی بات کر رہے ہو۔ اب وہی سکندر جمعیت متحدہ کا سالارِ اعظم ہے۔ اب اس کی زیر کمان وہی لوگ مقبوضہ ایرانی علاقوں پر ستم توڑ رہے ہیں جو اس سے پہلے ایتھنز میں تمہیں زندہ در گور کیے ہوئے تھے۔۔۔۔۔۔۔"

تابان کے چہرے پر شدید الجھن کے آثار نظر آ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا اس کے اندر گہرائی میں دفن کوئی جذبہ دھیرے دھیرے سر اٹھا رہا ہے۔ ایک بے نام جنبش اسے بے قرار کیے دے رہی تھی۔ اس نے روہتاس کے پاس سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "محترم روہتاس! اگر آپ مجھے سچ کہنے کی اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ میں آپ کے خیالات سے پوری طرح متفق نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ آپ مجھے میرے سپہ سالار سے بد ظن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ نے ایک بار کہا تھا کہ میدان جنگ سے باہر ہم جب بھی ملے دوستوں کی طرح ملیں گے لیکن آج آپ نے ایسا نہیں کیا۔"

روہتاس بولا۔ "میں جنگ یا امن کی بات نہیں کر رہا۔ اس لہو کی بات کر رہا ہوں جو تمہاری رگوں میں دوڑتا ہے اور جس کے ناطے تم اس سرزمین کے سپوت ہو۔ میں تم سے ۔۔۔۔۔۔۔"

"آپ مجھ سے کچھ اور مت کہیں" تابان نے بیزاری سے اس کی بات کاٹی۔ "پہلے میں آپ کے اس الزام کی تصدیق کر لوں کہ سردار شلال نے میرے خلاف جو سازش کی تھی اس میں سالارِ اعظم بھی شریک تھے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ تیزی کے ساتھ خیمے سے باہر نکل گیا۔ ذرا ہی دیر بعد اس کا گھوڑا برق رفتاری سے یونانی فوج کے عظیم الشان پڑاؤ کی طرف جا رہا تھا۔

وہ پڑاؤ میں داخل ہوا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ خیموں میں اور خیموں سے باہر راستوں پر تاحد نگاہ مشعلیں روشن تھیں۔ پڑاؤ کو گرد و غبار سے محفوظ رکھنے کے لیے راستوں پر چاول کی چھال بچھائی گئی تھی۔ پہریداروں کے لیے جگہ جگہ لکڑی کی مچانیں تعمیر کی گئی تھیں اور ان مچانوں کے نیچے سپاہیوں کی ٹولیاں آگ دہکائے بیٹھی تھیں۔ تابان کو اندازہ ہوا کہ پڑاؤ میں ایک طرح کی سراسیمگی پائی جاتی ہے اور ہر جگہ گفتگو کا موضوع فرال روز اور اس کے ساتھیوں کا وحشیانہ قتل ہی ہے۔ تابان مختلف راستوں پر گھوڑا بھگاتا پڑاؤ کے مرکز میں آ گیا اور یہاں سے شاہی خیمہ گاہ کی طرف چلا آیا۔ خیمہ گاہ اور ارد گرد کے علاقے میں غیر مانوس سی خاموشی نظر آ رہی تھی۔ تابان کو پہریداروں سے معلوم ہوا کہ پرچم بردار سردار فرال روز

اور دیگر مقتول افراد کی آخری رسوم ادا کی جا رہی ہیں۔ سالارِ اعظم سمیت بیشتر سالار اور کماندار انہی رسوم میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔ تابان کا دھیان فوراً شہزادی مارشا کی طرف چلا گیا۔ اس سے ملنے کے لیے یہ موقع بہت مناسب تھا۔ وہ اپنے گھوڑے کا رخ موڑ کر شاہی خیمہ گاہ کے عقب میں آیا۔ ایک طویلے میں گھوڑا باندھنے کے بعد وہ پیدل ہی ان خیموں کی سمت روانہ ہو گیا جہاں لشکر کے ساتھ آنے والی خواتین قیام رکھتی تھیں۔ آج یہاں بھی خال خال ہی پہریدار نظر آتے تھے۔ تابان نے گہری تیرگی کا فائدہ اٹھایا اور ایک پہریدار کی نگاہ بچا کر عقبی جانب سے خواتین کی خیمہ گاہ میں داخل ہو گیا۔ وہ کورا کا خیمہ پہچانتا تھا۔ اس وقت کورا ہی مارشا سے ملنے میں اس کی امداد کر سکتی تھی۔ خیمے کے پاس ایک خاتون محافظ ٹہل رہی تھی۔ تابان ایک اوٹ سے اس کی حرکات و سکنات دیکھتا رہا۔ جونہی محافظ عورت نے اس کی طرف سے رخ پھیرا وہ لپکا اور خیمے کی ڈوری قطع کر کے اندر گھس گیا۔ چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔۔۔۔۔۔۔ جیسے اسے گھٹا ٹوپ تاریکی سے نکال کر اچانک سینکڑوں فانوسوں کی روشنی میں لا کھڑا کیا گیا ہو۔ اسے اپنی نگاہوں پر اعتبار نہیں آیا۔ سامنے ایک آرام دہ بستر پر شہزادی مارشا بیٹھی تھی۔ اس کے کھلے ریشمی بال اس کے ہاتھوں میں تھے اور وہ انہیں جوڑے کی صورت لپیٹنے کے لیے بل دے رہی تھی۔ حسین چہرے کی

سوگواری اور لباس کی سادگی نے اس کے سراپا کو محبوبیت کے کمال پر پہنچا دیا تھا۔ تابان نے اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا اپنی پلکوں کو جنبش نہ دے سکتا۔ شہزادی تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی، اس نے قریبی دیوار سے اوڑھنی کھینچی اور سینہ ڈھانپ لیا۔ لمبے بال اس کے مرمریں ہاتھوں سے چھوٹ کر پشت پر جھولنے لگے تھے۔

"تم یہاں؟" اس کے ہونٹوں سے متحیر آواز نکلی۔

اتنے میں دائیں جانب ایک ریشمی پردہ متحرک ہوا اور ایک کنیز باہر نکل آئی۔ تابان کو دیکھ کر وہ پہلے تو چونکی پھر جھک کر سلام کیا اور سوالیہ نظروں سے شہزادی مارشا کی طرف دیکھنے لگی۔ شہزادی مارشا سوالیہ نظروں سے تابان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی جھیل سی آنکھوں میں تابان کے لیے شناسائی کی جھلک تھی اور روشنی کی ایک غیر مرئی کرن بھی جسے تابان فوری طور پر کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ تابان نے لہجے میں عاجزی سمیٹتے ہوئے کہا۔

"شہزادی حضور! میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔" لہجہ عاجزانہ ہونے کے باوجود مستحکم اور پُراعتماد تھا۔

شہزادی کی پیشانی پر الجھن کی شکن نظر آئی۔ پھر اس نے کنیز کی طرف دیکھا، جیسے اس کی موجودگی میں تابان کے سوال کا جواب دینے میں دقت محسوس کر رہی ہو۔ تابان نے فوراً کنیز سے کہا۔

"تم تھوڑی دیر کے لیے باہر جاؤ اور اگر کوئی اس جانب آئے تو شہزادی حضور کو اطلاع دو۔"

کنیز نے شہزاری کا مدعا جاننے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور اس کی خاموشی کو نیم رضا سمجھتے ہوئے باہر نکل گئی۔ تابان نے کاٹی ہوئی ڈوری کو جلدی سے گرہ دے دی۔ اب وہ دونوں اس خیمے میں تنہا تھے۔ حسن، عشق کے روبرو تھا۔ طالب اور مطلوب کے درمیان تنہائی کے سوا اور کوئی چیز حائل نہیں تھی۔ اپنی آنکھوں میں قرنوں کی پیاس اور وارفتگی لیے تابان، مارشا کی طرف دیکھنے لگا۔ شہزادی مارشا بے ساختہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ شاید اسے وہ لمحے یاد آ گئے تھے جب قصرِ نور میں تابان ہوش و حواس کھو کر اس کے قدموں سے لپٹ گیا تھا۔ ایک دم ہی خیمے کی فضا میں ایک سنسنی سی دوڑنے لگی۔ خاموشی اپنی زبان میں بات کرنے لگی۔ تابان کے بند ہونٹ مارشا کے کانوں سے ہمکلام ہونے لگے اور اس کی یاقوت بھری آنکھوں میں ایک حیا آمیز برہمی تیرنے لگی۔ وہ مرتعش آواز میں بولی۔

"کیوں آئے ہو یہاں؟"

تابان نے سب خدشات بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی تلوار نیام سے نکالی اور مارشا کے قدموں میں رکھ دی۔ "شہزادی صاحبہ! یہ آپ ہی کی بخشی ہوئی تلوار ہے اور دشمنوں کے لہو سے تر۔ صد افسوس کہ میں آپ کے حکم کی بجاآوری میں اپنی جان قربان نہیں کر سکا اور پھر آپ کے سامنے حاضر ہوں۔"

"آخر تم بار بار ہمارے سامنے کیوں آتے ہو؟ کیا چاہتے ہو ہم سے؟"

"میں کچھ نہیں چاہتا شہزادی۔ میں نے اپنی مرضی کو آپ کی مرضی میں گم کر دیا ہے۔ جو آپ چاہیں گی میں بھی وہی چاہوں گا۔ میں آپ کے حسین ہونٹوں سے نکلنے والی صدا ہوں شہزادی۔۔۔۔۔۔۔ اور کچھ نہیں ہوں۔"

"ہم چاہتے ہیں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ ہماری مشکلات میں اضافہ مت کرو۔"

"میں چلا جاتا ہوں شہزادی! لیکن آپ کو دیوتاؤں کا واسطہ مجھے ایک تحفہ دے دیجیئے۔ میں آپ کے سارے غم و آلام اپنے سینے میں سمیٹ کر لے جانا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے

اس سوغات سے محروم نہ کیجیے۔" شہزادی ایک قدم اور پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے چہرے پر شدید الجھن کے آثار تھے۔ کبھی لگتا تھا وہ تابان کو بری طرح جھڑک دے گی۔ کبھی اس کے چہرے پر ملامت نظر آنے لگتی تھی۔ تابان نے گریہ کے انداز میں کہا۔

"شہزادی! میں آپ کا غلام۔۔۔۔۔۔۔ میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں لیکن میں دیکھ رہا ہوں یہاں آپ کو ہر سمت سے حوادث کے سائے گھیر رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ میرے ساتھ چلئے شہزادی۔۔۔۔۔۔۔ اس حصار سے نکل چلئے۔ میں آپ کو اتنی دور لے جاؤں گا جہاں زمانے کی بے مہر آنکھ آپ کی گرد کو بھی نہ پاسکے گی۔ میں آپ کو کسی ایسے جزیرے پر لے جاؤں گا جو روئے زمین پر بہشت کا نمونہ ہو گا۔ میں آپ کے قدموں میں دنیا بھر کی مسرت ڈھیر کر دوں گا۔ پھر آپ کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو جاؤں گا۔ اس وقت آپ مجھے جانے کا کہیے گا، مجھے آپ ہی کی قسم میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔ آپ کی زندگی سے ہی نہیں اپنی زندگی سے بھی نکل جاؤں گا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن آپ کو اپنی شان کا واسطہ مجھے اس وقت جانے کا نہ کہے۔ میں آپ کو حوادث کے گرداب میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

تابان کے والہانہ انداز میں عجیب سی شدت تھی۔ شہزادی کا باوقار سراپا ڈگمگا کر رہ گیا۔ وہ خود کو سنبھال کر اور اپنے لہجے میں بے پناہ سنجیدگی سمیٹ کر بولی۔ "تم ایک ایسے راستے پر چل پڑے ہو غلام، جس کی کوئی منزل نہیں۔ تم ایک ایسی چیز کو چھونے کی کوشش کر رہے ہو جو تم سے قرنوں کے فاصلے پر ہے۔"

تابان کو پہلی بار احساس ہوا کہ شہزادی اس کی شوریدہ سری اور وارفتگی کو موضوع گفتگو بنا رہی ہے۔ اس کے دل کی زمین پر زلزلے نمودار ہوئے اور سینہ طوفانوں کی آماجگاہ بن گیا۔ وہ پلکیں موند کر بولا۔ "شہزادی! میں دیوانہ ہوں اور دیوانے منزل پر پہنچنے کے لیے نہیں چلتے۔ وہ اس کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں جو ان سے قرنوں کی فاصلے پر ہوتی ہے۔ میری دیوانگی کو تہمت نہ دیجیے۔ یہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے صرف یہ بتائیے کہ یہ دیوانہ اپنی زندگی ہارنے سے پہلے آپ کے کس کام آسکتا ہے؟"

تابان کے جذبوں کی شدت نے شہزادی کی پیشانی عرق آلود کر دی تھی۔ وہ اپنے نازنیں بدن کے لیے سہارا تلاش کرتی ہوئی مسہری پر بیٹھ گئی۔ "شاید تم واقعی دیوانے ہو، جس شخص نے ہمیں حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اس کی کٹی پھٹی لاش ابھی باہر پڑی ہے اور تم اس کی جگہ

لینے آن کھڑے ہوئے ہو۔ ہمیں ہمارے حصار سے نکالنے کی کوشش کرو گے تو حسرت ناک موت مرو گے۔ "مقدس ارواح" کے پیروکار تمہیں زمین کی ساتویں تہہ سے ڈھونڈ نکالیں گے اور عبرت نگاہ بنا کر دم لیں گے۔ ہمارے اور اپنے حال پر رحم کرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"مقدس ارواح کا طلسم ٹوٹ چکا ہے شہزادی۔ وہ ساری جادو نگری بکھر چکی ہے، اب وہاں کچھ باقی نہیں ہے۔"

"تم کچھ نہیں جانتے غلام، تمہیں کچھ پتہ نہیں۔ خاموش رہو اور اپنی سوچوں کو اختیار میں رکھو، کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

ایکا ایکی تابان کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھے اور سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر شہزادی کو بانہوں میں بھر لے۔ قرنوں کے فاصلے کو ایک جست میں پھلانگ کر اپنے جذبے کی تمام حدت اس پر عیاں کر دے۔ اس کے بعد کچھ بھی ہو جاتا، کیسی قیامت بھی گزر جاتی، اسے کچھ پروا نہیں تھی۔ خوشی اور غم، عذاب اور انعام، زندگی اور موت۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر سب اس کے لیے بے معنی الفاظ تھے۔ ذہن میں اچانک ابھرنے والے اس خیال کے تحت اس

نے بالکل بے اختیار ہو کر اپنے قدموں کو شہزادی کی طرف جنبش دی۔ مگر پھر اسے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ خیمے سے باہر بھاگتے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ خیمے کا پردہ اٹھا اور خوبصورت کنیز ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"شہزادی حضور! سردار فرال کی آخری رسوم ادا ہو گئیں۔ لوگ واپس لوٹ رہے ہیں۔"

شہزادی کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے۔ تابان نے کہا۔ "آپ گھبرائیں مت شہزادی۔ میں خیمے کو چاک کر کے عقبی سمت سے نکل جاتا ہوں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔" اس نے جھک کر شہزادی کے قدموں میں رکھی ہوئی خون آلود تلوار اٹھائی اور تیزی سے خیمے کی عقبی دیوار کے پاس پہنچ گیا۔ بڑی صفائی سے اس نے خیمے کا کپڑا چاک کیا اور اپنے گزرنے کے لیے راستہ بنا لیا۔ راستے میں گزرنے سے پہلے اس نے الوداعی نظروں سے شہزادی کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہزادی کی نگاہیں شعلہ فشاں ہو گی۔ چند لمحے پیشتر اس سے جو سنگین حماقت سرزد ہونے لگی تھی اس کے نتیجے میں شہزادی کا برہم ہونا یقینی تھا۔ مگر یہ دیکھ کر اس کا سینہ خوشگوار دھڑکنوں سے لبریز ہو گیا کہ اس کی نیت جاننے کے باوجود شہزادی کی آنکھوں میں شعلوں نے رقص نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ بس ہلکی سی

ناراضگی تھی جس میں شرم کا عنصر نمایاں تھا۔ تابان کا دل چاہا کہ ان لمحوں میں اسے موت آ جائے یا کائنات کی گردش تھم جائے۔ وہ اپنی ناکردہ جسارت کے نشے میں یونہی ڈوبا رہے اور شہزادی اسے یوں رک کے دیکھ کر تیزی سے کہا۔ "جاؤ"۔ وہ ٹھٹک کر خیمے سے نکلا اور سرعت کے ساتھ تاریکی کا حصہ بن گیا۔

خیمے سے باہر نکل کر اسے خیال آیا یہ تو کورا کا خیمہ تھا اور کورا کے ساتھ افشاندہ مقیم تھی لیکن ان دونوں کی بجائے اس خیمے میں شہزادی مارشا سے ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ دونوں کہاں تھیں۔۔۔۔۔۔۔۔ دفعتاً اس کا دھیان سردار شلال کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا جسم سنسنا اٹھا۔ سردار شلال جو کورا کے لیے کسی خطرناک درندے سے کم نہیں تھا، ایک بار پھر آزاد تھا اور اس پڑاؤ میں دندنا رہا تھا۔ وہ اپنے چہرے پر ایک بدنما زخم سجائے پھرتا تھا اور اس زخم کے عوض کورا کو بے عزت کر کے مار دینا اس کا مقصدِ حیات تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ کہیں کورا اس وحشی کے ستم کا شکار تو نہیں ہوگئی؟ یہ سوال نیزے کی مانند تابان کے سینے میں لگا اور وہ کورا سے ملنے کو بے تاب ہوگیا۔ وہ خیمہ گاہ کے عقب سے طویل چکر کاٹ کر سامنے والی گزرگاہ پر آیا اور خیمہ گاہ کے پہریداروں سے کہا کہ اسے اپنی کنیزوں

افشاندہ اور کورا سے ملنا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ان دونوں کے سامنے خیمے میں موجود تھا۔ کورا کو زندہ دیکھ کر تابان کو دلی سکون ملا۔ افشاندہ، اپنے بچوں کے ساتھ خوش تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے تابان کے لیے ایک کمبل اور صدری تیار کر رکھی تھی۔ کورا اور افشاندہ کے تعلقات اب سگی بہنوں جیسے تھے۔ تابان کو دیکھ کر افشاندہ کو کھانا پکانے کی فکر لاحق ہوگئی۔ تابان ایک عرصے بعد اس کے خیمے میں آیا تو وہ اس کے لیے اہتمام سے دستر خوان سجانا چاہتی تھی لیکن تابان بہت جلدی میں تھا۔ اس نے افشاندہ کو منع کر دیا۔ وہ کورا سے حال احوال پوچھ کر فوراً یہاں سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا۔ کورا کی زبانی اسے پتہ چلا کہ چند روز پیشتر ان کا خیمہ تبدیل کر گیا تھا۔ کورا ابھی سردار شلال کی رہائی سے آگاہ ہو چکی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں میں وہی سہا سہا تاثر تھا جو تابان کو پوری جان سے تڑپا دیا کرتا تھا۔ کورا نے تابان سے پوچھا کہ سردار شلال جب قاتل اور مجرم ثابت ہو چکا ہے تو سکندر کے مقربین میں کیوں شامل کیا ہے۔ کیا سالارِ اعظم سکندر عدل و انصاف کے تمام آداب بھول چکے ہیں؟ تابان اس سوال کا کیا جواب دیتا۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ خود یہی جواب ڈھونڈنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ اس کے تن بدن میں ایک آگ سلگ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ آج ہی کسی طرح سکندر سے ملاقات ہو جائے۔

کورا اور افشاندہ سے رخصت ہو کر اس نے شاہی خیمہ گاہ کا رخ کیا۔ حسبِ توقع یہاں آج بھی ملاقاتیوں کا ہجوم تھا۔ صرف خاص خاص آدمیوں کو اندر جانے کی اجازت مل رہی تھی۔ تابان بھی امیدواروں میں شامل ہو کر بیٹھ گیا۔ ابھی اسے بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ کندھے پر کسی کا ہاتھ آیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ عقب میں بوڑھا حبشی سردار یرغا کھڑا تھا۔ اس نے آنکھوں سے تابان کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ تابان اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ خیموں کے درمیان سے گزر کر وہ پڑاؤ کے گنجان حصے سے باہر نکلے اور درختوں سے گھری ہوئی ایک ہموار جگہ پر آ گئے۔ یہاں گہری تاریکی تھی۔ تابان کو اندازہ ہوا کہ اس نے اپنا گھوڑا یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر باندھ رکھا ہے۔

سردار یرغا نے کہا۔ "تابان! میرا خیال ہے تمہیں اس وقت یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔"

"کیوں؟" تابان کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

"تمہاری گرفتاری عمل میں آ سکتی ہے۔" یرغا نے جواب دیا۔ تابان اس جواب پر ششدر رہ گیا۔

"کیوں میں نے کیا کیا ہے؟" اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

یرغا نے اپنی آواز مزید دباتے ہوئے کہا۔ "تم نے کچھ نہیں کیا۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن تم پر شبہ کیا جا رہا ہے۔"

"کس بات کا شبہ؟"

"فرال روز کے قتل کا۔ فوج کے کچھ سرداروں کا خیال ہے کہ اس قتل میں تمہارا ہاتھ ہے۔ شہزادی مارشا کے سبب تم دونوں میں شدید رقابت تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ فرال کا قتل بھی شادی کے روز ہوا ہے، اس سے یہ شبہ اور تقویت پکڑتا ہے کہ اس کی جان جانے کا سبب تم ہو۔"

"لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن میں تو قتل کے وقت کئی اسٹیڈیم دور جھیل کی تفریح میں تھا۔ سردار پارمینو کے کئی قریبی ساتھی اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں۔"

"تم اپنی جگہ سچے ہو لیکن فوج میں کچھ لوگ تمہارے خلاف سرگرمِ عمل ہیں۔ ان کی ریشہ دوانیاں، سکندر کو تم سے بدظن کر سکتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کسی مصیبت میں پڑ جاؤ۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فرال اور اس کے ساتھیوں کی آخری رسوم ادا ہوئی ہیں۔ فرال کے

ساتھیوں کے جذبات بھڑکے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ تمہیں بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"سردار یرغا! آپ مجھے کس راستے پر ڈال رہے ہیں۔ جب میں گناہ گار نہیں تو کیوں چھپوں۔ کیوں سکندر کے سامنے جا کر اپنی صفائی پیش نہ کروں؟'

"میں تمہیں صفائی پیش کرنے سے نہیں روکتا۔ بس اتنا چاہتا ہوں کہ تم ایک دو روز کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ جذبات کی دھول بیٹھ جائے تو پھر میں تمہیں خود سکندر کے روبرو لے کر جاؤں گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"لیکن سردار۔۔۔۔۔۔۔۔" ابھی الفاظ تابان کے منہ میں تھے کہ گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ سردار یرغا نے خیمے کی اوٹ سے نکل کر دیکھا پھر تیزی سے بولا۔ "یہ خاص دستے کے سپاہی ہیں۔ اسی طرف آ رہے ہیں۔" تابان جلدی سے ایک تناور درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔

چند لمحوں بعد مشعلوں کی روشنی چمکی اور ایک تحکمانہ آواز ابھری۔ "کون ہے یہاں؟"

سردار یرغا نے تحکمانہ لہجے میں جواب دیا۔ "کیا بات ہے؟"

اس دوران مشعل بردار سپاہی یرغا کو پہچان چکے تھے۔ ان کے کماندار نے معذرت کے لہجے میں کہا۔ "معاف کیجیئے محترم سردار! ہم آپ کو دیکھ نہ سکے۔"

"کیا معاملہ ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟" سردار یرغا نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

کماندار اب گھوڑے سے نیچے اتر چکا تھا اور سردار یرغا کے سامنے مؤدب کھڑا تھا۔ اس کی آواز تابان کی سماعت سے ٹکرائی۔ "محترم سردار یرغا! ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک اہم واقعہ رونما ہوا ہے۔ خواتین کی خیمہ گاہ سے ایک کنیز نے بتایا ہے کہ سردار تابان کچھ دیر پہلے چوری چھپے خیمہ گاہ میں داخل ہوا تھا۔ وہ زبردستی شہزادی مارشا کی خلوت میں گھسا اور نازیبا گفتگو کی۔ بعد ازاں خیمے کو عقبی جانب سے چاک کر کے نکل گیا۔ نئے پرچم بردار سردار کی ہدایت پر ہم سردار تابان کی تلاش میں نکلے ہیں۔"

سردار یرغا نے محتاط لہجے میں پوچھا۔ "کچھ پتا چلا؟"

"ابھی نہیں۔" کماندار نے جواب دیا۔ "لیکن شاہی خیمہ گاہ میں کئی افراد نے بتایا ہے کہ سردار تابان وہاں شاہ کے ملاقاتیوں میں موجود تھا۔۔۔۔۔۔۔"

سردار یرغا کماندار سے باتیں کرتے ہوئے اسے موقعے سے دور لے گیا۔ ایک طرح سے یہ تابان کے لیے اشارہ تھا کہ وہ یہاں سے نکل جائے۔ تابان بجھے دل کے ساتھ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ وہ کچھ دور نشیب میں ایک درخت سے بندھا ہوا تھا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر تابان نے ایک دشوار راستہ اختیار کیا اور پڑاؤ کے گشتی دستوں سے حتی الامکان فاصلہ رکھتے ہوئے اس چراہ گاہ کی طرف بڑھنے لگا جہاں وہ ایرانی سردار روہتاس کو منتظر چھوڑ آیا تھا۔

وہ چراگاہ میں پہنچا تو رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ درمیانی راتوں کا چاند دور کہیں بحیرہ ایجئین کی آغوش میں جھانک رہا تھا۔ عجیب بات تھی کہ سردار روہتاس خیمے سے باہر ہی ٹہلتا ہوا مل گیا۔ اس نے تابان کو نہایت غور سے دیکھا، پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"مجھے یقین تھا تم ضرور واپس آؤ گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آؤ میرے ساتھ، میں اس بلا کی سردی میں تمہیں ایک پیالی گرم گرم قہوے کی پلاؤں۔"

تابان گھوڑے سے اترا اور سست قدموں سے چلتا روہتاس کے ساتھ گھاس پھونس کے خیمے میں داخل ہو گیا۔ کوئی یونانی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ دشمن فوج کا ایک بڑا سالار ان چرواہوں کے درمیان رُوپوش ہے۔ روہتاس کی شکل وصورت بھی کچھ ایسی تھی کہ وہ جنگلی

لباس اتارنے کے بعد ہو بہو چرواہا نظر آتا تھا۔ روہتاس نے تابان کو بتایا کہ وہ پچھلے ایک ہفتے سے اس بستی میں مقیم ہے۔ چرواہے اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں، اسے گردوپیش کی خبریں لا کر دیتے ہیں اور ان میں سے کئی ایک تو اپنے مقبوضہ علاقوں کو یونانیوں سے آزاد کرانے کے لیے جنگی خدمات کے لیے بھی تیار ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ ابھی روہتاس اور تابان یہی باتیں کر رہے تھے کہ ہوشمند ایک مقامی شخص کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ مقامی شخص نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ ہوشمند کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے مقامی لوگوں کی میزبانی سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ ضرورت سے زیادہ کھا کر، نشہ آور مشروب حلق تک بھر لیا ہے، اب اس کے قدم سنبھالے نہ سنبھل رہے تھے۔ تابان کے اشارے پر مقامی شخص نے اسے آتشدان کے قریب بستر پر لٹا دیا۔ وہ حالتِ خواب میں بڑبڑانے لگا اور اپنی گردن کے منحوس "پٹھے" کو صلواتیں سنانے لگا جو جنگ کے کئی ہفتے بعد ابھی تک نہیں اترا تھا۔

دفعتاً تابان اور سردار روہتاس کو بری طرح چونکنا پڑا۔ چراہ گاہ کی شمالی جانب سے چیخنے اور زور سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ روہتاس نے اٹھ کر نشیب میں دیکھا، چرواہوں کے آٹھ دس

جھونپڑے قریب قریب واقع تھے۔ وہاں کئی مشعل بردار گھڑ سوار دکھائی دے رہے تھے۔ پھر کچھ گھڑ سوار اس خیمے کی طرف بڑھے جہاں تابان، روہتاس اور ہوشمند موجود تھے۔ پہلے تو تابان اور روہتاس نے نووارد گھڑ سواروں کو ڈاکو جانا، لیکن جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ یونانی فوج کے سپاہی ہیں۔ تابان اور روہتاس کے ہاتھ خود بخود اپنی تلواروں پر آ گئے۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ کسی بھی ہنگامی صورت حال کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔ یونانی سپاہی دندناتے ہوئے ان کے خیمے کے سامنے سے گزرے اور ایک نزدیکی خیمے میں داخل ہو گئے۔ یہ چراگاہ کے سب سے معمر گڈریے کا خیمہ تھا۔ تابان نے جلدی سے اپنے خیمے کی مشعلیں بجھا ڈالیں۔ اب وہ گہری تاریکی میں دم سادھے کھڑے تھے اور معمر گڈریے کے خیمے سے ابھرنے والی آوازیں سن رہے تھے۔ یونانی سپاہی گڈریے کو بری طرح ڈانٹ رہے تھے۔ وہ اس سے ان چند نقاب پوشوں کا پتہ پوچھ رہے تھے جنہوں نے دوپہر کے وقت دریا کے کنارے ایک اہم یونانی سردار کو قتل کر دیا تھا۔ یقیناً "یونانی سردار" سے مراد فرال روز تھی۔ وہ فرال روز کے قتل کی تفتیش پر نکلے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ واردات کے بعد گیروا لباسوں والے نقاب پوش اس چراہ گاہ کے راستے فرار ہوئے ہیں اور چرواہوں نے یقیناً انہیں دیکھا ہو گا۔

معمر گڈریا بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار تھا اور حلفیہ کہہ رہا تھا کہ اس نے نقاب پوشوں کو دیکھا ہے اور نہ ہی بستی کے کسی اور فرد کو ان کے بارے میں علم ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اس گفتگو کے دوران بستی کے مرد و زن گھڑ سواروں کے گرد سہمے کھڑے تھے۔ کچھ دیر تفتیش کرنے کے بعد گھڑ سوار واپس چل دیئے۔ تابان اور سردار روہتاس نے سکھ کا سانس لیا۔ تاہم یہ "سکھ" دیر پا ثابت نہیں ہوا۔ گھڑ سوار ابھی نشیب میں بھی نہ پہنچے تھے کہ انہیں اندھیرے میں سے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ غالباً یہ کسی بچے کا کام تھا۔ یونانی سپاہیوں کو برہم کرنے کے لیے یہ "حرکت" تیر بہدف ثابت ہوئی۔ وہ غراتے ہوئے پلٹے اور ایک جھونپڑے میں گھس گئے۔ چند ہی لمحے بعد وہ وہ بارہ تیرہ برس کے ایک لڑکے کو گھسیٹتے ہوئے جھونپڑے سے باہر لے آئے۔ لڑکے کی جواں سال ماں لڑکے سے لپٹی ہوئی تھی اور رو رو کر یونانی سپہ سالار سے فریاد کر رہی تھی لیکن وہ اسے چھوڑنے کے لیے کسی صورت آمادہ نہیں تھے۔ دفعتاً انہوں نے اس لڑکے کو چھوڑ دیا اور اس کی ماں پر جھپٹ پڑے۔ وحشی جانوروں کی یلغار نے کمزور عورت کو چلانے پر مجبور کر دیا۔ وہ زمین پر گر پڑی اور خود کو بچانے کی کوشش کرنے لگی۔ طاقت کے نشے میں چور سپاہیوں نے اسے اٹھا کر گھوڑے پر لاد لیا اور اچک اچک کر

گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ بستی کے معمر گڈریے نے آگے بڑھ کر کماندار کے گھوڑے کی لگام تھام لی۔

"نہیں سردار، رحم کرو۔ اتنی چھوٹی سی غلطی کی ہمیں اتنی بڑی سزا مت دو۔"

"ہٹ جاؤ"۔ یونانی سردار دھاڑا۔ "ورنہ پوری بستی کو ہانک کر لے جائیں گے۔ ہٹ جاؤ۔" اس نے بوڑھے کو ٹانگ کے ساتھ زور سے دھکیلا۔ وہ پیچھے نہیں ہٹا تو اس نے ہاتھ میں پکڑی تلوار دستے تک اس کے پیٹ میں اتار دی۔ بوڑھے کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور وہ دوہرا ہو کر زمین پر جا گرا۔ یہ ایک لرزہ خیز منظر تھا۔ کماندار نے خون آلود تلوار ہوا میں لہرائی اور چنگھاڑ کر بولا۔ "اور کسی کو شوق ہے اس عورت کو چھڑانے کا؟" جواب میں گہرا سناٹا پوری بستی میں لپک گیا۔ اس سناٹے میں بدنصیب عورت کی گھٹی گھٹی چیخوں کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ تابان سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوا۔ ہوتا بھی کیسے۔ اس کی آنکھوں میں برسوں پرانا وہی منظر تازہ ہو گیا تھا جب ایسے ہی باوردی سپاہیوں نے ایک عورت سے اس کا بچہ چھیننے کی کوشش کی تھی۔ وہ عورت بھی اسی طرح روئی اور چلائی تھی۔ اسی طرح اس نے اپنے بچے کو بچانے کے لیے اپنی عزت اور جان داؤ پر لگائی تھی۔ اس وقت بھی، ایسی

ہی بدبودار مشعلوں کی روشنی میں کسی ایسے ہی جھونپڑے کے سامنے وہ دلدوز منظر وجود میں آیا تھا۔ ماں سے جدا کیا جانے والا وہ بچہ تابان خود تھا۔ اپنے بچپن کی وہ خون آلود دھندلی تصویر ابھی تک تابان کے ذہن پر نقش تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جب گھڑ سوار چیختی چلاتی عورت کو لے کر آگے بڑھنے لگے۔ وہ کسی بھوکے درندے کی مانند خیمے سے نکلا اور دیوانہ وار بھاگتا ہوا گھڑ سواروں کے پیچھے لپکا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی اور وہ ہر اندیشے سے بے نیاز تھا۔ اس کے عقب میں جو تلوار برادر سایہ لپک رہا تھا وہ سردار روہتاس کا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اس شب اس ویران چراہ گاہ میں اپنی من مانی کرنے والے دس یونانی سپاہی اپنے کماندار سمیت بے رحمی سے قتل کر دیے گئے تھے۔ ان میں سے چھ سپاہیوں کو اس تلوار نے موت کے گھاٹ اتارا تھا جو آج تک سکندر کی حمایت میں اٹھتی رہی تھی۔ دور و نزدیک جس کی کاٹ کا چرچا تھا اور جسے ایک حملے میں تین ناقابلِ شکست سرداروں کو ڈھیر کرنے کا اعزاز حاصل تھا۔ یہ تابان کی تلوار تھی اس کے ہاتھوں قتل ہونے والے اس کے اپنے ہی دستے کے سوار تھے۔ اس کے کماندار کا نام پزمان تھا اور تابان اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اندھیرے کے سبب

یونانی سپاہی تابان کو پہچاننے میں ناکام رہے تھے ورنہ شاید مغویہ کو چھوڑ بھاگ جاتے۔ انہوں نے اپنی جانب سے بھرپور مزاحمت کی تھی اور تابان نے روہتاس کے ساتھ مل کر چند لمحوں میں ان کو خاک و خون میں لوٹا دیا تھا۔

بستی کے مکینوں کے لیے یہ خونی نظارہ لرزہ خیز تھا۔ وہ جنگجو جو تھوڑی دیر پیشتر بستی کو نیست و نابود کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے اب مردہ مکھیوں کی طرح یہاں وہاں پڑے تھے۔ ان کے گھوڑے بغیر سواروں کے تاریکی میں چکرا رہے تھے اور سامانِ حرب ڈھلوان پر دور تک بکھرا ہوا تھا۔ چرواہے یہ سوچ کر خوفزدہ ہو رہے تھے کہ سکندری فوج کے ہاتھوں اب ان کا کیا انجام ہو گا۔

روہتاس کا خیال تھا کہ اب چرواہوں کو یہ جگہ فوراً چھوڑ دینی چاہیئے، مقتول دستے کی تلاش میں یونانی سپاہی بہت جلد یہاں پہنچ جائیں گے اور سب کو عبرتناک انجام سے دوچار کریں گے۔ تاہم تابان نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ پڑاؤ سے واپس آتے ہوئے یونانی سپاہیوں کی گشتی ٹولیاں دیکھ چکا تھا۔ اگر رات کے اس آخری پہر چرواہے اپنے ریوڑ کے ساتھ نقل مکانی کی کوشش کرتے تو یقیناً گشتی دستوں کی نظر میں آتے اور مشتبہ

ٹھہرتے۔ بہتر یہی تھا کہ وہ نقل مکانی کی کوشش نہ کریں۔ تابان نے مشورہ دیا کہ یونانی سپاہیوں کی لاشیں اس طرح ٹھکانے لگائی جائیں کہ کوئی ثبوت باقی نہ رہے۔ چونکہ ان میں سے کوئی بچ کر واپس نہیں گیا اس لیے ان کے انجام کا سراغ لگانا یونانیوں کے لیے آسان نہیں ہو گا۔

معمولی بحث و تمحیص کے بعد تابان کی یہ تجویز مان لی گئی۔ چراہگاہ سے کچھ ہٹ کر گھنی جھاڑیوں میں ایک گڑھا کھودا گیا۔ تمام کی تمام لاشیں گڑھے میں پھینک دی گئیں۔ ان کا سامانِ حرب بھی ساتھ ہی رکھ کر گڑھا پاٹ دیا گیا۔ تازہ مٹی کے اوپر ایک بار پھر خشک پتے بکھیر دیئے گئے۔ مقتولین کے گھوڑے بھی کچھ فاصلے پر لے جا کر منتشر کر دیئے گئے تھے۔ اب چراہگاہ میں یونانی دستے کی آمد اور خونی جھڑپ کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔

دن چڑھنے والا تھا۔ روہتاس تابان کو لے کر خیمے میں آ گیا۔ یہاں ہوشمند ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ روہتاس نے انگیٹھی کی آگ پر ہاتھ تاپتے ہوئے دور مشرق کی طرف نگاہ دوڑائی۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا لیکن افق پر اجالے کی چادر سی تنی ہوئی تھی۔ بوڑھے روہتاس نے خوابیدہ لہجے میں کہا۔

"تابان! لوٹ آؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ اپنی اصل کی طرف واپس جاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تم اپنی گم گشتہ جنت میں کھڑے ہو۔ اس جنت کو برباد کرنے والوں کا ساتھ مت دو۔ یہ لٹیرے اور غاصب ہیں۔ کل بھی انہوں نے ہماری آزادی پر حملے کیے تھے۔ آج بھی یہ ہماری آزادی کو غلامی میں بدل رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تم بہادر ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس وقت سرزمینِ ایران کو تم جیسے بہادروں کی ضرورت ہے۔ مادرِ وطن تم کو پکار رہی ہے۔ بال کھولے تمہارے نام کی دہائی دے رہی ہے۔ اس کی پکار کا جواب دو۔ بہادر بیٹے ایسے موقعوں پر خاموش نہیں رہا کرتے۔"

تابان کی نگاہیں انگیٹھی کے دہکتے انگاروں پر جمی تھیں۔ آنکھوں میں اضطراب کی گہری کیفیت کروٹیں لے رہی تھی۔ روہتاس نے سلسلہء کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "تابان! ایرانی سپاہ میں تمہیں تہہِ دل سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ سکندر نے تمہیں یک ہزاری سردار کا عہدہ دے کر تم پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ تمہاری جنگی مہارت اس لائق ہے کہ تمہیں یک ہزاری سردار بنایا جائے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اب تو تمہارے پاس کئی جنگوں کا تجربہ بھی

ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایرانی فوج میں تمہارا منصب پنج ہزاری سے کم نہیں ہو گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

روہتاس دیر تک تابان سے محوِ گفتگو رہا۔ اس کی گفتگو کا محور یہی تھا کہ تابان اپنی تلوار اپنی سرزمین اور اپنے لوگوں کی حفاظت میں اٹھائے۔ ایرانی فوج میں شامل ہو جائے اور یونانی غاصبوں کے دانت کھٹے کرنے میں اپنا کردار ادا کرے۔ تابان خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔ آخر میں جب روہتاس نے اس سے جواب طلب کیا تو تابان کا لہجہ ہر جوش و خروش سے عاری تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"سردار روہتاس! میرا دل میدانِ جنگ سے بھر گیا ہے۔ تلوار ایک بوجھ سا محسوس ہو رہی ہے مجھے۔"

روہتاس نے کہا۔ "یہ سب اس لیے کہ آج تک تم میدانِ جنگ میں غلط سمت کھڑے رہے ہو۔ تم نے جن لوگوں کے لیے قربانیاں دیں وہ قدر ناشناس ہیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں کہ ہیرے اور پتھر میں کیا فرق ہوتا ہے۔"

"بات کچھ بھی ہو سردار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اب مجھ سے کسی کے لیے تلوار نہ اٹھائی جائے گی۔ میرے اندر کوئی جذبہ مر گیا ہے۔ میں خود کو بالکل بے روح محسوس کر رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرا دل چاہتا ہے میدانِ جنگ اور کشت و خون کے ہنگاموں سے کہیں بہت دور نکل جاؤں۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اس سے پہلے میں ایک کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیسا کام؟" روہتاس نے پوچھا۔

"میں شہزادی مارشا اور کورا کو وہاں سے نکال لینا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ افشاندہ سے بھی ایک ملاقات ضروری ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے اس نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔"

تابان کے لہجے میں رچی ہوئی قنوطیت نے روہتاس کو آزردہ کر دیا۔ وہ ایک بار پھر نئے سرے سے تابان کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ تابان پر ان پند و نصائح کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے چہرے پر بیزاری آمیز سنجیدگی کا ایک دبیز نقاب چڑھ چکا تھا۔ وہ اب صرف اتنا چاہتا تھا کہ روہتاس کسی طرح اپنا کوئی آدمی یونانی پڑاؤ میں داخل کرے جو کہ مارشا اور کورا تک ایک

اہم پیغام پہنچا سکے۔ ابھی تابان اور روہتاس میں گفتگو جاری ہی تھی کہ ایک چرواہا تیزی سے جھونپڑے میں داخل ہوا۔ اس نے بتایا کہ ایک چادر پوش عورت دو بچوں کے ساتھ یہاں پہنچی ہے اور تابان نامی شخص سے ملنا چاہتی ہے۔ تابان چونک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دھیان فوراً افشاندہ کی طرف گیا تھا۔ اس نے جھونپڑے سے باہر نکل کر دیکھا۔ وہ افشاندہ ہی تھی۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ تابان جلدی سے اسے خیمے میں لے آیا۔۔۔۔۔۔۔۔ اب ہوشمند بھی بیدار ہو گیا تھا اور حیرانی سے یہ سارے منظر دیکھ رہا تھا۔ افشاندہ نے بتایا کہ وہ ایک چھکڑا بان کو اپنا قیمتی ہار رشوت میں دے کر پڑاؤ سے نکل سکی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ افشاندہ کو پڑاؤ سے نکالنے والی کورا تھی۔ وہ خود نہیں آ سکی تھی کیونکہ کچھ لوگ مسلسل اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ تابان نے افشاندہ سے تفصیلات پوچھیں تو اس نے بتایا کہ سردار شلال کورا کے ارد گرد منڈلا رہا ہے۔ کل رات اس نے ایک خواجہ سرا کے ہاتھ کورا کو پیغام بھیجا ہے کہ وہ خود کو اس کے حوالے کر دے۔ اسی میں اس کی نجات ہے۔ اگر اسے تابان کی طرف سے کوئی گھمنڈ ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ تابان کی حیثیت اب ایک مفرور قاتل کی سی ہے اور وہ پڑاؤ میں قدم رکھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس پیغام کے بعد کورا سخت پریشان تھی۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ چند خادمائیں اس پر کڑی

نگرانی رکھے ہوئے ہیں اور وہ خواتین کی خیمہ گاہ میں نظر بندی کی حالت میں ہے۔ آج علی الصبح سردار شلال نے خادمہ کے ہاتھ ایک اور پیغام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ اس کے پاس صرف شام تک کی مہلت ہے اس کے بعد وہ کورا کو اپنی قوتِ بازو سے حاصل کر لے گا۔

اس پیغام کے بعد کورا نے افشاندہ کو بچوں سمیت خیمہ گاہ سے نکال دیا تھا اور وہ ایک چھکڑا بان کی مدد سے تابان تک پہنچ گئی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کورا کی مصیبت کا جان کر تابان پوری جان سے تڑپ گیا۔ آخر وہی ہوا جس کا اسے خدشہ تھا۔ اسے سردار شلال سے بھی زیادہ سکندر پر طیش آیا، جس نے اپنا وعدہ نبھانے کے لیے ایک خونی قاتل کو لوگوں کی عزتوں اور جانوں سے کھیلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ بہت بڑی ناانصافی تھی یہ۔

تابان نے سردار روہتاس سے کہا کہ وہ اسی وقت پڑاؤ میں جائے گا اور کورا کو بحفاظت لے کر آئے گا۔ روہتاس نے کہا۔

"تابان! ہوش سے کام لو۔ ہوا کا رخ سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے مخالف سرداروں نے پڑاؤ میں تمہارے لیے ایک آگ بھڑکا رکھی ہے۔ تم جذبات میں آکر خود کو اس آگ کا ایندھن کیوں بنا رہے ہو۔ عین ممکن ہے کہ تمہیں الجھانے کے لیے ہی کورا کو یہ پیغامات

بھیجے جا رہے ہوں۔ اگر تم کورا کی طرف سے زیادہ اندیشہ محسوس کر رہے ہو تو سکندر کو ایک نامہ ارسال کر دو۔ جس میں لکھو کہ اس نے شلال جیسے خطرناک مجرم کو آزاد چھوڑ کر خطرہ مول لے رکھا ہے اور اگر کورا کو کچھ ہوا تو ذمے دار سردار شلال ہو گا۔"

تابان سمجھنے سمجھانے کی حد سے گزر چکا تھا۔ اس کے سینے کے صحرا میں ایک تند آندھی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ سردار روہتاس اور ہوشمند کے مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ہتھیار باندھ کر جھونپڑے سے نکلا اور گھوڑے تک آ گیا۔ یہ وہی اصیل گھوڑا تھا جو معبد میں اسے شہزادی مارشا کی طرف سے دیا گیا تھا۔ یہ انگلیوں کی جنبش پر چلنے والا گھوڑا تھا۔ تابان جست کر کے اس پر سوار ہوا اور ایڑ لگا دی۔

چراگاہ سے چند سو گز آگے آکر اسے اندازہ ہوا کہ سردار روہتاس اور ہوشمند بھی اس کے پیچھے آ رہے ہیں۔ تابان ایک شدید خطرے کا سامنا کرنے جا رہا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا اس کے ساتھ ہو۔ یوں بھی اس کا اکیلے رہنا زیادہ مفید تھا۔ اس نے ٹیلوں کے اندر ایک محفوظ مقام پر گھوڑے کو روک لیا۔ جب روہتاس اور ہوشمند خاصے دور نکل گئے تب وہ اپنی پناہ گاہ سے برآمد ہوا اور ایک مختلف راستے سے پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگا۔

اس کے سر پر چمکتا سورج تھا۔ بائیں طرف خودرو درختوں کے سلسلے تھے اور دائیں جانب دریا کا پانی ایک سفید لکیر کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ جوں جوں وہ پڑاؤ سے قریب ہو رہا تھا اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ گھوڑا بھگاتے بھگاتے اسے اچانک ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ اور اس نے لگامیں کھینچیں اور گھوڑا اپنی رفتار اچانک کم کر کے ٹھہر گیا۔ تابان نے غور سے چاروں طرف دیکھا۔ اونچے ٹیلے سر اٹھائے کھڑے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بالکل ویران اور سنسان۔ کہیں کوئی پرندہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ٹیلوں کے دامن میں کہیں کہیں سرخ اور نیلی جھنڈیاں گڑی تھیں۔ تابان کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی لی لہر دوڑ گئی۔ وہ روہتاس اور ہوشمند کو جُل دینے کی کوشش میں ایک خطرناک علاقے میں گھس آیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر غور سے چاروں طرف دیکھا شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ علاقہ جنگ اِسوس کی یادگار تھا۔ دریا کے بائیں کنارے سے یونانی فوج کی پیش قدمی کے لیے ایرانیوں نے یہاں گہری خندقیں کھود دی تھیں اور انہیں شاخوں اور پتوں سے ڈھانپ دیا تھا۔ جنگ میں یہ خندقیں بیکار ہی ثابت ہوئی تھیں۔ کیونکہ یونانی فوج نے چند سٹیڈیم دور وادی میں ہی ایرانی سپاہ کو ڈھیر کر دیا تھا۔ بعد ازاں جنگ گرفتار شدہ فوجیوں نے ان خندقوں کی نشاندہی کی تھی اور سکندر نے اپنے سپاہیوں کو حادثات سے بچانے کے لیے یہاں مختلف رنگوں کی جھنڈیاں نصب کرا

دیں تھیں۔ تابان ان جھنڈیوں کو خاطر میں لائے بغیر چلا آیا تھا اور کافی دور پہنچ گیا تھا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا ان خفیہ خندقوں میں لکڑی اور لوہے کی میخیں اس طرح ٹھونکی گئی ہیں کہ اندر گرنے والا گرتے ساتھ ہی چھلنی ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں ان خندقوں میں گرنا موت کے منہ میں جانا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ راستے کا انتخاب کرتے ہوئے اسے زندگی میں کبھی اتنی مشکل نہیں آئی تھی۔ چاروں طرف گہرا سناٹا تھا اور اس سناٹے میں ہانپتے ہوئے گھوڑے کی پھنکاریں دور دور تک گونج رہی تھیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جب اسے کچھ سمجھ نہیں آئی تو اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے گھوڑے کے نقوشِ پا پر چلتے ہوئے واپس لوٹ جائے۔ ابھی وہ واپسی کا سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے قدموں کے نیچے جنبش محسوس ہوئی۔ اس نے چونک کر دیکھا مٹی میں دراڑ نمودار ہو رہی تھی۔ اچانک اس کا گھوڑا زور سے ہنہنایا اور تابان نے اس کی پچھلی ٹانگوں کو خلا میں دھنستے دیکھا۔ موت اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ تابان کی آنکھوں میں ناچ گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا یا کرنے کا سوچتا زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ وہ ہوا میں اڑتا ہوا کئی گز نیچے خندق میں گرا۔ چند لمحوں کے لیے اسے اسے قطعی معلوم نہیں ہوا کہ وہ کہاں

گرا ہے۔ سر پر لگنے والی چوٹ سے آنکھوں میں ستارے ناچ گئے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر اس نے دیکھا وہ اپنے گھوڑے پر اوندھا پڑا ہے۔ چوبی میخیں گھوڑے کے جسم میں دھنسی ہوئی تھیں اور وہ جاں کنی کے عالم میں لرز رہا تھا۔ تابان تڑپ کر گھوڑے سے نیچے اترا۔ خندق میں دور تک میخیں گڑی ہوئی تھیں۔ ان کے نوکدار سرے کسی کے لیے بھی جان لیوا ثابت ہو سکتے تھے۔ تابان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اپنے گھوڑے کے اوپر گرا تھا اور ٹانگ پر معمولی خراش کے سوا کوئی زخم نہیں آیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھوڑے کا جسم خون سے خالی ہو گیا۔ تابان نے اس کی بے نور آنکھوں میں جھانکا اور دل مسوس کر رہ گیا۔ جیسے سکندر کو بیوسی فالس عزیز تھا یہ گھوڑا تابان کو عزیز تھا۔ یہ اس کے لیے اس ہستی کی طرف سے تحفہ تھا جس پر تابان اپنی ہزار زندگیاں بھی قربان کر سکتا تھا۔ اس نے نمناک آنکھوں سے گھوڑے کے ایال پر ہاتھ پھیرا اور خالی نظروں سے اس کے بہتے خون کو دیکھنے لگا۔ یہی وقت تھا جب اسے خندق کے کنارے سے کچھ دوری پر انسانی آوازیں سنائیں دیں۔ یوں لگتا تھا کہ ان ٹیلوں کے درمیان کچھ لوگ موجود تھے اور انہوں نے تابان کو خندق میں گرتے دیکھ لیا تھا۔ اب وہ ایک دوسرے کو پکارتے اور آپس میں تیز تیز باتیں کرتے خندق کی سمت آ رہے تھے۔ خندق کوئی چار ہاتھ چوڑی اور دس ہاتھ گہری تھی۔ کسی کی مدد کے بغیر اس میں سے

باہر نکل آنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ بے تابی سے آنے والوں کا انتظار کرنے لگا۔ ان کی تعداد آٹھ دس سے کم نہیں تھی اور وہ اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھے۔ جب آنے والے خندق کے بالکل نزدیک پہنچے تو تابان کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ آنے والی یونانی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ یقیناً اُن کا تعلق یونانی فوج سے تھا۔

تابان کا اندازہ درست ثابت ہوا اس نے خندق کے کنارے پر باوردی سپاہیوں کی ایک لمبی قطار دیکھی۔ تابان کو زندہ سلامت دیکھ کر وہ حیران ہو رہے تھے۔ تابان کی دلی خواہش تھی کہ وہ پہچانا نہ جائے لیکن آج دن ہی کچھ ایسا طلوع ہوا تھا۔ ہر کام اس کی خواہشات کے برعکس ہو رہا تھا۔ خندق کے کنارے کھڑے سپاہیوں میں سے کسی ایک فربہ اندام سپاہی نے تابان کو پہچان لیا اور سرگوشیوں میں اپنے ساتھیوں کو مطلع کرنے میں مصروف ہو گیا۔ حقیقت حال سے آگاہ ہوتے ہی یونانی سپاہی چوکس ہو گئے۔ ان میں سے چند ایک نے تیر کمان سنبھال لیے اور تابان کو یوں گھورنے لگے جیسے انہوں نے اس کے پر تلاش کر لیے ہوں اور اب انہیں خطرہ ہو کہ وہ کسی بھی لمحے پرواز کر جائے گا۔ تابان نے ان سے کہا کہ وہ اسے خندق سے نکالنے کا انتظام کریں۔ اس کا جلد از جلد سالارِ اعظم سکندر تک پہنچنا ہے۔ سپاہیوں پر تابان کی

اس دلیل کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ تابان کو پہچانتے ہی انہوں نے اپنے کان اس کی طرف سے بند کر لیے تھے۔

قریباً دو گھڑیاں تابان کو اسی طرح خندق میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے گزر گئیں۔ آخر کنارے پر چند اہم منصب دار نظر آئے۔ ان میں سے فرال روز کے ایک یک صدی سردار کو تابان اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بھی فوراً ہی تابان کو پہچان گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے غضب کی چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ اس نے نفرت سے تابان کی جانب سے منہ پھیر لیا اور مدھم آواز میں ماتحتوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ لگتا تھا کہ وہ لوگ تابان کو خندق سے باہر لانے میں خاصی احتیاط کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے لیے خندق میں رسی کی سیڑھی پھینکی گئی۔ سیڑھی پھینکنے سے پہلے تمام ہتھیار اس کے جسم سے اتروا لیے گئے تھے۔ جب تابان سیڑھی چڑھ رہا تھا تین تیر انداز کمانوں کے زہ کھینچے بالکل تیار حالت میں کھڑے تھے۔ جونہی تابان کنارے پر پہنچا اسے دبوچ کر نیچے گرا لیا گیا اور ہاتھ پاؤں زنجیر کر دیئے گئے۔ یک صدی سردار نے تابان کی پسلیوں میں کئی ٹھوکریں رسید کیں اور اسے فرال روز کے قاتل کا خطاب دیا۔ تابان یہ سب کچھ خاموشی سے سنتا

رہا۔ سننے کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسے گھوڑے پر لاد کر مخدوش علاقے سے باہر نکالا گیا۔ اور پھر ایک بند گھوڑا گاڑی میں بٹھا کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

گھوڑا گاڑی بڑی سرعت سے ایک نیم پختہ راستے پر اڑی چلی جا رہی تھی۔ تابان کو بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ اسے پڑاؤ کی طرف نہیں لے جایا جا رہا۔ تو پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ کہاں جا رہا تھا؟ کسی آخری نتیجے پر پہنچنے کے لیے اس کے پاس بہت کم وقت تھا۔ وہ جانتا تھا پڑاؤ میں کورا کے پاس بہت تھوڑی مہلت رہ گئی ہے۔ وہ بری طرح دشمنوں میں گھری ہوئی ہے اور گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ یہ گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ تابان نے اپنے پاؤں سامنے پھیلائے۔ ٹخنوں سے اوپر پنڈلیاں آہنی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھیں۔ زنجیر کے دونوں سروں کو ایک زنگ آلود قفل سے مربوط کر دیا گیا تھا۔ ایسی ہی ایک زنجیر نے تابان کے ہاتھ بھی جکڑ رکھے تھے۔ اسے پابند کرنے والوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسی زنجیروں کی تابان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ وہ بارہا اس لوہے کو پگھلا چکا ہے۔ اس نے

اپنے لمبے بالوں میں سے مخصوص آہنی چمٹی نکالی اور اس کے ذریعے قفل سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہو گیا۔ اس کے انداز میں غایت درجے کا انہماک پایا جاتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ناقابل شکست قفل اس کے ہاتھوں میں موم ہو گیا۔ پاؤں کی زنجیر کھلی تو ہاتھ بھی خود بخود بندش سے آزاد ہو گئے۔ تابان نے اندازہ لگایا کہ گھوڑا گاڑی کے عقبی دروازے پر کوئی موجود نہیں۔ اگر وہ کسی طرح یہ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس قید سے نجات مل سکتی تھی۔ وہ کچھ دیر اپنے ہاتھوں سے دروازے کو ٹٹولتا رہا۔ دروازہ خاصا مضبوط تھا اور یہاں کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی جس سے اس پر طبع آزمائی کی جا سکتی۔ تابان پنجرے میں بند شیر کی طرح گھوڑا گاڑی میں چکرانے لگا۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ گاڑی رکنے کا انتظار کرے۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس نے زنجیریں ایک بار پھر اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے لپیٹیں اور خاموشی سے ایک گوشے میں سمٹ گیا۔

ابھی اسے بیٹھے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ گاڑی کی رفتار اچانک کم ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی غیر مانوس سا شور سنائی دیا۔ کچھ لوگ فارسی زبان میں زور زور سے باتیں کر رہے تھے پھر یکا یک تلواریں چلنے کی آواز آئی۔ گاڑی کو بری طرح ہچکولے لگنے لگے۔ گھوڑے الٹے پاؤں

چلتے ہوئے نیم دائرے کی شکل میں چکرا رہے تھے۔ تابان کو محسوس ہوا کہ گھوڑا گاڑی کے یونانی محافظوں پر چند ایرانی گھڑ سواروں نے ہلہ بول دیا ہے۔ تابان زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا اس کے ساتھ اس کے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر بھی لگے تھے۔ جلد ہی گھوڑا گاڑی کے ارد گرد ہونے والی لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ اس لڑائی میں نووارد گھڑ سوار کامیاب رہے اور یونانیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا یا بھگا دیا گیا۔ گاڑی کا اکلوتا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور تابان نے اپنے سامنے چند نقاب پوشوں کو دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں عریاں تلواریں تھیں اور وہ لڑائی کے سبب ہانپے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی تابان باہر نکل آیا۔

یہ درختوں سے گھری ہوئی ایک سنسان جگہ تھی۔ ایک گرد آلود راستہ درختوں کے درمیان سے بل کھاتا دور تک نکل گیا تھا۔ اس راستے پر تین یونانی سپاہیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ایک لاش گاڑی پر اس طرح پڑی تھی کہ نصف دھڑ ہوا میں جھول رہا تھا۔ ایرانی نقاب پوش اپنے حلیے اور طور اطوار سے قبائلی ڈاکو نظر آتے تھے۔ ان کا سردار گٹھے ہوئے جسم کا ایک لحیم شحیم شخص تھا۔ اس نے اپنی خون آلود تلوار نیام میں رکھ کر نقاب اٹھایا تو تابان ششدر رہ گیا۔ وہ

اس کے یک ہزاری دستے کا ایک سردار تھا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر تابان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور پھر فوجی انداز میں تعظیم پیش کر کے ساکت کھڑا ہو گیا۔

تابان نے پوچھا۔ "تم یہاں کیسے؟"

وہ بولا۔ "سردار! آپ کے وفادار آپ کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔"

"کیا مطلب؟" تابان نے پوچھا۔

"سردار! پڑاؤ میں کچھ لوگ آپ کے خلاف سرگرمی سے کاروائیاں کر رہے ہیں۔ آپ کی پیاری کنیز کورا کو بھی آپ سے وفاداری کی سزا دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سردار شلال اس کے درپے ہے۔ وہ کسی بھی طرح اسے اپنے جال میں جکڑنا چاہ رہا ہے اور اگر میرے اندیشے رائیگاں نہیں تو وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو چکا ہے۔"

تابان کے رگ و پے میں بجلی سی کوند گئی۔ "کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے اپنے ماتحت کا گریبان پکڑ کر اسے جھنجھوڑ دیا۔

وہ آزردگی سے بولا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے معلوم ہوا ہے کہ کورا ایک خادمہ کا بھیس بدل کر پڑاؤ سے فرار ہو گئی ہے اور متلاشی دستہ اس کے تعاقب میں گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کورا کو کسی جال میں الجھایا گیا ہے۔ سردار شلال پڑاؤ میں اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا لہٰذا اس نے اسے جان بُوجھ کر فرار ہونے کا موقع دیا ہے۔"

تابان بات کی تہہ تک پہنچ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ زلزلوں کی آماجگاہ بنتا جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا سردار شلال پڑاؤ میں ہے؟"

ماتحت کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے کہا۔ "جناب! یہی بات تو زیادہ تشویشناک ہے۔ سردار شلال بھی پڑاؤ میں نہیں ہے۔"

تابان نے اپنے ماتحت سردار سے ضروری معلومات حاصل کیں۔ ضروری ہتھیار اور ایک تیز رفتار گھوڑا لیا اور کورا کی تلاش میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ماتحت سردار نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اور اس کے تمام ساتھی تابان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن تابان نے انہیں سختی سے منع کر کے واپس بھیج دیا۔ وہ اپنے خیر خواہوں کو اپنے ساتھ خطرات میں جھونکنا نہیں چاہتا تھا۔ انہوں نے جو کچھ کیا تھا یہ بھی ان کی استطاعت سے باہر کی بات

تھی۔ ماتحت سردار اور اس کے ساتھی تابان کو خیر اندیش نظروں سے دیکھتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دریا کی طرف روانہ ہو گیا۔ ماتحت سردار کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق یونانی فوج کا متلاشی دستہ کورا کی تلاش میں اسی راستے پر روانہ ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تابان دریا کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف جا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ چند کوس آگے ایک برباد شدہ قلعے کے قدیم کھنڈر موجود ہیں۔ اگر کورا اس سمت میں گئی تھی تو اس وقت وہ کھنڈر ہی اس کا مسکن ہو سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ خود وہاں چھپ گئی ہو اور زیادہ ممکن یہ تھا کہ سردار شلال یا اس کے ساتھی اسے قابو کر کے وہاں لے گئے ہوں۔ تابان کے ماتحت سردار نے بھی اس امکان کا اظہار کیا تھا۔

یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ تیز چمکیلی دھوپ میں ہر چیز اپنے اصل رنگ میں چمک دمک رہی تھی۔ تابان نے تھوڑا آگے جا کر عام راستہ ترک کر دیا اور ایک نسبتاً دشوار گزار راستے پر گھوڑا بھگاتا کھنڈرات کی جانب بڑھنے لگا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ شام سے تھوڑی دیر قبل ان کھنڈروں

تک پہنچ سکا۔ گھوڑا کچھ فاصلے پر درختوں میں باندھنے کے بعد وہ دبے قدموں قلعے کی طرف بڑھا۔ عقلمندی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس مہم جوئی کے لئے اندھیرا پڑنے کا انتظار کرے لیکن صورت حال تاخیر کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اگر کورا اس منتقم المزاج شلال کے قبضے میں آ چکی تھی تو ہر لمحہ قیمتی تھا۔ وہ ایک نسبتاً محفوظ مقام سے کھنڈر میں داخل ہوا اور بڑی احتیاط سے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ شلال کے شیطانی منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے یہ سنسان جگہ بے حد موزوں تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن نہ جانے کیوں کھنڈر میں داخل ہوتے ہی تابان کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ سردار شلال اس طرف نہیں آیا۔ کھنڈر میں اتھاہ خاموشی تھی۔ گرد آلود قطعات پر کہیں قدموں کے نشان نظر آتے تھے اور نہ ہی کہیں کوئی گھوڑا بندھا ہوا تھا۔

تابان بڑی احتیاط سے کھنڈر کے اندرونی حصوں میں پہنچا لیکن اسے کہیں کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیا۔ اس کے دل میں امید کی کرن روشن ہونے لگی۔ کہیں اس کے خدشات غلط تو نہیں تھے۔ ہو سکتا تھا کورا واقعی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی ہو یا پھر ماتحت سرداروں کی اطلاع ہی غلط ہو۔ وہ دیر تک قلعے کے پُر ہیبت کھنڈروں میں گھومتا رہا اور تہہ خانوں اور سرنگوں میں

جھانکتا رہا۔ شام گہری ہو گئی اور کھنڈرات میں کچھ بھی دکھائی دینا بند ہو گیا تو اس نے گھوڑا سنبھالا اور ایک بار پھر دریا کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔

اس رات تیسرے پہر تک وہ یونہی بھٹکتا پھرا۔ نہ کورا کا کوئی سراغ ملا اور نہ سردار شلال کا۔ آخر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اب کورا کو پڑاؤ میں دیکھنا چاہیئے لیکن پڑاؤ میں داخل ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ اپنے پاؤں پر چل کر موت کے منہ میں جانے والی بات تھی۔ تابان شدید تذبذب کے عالم میں ایک درخت تلے کھڑا تھا جب کسی کے کراہنے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ دودو کرب میں ڈوبی ہوئی یہ آواز کچھ فاصلے پر زیتون کے گنجان درختوں سے آئی تھی۔ تابان تڑپ کے گھوڑے سے اترا اور تلوار بے نیام کرتا ہوا آواز کی سمت بڑھا۔ درختوں میں پہنچ کر اس نے دیکھا ایک عمر رسیدہ یونانی سپاہی گھاس پر چت پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کی پسلیوں میں نیزے کا گھاؤ تھا۔ ہر سانس کے ساتھ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہوتے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک مشعل جل رہی تھی۔ یہ مشعل زمین پر پڑی تھی اور اب بجھنے کے بالکل قریب تھی۔ تابان نے اپنے گھوڑے کی خرجین میں سے روغن نکال کر مشعل پر انڈیلا اور اسے زخمی کے قریب زمین پر گاڑ دیا۔ زخمی کے ہونٹ

خشک تھے اور وہ "پانی، پانی" کی پکار کر رہا تھا۔ تابان نے اسے پانی پلایا اور کندھوں سے تھام کر ایک تناور درخت کے سہارے بٹھا دیا۔ یہ زخمی یونانی سپاہی تابان کو نہیں پہچانتا تھا۔ اس نے اپنا نام شاکرت بتایا اور کہا کہ وہ ایک سنگین واردات کا گواہ ہے اور مرنے سے پہلے اپنی یہ گواہی کسی معتبر سردار تک پہنچا دینا چاہتا ہے۔ تابان نے اس سے کہا۔

"میرا نام تابان ہے اور میں سکندری فوج میں یک ہزاری سردار کے منصب پر فائز ہوں تم جو کچھ بتاؤ گے میں ذمے دار افراد تک پہنچانے کی پوری کوشش کروں گا لیکن فی الحال میں چاہتا ہوں کہ تمہیں طبّی امداد پہنچاؤں۔ میری خرجین میں مرہم پٹی کا سامان موجود ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

تابان اٹھنے لگا تو سپاہی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "نہیں سردار!" وہ عاجزی سے بولا۔ "میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ میری بات سن لو۔ میں شلال نامی سردار کے ساتھ ایک لڑکی کے تعاقب میں یہاں پہنچا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ اب سے کوئی ڈھائی پہر پہلے کی بات ہے۔"

شلال اور لڑکی کے ذکر نے تابان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ ششدر نگاہوں سے بوڑھے سپاہی کی جانب دیکھنے لگا۔ سپاہی تابان کی کیفیت سے بے خبر آنکھیں موندے اپنی بات کہتا چلا

گیا۔ اس نے کہا۔ "اس لڑکی کا نام کورا ہے۔ وہ پڑاؤ میں عورتوں کی خیمہ گاہ سے چوری چھپے نکلی تھی۔ راستے میں سردار شلال کے حکم پر ہم نے اس کے لیے گھات لگا رکھی تھی۔ اسے پکڑ لیا گیا اور سردار شلال کے حکم پر یہاں پہنچا دیا گیا۔ یہاں گھنے درختوں کے اندر پہلے سے ایک بند گھوڑا گاڑی موجود تھی۔ چیختی چلاتی لڑکی کو لے کر سردار شلال اس گھوڑا گاڑی میں گھس گیا۔ ہم لوگ باہر پہرے پر کھڑے رہے۔ رات کے دوسرے پہر شلال اس گاڑی سے برآمد ہوا۔ وہ نشے میں چور تھا۔ واپس پڑاؤ میں جانے سے پہلے اس نے اپنے ماتحت سرداروں سے کہا کہ وہ بھی صبح تک باری باری گاڑی میں جاتے رہیں پھر لڑکی کو قتل کر کے یہیں درختوں میں دفن کر دیں۔ میں یہ سب کچھ بہت کرب کی حالت میں دیکھ رہا تھا، سردار شلال موقعے سے واپس چلا گیا تو مجھے دیگر سرداروں کے سامنے بولنے کی جرات ہو گئی۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ایک ادنی سپاہی ہوں۔ آپ سب سے کم حیثیت کا مالک ہوں لیکن عمر کے لحاظ سے تمہارے بزرگوں کی جگہ ہوں۔ اس جگہ ہم نے جو کچھ کیا ہے یہ دیوتاؤں کے ایوان لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔ شکر کرو کہ آسمان ہم پر ٹوٹ کر نہیں گرا یا زمین نے ہم کو نگل نہیں لیا۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن اب اپنے نامہ اعمال کو مزید سیاہ مت کرو۔ چند لمحے کے لیے اپنے گھر بار اور اہل و اعیال کے بارے میں سوچو اور اس لڑکی پر رحم کرو۔ اگر اس

بدقسمت کی تقدیر میں موت لکھی جا چکی ہے تو اسے فوراً مار دو۔ اس کی زندگی کو بے حسی کے کانٹوں پر اور مت گھسیٹو۔۔۔۔۔۔۔۔ نشے میں چور ایک سردار نے میری گردن دبوچ لی اور مجھے اٹھا کر ان درختوں میں پھینک دیا۔ نہ جانے میرے اندر اتنا حوصلہ کہاں سے آ گیا تھا۔ میں اٹھ کر سردار کے قدموں سے لپٹ گیا اور اسے گاڑی کی طرف جانے سے روکنے لگا۔ دوسرے سردار قہقہے لگا رہے تھے اور مجھے پیچھے ہٹانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اسی دوران گاڑی سے ایک سایہ برآمد ہوا۔ لڑکھڑاتا ہوا دریا کی طرف بڑھا اور بلندی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ یہ وہی بدنصیب لڑکی تھی۔ لڑکی کو یوں ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سردار بھڑک اٹھے۔ انہوں نے مجھے ٹھوکریں ماریں اور ایک سردار نے سپاہی کے ہاتھ سے نیزہ پکڑ کر میرے سینے میں گھونپ دیا۔ وہ اپنی دانست میں مجھے مار گئے تھے لہٰذا مڑ کر میری طرف دیکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ کچھ دیر وہ دریا کے کنارے کھڑے چیختے چلاتے رہے، پھر گھوڑوں پر سوار دریا کنارے کنارے بہاؤ کی طرف چلے گئے۔۔۔۔۔۔"

تابان نے یہ سب کچھ سکتے کی کیفیت میں سنا۔ اس کی بصارت زائل، زبان گنگ اور سماعت ہلاک ہو چکی تھی۔ نگاہوں میں کورا کا خونچکاں چہرہ تھا اور کانوں میں ایک ہی صدا گونج رہی

تھی۔ "تابان! آخر سردار شلال اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ اپنے زخمی چہرے کے بدلے اس نے کورا کو عبرت نگاہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ کورا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جو تیری زندگی کے جھلستے صحرا میں پھولدار درخت کا گھنا سایہ تھی۔ کبھی ایک ہمدم کی طرح تیرے دکھ سنتی تھی، کبھی ایک بہن کی طرح تیرے جسم کے کانٹے پلکوں سے چنتی تھی، کبھی ایک شفیق ہستی کی طرح تیرا چہرہ اپنی آغوش میں چھپا لیتی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں اس کورا کو آج زندہ در گور کر دیا گیا، اس کے نازنین بدن کو ہوس کے کانٹوں پر گھسیٹ کر تار تار کر دیا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ اب تُو بھی زندہ کیوں ہے۔ مر جا یا مار دے۔ خود فنا ہو جا یا شلال اور اس کے ٹولے کو فنا کر دے۔" اس کی شفاف آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ جاں بلب سپاہی نے درخت سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ دفعتاً وہ لڑھک کر پھر گھاس پر گر گیا۔ تابان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ بہت دیر بولنے کے سبب اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ تابان نے محسوس کیا کہ وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہے گا۔ اس نے بوڑھے کے دونوں شانے تھام لیے اور ملتجی لہجے میں بولا۔ "نہ بابا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ابھی مر نانہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تمہاری گواہی بے حد اہم ہے۔ میں تمہیں سکندر کے روبرو لے جاؤں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ دیکھ یہ ہے وہ شخص جس نے تیرے پالتو کتوں کو ایک بے گناہ لڑکی کی بوٹیاں نوچتے اپنی آنکھوں سے دیکھا

ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔" کوشش کے باوجود بوڑھے کی آنکھیں بند ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ تابان نے اس کے شانوں کو ایک بار پھر جھنجھوڑا پھر اس کے منہ میں تھوڑا سا پانی ٹپکایا اور اسے اٹھا کر اپنے کندھے پر لاد لیا۔ گھنی جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں سے راستہ بناتا وہ اپنے گھوڑے تک آیا۔ وہ بوڑھے کو اپنے گھوڑے پر سوار کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے جسم میں ایک جھرجھری نمودار ہوئی اور تابان کے کندھے پر اس کا بوجھ یکدم بڑھ گیا۔ تابان نے اسے سیدھا کیا۔ وہ مر چکا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ گواہی ناپید ہو چکی تھی جو سالارِ اعظم کی نظر میں سردار شلال کو مجرم ٹھہرا سکتی تھی۔

تابان نے بوڑھے کا جسم بہ آہستگی زمین پر رکھ دیا۔ کچھ دیر اس کے سرہانے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اچک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گھوڑے کو ایڑ لگی اور وہ سرپٹ شمال کی طرف بھاگنے لگا۔ گھوڑے کی ٹاپیں تابان کے کاسہ سر میں گونج رہی تھیں۔ اس کا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ ایسا گرد و غبار تھا کہ کچھ دکھائی اور سجھائی نہیں دیتا تھا۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ اسی طرح سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا فوج کے پڑاؤ میں گھس جائے۔ سامنے آنے والے ہر شخص کو تہ تیغ کر ڈالے اور اس وقت تک تلوار چلاتا رہے جب تک اس کے جسم کو سینکڑوں

نیزوں میں پرو نہ دیا جائے۔ کبھی وہ سوچتا کہ سیدھا سکندر کے خیمے میں پہنچے اور چلا چلا کر اس سے انصاف طلب کرے۔ کبھی اس کا دھیان شلال کی طرف چلا جاتا اور وہ تصور ہی تصور میں اس کی دھجیاں بکھیرنے لگتا۔ پڑاؤ کی جانب نصف سے زائد فاصلہ طے کر کے اس نے اچانک گھوڑا روک لیا۔ وہ جذبات کے بے پناہ گردوغبار پر حوصلے اور تحمل کے چھینٹے دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی تندہی و تیزی اس کے دشمنوں کو اس سے دور لے جا سکتی تھی۔ اپنی عجلت کے سبب وہ بے موت مر جاتا تو یہ کورا کے قاتلوں کی بہت بڑی خوش بختی تھی۔ اس نے خود کو سمجھایا کہ وہ اندھادھند پڑاؤ میں نہ گھسے۔ اگر اسے کورا کے مجرم سے قرار واقعی بدلہ لینا ہے تو اپنے سینے پر برداشت کا بھاری پتھر رکھے اور سوچے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے گھوڑے کا رخ موڑا اور دریا کی طرف چلا گیا۔ دریا کے کنارے گھوڑا چلاتا وہ اس ٹیلے کے دامن میں پہنچ گیا جہاں سے عمر رسیدہ سپاہی کے بقول کورا نے دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔ وہ ٹھٹھری ہوئی سردی اور سنسان رات سے لاتعلق دریا کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس کے کان پانی کے مدھم شور پر تھے۔ اس پانی نے کورا کو نگلا تھا اور اس کی بے مراد زندگی سے آخری سانسیں چھینی تھیں۔ تابان کو محسوس ہوا کہ اس کے رخساروں پر نمی ہے۔ وہ رو رہا تھا۔ لگتا تھا آنکھوں سے پانی کی بجائے تیزاب کے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ ایک سیال آتش میں

اس کا چہرہ جھلستا چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس کے دل میں امید کی ایک کرن روشن ہوئی۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے کورا ابھی تک زندہ ہو۔ پانی اسے بہا کر دور لے گیا ہو اور کسی کنارے پر پھینک دیا ہو۔ کیا وہ دوبارہ کورا کی صورت دیکھ سکے گا؟ "کاش ایسا ہو سکے !" اس کے دل کی گہرائیوں میں خیال ابھرا۔ "ایسا ہو جائے تو وہ کورا کے ہر زخم پر مرہم رکھ دے گا۔ اسے اتنی محبت دے گا کہ اس کے پاس زندہ رہنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں رہے گا۔ ہر اس چھوٹی سے چھوٹی کوتاہی کا مداوا کر دے گا جو کورا کے سلسلے میں اس سے ہوئی ہے۔"

وہ دریا کے کنارے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ دور مشرق سے سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ تابان کا گھوڑا اب تازہ دم تھا۔ اس کے سوچا کہ اجالا ہوتے ہی وہ دریا کے ساتھ ساتھ نکلے گا اور کورا کو ڈھونڈے گا لیکن اسے یہ تردد کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ روشنی ہوتے ہی اسے کورا کی لاش نظر آ گئی۔ وہ جسے دور دور ڈھونڈنے کا ارادہ کر رہا تھا وہ اس کے پاس ہی موجود تھی۔ صرف تین قدم کے فاصلے پر کورا کا بے جان جسم پانی کے اندر ایک جھاڑی سے الجھا ہوا تھا۔ اس کے لمبے ریشمی بال ایک شاخ سے یوں بل کھا گئے تھے کہ شب بھر پانی میں رہنے کے باوجود وہ نیچے کی طرف نہیں جا سکی تھی۔ تابان تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور بھاگ کر

کورا کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا خونچکاں چہرہ بیت جانے والی قیامت خیز رات کی گواہی دے رہا تھا۔ یہ گواہی تابان کے لیے اپنے چہرے پر سجا کر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔

تابان نے کورا کے بال بہ آہستگی شاخوں سے چھڑائے اور اسے بانہوں میں اٹھائے ہوئے پانی سے باہر آ گیا۔ رات بھر سخت سردی میں رہنے کے سبب لاش اکڑ چکی تھی۔ اس نے اسے ایک ہموار پتھر پر لٹا دیا اور محویت سے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ اس پُر سکون سمندر کی طرح جس کے نیچے طوفان پلتے ہیں۔ دفعتاً اسے چونکنا پڑا۔ کورا کی لاش پر کسی کا سایہ پڑ رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور بری طرح ٹھٹک گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر گیر والباس والا ایک تلوار بردار کھڑا تھا۔ وہ نہ جانے کب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تابان کا ہاتھ بے اختیار اپنی تلوار کی طرف بڑھا۔ اس وقت عقب سے اسے ایک بلند نعرہ سنائی دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ گیر والباس والے اور منڈے ہوئے سروں والے کم از کم دس گھڑ سوار تلواریں لہراتے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تابان کی آنکھوں میں فرال روز اور اس کے ساتھیوں کی موت کا منظر کھو گیا۔ انہیں بھی ایسے ہی پُر اسرار افراد نے دریا کے اندر ہلاک کر ڈالا تھا اور بہت تگ و دو کے باوجود پکڑے نہیں جا سکے تھے۔ آج اس ویران مقام پر وہ تابان پر حملہ آور

ہو رہے تھے۔ موت تابان کی آنکھوں میں ناچ گئی۔ فرال روز کی طرح وہ بھی شہزادی مارشا کا دعویدار تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ شہزادی مارشا جو گیر والباس والوں کے لیے "مہا دیوی" تھی اور جس کے تحفظ کی وہ قسم کھائے ہوئے تھے۔ تابان کی توجہ چند ساعتوں کے لیے گھڑ سواروں کی طرف منعطف ہوئی۔ اس دوران سامنے کھڑے شخص نے بے دریغ تابان پر چھلانگ لگائی اور اسے لیتا ہوا نم آلود ریت پر گرا۔ وہ ایک گرانڈیل شخص تھا۔ اس کے نیچے سے نکلنے میں تابان کو چند لمحے کی تاخیر ہوئی، گھڑ سواروں کے لیے اتنی مہلت بہت تھی، وہ موقع پر پہنچے اور گھوڑوں سے اتر اتر کر تابان سے لپٹ گئے۔ تابان کو غیر مسلح کر کے ہر طرف سے دبوچ لیا گیا اور ایک ریشمی ڈور سے مشکیں کس دی گئیں۔ زیتون کے خزاں رسیدہ درختوں سے ایک گھوڑا گاڑی برآمد ہوئی اور تابان کے قریب آ رکی۔ ایسی گھوڑا گاڑیاں تابان ہیلی کاریس کے معبد میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ ان میں دو ہم رنگ گھوڑے جوتے جاتے تھے اور گاڑی پر چاروں طرف چمڑا منڈھا ہوتا تھا۔ تابان کو اٹھا کر اس گھوڑا گاڑی میں لاد دیا گیا۔ پھر کورا کی لاش ایک کمبل میں لپیٹی گئی اور اسے بھی تابان کے قریب رکھ دیا گیا۔ گھوڑا گاڑی آگے بڑھی تو تابان نے دیکھا کہ یہاں ایک اور جسم بھی موجود ہے۔ یہ اسی عمر رسیدہ

شخص کی لاش تھی جسے سردار شلال اور اس کے ساتھی درختوں میں جاں بلب چھوڑ گئے تھے اور جس نے تابان کو کورا کے انجام سے آگاہ کیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

گھوڑا گاڑی کے سفر کے دوران ہی تابان کو گہری غنودگی نے آن لیا تھا۔ کوئی خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسی تھی اور وہ بتدریج نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک آراستہ کمرے میں پایا۔ بغور دیکھنے پر اس کو یہ کمرا جانا پہچانا محسوس ہوا اور پھر وہ یہ جان کر دنگ رہ گیا کہ یہ وہی کمرہ ہے جس میں وہ کئی ہفتے قیام کر چکا ہے۔ دمشق کے معبد میں مہمان پجاری کی حیثیت سے وہ اسی کمرے میں رہا تھا۔ وہی در و دیوار، وہی آرائش، وہی گھنٹیوں کی دور افتادہ صدائیں اور بھینی بھینی خوشبو۔ وہ اٹھ کر دروازے پر پہنچا۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ اس نے دریچے کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ باہر ویسی ہی راہداری نظر آ رہی تھی۔ دریچے کے عین سامنے طاقدان میں ایک مورتی سجی ہوئی تھی اور یہ مورتی اس کمرے میں سے وہ کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس کا ذہن چکرا کر رہ گیا۔ اس کمرے اس راہداری اور اس پورے معبد کو وہ تاخت و تاراج دیکھ چکا تھا۔ یہاں ملبے کے ڈھیر

تھے۔ منہدم چھتیں تھیں اور دھوئیں سے سیاہ دیواریں تھیں۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا وہ خواب تھا یا یہ خواب ہے؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ اپنا لباس دیکھا۔ اب وہ بھیگے ہوئے فوجی لباس میں نہیں تھا۔ اس کے جسم پر معبد کا مخصوص معطر چغہ تھا۔ چہرے کے بال صاف تھے اور ناخن ترشے ہوئے تھے۔ وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا یہ سچ مچ ایک جادونگری تھی جو تباہ و برباد ہو کر پھر اپنی اصل حالت میں آ گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یا پھر اس کی آنکھیں شعبدہ بازی کا ایک اور کرشمہ دیکھ رہی تھیں۔

وہ نڈھال سا ہو کر بستر پر بیٹھ گیا۔ یہ وہی بستر تھا، وہی کمرہ تھا لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ وہ اپنے پورے ہوش و حواس سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کورا کی لاش آئی اور سینہ فرطِ غم سے شق ہونے لگا۔ وہ ایک دم بستر سے اٹھا اور دروازے پر جھپٹا۔ چوبی دروازہ اس کے آہنی گھونسوں سے لرز اٹھا۔ وہ حلق کی پوری قوت سے چلانے لگا۔ "دروازہ کھولو۔ میں کہتا ہوں دروازہ کھولو۔" چند ہی لمحے بعد دو کنیزیں دریچے کے سامنے نظر آئیں۔ کنیزوں کی صورتیں اجنبی لیکن لباس جانے پہچانے تھے۔ تابان انہیں دیکھ کر دھاڑا۔

"مجھے کون لایا ہے یہاں؟ کس لیے لایا گیا ہے مجھے یہاں؟"

ایک کنیز آہستگی سے بولی۔ "آپ مہادیوی کے مہمان پجاری ہیں۔ انہی کے حکم پر آپ کو یہاں پہنچایا گیا ہے۔"

"کون مہادیوی؟"

"اس معبد کی مہادیوی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ تھوڑی دیر بعد آپ کو قصرِ نور میں طلب فرمانے والی ہیں۔"

مہمان پجاری، مہادیوی قصرِ نور۔ تابان کا دماغ پھٹنے لگا۔ کیا وقت کا دریا الٹے رخ پر بہنے لگا تھا۔ یہ تو وہی مقم تھا جہاں سے وہ گزر چکا تھا۔ جہاں سے وقت بھی گزر چکا تھا۔ قصرِ نور اور مہادیوی کا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں میں مارشا کی صورت لپک گئی۔ تو کیا قصرِ نور میں مارشا بھی اس کی منتظر تھی۔ کیا وہ پھر اس کے رُوبرو جانے والا تھا؟ اسے سوچ میں گم دیکھ کر کنیز نے ادب سے کہا۔

"آپ ابھی آرام فرمائیے۔ تھوڑی دیر میں قصرِ نور کی خاص خادمائیں آپ کو لینے کے لیے آئیں گی۔"

اس کے ساتھ ہی دونوں کنیزیں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ اس دریچے کو آہنی جنگلے سے بند کیا گیا تھا ورنہ تابان ایک لمحہ ضائع کیے بغیر باہر کود جاتا اور دندناتا ہوا اس مقام پر پہنچ جاتا جسے یہاں "قصرِ نور" کہا جاتا تھا۔ وہ اپنے سر کے بال مٹھیوں میں جکڑ کر واپس مڑا اور اس خوبصورت فوارے کے پاس جا بیٹھا جس میں سے ہفت رنگ پانی کا دھارا چھوٹتا تھا اور جلترنگ کی مسحور کن آواز آتی تھی۔ وہ مرمریں تخت بھی موجود تھا جس پر بیٹھ کر وہ اور دیوی انگبیں راز و نیاز کیا کرتے تھے۔ وہ تخت پر بیٹھ گیا اور بے دم سا ہو کر گہرے سانس لینے لگا۔

قصرِ نور کی خادماؤں کے لیے تابان کو خاصا انتظار کرنا پڑا۔ یہ بے حد کٹھن اور تکلیف دہ انتظار تھا۔ تابان جیسے خواب اور بیداری کے درمیان بھٹک رہا تھا۔ آخر کمرے کا دروازہ کھلا اور سفید براق لباس پہنے، حسین و جمیل خادماؤں نے اندر آ کر اسے تعظیم پیش کی۔

"قصرِ نور میں معزز مہمان کو مہادیوی نے یاد فرمایا ہے۔" ان میں سے ایک کھنکتی ہوئی آواز میں بولی اور دوسری نے سفید پھولوں کا ایک گلدستہ تابان کو تھما دیا۔

تابان خاموشی سے ان کے ساتھ چل دیا۔ حسبِ سابق وہ چند طویل راہداریوں سے گزرے اور معبد کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں گردوپیش کی ہر چیز سفید نظر آتی تھی۔ سنگِ مرمر کے درو دیوار، ان درو دیوار سے پھوٹتی ہوئی دودھیا روشنی، سفید قالین اور محرابی دروازوں کے سفید پردے۔ ایک محرابی دروازے کے اوپر دیوار پر تابان کو پانچ مقدس ارواح کی شبیہیں نظر آئیں۔ تابان کو اپنی بصارت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ چند ہفتے پیشتر وہ ان سب مناظر کو تباہی کی زد میں دیکھ چکا تھا۔ "کیا اس مختصر مدت میں یہ سب کچھ دوبارہ تعمیر کر لیا گیا ہے؟" یہ سوال خاصا اہم تھا۔ چند ایک مقامات پر تابان کو محسوس ہوا تھا کہ در و بام کی ساخت میں معمولی ردوبدل ہے اور تعمیر بھی پرانی نہیں ہے لیکن اگر یہ سب کچھ دوبارہ تعمیر ہوا تھا تو کیونکر؟ اول تو اس مختصر مدت میں یہ ممکن نہیں تھا پھر دمشق پر متحدہ یونانی فوج کا قبضہ تھا اور اس تباہ حال معبد کے گرد فوجی رسالوں کے پڑاؤ تھے۔ یہ امر یقینی تھا کہ تابان جس عمارت میں کھڑا ہے یہ دمشق میں نہیں ہے۔ شاید یہ اندرونی ایران کا کوئی اور شہر تھا جہاں بعین دمشق کے معبد جیسا ایک اور معبد موجود تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ گھوڑا گاڑی کے سفر کے دوران وہ کتنی دیر بے ہوش رہا لیکن کوشش کے باوجود وہ کوئی اندازہ قائم نہ کر سکا۔

اپنے خیالوں میں غلطاں آخر تابان اس مقام تک پہنچ گیا جس سے آگے خادمائیں اس کا ساتھ دینے سے قاصر تھیں۔ وہی بلند و بالا محرابی دروازہ اس کے سامنے تھا جس میں ایک بیش قیمت سفید پردہ جھول رہا تھا۔ دفعتاً تابان کو توامی حبشیوں کا خیال آیا۔ ان حبشیوں سے اولین ملاقات یہیں پر ہوئی تھی۔ کیا وہ اسے پھر سے خوش آمدید کہیں گے؟ اس نے سوچا اور منتظر نگاہوں سے پردے کی جانب دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پردے میں جنبش ہوئی، ایک سیاہ ہاتھ باہر نکلا اور پھر ایک دیو قامت شخص تابان کے سامنے آگیا۔ تابان ایک دراز قد شخص تھا لیکن پردے کے پیچھے سے برآمد ہونے والا شخص اس سے بھی کئی بالشت اونچا تھا۔ یوں لگتا تھا اس کا سر چھت کو چھو رہا ہو۔ تابان سمیت ارد گرد کی ہر چیز اس کے مقابلے میں حقیر دکھائی دیتی تھی۔ اس کا جسم بے ڈول تھا محسوس ہوتا تھا کہ غیر معمولی قد اس کے لیے زحمت بنا ہوا ہے۔ اس نے تابان کو اپنی غیر معمولی طور پر بڑی آنکھوں سے گھورا اور پھر جھک کر تعظیم پیش کی اور بولا۔

"خوش آمدید معزز مہمان! مہادیوی آپ کو شرفِ ملاقات بخشنا چاہتی ہیں۔"

بعینہ یہی الفاظ توامی حبشیوں نے تابان سے کہے تھے۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ توامی حبشیوں کی جگہ اس دیو قامت حبشی نے لے لی ہے۔ شاید قصرِ نور کی محافظت کے لیے عجیب الخلقت پیدا ہونا شرطِ اول کی حیثیت رکھتا تھا۔ توامی حبشی پیدائشی طور پر ایک دوسرے سے پیوست تھے جبکہ موجودہ محافظ ناقابلِ گمان حد تک طویل قامت تھا۔ تابان محرابی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ طویل قامت حبشی ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اب پھر وہی مرحلہ درپیش آیا۔ انہیں چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے مہادیوی کے ایوان میں پہنچنا تھا۔ تابان جانتا تھا کہ اگر اس نے یہ رسم پوری نہ کی تو اس کا قصرِ نور میں پہنچنا مشکوک ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ ہر صورت وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ اگر مہادیوی شہزادی مارشا ہی تھی تو وہ اس تک پہنچنے کے لیے سر کے بل چلنے کو بھی تیار تھا۔ وہ طویل قامت حبشی کے پاس جھک گیا اور ہتھیلیوں اور گھٹنوں کے بل چلنے لگا۔ گلدستہ بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک طویل راہداری طے کر کے وہ ایک اور محرابی دروازے کے پاس پہنچے۔ یہاں پہنچ کر دیو قامت حبشی رک گیا۔ آنکھوں آنکھوں میں اس نے تابان کو سمجھایا کہ اس سے آگے وہ اکیلا جائے گا۔ تابان آگے بڑھا۔ سامنے وہی خوبصورت ایوان تھا جس کا ہر منظر دودھیا دھند میں دھندلایا رہتا تھا۔ فرش سے نیم دائرے کی شکل میں سفید سیڑھیاں اٹھتی تھیں اور قدِ آدم

بلندی پر جا کر اوجھل ہو جاتی تھیں۔ تابان جانتا تھا کہ جب تک دیوی کی آواز نہ آئے وہ سر جھکائے رکھنے کا پابند ہے۔ وہ چور نظروں سے سیڑھیوں کے بالائی سرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دھند میں حرکت پیدا ہوئی اور سفید براق لباس میں ملبوس مہادیوی اپنی نادیدہ نشست پر براجمان ہو گئی۔ تابان کا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ جلد از جلد مہادیوی کا رُخِ زیبا دیکھنا چاہتا تھا۔

"سر اٹھاؤ!" مہادیوی کی گونجتی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے سر اٹھایا۔ اس کے سامنے ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ چہرہ شہزادی مارشا کا نہیں تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ دیوی انگبیں کا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ تابان کا دل بجھ گیا۔ دیوی انگبیں جو معبد کی سرکردہ دیوی کہلاتی تھی، آج مہادیوی کی مسند پر بیٹھی تھی۔ اس کے سفید تاج میں سے مسحور کن شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اور اس تاج کے نیچے سے اس کا حسین چہرہ بے انتہا سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ تابان نے غور سے اسے دیکھا۔ یہی انگبیں دیوی تھی جو گلابی دھند میں لپٹی اس سے پہروں راز و نیاز کیا کرتی تھی۔ اس کی ادائیں تابان کے لیے اجنبی تھیں اور نہ اس کا جسم۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن آج وہ خود کو اس سے بہت دور محسوس کر رہا تھا۔ ان کے

درمیان غیریت کی ایک بلند دیوار حائل ہو چکی تھی۔ تابان سوچنے لگا کہ اس نے انگبین دیوی کو آخری بار کب دیکھا تھا۔ اسے یاد آیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ دونوں ہفت رنگ پانی کے فوارے کے پاس موجود تھے۔ اچانک در و دیوار گہری تاریکی میں ڈوب گئے تھے پھر تابان کو سینے پر زوردار دھکا لگا تھا۔ وہ سنگی فوارے کو توڑتا ہوا فرش پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب روشنی لوٹی تھی تو انگبین دیوی وہاں سے جا چکی تھی۔ اس واقعے کے کئی ماہ بعد وہ آج انگبین دیوی کو دیکھ رہا تھا۔

حسبِ دستور وہ آگے بڑھا اور اس نے سفید گلدستہ سب سے نیچے زینے پر رکھ دیا۔ "کیا یہ درست ہے کہ تم مہادیوی مارشا سے محبت کا دم بھرتے ہو؟" انگبین دیوی کی آواز ابھری۔ یہ سوال بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔ تابان کو لگا جیسے اسے یہ سوال پوچھنے کے لیے یہاں طلب کیا گیا ہے۔ انگبین کی شعلہ بار سوالیہ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

تابان نے کہا۔ "ہاں دیوی! مجھے اپنے جرم سے انکار کی تاب نہیں۔ میں شہزادی مارشا سے محبت کرتا ہوں۔ اب سے نہیں اس وقت سے جب وہ صرف شہزادی مارشا تھی۔ مہادیوی نہیں تھی۔"

"تمہارا جرم ناقابل معافی ہے۔" انگبین کی بے لچک آواز ابھری۔ "بہتر یہ تھا کہ مہادیوی خود یہاں جلوہ افروز ہو کر تمہیں سزا سناتیں لیکن وہ معبد میں موجود نہیں ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں یہ فرض مجھے ادا کرنا پڑ رہا ہے۔" دیوی انگبین نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چھوٹا سا نقرئی عصا دو بار فرش پر مارا۔ طویل قامت حبشی سر جھکائے اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں تین مسلح محافظ تھے۔ انگبین دیوی نے بے حد سرد مہری سے تابان کو دیکھا اور بولی۔

"اسے لے جاؤ، اور مہادیوی کی واپسی تک بندی خانے میں قید رکھو۔ یاد رہے کہ اس کی موت واقع نہیں ہونی چاہیئے۔"

تابان کے لیے یہ فیصلہ کن لمحات تھے۔ وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر مسلح محافظوں سے گتھم گتھا ہو سکتا تھا لیکن مسئلہ ان محافظوں کو زیر کرنے کا نہیں اس معبد کی بھول بھلیوں سے نکلنے کا تھا اور وہ جانتا تھا یہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔ راہداریوں کے پتھروں میں جگہ جگہ ایسے ہم رنگ شیشے جڑے ہوئے تھے جن کے پیچھے سے ان گنت نگران آنکھیں نقل و حرکت کرنے والوں پر نگاہ رکھتی تھیں۔ یہ ایسا گورکھ دھندہ تھا جس کے پیچ و خم سے سر تو پھوڑا جا سکتا تھا رہائی حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔ "تو کیا اسے نامعلوم مدت کے لیے کسی تاریک بندی

خانے میں ڈال دیا جائے گا؟" یہ سوال زہرناک تیر کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ وہ قید و بند سے ڈرتا نہیں تھا لیکن سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ نے اسے جاں کنی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ یہ کورا کے انتقام کی آگ تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس آگ کے ساتھ بندی خانے میں چلا گیا تو چند راتوں میں جل کر بھسم ہو جائے گا۔

اس نے ملتجی لہجے میں دیوی انگبیں سے کہا۔ "دیوی! مجھے مت روکیے۔ اس وقت میرے اور اس معبد کے دشمن ایک ہیں۔ میں سکندر کے چند اہم سرداروں کو عبرتناک موت دینے کی قسم کھا چکا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے جانے دیجئیے دیوی۔ اس میں میرا ہی نہیں اس معبد کا اور اس معبد کی سلامتی کے لیے لڑنے والوں کا بھی بھلا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تابان نے انگبیں دیوی کے سامنے مختصر الفاظ میں کورا کی حرماں نصیبی کا ماجرا بیان کیا اور اسے بتایا کہ اس کے سینے میں کورا کے قاتلوں کے لیے کیسی آتش بھڑک رہی تھی۔

تابان کا خیال تھا کہ اس کی دلیلیں انگبیں دیوی کو متاثر کریں گی اور اس کے دل میں تابان کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو جائے گا لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ انگبیں کا چہرہ بدستور سرد مہری کے دبیز نقاب میں چھپا رہا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر تابان کو عجیب سا احساس ہوا۔ اسے لگا جیسے

وہ خاموشی کی زبان میں اس سے مخاطب ہے اور کہہ رہی ہے "بے وقوف غلام! میں تمہاری دلیلیں کیوں سنوں جبکہ میں تمہیں معاف نہ کرنے کا عہد کر چکی ہوں۔ شہزادی مارشا تو صرف ایک بہانہ ہے۔ میں تمہیں اس فریب کی سزا دے رہی ہوں جو تم اپنے قیام کے دوران مجھے دیتے رہے ہو۔ تم نے مارشا کو رجھانے کے لیے میرے قصیدے پڑھے۔ اپنی آواز اس کے کانوں تک پہنچانے کے لیے تم نے مجھے ذریعہ بنایا۔ میرے دل کو کھلونا سمجھ کر کھیلتے رہے اور میرے جذبات کی نازک کونپلوں کو اپنے بے حس قدموں سے کچلتے ہوئے گزر گئے۔"

انگبیں دیوی کے دلی جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے تابان نے کہا۔ "مہا دیوی! کیا میں آپ سے تنہائی میں کچھ عرض کر سکتا ہوں؟"

"اپنی زبان کو لگام دو غلام۔ تمہاری یہ زبان تمہیں اس انجام تک لائی ہے۔ اب اس انجام کو اپنی چرب زبانی سے اور بھیانک مت بناؤ۔ جاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دور ہو جاؤ ہماری نگاہوں سے۔"

انگبیں، مہادیوی کی مسند پر بیٹھی کسی زخمی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ تابان کو اپنی کج روی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے واقعی انگبیں سے بے رحمانہ سلوک کیا تھا لیکن رد عمل اتنا سخت ہو گا یہ بات کبھی اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔

اس نے انگبیں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی صفائی میں کچھ عرض کر سکتا ہوں؟"

"تم اپنے جرم کا اقرار کر چکے ہو۔ تم نے مہادیوی کے حوالے سے اپنے دل میں ناپاک سوچوں کو جگہ دی ہے اور یہ جرم اس چار دیواری میں نا قابل معافی ہے۔"

تابان نے کہا۔ "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جرم میں نہیں کسی اور جرم میں سزا دی جا رہی ہے۔" انگبیں دیوی کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جیسے تابان نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔

"کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" وہ گرجی۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اس معبد کی ایک محترم ہستی اپنے ذاتی عناد کی بناء پر مجھے اس سزا کی بھٹی میں جھونک رہی ہے۔"

انگبیں دیوی نے جز بز ہو کر دراز قد سیاہ فام کی طرف دیکھا اور اسے اشارہ کیا کہ وہ تابان کو یہاں سے لے جائے۔ سفید پوش محافظوں نے اسے گھیرے میں لے لیا اور ہانکتے ہوئے ایوان سے باہر لے آئے۔ یہاں اس کے گرد حصار مضبوط کرنے کے لیے چند اور محافظ موجود تھے۔ وہ نیزوں کی نوک پر اسے قصرِ نور سے باہر لے آئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ معبد کے نیم تاریک بندی خانے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس بندی خانے کی چھت پر لاتعداد آہنی پنجرے جھول رہے ہیں۔ ان پنجروں میں پرندوں کی بجائے انسان بند ہیں۔ خود رو داڑھیوں اور لمبی جٹاؤں والے ہڈیوں کے ڈھانچے، وہ مادر زاد برہنہ تھے۔ ان کے بول و براز کی بو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ ایک خالی پنجرے کو دیکھ کر تابان جان گیا کہ اس کے لیے قید و بند کی صعوبتوں کا طویل دور شروع ہونے والا ہے۔ غیر ارادی طور پر اس نے قدم پیچھے ہٹائے لیکن سیڑھیوں پر براجمان تنومند پہریداروں نے اسے آہنی نیزوں سے دھکیلا اور وہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا کئی قدم نیچے ٹھنڈے غلیظ فرش پر جا گرا۔

"خوش آمدید!" ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا سر کے عین اوپر جھولتے ہوئے پنجرے میں ایک مدقوق شخص اسے جلتی نظروں سے گھور رہا

تھا۔ تابان نے کوشش کی اور اسے پہچان گیا۔ وہ ازبک تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تھسلی کا امیر زادہ جو مارشا کا منگیتر ہونے کا دعویدار تھا۔ وہ جنگ اسوس سے قبل کاہن خاتام کے ساتھ دمشق کے معبد میں پہنچا تھا۔ وہاں کاہن خاتام کو سزائے موت ہوئی اور ازبک نکل بھاگنے میں کامیاب ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آج وہ بھی اس بدبودار بندی خانے میں عبرت نگاہ بنا آہنی پنجرے میں جھول رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

موسمِ گرما گزر چکا تھا۔ متحدہ یونانی فوج کا رخ اب سرزمینِ مصر کی طرف تھا۔ گرینی کس اور اسوس کے یادگار معرکے سر کرنے کے بعد اب انہوں نے "صور" کو مرکزِ نگاہ بنایا تھا۔ بحیرہ احمر کے ساحل پر "صور" ایک بارونق و خوبصورت شہر تھا۔ یہاں کے زیادہ تر باشندے فونیقی اور کنعانی تھے۔ انہوں نے اپنے قرب و جوار کے حریفوں کو زیر کر کے علاقے میں برتری حاصل کر رکھی تھی۔ اب وہ ارغوانی رنگ، شیشے کے آلات خوشبوؤں، جواہرات اور غلاموں کی تجارت میں بحیرہء روم کے اندر اجارہ داری قائم کرنے کی فکر تھی۔ صور کے قریبی شہر صیدا کے باشندوں نے سکندر کی اطاعت بسر و چشم قبول کر لی تھی لیکن اہل صور

یونانی یلغار سے چنداں خوفزدہ نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یونانی فوج تعداد میں بہت زیادہ نہیں اور وہ اس ساحلی علاقے میں مختصر قیام کے بعد آگے نکل جائے گی۔ وہ گرینی کس اور اسوس کے معرکوں کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ حالات کا تجزیہ اپنے طور پر کر رہے تھے اور اس تجزیئے کے نتیجے میں ان پر ایک گوناگوں بے فکری طاری تھی۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ یونانی فوج تنگ ساحلی علاقے پر قابض ہے۔ ایک طرف شہنشاہِ اعظم دارا کی سلطنت ہے اور دوسری طرف سمندر۔ سمندر میں صور کا طاقتور بحری بیڑا گشت پر ہے اور بوقتِ ضرورت قبرص اور مصر کے بیڑے بھی اس کی معاونت پر کمربستہ ہو سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہیں اپنے محلِ وقوع پر بھی ناز تھا۔ شہر ساحل سے ہٹ کر ایک جزیرہ نما مقام پر واقع تھا۔ یہاں بری فوج کامیابی سے محاصرہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے پہلے مختلف ادوار میں بیرونی حملہ آوروں کی طرف اس شہر کے جتنے محاصرے بھی ہوئے ناکام رہے تھے۔ بلکہ بابل کے فرمانروا بخت نصر کے متعلق مشہور تھا کہ اس نے پندرہ برس شہر کو محاصرے میں رکھا لیکن کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔ ان حقائق کی روشنی میں اہلِ صور نے بہتر سمجھا کہ وہ سکندر سے مفاہمت کی بجائے مزاحمت کا راستہ اختیار کرے۔

سکندر نے جب دیکھا کہ اہلِ شہر مصالحانہ گفتگو کی آڑ میں صرف اس کا وقت ضائع کر رہے ہیں تو اس نے عملی اقدام کا فیصلہ کیا۔ اہلِ شہر کی طرح سکندر نے بھی شروع میں حیلہ جوئی سے کام لیا۔ اس نے والئی شہر کو پیغام بھیجا کہ وہ اور اس کے سردار صرف اس لیے شہر میں داخل ہونا چاہتے ہیں کہ ہرقل کے قدیم کی معبد زیارت کر سکیں۔ زیارت کے بعد وہ آگے بڑھ جائیں گے۔ جواب میں اہلِ صور نے رائے دی کہ یونانی صور کا اندرونی معبد دیکھنے کی بجائے اس معبد کی زیارت کر لیں جو فصیل سے باہر واقع ہے۔ ساتھ ہی یہ عزم بھی ظاہر کیا کہ وہ ایرانی کارندوں یا یونانی سپاہیوں کو ہرگز شہر میں آنے دیں گے۔ یہ ایک ہتک آمیز سلوک تھا۔ اسی روز یونانیوں کی فوجی کونسل منعقد ہوئی اور شہر صور کے محاصرے کا حتمی فیصلہ کر لیا گیا۔

شہر کی اطراف کا بغور جائزہ لینے کے بعد مقدونوی انجینئروں پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ جس چٹان پر شہر صور آباد ہے وہ ایک جزیرے کی مانند ہے اور اس جزیرہ نما چٹان میں سے پتھر کی مضبوط فصیلیں اٹھا کر شہر کو محفوظ کیا گیا ہے۔ ساحل اور جزیرہ نما کا درمیانی فاصلہ قریباً نو سو قدم تھا۔ اس درمیانی فاصلے میں سمندر کم گہرا تھا اور کہیں کہیں پتھریلے ٹیلے

ابھرے ہوئے تھے۔ شہر کی فصیلوں کے قریب جا کر پانی کی گہرائی قریباً اٹھارہ فٹ ہو جاتی تھی۔ فیصلہ کیا گیا کہ کنارے اور فصیل کے درمیانی سمندر کو ایک پتھریلے راستے سے پاٹ دیا جائے۔ اس سلسلے میں مشہور مقدونوی انجینئر ویادس کی صلاحیتیں بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔

ہنر مندوں کے صلاح مشوروں کے بعد راستہ بنانے کی تجویز قابل عمل قرار پائی۔ بھاری بھر کم مشینوں کے ذریعے راستے کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ وزنی چٹانوں اور پتھروں کو سمندر میں لڑھکایا جاتا اور جب وہ سطح آب تک پہنچ جاتیں انہیں ہموار کر کے 200 فٹ چوڑے راستے کی شکل دے دی جاتی۔ اس راستے پر جگہ جگہ لکڑی کے اونچے برج بھی تعمیر کیے جا رہے تھے تا کہ سپاہیوں کو آڑ میسر آ سکے۔ جوں جوں کام آگے بڑھ رہا تھا۔ شہر کے اندر سے مزاحمت میں ہمت پیدا ہو رہی تھی۔ دن میں کئی مرتبہ فصیل پر سے اچانک سنگ بازی اور آتش بازی شروع کر دی جاتی۔ منجنیقیں وزنی پتھر پھینکتیں۔ نفط اور رال سے بھرے ہوئے مرتبان سنسناتے ہوئے آتے اور پھٹ کر تباہی مچا دیتے۔ ان تمام کاروائیوں کے باوجود مزدور و کاریگر شب و روز مصروف تھے۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں کی جگہ نئے

لوگ آجاتے اور اسی جوش و خروش سے مصروف ہو جاتے۔ ویادس اور دوسرے انجینئروں نے ساحل پر واقع پرانے شہر کے کھنڈر کھود ڈالے تھے۔ اب اس شہر کا ملبہ راستے کی تعمیر میں استعمال ہو رہا تھا۔ یہ راستے دیکھنے میں ایک شاخ کی طرح نظر آتا تھا کو ساحل کے تنے سے پھوٹ کر شہر کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھی۔

صور کی فصلیں قریباً ایک سو گز دور رہ گئیں تو تعمیر روکنا پڑی۔ اس تعطل کا سبب فصیل پر سے ہونے والی شدید آتش باری تھی۔ صلاح مشورے کے بعد سکندر نے مقدونوی انجینئروں کو راستے کے آخری سرے پر بلند برج تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ ان برجوں کی بلندی شہر کی فصیل کے برابر تھی اور یہاں سے آتش باری روکنے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جا سکتے تھے۔ یہ دیکھ کر صور کی فوجوں نے جوابی کاروائی کی۔ ان کا طاقتور بحری بیڑہ نو تعمیر شدہ راستے کی دونوں طرف نمودار ہوا اور زبردست حملے کرنے لگا۔ اب حالت یہ ہو گئی کہ شب و روز تیر، نیزے اور منجنیقوں کے پتھر برسنے لگے۔ ہلاکت کی اس موسلادھار بارش میں ساحل اور برجوں کے درمیان نقل و حرکت ناممکن ہو کر رہ گئی۔ اس کا توڑ یونانی انجینئروں نے یہ کیا کہ راستے کے دونوں طرف لکڑی کے شہتیروں سے مضبوط باڑھ بنانی شروع کی۔ اہلِ صور نے

نہلے پہ دہلا مارتے ہوئے ان باڑھوں کو فصیل پر سے اندھادھند نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ لکڑی کی باڑھوں پر جب روغن گرتا اور پھر آتشیں تیر برسائے جاتے تو وہ دھڑا دھڑ جلنے لگتیں۔ یونانیوں نے جوابی کاروائی کے طور پر ان باڑھوں کو ایک خاص قسم کے چمڑے سے ڈھانپ دیا اور وہ آگ سے محفوظ ہو گئیں۔

ایک طرف بحیرہ احمر کے پانیوں میں یہ ہنگامہ محشر برپا تھا اور دوسری طرف جبل الشیخ کے ایک سردار اور تاریک قید خانے میں تابان قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہا تھا۔ اسے ان مصائب میں گرفتار ہوئے اب کئی ماہ بیت چکے تھے۔ دوسرے قیدیوں کی طرح اس کے چہرے اور سر کے بال بھی جٹاؤں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ برہنہ جسم پر میل کچیل کی تہیں تھیں اور مسلسل خنکی کی وجہ سے کھال پھٹ چکی تھی۔ قید کی اس طویل سرد رات میں اس کے تصور کے آسمان پر صرف دو ہی ستارے چمکتے تھے۔ کورا اور مارشا۔ وہ انہی کے خیالوں میں گم رہتا تھا۔ کورا کے قاتلوں سے انتقام لینا اور مارشا کو اس کے دشمنوں کے نرغے سے نکالنا یہی اس کی زندگی کی دو آخری خواہشیں تھیں لیکن قرائن بتاتے تھے کہ یہ آخری خواہشیں اس کے ساتھ ہی اس تاریک قید خانے میں دفن ہو جائیں گی۔ شروع شروع میں

تابان اس قید خانے سے نکل جانے میں پُر امید تھا لیکن پھر ایک روز اس کی تمام امیدوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ اسے پابندِ سلاسل کرنے والوں کو کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ تابان نامی یہ قیدی ایجیئن اور یونان میں ایک ایسے بھگوڑے غلام کے طور پر مشہور ہے جو "نکل بھاگنے میں "اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اسی روز سے تابان کے لیے خاص احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی تھیں اور وہ چھت سے جھولتے ہوئے اپنے پنجرے میں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ پھر دھیرے دھیرے تابان نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اب وہ صرف کسی معجزے کے انتظار میں زندہ تھا۔ اس کے مردہ حوصلوں کی راکھ تلے امید کی ایک چنگاری تھی۔ وہی چنگاری اس کے ٹھٹھرے ہوئے جسم میں زندگی کی حرارت باقی رکھے ہوئی تھی۔ شاید کوئی انہونی ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔۔ شاید شب و روز کے یخ بستہ انبار میں سے کوئی سورج ایسا طلوع ہو جائے جس کی کرنیں اس کی زنجیروں کو پگھلا ڈالیں۔۔۔۔۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔۔۔۔۔ شاید۔

وہ ایک تاریک دن تھا۔ اس قید خانے میں ہر دن تاریک ہوتا تھا۔ صرف محافظوں کی آمد و رفت اور پنجروں میں پھینکی جانے والی خوراک سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان پتھریلی دیواروں

سے باہر کہیں دور نیلے آسمان پر سورج چمکنے لگا ہے۔ تابان اپنے آہنی پنجرے میں بے سُدھ پڑا تھا۔ اس کی نگاہیں کچھ دور ایک دوسرے پنجرے پر مرکوز تھیں۔ یہ پنجرہ خالی تھا۔ اس کا مکین چند روز پہلے رہائی پا گیا تھا۔ پنجرے کی قید سے بھی اور زندگی کی قید سے بھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ کئی دن سے اپنے پنجرے میں بے سُدھ پڑا تھا۔ نہ کروٹ بدلتا تھا نہ کھانے پینے کے لیے اٹھتا تھا۔ پھر ایک روز اس کے گلے سے خرر خرر کی صدا نکلنے لگی تھی اور وہ صبح ہونے تک مر گیا تھا۔ محافظ کچھ دیر اسے لمبی چھڑیوں سے ٹھوکے دیتے رہے تھے پھر پنجرے سے نکال کر غلیظ فرش پر گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مرنے والا ازبک تھا۔ عیش و عشرت میں آنکھیں کھولنے والا اور ناز و نعم میں پلنے والا رئیس زادہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ اس جان لیوا تاریکی میں بھلا کب تک زندگی کا بوجھ اٹھاتا۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ مر گیا تھا، ایک خوبرو چہرے کی جستجو میں اپنی زیست گنوا بیٹھا تھا اور اس سرد جہنم میں مرنے والا یہ کوئی پہلا قیدی نہیں تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز کوئی نہ کوئی نصیب کا مارا یونہی "آزادی" پا جاتا تھا۔ تابان کے ساتھ قید رہنے والے قریباً سبھی قیدی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ ایک وہی اب تک سینے پر سانسوں کے وار سہہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کسی صبح وہ بھی اپنے پنجرے میں بے حس و حرکت پایا جائے گا اور محافظ اسے طویل

چھڑیوں سے ٹھوکے دینے کے بعد اٹھا کر باہر لے جائیں گے۔ باہر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جہاں زندگی اپنی تمام تر حرارت اور روشنی کے ساتھ موجود ہو گی لیکن وہ نہیں ہو گا۔

دفعتاً تابان کو اپنے خیالات سے چونکنا پڑا قید خانے کا آہنی دروازہ کھلا اور اسے محافظوں کے ساتھ چند اجنبی افراد نظر آئے۔ وہ تعداد میں چار تھے اور انہوں نے ایرانی فوج کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ قید خانے میں پھیلے ہوئے شدید تعفن سے بچنے کے لیے انہوں نے اپنے منہ کپڑے سے ڈھک رکھے تھے۔ آہنی پنجروں پر نظریں دوڑاتے ہوئے وہ تابان کے سامنے آ رکے۔ ایک شخص نے ناک سے کپڑا ہٹایا تو تابان اسے پہچان کر دنگ رہ گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ سردار روہتاس تھا۔ کئی ماہ پہلے جب تابان افشاندہ کی اطلاع پر کورا کو پڑاؤ سے نکالنے گیا تھا تو روہتاس اور ہوشمند کو راستے میں جُل دے گیا تھا لیکن آج روہتاس کو دیکھ کر اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اسی وقت سے اس کے تعاقب میں ہے۔ اسے کھو کر شب و روز اسے ڈھونڈتا رہا ہے اور آج اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ تابان کی حالت دیکھ کر روہتاس کی آنکھوں میں گہرا تاسف ابھر آیا۔ یہی حالت ہوشمند کی ہوئی۔ وہ روہتاس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ تابان اپنے قفس میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا

تھا۔ روہتاس نے سخت لہجے میں بندی خانے کے محافظوں سے کوئی بات کی۔ وہ جلدی جلدی اقرار میں سر ہلانے لگے۔ پھر چند محافظ ایک متحرک چبوترہ لیے اندر داخل ہوئے۔ یہ چبوترہ قیدیوں کو پنجروں سے نکالنے یا داخل کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ متحرک چبوترے کی آمد کا مطلب تھا کہ تابان کو نکالا جا رہا ہے۔

کوئی ایک پہر بعد تابان ایک صاف ستھرے آراستہ کمرے میں موجود تھا۔ اس کے بدن کو خوشبو ملے نیم گرم پانی سے مل مل کر دھویا گیا تھا، آرام اہ ریشمی لباس پہنایا گیا تھا اور پھر اس پُر حرارت گداز بستر پر پہنچا دیا گیا تھا۔ سردار روہتاس اور ہوشمند اس کے ساتھ تھے۔ تابان نے سردار روہتاس سے کہ وہ سورج کی روشنی دیکھنا چاہتا ہے۔ سردار نے کہا یہ دن نہیں رات ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں وہ ستاروں کا منظر دیکھ سکتا ہے۔ اس نے پہلو میں واقع کھڑکی کا دبیز پردہ سرکا دیا تھا۔ کھلے آسمان کا ایک ٹکڑا دکھائی دیا جس پر ستارے قندیلوں کی طرح روشن تھے۔ اس آسمان کے نیچے ایک سرسبز قطعہ نظر آ رہا تھا۔ اس قطعے میں رنگین روشنیوں والے فوارے سے تھے اور خوبصورت روشیں تھیں۔ تابان کے لیے یہ مقام اجنبی نہیں تھا۔ دمشق کے معبد میں وہ ایسے خوشنما قطعے دیکھ چکا تھا۔ اس نے روہتاس سے وہ

سوال پوچھا جو پچھلے کئی ماہ سے بچھو کی مانند اس کی سوچوں کو ڈس رہا تھا۔ وہ سوال اس معبد کے بارے میں تھا۔ اس نے پوچھا۔

"سردار میں کس جگہ پر ہوں؟"

سردار بولا۔ "یہ شیخ الجبل ہے۔"

"لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ معبد تو دمشق میں تھا۔"

"دمشق میں بھی تھا۔" روہتاس نے "بھی" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "جب دمشق کے معبد کو یونانی حملہ آوروں سے خطرہ پیدا ہونا شروع ہوا تو اس معبد کی تعمیر کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ اسے بعین دمشق والے معبد کے نقشے پر بنایا گیا ہے۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ذہن میں رکھا گیا ہے۔"

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" تابان نے پوچھا۔

"بات ضرورت کی نہیں حکم کی تھی۔ معبد کے پجاریوں اور پیروکاروں کے لیے اپنے پیشواؤں کا حکم اٹل ہوتا ہے۔ جو بات پانچ مقدس ارواح کے ہونٹوں سے نکلتی ہے، وہ پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔"

"پانچ مقدس ارواح؟" تابان نے حیرانی سے کہا۔ "میں تو ان کے بے جان جسموں کو پھانسی گھاٹ پر جھولتے دیکھ چکا ہوں۔"

"جسموں کی موت سے مقدس ارواح نہیں مرتیں، وہ سینکڑوں برس سے زندہ ہیں اور معلوم نہیں کب تک زندہ رہیں گی۔"

"کیا مطلب؟" تابان نے متحیر لہجے میں پوچھا۔

"مطلب یہ کہ "مقدس ارواح" افراد کا نام نہیں یہ اس عقیدے کا نام ہے جو اس معبد کے پجاری صدیوں سے اپنائے ہوئے ہیں۔ مقدس روح کا روپ دھارنے والا کوئی شخص مر جائے تو اس کی جگہ دوسرا شخص لے لیتا ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ لہذا مقدس ارواح اب بھی زندہ ہیں اور شاید مستقبل میں بھی زندہ رہیں گی۔۔۔۔۔۔۔۔"

ہوشمند نے کہا۔ "تابو! کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے ہو۔ یہ نہیں پوچھو گے ہم تم تک کیسے پہنچے؟"

تابان نے کہا۔ "ظاہر ہے یہ کوئی آسان کام نہیں رہا ہو گا۔ بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑی ہو گی آپ کو۔"

"بھاگ دوڑ؟ ارے ہم تو ہوائی گھوڑے پر سوار رہے ہیں پچھلے آٹھ ماہ سے۔ غالباً ایک ایک چپہ دیکھ مارا ہے ہم نے ٹرائے سے یہاں تک۔۔۔۔۔۔۔"

ہوشمند اس روئیداد کو تفصیل سے بیان کرنا چاہتا تھا لیکن سردار روہتاس نے اسے روک دیا۔ تابان نے پوچھا۔ "یونانی فوج اب کہاں ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور کورا کے بارے میں تمہیں کچھ پتا چلا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔؟ جانتے ہو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ان درندوں نے؟" آخری الفاظ کہتے کہتے تابان کا گلا رندھ گیا۔

روہتاس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "سب معلوم ہو چکا ہے ہمیں، سب معلوم ہو چکا ہے۔ تم خوامخواہ اپنے زخم مت کریدو۔۔۔۔۔۔۔۔۔اطمینان رکھو کورا کے قاتل عبرتناک انجام سے بچ نہیں سکیں گے۔ کورا کا بدلہ ہم سب پر قرض ہے اور یہ قرض چکانے تک ہم

اطمینان سے نہیں بیٹھیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہم ساری معلومات حاصل کر چکے ہیں۔ سردار شلال اس وقت سکندری فوج کے ساتھ "صور" میں ہے۔ صور کو سکندری فوج نے محاصرے میں لے رکھا ہے اور وہاں زبردست جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ اہلِ صور کی اعانت کے لیے کئی ایرانی دستے خشکی کے راستے صور میں داخل ہو چکے ہیں۔ میں بھی پانچ سو جانبازوں کے ایک جتھے کے ساتھ جانے کے لیے تیار بیٹھا ہوں۔ مجھے صرف تمہاری فکر تھی۔ میں نے قسم کھا رکھی تھی کہ تمہاری صورت دیکھے بغیر کسی لڑائی میں حصہ نہیں لوں گا۔"

ہوشمند نے کہا۔ "آپ نے کچھ اور قسمیں بھی کھا رکھیں تھیں، ان کے بارے میں بھی بتا دیجئیے۔" سردار روہتاس مطمئن انداز میں مسکرانے لگا۔ ہوشمند نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب سے تم گم ہوئے ہو غالباً۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ بستر پر سوئے ہیں نہ پُر تکلف کھانا کھایا ہے نہ عورت اور شراب کے قریب گئے ہیں۔ ہر طرح کی مسرت انہوں نے خود پر حرام کر رکھی تھی غالباً۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

تابان حیرانی سے سردار روہتاس کی طرف دیکھنے لگا۔ پہلی بار تابان کو اندازہ ہوا کہ سردار روہتاس بہت کمزور اور خستہ حال نظر آرہا ہے۔ اس کی فوجی وردی بھی بے حد کستہ اور پھٹی پرانی تھی۔

تابان نے کہا۔ "آپ نے یہ سب کیوں کیا سردار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے تو لگ رہا ہے، میری طرح آپ بھی یہ آٹھ ماہ کسی بندی خانے میں گزار کر آئے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" سردار روہتاس مسکرایا۔ "لیکن اب اس بندی خانے کے بند در کھل چکے ہیں۔ اب تمہاری طرح ہم دونوں بھی آزاد ہیں۔ عنقریب ہماری آزادی ان لوگوں پر برق بن کر گرے گی جنہوں نے بے گناہ کورا کی آبرو اور جان لی ہے اور جو شہزادی مارشا کو تم سے دور رکھے ہوئے ہیں۔"

شہزادی مارشا کا نام سن کر تابان کے سینے میں ایک خنک لہر سی دوڑ گئی۔ "شہزادی کہاں ہے؟" بے اختیار اس کے ہونٹوں پر سوال آگیا۔

سردار روہتاس نے کہا۔ "وہ سکندر کی تحویل میں ہے۔ اسے سخت پہرے میں رکھا جاتا ہے۔ کچھ اور باتوں کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سکندر اس پر اکثر نوازشات کرتا رہتا

ہے۔ ایک نوجوان بادشاہ کی ایک حسین و جمیل دوشیزہ پر نوازشات بے معنی نہیں ہیں۔ اگر ہم مارشا کو جلد اس ماحول سے نہ نکال سکے تو حالات کچھ بھی ہو سکتے ہیں۔"

ہوشمند نے کہا۔ "ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم جلد از جلد صور پہنچ جائیں۔ صور ایک ایسا مضبوط قلعہ ہے جس نے کبھی حملہ آوروں کے سامنے سپر نہیں ڈالی۔ یونانی فوج کو بھی وہاں شدید ترین مزاحمت کا سامنا ہے۔ اگر اہلِ صور کو شہنشاہ دارا اور قبرص کے فرمانروا کی طرف سے مناسب کمک مل گئی تو سکندر کے دانت کھٹے ہو جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے شکست فاش ہی ہو جائے۔ اس وقت اہلِ صور کو افرادی قوت اور ہتھیاروں کی اشد ضرورت ہے۔ ایک ایک فرد اور ایک ایک ہتھیار قیمتی ہے۔"

تابان نے کہا۔ "اگر شہر محاصرے میں ہے تو ہم وہاں داخل کیسے ہوں گے؟"

روہتاس نے جواب دیا۔ "شہر کی ایک "جانب" خشکی سے ملی ہوئی ہے۔ اس طرف سے ہر طرح کی کمک اہلِ شہر کو پہنچ رہی ہے اور یہی بات محصورین کے حق میں جاتی ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ٹھیک پندرہ روز بعد تابان اپنے محسن روہتاس اور دوست ہوشمند کے ساتھ صور میں موجود تھا۔ اہلِ صور کے حوصلے بلند تھے۔ شہریوں کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنے دفاع پر مکمل بھروسہ ہے اور وہ یونانی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ شہر میں نہ صرف روزمرہ کے معمولات جاری تھے بلکہ راگ رنگ کی محفلوں اور دیگر تفریحات پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ صور میں پہنچ کر سردار روہتاس نے پہلے تو تابان کی آزادی کا جشن منایا۔ نہادھو کر ریشمی لباس پہنا، شہر کی ایک مہنگی بعام گاہ میں پُر تکلف کھانا کھایا اور رات بھر کے لیے شراب اور شباب میں ڈوب گیا۔ اس کے بعد وہ لوگ باقاعدہ سپاہ کے طور پر اپنا اندراج کرانے کے لیے چھاؤنی پہنچ گئے۔ یہاں انہیں حسبِ قابلیت مختلف مراتب سونپ دیئے گئے اور برسرپیکار کمانداروں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ تابان نے ان تمام مصروفیات کے دوران کسی جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ایک عجیب طرح کی بے حسی اس پر طاری ہو چکی تھی۔ لگتا تھا اسے جنگ کے ہنگاموں سے کوئی سروکار ہے اور نہ اس بات میں دلچسپی ہے کہ کون ہارتا ہے اور کون جیتتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جیسے کورا کی بربادی کا منظر جم چکا تھا۔ اگلے روز سردار روہتاس اور ہوشمند اسے جنگ کی صورتحال دکھانے کے لیے فصیل پر لے گئے۔ فصیل کے گردونواح میں شورِ محشر برپا تھا۔ تابان کو

اپنے سامنے نشیب میں دور تک نظر آ رہا تھا۔ شمال میں حدِ نگاہ تک سمندر کا نیلگوں پانی تھا۔ اس پانی کو مشرق میں شام اور لبنان کے طویل ساحلوں نے روک رکھا تھا۔ فصیل کی بلندی سے صور کی دونوں بندرگاہیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ جنوبی بندرگاہ کو مصری بندرگاہ کہا جاتا تھا، یہ تنگ سی کھاڑی تھی جسے اہلِ صور نے شہتیروں سے بند کر دیا تھا جو بندرگاہ شمال کی طرف تھی اسے صیدائی بندرگاہ کہتے تھے۔ یہ نسبتاً وسیع تھی اور اسے بند کرنے کے لیے وہاں جنگی کشتیاں لنگرانداز کر دی گئی تھیں۔ تابان کو وہ پتھریلا راستہ بھی نظر آیا جو اٹھارہ فٹ گہرے سمندر میں آگے بڑھتا فصیل سے قریباً سو گز دوری پر پہنچ چکا تھا۔ راستے کے آخری سرے پر بلند و بالا برج تعمیر کر دیئے گئے تھے اور وہاں سے فصیل پر مسلسل تیراندازی ہو رہی تھی۔ روہتاس، تابان اور ہوشمند دوپہر تک فصیل پر موجود رہے، جب وہ چھاؤنی واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے، دفعتاً پتھریلے راستے کے اردگرد ہونے والی جھڑپوں میں شدت آ گئی۔ تابان نے دیکھا کہ بندرگاہ میں ایک بڑی کشتی نمودار ہوئی۔ کشتی کے عقبی حصے میں بہت زیادہ بوجھ رکھا ہوا تھا جس کی وجہ سے اگلا حصہ اوپر کو اٹھ گیا تھا۔ اگلے حصے میں فالتو مستول بھی تھے جن کے ساتھ بڑی بڑی دیگیں لٹک رہی تھیں۔ مستولوں کے نیچے خشک ایندھن کے گٹھے بندھے ہوئے تھے۔ دور سے دیکھنے پر بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان

گٹھوں پر خوب تار کول مل دیا گیا ہے۔ کشتی کے ملاح مؤافق ہوا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی تیزی سے کشتی کو چوبی برجوں کے پاس لے آئے اس سے پیشتر کہ یونانی سپاہی دفاعی کاروائی کرتے انہوں نے کشتی کو برجوں سے لگا دیا اور اس کے اگلے حصے میں جلتی ہوئی مشعلیں چھینک کر پانی میں کود گئے۔ یونانیوں کے تعمیر کردہ برجوں میں یکبار گی آگ بھڑک اٹھی۔ کشتی کے عرشے کو بھی آگ لگ گئی۔ سامنے کے مستول گر کر بُرجوں سے ٹکرائے۔ مستولوں سے بندھی ہوئی دیگیں الٹ گئیں۔ ان دیگوں میں گندھک، تار کول اور تیل وغیرہ بھرا گیا تھا۔ یہ آتش گیر مادے نکل کر آگ میں گرے تو جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا۔ چوبی برجوں سمیت ارد گرد کی ہر چیز شعلوں اور دھوئیں میں چھپ گئی۔ فصیل پر سے یہ منظر دیکھ کر صور کے سپاہیوں نے فاتحانہ نعرے بلند کیے۔۔۔۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد جب آگ اور دھوئیں کے بادل چھٹے تو یونانی فوج کے تعمیر کردہ بُرج ناپید ہو چکے تھے۔

سردار روہتاس کے چہرے پر دبا دبا جوش نظر آرہا تھا۔ اس نے تابان کا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ "دیکھا تم نے۔۔۔۔۔۔۔۔ صور کے جنگجو یونہی مزاحمت کرتے رہے تو سکندر کو بھاگنے کے لیے راستہ نہیں ملے گا۔"

تابان کا چہرہ بدستور بے تاثر تھا۔ اس نے کہا۔ "میرا خیال آپ سے مختلف ہے۔ میں نے سکندر کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ بہت دور جانے کا عزم رکھتا ہے اور جنہوں نے دور جانا ہو ان کے ارادے بہت پختہ ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے اس کے شیر جلد ہی شہر کو تسخیر کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ لیں گے۔"

روہتاس نے تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر ذرا غور سے تابان کو دیکھا اور بولا۔ "مجھے لگتا ہے تم ابھی تک سکندر کے ماتحت کی حیثیت سے سوچ رہے ہو۔ کیا میں تمہیں اب بھی اس کا وفادار سمجھوں؟"

تابان افسردگی سے بولا۔ "آپ مجھے کسی کا بھی وفادار مت سمجھیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں جنگ وجدل سے میرا دل بھر گیا ہے۔ کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ اب میری تلوار کبھی کسی کے حق میں نہ اٹھ سکے گی۔"

"مارشا اور کورا کے حق میں بھی نہیں؟" سردار روہتاس نے پوچھا۔

"وہ لڑائی نہیں۔ وہ تو ایک قرض ہے جو میں نے چکانا ہے اور شاید اسی کے لیے میں زندہ بھی ہوں۔"

روہتاس کچھ دیر اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے شانے جھنجھوڑ کر بولا۔ "تابان! تم موت کے منہ سے بچ کر آئے ہو۔ اب زندگی کی طرف لوٹو، زندگی کی طرف دیکھو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ دیکھو وہ ہے زندگی۔ تھرکتے شباب کے اس شبستان میں نیند گنوانے کا نام زندگی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آؤ، میں تمہیں زندگی دکھاؤں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

تابان نے دیکھا فصیل کے نیچے شہر کی فوج کے مخمور سپاہیوں کے گھیرے میں ایک لبنانی رقاصہ لہک لہک کر گا رہی تھی۔

سردار روہتاس تابان کو فصیل سے نیچے لایا اور لبنانی رقاصہ کا رقص دکھانے لگا۔ یہ ایک خوبصورت خانہ بدوش لڑکی تھی۔ اس کا جسم مچل رہا تھا اور سینکڑوں جلتی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ وہ ایک دلکش لبنانی گیت گا رہی تھی۔ گیت کے بول کچھ یوں تھے۔

اے پیار کرنے والے ہوشیار
وقت کی مخمور ہوا
تجھے لوریاں دے کر سلا نہ دے

تیرے دل میں انتظار کا دیا بجھا نہ دے
کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی بہانے
تیری بے کلی کو چین آ جائے
تیری تمنا کسی کھلونے سے بہل جائے
میں قسم کھاتی ہوں بہاروں کی
اور رُوئے زمین کے سب خوبصورت نظاروں کی
اور ہر اس چیز کی جس کی دید
جھلسے سینوں میں ٹھنڈک اتارتی ہے
جس آنچ میں انتظار مرتا نہیں
اس آنکھ میں محبوب اترتا ہے
اس آنکھ میں محبوب اترتا ہے

رقاصہ کی دلنشیں آواز نے تابان کے دل میں یاسیت بھر دی۔ وہ کھوئی نظروں سے رقص کا منظر دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا یہ حسین و جمیل رقاصہ اس کی دسترس میں ہے۔ وہ رضامندی کا ہلکا سا اشارہ بھی دے تو سردار روہتاس منہ مانگی قیمت چکا کر اس رقاصہ کو تابان کی خلوت میں پہنچا دے گا لیکن تابان کے دل میں ایسی خواہش کا گزر تک نہیں تھا۔ وہ تو رقاصہ کے پُرسوز گیت میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں مارشا کی صورت گھوم رہی تھی۔ کورا کی موت ایک ایسے تند طوفان کی طرح تھی جس نے گرد و پیش کا ہر خوبصورت منظر گرد و غبار میں چھپا لیا تھا۔ پچھلے آٹھ دس ماہ میں یہ زہریلا گرد و غبار مارشا کی یادوں پر بھی چھایا رہا تھا۔ وہ مارشا کو بھولا نہیں تھا لیکن شعلوں میں انگارے چھپ جاتے ہیں، مارشا کی یاد بھی کورا کے خیال میں چھپی ہوئی تھی۔

رقص ختم ہوا تو خانہ بدوش رقاصہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر انگوٹھیاں فروخت کرنے لگی۔ ان انگوٹھیوں میں ایک ہی طرح کا نارنجی پتھر جڑا ہوا تھا۔ رقاصہ کا دعویٰ تھا کہ یہ انگوٹھی پہننے والے کے دل میں اپنے محبوب کی یاد کا دیا سدا روشن رہے گا۔ پتھر کا نارنجی رنگ بھی اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک انگوٹھی پہننے والے کو اپنے محبوب کا وصل نصیب

نہیں ہو جاتا۔ سپاہی بڑے شوق سے یہ انگوٹھیاں خرید رہے تھے۔ تابان کی خواہش کا اندازہ کرتے ہوئے ہوشمند نے ایک انگوٹھی خرید کر تابان کی انگلی میں بھی پہنا دی۔ تابان عجیب محویت سے انگوٹھی کو دیکھنے لگا۔

سردار روہتاس بولا۔ "سایوں کے پیچھے مت بھاگو تابان۔ سائے محرومی کے سوا اور کچھ نہیں دیتے۔ ان انگوٹھیوں میں کیا رکھا ہے۔ زندگی پتھروں میں نہیں نرم و نازک سوچوں اور گداز جسموں میں ملتی ہے۔"

قریب کھڑا ایک ادھیڑ عمر سپاہی بولا۔ "سردار! اس انگوٹھی کو معمولی نہ سمجھو۔ اس میں جڑا پتھر اس علاقے کا نایاب تحفہ ہے۔ یہ پتھر سوقِ الفت کے اس مشہور محل سے لایا گیا ہے جہاں ایک گمنام شاعر کا روتا ہوا مجسمہ ان گنت زمانوں سے ایستادہ ہے۔"

"کون تھا وہ شاعر؟" ہوشمند نے پوچھا۔

"ایک عاشق تھا۔ اسے حیفہ کے ایک کماندار محب تابش کی بیٹی روبینہ سے عشق ہو گیا تھا۔ کہاوت کے مطابق وہ اپنی حویلی کی چھت پر کھڑا ہر وقت محبوبہ کے جھروکے کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد روبینہ نے بھی شاعر میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ وہ کوئی ایسا

نامور شاعر نہیں تھا لیکن محبت کی شدت نے اس کے شعروں کو حدت سونپ دی۔ اس کا کلام اہلِ حیفہ اور جافہ کے دلوں میں آتش بھڑکانے لگا لیکن اس آتش نوا سے اس کی محبوبہ نے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا۔ شاعر حساس دل کا مالک تھا۔ وہ چاہتا تھا محبوبہ اس کی محبت کا جواب محبت سے دے۔ اس کی تمنا تھی کہ راہِ الفت پر پیش قدمی یکطرفہ نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ اس نے اپنی حویلی کے باغ میں کپاس کا ایک پودا لگایا۔ پھر شب و روز اسے اپنے آنسوؤں سے سینچا۔ جب آنسوؤں سے سینچی ہوئی کپاس تیار ہو گئی تو اس نے چاندنی راتوں میں بیٹھ کر اسے اپنے ہاتھوں سے کاتا اور ایک کپڑے کی شکل دی۔ تب اس نے اپنے خون کو مشک نافہ میں ملا کر ایک روشنائی تیار کی اور کپڑے کے ٹکڑے پر ایک محبت نامہ لکھ کر اپنی محبوبہ تک پہنچایا۔ اس کے بعد وہ اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ محبوبہ محبت نامے کا جواب دے گی لیکن وہ ایک عورت تھی۔ نرگسیت اس کی فطرت تھی۔ "چاہنے" کی بجائے وہ "چاہے جانے" کی خواہش رکھتی تھی۔ وہ اپنی جگہ مجبور تھی اور شاعر اپنی جگہ لاچار۔ یوں ان کی "پیار کہانی" نے عجیب و غریب رخ اختیار کر لیا۔ دنیا بھر کی "پیار کہانیوں" میں چاہنے والوں کے راستے میں زمانہ دیوار بنتا ہے لیکن اس کہانی میں چاہنے والے خود ہی اپنے راستے کی دیوار بن گئے۔ ان کے پیار کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ ان کا ملاپ عین ممکن تھا لیکن انہوں نے انا کے بت

کو اپنے پیار کا دشمن بنا لیا۔ وہ شب و روز ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے، ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، ایک دوسرے کی پیش رفت کا انتظار کرتے رہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ وہ مہلت ختم ہو گئی جو قدرت کی طرف سے پیار کرنے والوں کو عطا ہوتی ہے۔ ایک رات دونوں نے ایک ہی خواب دیکھا۔ ایک منادی کرنے والے نے ان سے کہا، کل کا سورج تمہارے سروں پر چمکنے والا آخری سورج ہو گا۔ اگر اس سورج کی حدت میں تمہارے پتھریلے قدم موم ہو گئے تو بچا ورنہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوریاں تمہارا مقدر ٹھہریں گی۔ اگلے روز سورج دیوتا کا رتھ اپنی سنہری گزر گاہ پر گامزن ہوا تو وہ دونوں دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں اس پل پل گزرتے وقت کو تھام لینا چاہتے تھے۔ اپنے ارادوں میں کچھ لچک پیدا کر لینا چاہتے تھے لیکن فیصلے کے بالکل قریب پہنچ کر وہ تذبذب کا شکار ہو گئے۔ اس دوران سورج دیوتا کے رتھ نے اپنا سفر مکمل کر لیا۔ اچانک نیلگوں آسمان تاریکی میں چھپ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک طوفان بلاخیز نمودار ہوا۔ ایک تند ہوا چلی اور روبینہ کو اپنے دوش پر سوار کر کے نامعلوم فاصلوں پر لے گئی۔ ایک تاریک بادل سے صاعقہ لپکی اور شاعر کو اس کے مقام پر پتھر کر گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ پتھر آج بھی سوقِ الفت کے قریب ایک ویران حویلی کی چھت پر موجود ہے اور دیکھنے والوں کو ایک برباد محبت کی کہانی

سناتا ہے۔ شاعر کا وہ مجسمہ ایک عجیب وضع کے چبوترے پر کھڑا ہے۔ یہ نگینہ جو تم اپنی انگوٹھی میں دیکھ رہے ہو اسی چبوترے کا ایک ٹکڑا ہے--------اس ٹکڑے کو معمولی مت سمجھو۔ یہ حقیقت ہے کہ اسے پہننے والے کے دل میں اپنے محبوب کی یاد ایک نہ ختم ہونے والی خوشبو کی طرح سلگتی رہتی ہے۔"

ادھیڑ عمر سپاہی کے ساتھ باتیں کرتے کرتے وہ چھاؤنی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ لبنانی کی باتیں سننے کے بعد وہ اس معمولی انگوٹھی کو نہایت غور خوض سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اچانک انہیں بے پناہ شور و غل سنائی دیا۔ چھاؤنی کے احاطے میں سپاہی فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے اور تلواریں لہرا لہرا کر اپنے غیض و غضب کا اظہار کر رہے تھے۔ بہت سے چہرے ایسے بھی تھے جن پر جوش و خروش کی بجائے مردنی چھائی ہوئی تھی۔ تابان وغیرہ کو اندازہ ہوا کہ کوئی اہم واقع رُونما ہو چکا ہے۔ وہ تیز قدموں سے چلتے چھاؤنی میں پہنچے۔ انہیں یہ خبر ملی کہ قبرص کی حکومت جس سے اہلِ صور کو بہت سی امیدیں تھیں، سکندر کی طرفدار ہو گئی ہے اور ایک سو بیس بحری جہازوں پر مشتمل قبرص کا عظیم الشان بحری بیڑا اسکندر کی حمایت میں صیدا پہنچ گیا ہے۔ یہ ایک زبردست سیاسی کروٹ تھی۔ اب

اہلِ صور بجا طور پر یہ اندیشہ کر سکتے تھے کہ علاقے کی دیگر طاقتیں بھی ان کی حمایت سے ہاتھ اٹھا لیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

صور کے ناقابلِ شکست دفاع کو توڑنے کے لیے سکندر نے زبردست حکمتِ عملی اور تندہی سے کام لیا۔ روڈز اور جوبیل سے جہاز سازی کے ماہر بلائے گئے اور انہوں نے قبرصی جہازوں پر دیوہیکل منجنیقیں نصب کر دیں۔ بڑے بڑے جہازوں پر دفاعی برج تعمیر کر دیئے گئے۔ "کریٹ" کے وہ افسران جنہیں بحری جنگوں کا وسیع تجربہ تھا مقدونیہ کے ہنرمندوں کو جنگی جہازوں پر منجنیقیں اور دیگر اسلحہ استعمال کرنے کی تربیت دینے لگے۔ مختصر عرصے میں متحدہ یونانی فوج نے محض جنگی جہاز تیار نہ کر لیے بلکہ ایسی بحری فوج منظم کر لی جو محاصرے کے سامان، رسد کے لوازمات اور منجنیقوں سے لیس تھی--------اور پھر 332ق م کے موسم گرما کا وہ قیامت خیز دن طلوع ہوا جب اہلِ صور نے اپنی مضبوط فصیلوں کے اوپر سے ایک دم بخود کر دینے والا منظر دیکھا۔ ان کے ناقابلِ شکست حصار کو زیر و زبر کرنے کے لیے ایک زبردست بحری فوج فصیل کی طرف بڑھ رہی

تھی۔ یونانیوں کے تعمیر کردہ راستے کے دونوں طرف دور تک جنگی جہازوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ ایک سیلِ بے اماں تھا جو ناممکن کو ممکن کرنے کے لیے کناروں سے اچھلا جا رہا تھا۔

یہ کوئی مختصر معرکہ نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی ایسی جنگ تھی جو ایک دو دن میں ختم ہو جاتی۔ یہ تو زور آزمائی کا خونچکاں سلسلہ تھا جو تباہی و بربادی کے سنگ سنگ طویل ہوتا چلا گیا۔ صور کے ارد گرد ہونے والی کشمکش انتہائی سنگین ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی تھی۔ دونوں طرف کے ماہرین ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ ہر حربے کا توڑ کیا جا رہا تھا اور ہر توڑ کے بعد نیا حربہ استعمال ہو رہا تھا۔ یونانیوں نے اٹھارہ فٹ گہرے سمندر کو پاٹ کر پتھریلا راستہ فصیل تک پہنچا دیا تھا لیکن اس دوران اہلِ صور فصیل کے اس حصے کو ناقابلِ گمان حد تک مستحکم کر چکے تھے۔ یہ صورتحال دیکھ کر یونانی سالاروں نے اس حصے کو نشانہ بنانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ وہ منجنیق بردار جہازوں کو فصیل کے کمزور حصوں کی طرف لے آئے اور سنگ باری شروع کر دی۔ منجنیقیں چلانے کے لیے ضروری تھا کہ جہاز لنگر انداز رہیں، لیکن صور کے غوطہ خوروں نے اس تیزی سے لنگروں کے رسے کاٹنے

شروع کر دیے کہ سنگ باری ناممکن ہو کر رہ گئی۔ یونانیوں نے رسوں کی جگہ آہنی زنجیریں استعمال کیں تو اہلِ صور نے منجنیقوں کے ذریعے ان تمام مقامات پر بھاری شہتیر پھینک دیئے جہاں یونانی جہاز لنگر انداز ہونا چاہتے تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر یونانیوں نے چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں ایسے طاقتور آلے لگا دیئے جو شہتیروں کو اٹھا کر راستہ صاف کر سکتے تھے۔ اس کشمکش کے دوران صور کے گرد گھیرا تنگ ہوتا چلا گیا۔ جن یونانی جانبازوں کو حملے کے لیے آگے بڑھنا تھا ان کے استعمال کے لیے عارضی پُل تعمیر کر دیے گئے تاکہ وہ جہازوں سے کودتے ہی فصیل پر چڑھ جائیں۔ آخر ایک روز بھرپور حملے کا آغاز ہوا۔ بھاری منجنیقوں نے زبردست سنگ باری کر کے فصیل میں جگہ جگہ رخنے ڈال دیئے اور بندگاہ کے راستوں کے قریب دو مقامات پر فصیل بری طرح متاثر ہوئی۔ اب مشینوں کی جنگ انسانوں کی جنگ میں بدل گئی۔ سینکڑوں زرہ پوش جانباز عارضی پُلوں پر پہنچے اور فصیل پر حملہ آور ہو گئے۔ "ناقابلِ شکست" کی شکست کا وقت آ گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جب فیصلہ کن مرحلہ شروع ہوا۔ تابان، ہوشمند اور روہتاس فصیل کی ایک مضبوط برجی پر موجود تھے۔ وہ تینوں مکمل جنگی لباسوں میں تھے اور لڑائی میں کودنے کے لیے قطعی تیار۔ روہتاس نے تابان کی طرف ڈبڈبائی نظروں سے دیکھا اور بولا۔

"مجھے معلوم ہے تابان! آج میں تمہیں کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ اگر ہم دونوں بچ بھی گئے تو تم مجھ سے بہت دور جا چکے ہو گے۔ میں جانتا ہوں تم آج بھی سکندر مقدونوی کے وفادار ہو۔ ایرانی ہونے کے باوجود تمہاری تلوار آج بھی سکندر کے حق میں اٹھے گی اور لڑائی کے بعد تمہاری واپسی میری طرف نہیں سکندر کی طرف ہو گی۔"

تابان نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ "سردار روہتاس! کاش میں آپ کی غلط فہمی دور کر سکتا۔ آج میں شاید آخری بار میدانِ جنگ میں قدم رکھ رہا ہوں لیکن لڑنے کے لیے نہیں۔ صرف اپنے ہدف تک پہنچنے کے لیے۔ اور میرا ہدف، آپ جانتے ہی ہیں سردار شلال ہے اس ہدف کے راستے میں جو بھی آئے گا وہ میرا دشمن ہو گا۔ میں اس سے لڑوں گا، اسے قتل کروں گا یا اس کے ہاتھوں قتل ہو جاؤں گا۔"

روہتاس کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے تابان کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ "دیوتا تمہاری حفاظت کریں۔"

"آپ کی بھی۔" تابان نے کہا۔ دونوں چند لمحوں کے لیے بغلگیر ہوئے پھر اپنے اپنے خود پہن کر تلواروں سے مسلح ہوئے اور مختلف اطراف میں بڑھ گئے۔ چند قدم اٹھانے کے بعد

تابان واپس مڑا۔ "سردار روہتاس!" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ سردار مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ تابان نے کہا۔ """سردار! میں آپ کا احسان مند ہوں۔ آپ نے مجھے جبل الشیخ کے قید خانے سے نکالنے کے لئے کئی ماہ تک اپنی جان جوکھوں میں ڈالی رکھی۔ دشمن ہونے کے باوجود آپ نے قدم قدم پر میرے لیے مصیبت جھیلی۔ میرا دل نہیں چاہتا آپ کو یوں اہلِ صور کے حق میں لڑتے دیکھوں۔"

"اس کی وجہ؟" روہتاس نے پوچھا۔

"وجہ وہی ہے جو میں پہلے بھی کئی مرتبہ آپ کو بتا چکا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اہلِ صور اس لڑائی سے تباہی و بربادی کے سوا کچھ حاصل کر سکیں گے۔ میں سکندر کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ وہ پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ اہلِ صور نے اسے مشتعل کر کے سخت غلطی کی ہے۔"

روہتاس نے بے دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کچھ بھی ہے تابان! اب تو یہ غلطی ہو چکی ہے۔ جنگ شروع ہو چکی ہے اور تم جانتے ہو ایک سچا سپاہی اس مرحلے پر پیچھے نہیں ہٹتا۔"

روہتاس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ تابان نے اسے ایک مرتبہ پھر گلے سے لگایا اور الوداع کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ ہوشمند اس کے ساتھ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قریباً یہی وقت تھا جب صور کی

ناقابلِ شکست فصیل بندرگاہ کی جانب سے اچانک گر گئی۔ اس شگاف میں سے سینکڑوں یونانی سپاہی فلک شگاف نعرے بلند کرتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان کی تلواروں میں بجلیاں اور آنکھوں میں شعلے تڑپ رہے تھے۔ اہلِ صور کی طرف سے انہیں کئی ماہ تک جان لیوا مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بے شمار جانی و مالی نقصان کے بعد آج وہ یہ حصار توڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب وہ سراپا وحشت و انتقام تھے۔ ان کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ آج وہ صور کے باشندوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے۔ تھوڑی ہی دیر ایک دوسرے مقام سے بھی فصیل ٹوٹ گئی۔ ان دونوں مقامات سے شعلہ فشاں یونانیوں کا ایک سیلِ رواں شہر میں داخل ہونے لگا۔ صور کے ہراول دستے ابھی تک اپنی طاقت کے گھمنڈ میں تھے۔ انہوں نے شدید مزاحمت کی۔ کئی مقامات پر زبردست رن پڑا۔ لمحوں میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ لیکن جلد ہی یونانی فوج کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ ہر طرف ہتھیاروں کی جھنکار تھی۔ زخمیوں کی چیخ و پکار تھی اور جوشیلے سپاہیوں کے نعرے تھے۔ اس ہنگامہ ٔ محشر میں تابان جنگجو دستوں کے درمیان سے راستہ بناتا ایک طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کی بے قرار آنکھوں کو کسی کی تلاش تھی۔ اس کے ہاتھ میں چمکتی تلوار، کسی کے خون کی طلب میں ہانپ رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ کہاں تھا؟ وہ کہاں تھا جس نے کورا اذیت ناک موت سے دوچار کیا تھا؟ جس نے اپنے انجام سے بے پرواہ ہو کر ایک کمزور عورت پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے تھے۔ گاہے گاہے یونانیوں سے تابان کا تصادم بھی ہو رہا تھا۔ وہ کسی سے پہلو بچا کر اور کسی سے ٹکرا کر آگے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس کے سر آہنی خود تھا۔ کوئی اسے پہچان نہیں سکتا تھا، یہ جان نہیں سکتا تھا کہ مقدونوی فوج کا خطرناک ترین جنگجو آج ایک اہم مقدونوی سردار کو ختم کرنے مہم پر نکلا ہے، سکندر کے ترکش کا ایک کارگر تیر آج اسی کے ایک معتمد سردار کی طرف محوِ پرواز تھا۔ تابان مار دھاڑ کرتا اب کافی آگے نکل آیا تھا۔ آخر اسے سردار شلال نظر آ گیا۔ وہ پاپیادہ تھا۔ تابان نے اسے اس کے دو سنہری پروں والے مخصوص خود سے پہچانا۔ وہ ان خاص محافظوں میں شامل تھا جو سالارِ اعظم سکندر کو چاروں طرف سے اپنے نرغے میں لیے ہوئے تھے۔ وہ سر تا پا لوہے میں غرق تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک مضبوط کمان تھی۔ وہ بڑی تیزی سے مخالف سپاہیوں پر تیر چلا رہا تھا۔ تیر اندازی کے دوران وہ گاہے گاہے اپنی کمان بلند کرتا اور ایک فلک شگاف نعرہ لگاتا۔ اس کی آواز کسی بھینسے کی کرخت اور بھاری تھی۔ اس کا سراپا دیکھ کر تابان کے سینے میں آتش فشاں کے دھماکے ہونے لگے۔ اسے لگا اگر وہ سردار شلال پر جھپٹ نہ پڑا تو اس کا جسم پھٹ جائے گا۔ سینکڑوں ٹکڑوں میں بٹ جائے گا یا پھر غضب کی شدت اسے بھاپ بنا کر اڑا دے گی۔ اس کے وجود کا ہر رگ و ریشہ تن گیا۔ ہر

ذرے میں وہ اذیت سمٹ آئی جو کورا نے اس ویران جنگل میں اس بند گھوڑا گاڑی میں برداشت کی تھی۔ وہ دیوانہ وار سردار شلال کی طرف بڑھا۔ سردار شلال اور اس کے درمیان درجنوں آہن پوش چوکنا ہو گئے۔ ان کی تلواریں تابان کو روکنے کے لیے اٹھیں لیکن وہ رکنے کے لیے نہیں بڑھا تھا۔ اس کا رکنا ممکن ہی نہیں تھا۔ شاید وہ مر بھی جاتا تو اس کی لاش اپنے پاؤں پر چل کر شلال تک پہنچ جاتی۔ اس کے راستے میں آنے والے یونانی سپاہی دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہوا میں اڑے۔ کوئی دائیں طرف گرا کوئی بائیں طرف۔ کوئی عضو بدن سے محروم ہوا کوئی روح بدن سے۔ یوں لگا ایک خونی لکیر سی یونانی دستے کے درمیان لپک گئی ہے۔ تابان نے پندرہ بیس گز کا فاصلہ طے کر لیا تو حیرت میں ڈوبے ہوئے محافظ جیسے ہوش میں آئے۔ وہ تلواریں سونت کر تابان کے مقابل ہوئے۔ وہ تابان کو روکنا چاہتے تھے۔ انہیں لگا کہ کوئی سر پھرا جنگجو ان کے سالارِ اعظم تک پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی پوری ہمت سے تابان کے آگے ڈٹ گئے لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ اس تلوار کے مقابل آنے کی غلطی کر رہے ہیں جو اپنی کاٹ میں بے مثال اور برتری میں تسلیم شدہ ہے۔ چند ہی لمحوں میں تابان نے کئی لاشیں بچھا دیں اور دیوانہ وار چیختا ہوا سردار شلال کی طرف بڑھا۔ شلال کی چھٹی حس جیسے اسے موت کی آمد سے آگاہ کر چکی تھی۔ اس نے دہشت زدہ

نگاہوں سے اپنی طرف لپکتے ہوئے تابان کو دیکھا اور یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہے اور کیوں اس کی طرف آ رہا ہے، رخ پھیر کر بھاگا۔ یہ ایک حیران کن منظر تھا۔ مقدونوی فوج کا ایک جری جنگجو سرتاپا آہن میں غرق، اور اپنے ساتھیوں میں گھرا ہوا ایک تنہا شخص سے خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھا تھا۔ معلوم نہیں اس نے فرشتہ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنی تھی یا تابان کی آمد کا منظر ہی ایسا ہیبت ناک تھا کہ وہ اپنے اعصاب پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ بھاگا تو تابان سے اس کا فاصلہ دس قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ ان لمحات میں تابان کو یوں محسوس ہوا اس میدانِ جنگ میں سردار شلال کے سوا کوئی ذی روح باقی نہیں رہا۔ ارد گرد کا ہر منظر اس کی نگاہ میں دھندلا چکا تھا۔ بس شلال تھا اور وہ دس قدم کا درمیانی فاصلہ تھا۔ اسے لگا کہ اس کے دائیں طرف چار پانچ قدم کے فاصلے پر سکندر کھڑا ہے۔ پھر اسے یہ پتہ بھی چلا کہ سکندر کا تلوار والا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا ہے۔ اس نے سکندر کی تلوار اپنے سر سے ٹکرانے اور اپنے آہنی خود کے گرنے کی آوازیں سنیں لیکن اس کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور نہ اس کی نگاہوں نے اپنا مرکز تبدیل کیا۔ وہ بلائے ناگہانی کی طرح شلال کی طرف لپک رہا تھا۔ اس کے پیچھے آوازوں کا ہجوم تھا، نیزوں کی سنسناہٹ تھی اور قریب آتے قدموں کی گونج لیکن

وہ بھاگتا چلا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شکار اور شکاری کے درمیان فاصلہ ختم ہو گیا۔ شلال کو "موت" سے دور رکھنے والے "دس قدم" طے ہو گئے۔

"رک جاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رک جاؤ۔" ایک توانا بازو تابان کے گلے میں حمائل تھا اور ایک آواز اس پر چلا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا یہ بازو سالارِ اعظم سکندر کا ہے اور پاٹ دار آواز بھی اسی کی ہے۔ وہ اسے روک رہا تھا۔ جمیعت متحدہ یونان کا سالارِ اعظم اسے روک رہا تھا لیکن تابان رکنے اور ٹھہرنے کی حد سے گزر چکا تھا۔ اس نے ایک وحشیانہ جست کے ساتھ شلال پر یلغار کی۔ اس کی وزنی تلوار شلال کی زرہ توڑتی ہوئی کمر میں پیوست ہوئی اور ناف کی طرف سے باہر نکل آئی۔ سردار شلال ایک ہیبت ناک چیخ کے ساتھ اوندھے منہ گرا اور تڑپنے لگا۔ تابان نے تلوار کھینچی تو وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں تابان پر تھیں اور پتلیوں میں دنیا جہان کا خوف سمٹا ہوا تھا۔ تابان نے دوسرا وار ان آنکھوں پر ہی کیا اور خون آلود تلوار اس موذی کے کاسہ ءسر میں دھنسادی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس وقت تک درجنوں آہنی بازو تابان کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ ان میں دو بازو سالارِ اعظم سکندر کے بھی تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

صور فتح ہو چکا تھا۔ آٹھ ہزار شہری مارے جا چکے تھے۔ قریباً تیس ہزار قید ہوئے تھے، جن میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ شہر کے کئی بازاروں کو نظرِ آتش کر دیا گیا۔ گھروں کو تاراج کر دیا گیا اور نوجوان عورتوں کو فتح کے نشے میں چُور یونانی سپاہی اٹھا کر لے گئے تھے۔ سکندر اور اس کے ساتھیوں نے ہرقل کے مندر میں قربانی کی رسم ادا کی اور فتح کا جشن منایا۔ اسی روز تابان کو "سکندرِ اعظم" کی طلبی پر اس کے خیمے میں پیش کیا گیا۔ تابان کی حیثیت ایک قیدی کی سی تھی۔ شاہی خیمے میں داخل ہوتے ہوئے تابان کو اپنے انجام کے بارے میں کسی طرح کی خوش فہمی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک غضب ناک دشمن کے خیمے میں قدم رکھ رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس دشمنی کی ابتداء اسی گھڑی ہو گئی تھی جب سکندر نے تابان اور کورا کے جانی دشمن شلال کو آزاد کیا تھا۔ نہ صرف اسے آزاد کیا تھا بلکہ ایک اعلیٰ منصب بھی بخشا تھا۔ پھر یہ جانتے ہوئے بھی شہزادی مارشا تابان کے جسم میں جان کی طرح بسی ہوئی ہے۔ سکندر نے اس کی شادی اپنے منظورِ نظر فرال روز سے طے کرا دی تھی۔ بعد میں جب فرال قتل ہوا تو اس کا الزام بھی تابان پر لگایا گیا اور سکندر کے ہرکارے ابھی تک اسے ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ اسیر شہزادی مارشا پر سکندر کی نوازشات کی خبر بھی تابان تک پہنچ چکی تھی اور اب جو رہی سہی کسر تھی وہ شلال کے قتل نے پوری کر دی تھی۔ سکندرِ

اعظم اس قتل کا چشمِ دید گواہ تھا۔ اتنے ڈھیر سارے حقائق کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں تھی کہ تابان اپنے انجام کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار ہو۔

خیمے میں داخل ہوتے ہی تابان کو حیرت کا پہلا شدید جھٹکا لگا۔ اسے اندر لانے والے تلوار بردار محافظ اسے سکندر کر روبرو چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ یہ قطعی غیر متوقع بات تھی۔ تابان اور سکندر اب خیمے میں تنہا تھے۔ سکندر اس کے ساتھ نرمی سے پیش آیا اور بیٹھنے کے لیے اپنے قریب جگہ دی۔ کل وہ اپنی آنکھوں سے شلال کے قتل کا دردناک منظر دیکھ چکا تھا، اس کے باوجود یہ سلوک حیران کن تھا۔ سکندر نے قتل کے واقعے کو زیرِ بحث لانے کی بجائے پوچھا۔

"تم اب تک کہاں تھے تابان۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمیں امید نہیں تھی کہ تم یوں ہم سے بھاگے پھرو گے۔ حالات کیسے بھی کٹھن تھے، تمہیں ہم پر اعتماد کرنا چاہیئے تھا۔ ہمارے سامنے اپنی صفائی پیش کرنی چاہیئے تھی۔۔۔۔۔۔۔"

تابان نے نگاہ اٹھا کر سکندر کی طرف دیکھا۔ سنہری بالوں والے سر کو حسبِ عادت ایک طرف جھکائے ہوئے وہ قدرے مغموم نظروں سے تابان کو دیکھ رہا تھا۔ تابان نے ایک گہری سانس بھر کر کہا۔

"سالارِ اعظم! آپ کے کچھ سردار میرے اور آپ کے راستے میں دیوار بن چکے تھے۔ انہوں نے آپ تک پہنچنے کی میری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ میں کئی مرتبہ آپ کے ملاقاتیوں کی قطار میں بیٹھ کر مایوس واپس لوٹ چکا ہوں۔"

"لیکن ہم سے ملاقات نہ ہو سکنے کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ تم سردار فرال روز اور سردار شلال کو موت گھاٹ اتار دیتے۔"

"میں نے فرال روز کو قتل نہیں کیا سالارِ اعظم۔ اور یہ بات اتنی ہی سچ ہے جتنی یہ کہ آج سورج مشرق سے نکل کر مغرب میں غروب ہوا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن بے حد معذرت کے ساتھ میں ایک سوال آپ سے بھی پوچھنا چاہتا ہوں سالارِ اعظم! آپ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ مارشا کا حصول میری زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہے آپ نے اسے کماندار فرال روز کے حوالے کر دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"کون کہتا ہے ہم نے اسے فرال راز کے حوالے کر دیا۔ ہمیں اس معمے کی مطلق کوئی خبر نہیں۔ سالار پار مینو نے ہم سے درخواست کی تھی کہ ہم یہ معاملہ ان کے سپرد کر دیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ افہام و تفہیم سے اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کریں گے اور تمہاری مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو گا۔ سالار پار مینو نے ہی ہم سے کہا تھا کہ یہ مسئلہ حل ہو گیا ہے اور تم نے شہزادی مارشا کے حق سے دستبردار ہونے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔"

"یہ سراسر غلط بیانی ہے سالارِ اعظم! مجھے توقع نہیں تھی کہ سالار پار مینو جیسا معتبر شخص ایسی حیلہ جوئی سے کام لے گا۔ مجھ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں اسوس کی جھیل والی تفریح گاہ میں تھا جب مجھے پتا چلا کہ شہزادی مارشا کو فرال روز کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک کیا جا رہا ہے۔ اس وقت تک فرال روز معبد کے محافظوں کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔" سکندر کی کشادہ پیشانی پر الجھن کی سلوٹیں نظر آنے لگیں۔ اس کی نیلگوں آسمان جیسی آنکھوں میں حیرت کی بدلیاں تیر رہی تھیں۔ تابان نے کہا۔

"سالارِ اعظم! میں آپ کی فہم و فراست پر شبہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن اتنا کہنے کی جرات کروں گا کہ میرے خلاف گھمبیر سازش کی گئی۔ سردار شلال پہلے دن سے مجھے اپنا دشمن تصور کر چکا تھا اور فرال روز اس کا دیرینہ دوست تھا۔ فرال روز نے شلال کی سزائے موت معاف کرائی اور شلال نے مجھے نیچا دکھانے کے لیے فرال کو اس بات پر تیار کیا کہ وہ شہزادی مارشا کو آپ سے اپنے لیے مانگ لے۔ یہ میری انتہائی بدقسمتی ہے کہ سالارِ اعظم اپنی بے پناہ مصروفیات کے سبب میرے خلاف ہونے والی اس سازش کے پیچ و خم پر غور نہ کر سکے اور میرے بدخواہوں نے مجھے سالارِ اعظم سے دور کر دیا۔"

سکندر نے بے قراری سے نشہ آور مشروب کا ایک گھونٹ بھرا اور بولا۔

"لیکن کچھ بھی تھا تمہیں کسی طور ہم تک پہنچنا چاہیئے تھا، اپنا مقدمہ پیش کرنا چاہیئے تھا۔"

"میں نے بہت کوشش کی تھی سالارِ اعظم، لیکن سردار شلال نے میری ایک نہیں چلنے دی۔ وہ آپ تک پہنچنے سے پہلے ہی میرا کام تمام کر دینا چاہتا تھا۔ مایوس ہو کر میں نے اپنی جنگ آپ لڑنے کا فیصلہ کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن افسوس نہ خود کو بے گناہ ثابت کر سکا اور نہ ایک بے گناہ کی جان بچا سکا۔۔۔۔۔۔۔۔"

"کون بے گناہ؟" سکندر نے پوچھا۔

تابان کے چہرے پر غم واندوہ کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

""صد افسوس کے ہر مرحلے پر آپ سے حقائق چھپائے گئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کورا کو سردار شلال نے قتل کر دیا ہے سالارِ اعظم۔ اسے ایک سازش کے تحت پہلے آپ کی حفاظت سے نکالا گیا، پھر پکڑا گیا اور ویران جنگل میں لے جا کر تاراج کر دیا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اپنے ایک زخم کے بدلے میں شلال نے اس بدقسمت کو اذیت ناک موت مار دیا سالارِ اعظم۔۔۔۔۔۔۔۔" تابان کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

سکندر نے حیرت سے کہا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ سردار شلال نے ایسا کیا ہے؟"

"سو فیصد یقین ہے سالارِ اعظم۔ یونانی فوج کا ایک ادھیڑ عمر سپاہی ان تمام واقعات کا چشم دید گواہ تھا۔ افسوس وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔۔۔۔۔۔۔" تابان نے شلال کے ساتھیوں کے ہاتھوں زخمی ہونے والے باضمیر سپاہی کی تمام روئیداد تفصیل کے ساتھ سکندر کو بتائی۔ سکندر خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے چہرے پر اندرونی کرب کے آثار تھے۔ آخر میں تابان نے آبدیدہ لہجے میں کہا۔ "سالارِ اعظم! میرے ساتھ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ میں

آپ کی عنایات کے قابل نہیں تھا۔ آپ کی مہربانیوں کی بارش میرے چہرے سے غلامی کی کالک نہ دھو سکی۔ فوج کے سرداروں نے مجھے ہمیشہ غلام سمجھا اور وہی برتاؤ کیا جو غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ میں سخت شرمندہ ہوں کہ میری کم نصیب ذات آپ کے لیے پریشانیوں اور الجھنوں کا باعث بنی۔۔۔۔۔۔۔۔ آج میں ایک قاتل کی حیثیت سے آپ کے سامنے موجود ہوں، مجھ سے کوئی رعایت نہ کیجئیے سالارِ اعظم۔ انصاف کی رُو سے میں جس سزا کا مستحق ہوں وہ مجھے دیجئیے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

سکندر یک ٹک تابان کو دیکھ رہا تھا۔ چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں کی تہہ میں جھانکنا ناممکن تھا۔

تھوڑی دیر بعد تابان کو شاہی خیمے سے رخصت کر دیا گیا۔ اس کی واپسی قیدی کی حیثیت سے نہیں ہوئی تھی۔ دو محافظوں نے احترام کے ساتھ اسے ایک آرام دہ خیمے میں پہنچا دیا تھا۔

تابان اگلے روز دوپہر تک اسی خیمے میں موجود رہا۔ دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد شاہی محافظ اسے دوبارہ سکندر کے پاس لے گئے۔ سکندر کا چہرہ آج شفاف اور روشن تھا۔ وہ تابان کے

بارے میں جیسے کسی فیصلے پر پہنچا ہوا تھا۔ مختصر تمہید کے بعد وہ اصل موضوع پر آگیا۔ اس نے کہا۔

"تابان! ہو سکتا ہے سازش کرنے والوں نے تمہارے دل میں ہماری طرف سے کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دی ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم تمہاری وفاداری کو ہر شک و شبہے سے بالا تر سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمیں یقین تھا تم ایک نا ایک دن ہم تک ضرور پہنچو گے، چاہے کسی حال میں پہنچو۔ جہاں تک شہزادی مارشا کا تعلق ہے وہ ہمارے پاس تمہاری امانت کے طور پر موجود ہے۔ ہم نے اسے اپنی تحویل میں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہونے دی۔ وہ تمہیں خود بتائے گی اسے یہاں خاص مہمان کی حیثیت حاصل تھی۔ تم جب چاہو اسے ہمارے پاس سے لے جا سکتے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ تم نے کل انصاف کی بات کہ تھی۔ ہم نے تمہارے معملات کی تفتیش کرائی ہے اور انصاف کی رُو سے تم مجرم کی بجائے مدعی ثابت ہوئے ہو۔ دیوتاؤں نے چاہا تو دو تین دن میں سب کچھ تمہارے روبرو آجائے گا اور تم سردار شلال کے جرم دار ساتھیوں کو اپنے سامنے پھانسیوں پر جھولتے دیکھو

گے۔۔۔۔۔۔۔۔ تاہم ایک بات ہم تم سے ضرور کہنا چاہتے ہیں۔ اس بات کا تعلق تمہاری اور مارشا کی سلامتی سے ہے۔ اس لیے نہ چاہنے کے باوجود ہم یہ بات کہنے پر مجبور ہیں۔"

تابان کی سوالیہ نگاہ سالارِ اعظم کی طرف اٹھی۔ خیمے کی جگمگاتی روشنی میں زرنگار مسند پر بیٹھا وہ ایک سپہ سالار سے زیادہ ایک فلسفی نظر آرہا تھا۔ کتابوں میں کھویا رہنے والا، رُوئے زمین کے تصوراتی نقشوں میں سر کھپانے والا اور نامعلوم زمینوں کے مافوق الفطرت دیوی دیوتاؤں پر پختہ یقین رکھنے والا۔ اس نے جھلملاتے شیشے میں سے سرخ مشروب کا ایک جرعہ لیا اور بولا۔

"ہم نے ہمیشہ اور ہر مقام پر عبادت گاہوں کے تقدس کو پیشِ نظر رکھا ہے تاہم کہیں جنگی ضروریات کے تحت ہمارے سپاہیوں کو ایسی جگہوں پر دھاوا بھی بولنا پڑا ہے۔ ہم اپنے ان اقدامات سے کبھی خوش نہیں ہوئے بلکہ ایسے واقعات کی یاد ہمارے دل میں ایک طرح کا اضطراب جگا دیتی ہے۔ دمشق کے معبد کا واقعہ بھی ایسے ہی معاملات میں سے ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شہزادی مارشا کو اس معبد میں مہادیوی کا درجہ دیا جا چکا تھا اور وہاں کے پجاری ابھی تک اس کوشش میں ہیں کہ شہزادی کو واپس اپنے حلقہء اثر میں لے جائیں اور مہا

دیوی کی مسند پر بٹھائیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ تم نے شہزادی کو اپنانے کی کوشش کی تو تم پر کوئی بھیانک مصیبت نازل ہو جائے گی۔ یہ مصیبت انسانوں کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے جیسے فرال روز پر آئی اور ان طاقتوں کی طرف سے بھی جنہیں ہم دیوی دیوتاؤں کے نام سے پکارتے ہیں۔"

تابان کا دل چاہا کہ وہ کھل کر کہہ دے وہ دیوی دیوتاؤں کو مانتا ہی نہیں اور اگر اس نام کی کوئی مخلوق ہے بھی تو اس کی طرف سے ٹوٹنے والا ہر قہر مارشا کے نام پر اسے ہزار جان سے قبول ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ خاموش رہا بس اتنا ہی کہہ سکا۔ "سالارِ اعظم! مجھے اس بارے میں کچھ سوچنے کی مہلت عنایت فرمائیے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

منظر صور کے عالیشان محل کا تھا۔ والئ صور کا یہ محل اب یونانی فوج کے تصرف میں تھا۔ محل کے فرش نہایت شفاف تھے۔ دیواروں پر شیشہ کاری کی گئی تھی اور منقش ستونوں سے پھولوں کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ ایک شاندار کمرے کے ادھ کھلے دریچے پر مخملی پردے لہرا رہے تھے اور ان کے درمیان سے دور نیچے سمندر کا جھاگ اڑاتا نیلگوں پانی نظر آ رہا

تھا۔ کمرے میں تابان اور مارشا آمنے سامنے کھڑے تھے۔ دو سنگی مجسموں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ تابان کے چہرے پر لودیتے جذبوں کا عکس تھا جبکہ مارشا کا چہرہ سنگِ مرمر کی طرح شفاف اور سپاٹ تھا۔ تابان کی جذبات سے رندھی ہوئی آواز ابھری۔

"شہزادی! کب تک۔۔۔۔۔۔۔۔ آخر کہاں تک۔۔۔۔۔۔۔۔ میری ہمت جواب دے رہی ہے شہزادی۔ میں آپ کے ہونٹوں سے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیے، مجھے مرنا ہے یا زندہ رہنا ہے۔ صرف ایک بار۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک بار میرے لیے اپنے لبوں کو زحمت جنبش دے دیجئیے۔"

شہزادی نے اپنی خوبصورت پلکیں جھکائیں تو جیسے فلک کی روشن ترین کہکشائیں گلابی بدلیوں میں چھپ گئی ہوں۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔ "تم بے حد سنگین غلطی کر رہے ہو۔ تمہیں معلوم نہیں تم کیا چاہ رہے ہو۔ تم اپنے لیے ایسی مصیبتوں کو دعوت دے رہے ہو جو تمہیں زندہ درگور کر دیں گی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ آتش پرست تمہیں معاف کر دے گا۔ ہر گز نہیں۔ وہ تمہیں عبرت نگاہ بنا کر چھوڑیں گے۔"

"عبرت نگاہ تو میں بن چکا ہوں شہزادی۔ اب مجھے کسی سزا کا خوف نہیں۔ نہ ہی کوئی اندیشہ میری شدتِ طلب میں کمی واقع کر سکتا ہے۔ مجھے صرف ایک بار میرے سوال کا جواب دے دیجئیے، میں اپنے دل میں کسی آس کو جگہ دے سکتا ہوں یا نہیں؟"

شہزادی نے رُخ پھیر لیا۔ اس کی روشن پیشانی پر ایک نمی سی چمکنے لگی تھی۔ وہ کراہ کر بولی۔ "ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ہم تمہارے لایعنی سوال کا کیا جواب دیں۔ کیوں ہماری پریشانیوں میں اضافہ کر رہے ہو۔ اگر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں تھوڑا بہت بھی ہمارا خیال ہے تو چلے جاؤ یہاں سے۔ ایسا کر کے نہ صرف تم اپنی زندگی محفوظ رکھ سکو گے
بلکہ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم بھی تمہارے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ احسان مند ہوں گے۔"

تابان گھٹنوں کے بل زمین پر گر گیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنس گئیں۔ لہجے میں خود بخود انتہا درجے کی عاجزی اتری اور وہ سرتاپا فریاد بن کر بولا۔ "میں چلا جاؤں گا شہزادی۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ ہی کی قسم ہمیشہ کے لیے آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤں گا لیکن اس سے پہلے اس سوال کا جواب دے دیجئیے جو برسوں سے میرے دل میں دہکتے خنجر کی طرح پیوست ہے۔ مجھے آگاہ کر دیجئیے میرے نادان دل کی گواہی سچی

ہے۔ میں نے گاہے گاہے آپ کی حسین آنکھوں میں اپنے لیے جو ایک بے نام جذبہ دیکھا ہے وہ وہم نہیں حقیقت ہے۔ صرف ایک مرتبہ اس بات کا اقرار کر لیجئیے شہزادی، پھر اپنی کم نصیبی کو گلے لگا کر میں آپ کی دنیا سے نکل جاؤں گا۔"

شہزادی کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ اس نے ایک نظر گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تابان کی طرف دیکھا۔ پھر تیز قدموں سے چلتی ہوئی دریچے پر جا کھڑی ہوئی۔ کہنی چوکھٹ پر ٹیک کر اس نے پیشانی کو اپنی مومی انگلیوں میں تھام لیا۔ "تم۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تم ہمیں پاگل کر دو گے۔ تم ہمارا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ ہم شہزادی ہو کر تم سے درخواست کرتے ہیں۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ جو بات تم چاہ رہے ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ ناممکن ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تابان کو شہزادی کے لہجے میں پہلی بار ایک معمولی سی لچک کا احساس ہوا تھا۔ اس احساس نے اس کے سینے میں حوصلے کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔ اس کی لڑکھڑاتی زبان کو ہمت نصیب ہونے لگی۔ وہ اور شدت سے اظہارِ تمنا کرنے لگا۔ اس کے الفاظ کچھ اور جاندار ہو گئے۔ ملتجی لہجے کی اثرانگیزی کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کی ہذیانی کیفیت دیکھ کر شہزادی کو چُپ سی لگ گئی۔ وہ

بدستور تابان کی طرف سے رُخ پھیرے کھڑی تھی۔ مومی شمعوں جیسی انگلیاں ایک دوسرے میں الجھ رہی تھیں۔ چہرے پر سرخی تھی۔ یہ حیا آمیز سرخی لحہ بہ لحہ گھمبیر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر اس نے بے بسی سے اپنے سر کو جنبش دی اور تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔

تابان آراستہ کمرے میں تنہا رہ گیا۔ اس کے گھٹنے گداز قالین پر ٹکے ہوئے تھے اور انکھیں اس دروازے پر مرکوز تھیں جہاں سے ابھی شہزادی خوشبو میں بسے ہوئے رنگین جھونکے کی طرح گزری تھی۔ تابان سیدھا کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹ خشک تھے اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ بحیرہ روم کی خنک ہوا دریچے کے ریشمی پردوں سے اٹھکیلیاں کرتی کمرے میں چکرا رہی تھی۔ جھاگ اڑاتے نیلگوں پانی کا شور نامراد عاشق کی سسکیوں کی طرح محل کے در و بام میں گونج رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے تابان کی نگاہ آبنوس کی ایک منقش چوکی پر پڑی۔ کتاب کی اس خوبصورت چوکی پر لکھنے کا سامان رکھا تھا۔ ایک بے نام جذبے کے تحت تابان چوکی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ خود بخود بلوری قلمدان کی طرف بڑھا اور مور کے پر والا قلم اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے مہین چرمی کاغذ پر یونانی میں لکھنا شروع کیا۔

"شہزادی! اگر میں آپ کے دل کا حال جانے بغیر چلا گیا تو میرا وجود اس بے قرار روح کی مثال ہو گا جو ہمیشہ زمین اور آسمان کے درمیان بھٹکتی رہتی ہے۔ مجھے اس عذابِ مسلسل سے نجات دلانا آپ کے اختیار میں ہے شہزادی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پرسوں صور کی فتح کا جشن منایا جا رہا ہے۔ شاہی محل میں ایک بڑی تقریب ہو گی۔ یقیناً آپ کو بھی اس بارے میں علم ہو گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ کے پاس زرد پھولوں والا ایک سفید لباس ہے۔ اگر آپ نے وہ لباس زیب تن کیا تو میں سمجھوں گا کہ میں دنیا کا خوش قسمت ترین شخص ہوں، کیونکہ ایک ایسی ہستی کے دل میں میری چاہت کا گزر ہوا ہے جو حسنِ صورت و سیرت میں حرفِ آخر ہے۔ بصورتِ دیگر میں خود کو دنیا کا بدقسمت ترین شخص تصور کرنے میں حق بجانب ہوں گا۔ تاہم دونوں صورتوں میں، میں یہ شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور آپ کی آنکھوں کو کبھی میرا چہرہ دیکھنے کی زحمت نہیں ہو گی۔"

یہ خط تحریر کرنے کے بعد تابان نے ریشم کی چھوٹی سی تھیلی میں سربمہر کیا اور شہزادی مارشا کی خادمہ خاص کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شاہی محل بقیہ نور بنا ہوا تھا۔ رنگوں اور روشنیوں کا ایک سیلاب تھا جس نے محل کے ساتھ ساتھ پورے شہر کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ سمندر میں کھڑے جنگی جہازوں کو بھی خوبصورت روشنیوں اور پرچموں سے سجایا گیا۔ شاہی محل کے ایوانِ خاص میں جیسے جھلملاتے ستاروں کے جھرمٹ اتر آئے تھے۔ زرق برق لباسوں والی حسین عورتیں، روشن چہرہ مرد اور ان کے درمیان ساغر و مینا لے کر چکراتے ہوئے انتہائی خوش پوش خدام۔ اس تقریب میں اہم ترین لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ سالارِ اعظم سکندر کی نشست پُر ہونے میں ابھی دیر تھی، تاہم مہمان مسلسل ایوانِ خاص میں داخل ہو رہے تھے۔ تابان کی منتظر نگاہیں اس دروازے پر جمی تھیں جہاں سے گاہے گاہے معزز خواتین اندر داخل ہوتی تھیں اور سبز قالین سے ڈھکے ہوئے ایک راستے پر قدم رکھتی عورتوں کی نشست گاہ میں جا بیٹھتی تھیں۔ ان میں شاہی خاندان کی عورتیں تھیں۔ سرداروں اور منصب داروں کی بیگمات تھیں اور معزز ایرانی گھرانوں کی خواتین تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین چہرہ موجود تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک روشن تارا چمک رہا تھا لیکن ان تاروں میں "چاند" کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ تابان نہیں جانتا تھا یہ چاند کب نظر آئے گا اور آئے گا تو کس رنگ میں نظر آئے گا۔ اس کی رگوں میں گردشِ خون کی شدت جان لیوا ہوتی جا رہی تھی۔ دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔ تابان کے قریب بیٹھا ہوشمند بھی بے قراری سے پہلو بدل رہا تھا۔ گزرنے والا ہر لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر اچانک وہ نظر آئی۔ ماہتاب جیسے اچھل کر بام پر آ گیا۔ ستاروں اور چراغوں کی روشنی ماند پڑ گئی۔ وہ زرد رنگ کے پھولوں والے سفید لباس میں تھی۔ تابان نے اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ اس کی محبت کا اقرار کر رہی تھی۔ یہ اعلانِ واشگاف تھا لیکن کوئی اسے سن نہیں سکتا تھا۔ تابان جانتا تھا یا وہ جانتی تھی۔ جھکی جھکی پلکوں کے ساتھ اس نے سبز قالین والے راستے پر قدم رکھا اور اپنے بدن میں ہزاروں قیامتیں سمیٹے دھیمی رفتار سے چلتی نشست گاہ میں داخل ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔۔ تابان کے دل کی گواہی سچ نکلی تھی۔ اس نے شہزادی مارشا کی آنکھوں میں محبت کا چشمہ دیکھا تھا، سراب نہیں دیکھا تھا۔ تابان کو محسوس ہوا اس کا دل دھڑکنا بھول گیا ہے اور سانس کی آمد و رفت رک گئی ہے۔ یہ شادیءمرگ کی کیفیت تھی یا یا شاید اس سے بھی آگے کی کوئی بات تھی۔ اس کی مسلسل تڑپ رنگ لا چکی تھی۔ اس کے سینے میں برسوں سے بھڑکنے والی آگ کی چنگاریاں شہزادی مارشا کے برفاب سینے میں بھی حدت جگا چکی تھیں۔ یہ زرد پھولوں والا سفید لباس اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ معلوم نہیں شہزادی کے دل میں اس محبت نے کب جنم لیا تھا اور کب پرورش پائی تھی لیکن یہ محبت

ایک اٹل حقیقت تھی۔ اب دنیا کی کوئی طاقت تابان کو مارشا کے قریب پہنچنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ وہ کیوں دور رہتا اس سے؟ وہ اس سے محبت کرتا تھا اور وہ بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ اب کس میں جرات تھی ان کے درمیان آتا۔ تابان کی آنکھوں کے سامنے ایک دھند سی چھانے لگی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سا ہونے لگا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جیسے خواب کی حالت میں چلتا ہوا وہ خواتین کی نشست گاہ کی طرف بڑھا۔ وہ یک ہزاری سردار کی وردی میں تھا۔ اس کے خوبصورتی سے ترشے ہوئے بال پیشانی پر جھول رہے تھے۔ اس کے سراپے میں مردانہ وجاہت کی متاثر کرنے والی جھلک تھی۔ اسے نشست گاہ کی طرف بڑھتے دیکھ کر ایک مؤدب خادمہ اس کے قریب چلی آئی۔ تابان نے اسے شہزادی مارشا کو بلانے کا حکم دیا۔ خادمہ نے جا کر شہزادی مارشا کے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے سراسیمہ نظروں سے تابان کی طرف دیکھا۔ اس کے ارد گرد معزز خواتین موجود تھیں۔ وہ ان کے سامنے کسی خاص ردِ عمل کا اظہار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ خادمہ کی بات سن کر وہ اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی تابان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے ہلکا سا سنگھار کر رکھا تھا۔ یہ سنگھار خوبصورت لباس کے ساتھ مل کر قیامت ڈھا رہا تھا۔ مردوزن کی نگاہیں اس کی طرف اٹھتی

تھیں تو اٹھی رہ جاتی تھیں۔ وہ جانِ محفل بھی تھی اور مرکزِ محفل بھی۔ تابان کے سامنے پہنچ کر اس کے چہرے پر شفق سی پھیلی اور پلکیں خود بخود جھک گئیں۔

"کیا بات ہے؟" وہ لہجے کو زیادہ سے زیادہ باوقار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"بہت ضروری بات ہے شہزادی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے ساتھ آیئے"

"جو کچھ بھی کہنا ہے یہاں کہہ دو۔ خو مخواہ ہمیں تماشا نہ بناؤ۔"

"بات یہاں کہنے کی نہیں شہزادی۔ کیا آپ میری یہ آخری خواہش پوری نہیں کریں گی؟"

یہی وقت تھا جب سکندرِ اعظم سرخ مخملی پردوں کے پیچھے سے نمودار ہوا اور اپنی نشست سنبھالنے کے لیے قالین پوش راستے کی جانب بڑھا۔ شرکائے محفل اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ سب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔ تابان نے اس موقعے کو غنیمت جانا اور ایک جراتِ رندانہ سے شہزادی مارشا کا بازو تھام لیا۔ شہزادی کا لمس اس کے دل میں ہزاروں طوفان برپا کر گیا۔ اس نے بے پناہ کوشش سے اپنے بکھرتے لہجے کو سمیٹا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ "آیئے شہزادی! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھ پر بھروسہ کیجئیے شہزادی۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

شہزادی کی سراسیمگی دیدنی تھی۔ اس کا وقار ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ اس نے متوحش نظروں سے دائیں بائیں دیکھا پھر تابان کے ساتھ چل دی۔ وہ مبہوت سی ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا تابان کی وارفتگی کے منظر نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر لی ہے۔ ڈھلوان پر بہنے والی آبِ جو کی طرح وہ تابان کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ تابان اسے محل سے باہر کھڑی گھوڑا گاڑیوں کے پاس لے آیا۔

وہ تیز سرگوشی میں بولی۔ "کہاں لے جا رہے ہو ہمیں؟" اس کا ہاتھ تابان کے ہاتھ کی گرفت میں مزاحمت کر رہا تھا لیکن یہ مزاحمت اتنی شدید نہیں تھی کہ ارد گرد لوگ اسے محسوس کر سکیں۔

تابان نے کہا۔ "زیادہ دور نہیں شہزادی۔ مجھ پر بھروسہ کیجئیے۔ مجھ سے آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ کیا آپ سوچ سکتی ہیں کہ میں آپ کو کوئی تکلیف دوں گا؟"

شہزادی بے چارگی کے گرداب میں تھی۔ ان دونوں کے ارد گرد کئی افراد موجود تھے۔ وہ کسی شدید ردِ عمل کرتی تو دیکھنے والے لوگ چونک جاتے۔ تابان اسے ایک آراستہ گھوڑا گاڑی کے پاس لے آیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچائی پھر گھوڑا گاڑی میں سوار ہو گئی۔ شاید اس نے

سوچا تھا سرِ عام تکرار کرنے کی بجائے وہ گھوڑا گاڑی میں تابان کو سمجھانے کی کوشش کرے گی لیکن جونہی وہ دونوں بند گھوڑا گاڑی میں داخل ہوئے۔ گاڑی بان کی نشست پر بیٹھے ہوئے ہوشمند نے ایک جھٹکے سے گھوڑے آگے بڑھا دیئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی شہر سے باہر جانے والے راستے پر اڑی جا رہی تھی اور گاری کے اندر شہزادی مارشا کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟ یہ بے وقوفی کی انتہا ہے۔ تم جانتے نہیں اس دیدہ دلیری کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ گاڑی رکواؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم کہتے ہیں گاڑی رکواؤ۔"

تابان نے عاجزی سے کہا۔ "شہزادی! آپ کو زیادہ دور نہیں لے جاؤں گا بس تھوڑی سی مہلت چاہتا ہوں آپ سے۔ پھر آپ چاہیں تو واپس آ جائیے گا۔"

شہزادی نے بے باکی سے تابان کی طرف دیکھا اور دوٹوک الفاظ میں بولی۔ "دیکھو! اگر تمہارے دل میں کوئی ایسا خیال ہے تو یہ خیال نکال دو۔ یہ ناممکن ہے۔ تمہارے لیے کیا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ مہا دیوی کی مسند پر بیٹھنے کے بعد یہ بعید از قیاس ہے کہ ہم کسی سے منسوب ہوں۔ اگر کوئی ایسا سوچے یا کرے گا تو مقدس ارواح اسے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔"

تابان نے کہا۔ "شہزادی حضور! آپ کن مقدس ارواح کی بات کر رہی ہیں۔ مقدس ارواح کا کوئی وجود نہیں۔ صرف ایک خوف ہے جو صدیوں کے دوش پر سفر کرتا آپ تک پہنچا ہے اور آپ نے اسے اپنے ذہن میں بسا لیا ہے۔ اس خوف کے حصار سے نکل آیئے شہزادی۔ آپ اب بھی ایک انسان ہیں۔ ایک انسان کی طرح اپنے ڈھنگ سے زندگی گزارنے کا پورا حق رکھتی ہیں۔ آپ جب اس حق کو استعمال کرنے کا عزم کر لیں گی تو کوئی مقدس روح کوئی بے جان مورتی اور کوئی طلسمی دیوار آپ کے راستے میں نہیں آئے گی۔"

شہزادی نے کہا۔ "تم کچھ نہیں جانتے ہو۔ تمہارا علم صفر ہے۔ دنیا میں وہی کچھ نہیں جو نظر آتا ہے۔ اس کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ وہ دیکھو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالو۔ آسمان پر طوفان کے آثار جمع ہو رہے ہیں۔ اگر تم نے اپنی حماقت سے ہاتھ نہ کھینچا تو یہ طوفان تمہارے لیے فرشتہ ءاجل کا روپ دھار لے گا۔"

تابان نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ روشن آسمان پر ایک غبار سا پھیل رہا تھا۔ اس غبار میں چمکیلے ستارے تیزی سے اوجھل ہو رہے تھے۔ شہزادی نے کہا۔ "تم یہ غبار آج دیکھ رہے ہو لیکن ہم ہر شب دیکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسا خواب جو مہادیوی بننے کے بعد ایک رات کے لیے بھی

ہماری آنکھوں سے جدا نہیں ہوا۔ ہر شب یہ غبار چاند تاروں کو نگلتا ہے۔ جب فلک پر گھٹا ٹوپ تیرگی کا راج ہو جاتا ہے تو پانچ مقدس ارواح ہم پر ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ بیک زبان ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ ہم مہادیوی ہیں اور ہمیں اپنی اس حیثیت کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کرنا۔ وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ اگر "ہمیں معبد سے دور رکھنے والے "ان ستاروں کی طرح لاتعداد اور ناقابلِ تسخیر بھی ہوئے تو مٹ جائیں گے۔"

تابان نے ایک بار پھر بے پناہ جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے شہزادی کا مرمریں ہاتھ تھام لیا۔ "یہ سب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب آپ کا وہم ہے شہزادی۔ ایسے گرد باد بحیرہ ءروم کے ساحلوں پر ہر روز نظر آتے ہیں۔ اگر یہ واقعی طوفانِ باد و باراں ہے تو اسے کسی مقدس روح نے نہیں بھیجا۔ اسے بھیجنے والی وہی قدرت ہے جو اس دنیا کا نظام چلاتی ہے۔ ستاروں کو چمک دیتی ہے، سورج طلوع کرتی ہے اور موسم بدلتی ہے۔ یہ قدرت کسی بے جان مورتی میں نہیں۔ نہ ہی گیروالباس والے عیاش پجاریوں میں ہے، نہ چرمی کاغذوں پر لکھی ہوئی کہنہ کتابوں میں۔ آپ بے فکر رہیں۔ یہ طوفان میرا یا آپ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔"

اندر یہ گفتگو ہو رہی تھی اور باہر ہوشمند گاڑی بان کی نشست پر بیٹھا چابک پر چابک چلا رہا تھا۔ گھوڑے ہوا کے دوش پر سوار تھے اور صور کے ساحل کی طرف جانے والا راستہ گاڑی کے پہیوں تلے گرد ہو رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آخر گاڑی ایک ویران مقام پر رکی۔ درختوں میں گھِرا ہوا یہ ایک کھنڈر علاقہ تھا۔ محسوس ہوتا تھا گئے زمانوں میں یہاں کوئی بستی رہی ہو گی۔ ان کھنڈرات میں ایک محل نُما عمارت بہت نمایاں تھی۔ برجیاں گر چکی تھیں، محرابی دروازے مسمار تھے تاہم بہت سے حصے ابھی تک محفوظ دکھائی دیتے تھے۔ گاڑی رکی تو تابان اور مارشا باہر نکلے۔ مارشا کا ہاتھ ابھی تک تابان کی گرفت میں تھا۔ اس نے ملائمت سے کہا۔

"شہزادی صاحبہ! بس تھوڑی سی زحمت اور۔ میں آپ کو محل کی چھت پر لے جانا چاہتا ہوں۔"

شہزادی کی آنکھوں میں سے بے بسی نمی بن کر تیر رہی تھی۔ اس نے شانوں کو ہلکی سی جنبش دی اور تابان کے ساتھ محل کے صحن کی طرف بڑھی۔ ایک دالان سے گزر کر وہ زینوں تک پہنچے۔ ہوشمند نے ایک مشعل جلا کر تابان کے ہاتھ میں تھما دی۔ تابان نے کہا۔ "ہوشمند! تم اب جا سکتے ہو۔ گھوڑا گاڑی سے ایک گھوڑا کھول لو اور مہمان خانے چلے جاؤ۔"

ہوشمند نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور تابان پر الوداعی نگاہ ڈال کر واپس چلا گیا۔ تابان اور مارشا خستہ زینوں پر احتیاط سے پاؤں رکھتے ہوئے محل نُما حویلی کی چھت پر پہنچے۔ یہاں منڈیر کے ساتھ ایک قد آدم مجسمہ نصب تھا۔ مجسمے کی دونوں کہنیاں منڈیر پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں نے ایک پیالہ سا بنا رکھا تھا اور ٹھوڑی اس پیالے میں ٹکی ہوئی تھی۔ وہ یوں جھکا ہوا تھا جیسے دور سامنے کوئی منظر دیکھ رہا ہو۔ تابان نے مشعل مجسمے کے سامنے منڈیر کے ایک رخنے میں گاڑ دی۔ مشعل کی روشنی میں مجسمے کے خدوخال نمایاں ہو گئے۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے اور آنکھوں میں پتھر کے دو آنسو منجمد ہو چکے تھے۔ شہزادی مارشا چند لمحات کے لیے اپنی گوناگوں پریشانیاں بھول کر مجسمے کو دیکھنے لگی۔۔۔۔۔۔۔۔ اب آسمان کو بادلوں کی تاریک چادر نے ڈھانپ لیا تھا اور تیز ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اس ہوا میں مشعل پھڑ پھڑا رہی تھی اور شہزادی کے دراز ریشمی بال کھل کر لہرا رہے تھے۔ تابان نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔

"یہ گمنام شاعر کا مجسمہ ہے۔ اس کی محبوبہ کا نام روبینہ تھا۔ وہ دیکھئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ سامنے نشیب میں جو تنہا برجی والا کھنڈر نظر آ رہا ہے روبینہ کا گھر تھا۔ کہاوت کے مطابق

روبینہ اور گمنام شاعر ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ ایسی محبت تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے بھی ایک دوسرے کے لیے بھی ایک دوسرے کی نگاہ سے اوجھل رہنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ پہروں اپنے اپنے گھر میں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے رہتے۔ گمنام شاعر اپنی حویلی کی چھت پر اور محبوبہ اپنے گھر کے آنگن میں۔ ان دونوں کے ملاپ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، شاید اس لیے انہوں نے جھوٹی انا کا ایک بُت تراش لیا اور شب و روز اس کی پرستش شروع کر دی۔ اپنے اپنے جذبے کی سچائی کے گھمنڈ میں وہ اس بات کے منتظر رہے کہ "دونوں گھروں" کا درمیانی فاصلہ پاٹنے میں دوسرا فریق پہل کرے۔ وہ سوچتے رہے اور وقت ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ایک دوسرے کے بالکل قریب پہنچ کر وہ لامتناہی فاصلوں پر چلے گئے۔ روبینہ کو ایک نامعلوم ہوا لے اڑی اور گمنام شاعر اپنی جگہ پتھر ہو کر رہ گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

تابان پوری تفصیل یہ کہانی سناتا رہا اور مارشا محویت سے سنتی رہی۔ تابان کی صدا لمحہ بہ لمحہ خوابناک ہوتی جا رہی تھی۔ ہوا کھنڈرات میں سسکیاں بھر رہی تھی اور چشمِ فلک سے آنسو

ٹپکنے لگے تھے۔ لگتا تھا اس "المیہ داستان کا گداز" گمنام شاعر کے منجمد اشکوں کو بھی رواں کر دے گا۔ تابان نے عجیب وجدانی انداز میں شہزادی مارشا کے شانوں پر ہاتھ رکھے اور بولا۔

"میری طرف دیکھئیے شہزادی! میری جانب نگاہ کیجئیے۔" مبہوت شہزادی نے اپنا رُخ تابان کی طرف پھیرا۔ وہ سنسنی خیز بے باکی سے بولا۔ "کیا یہ کہانی اب پھر دوہرائی جائے گی شہزادی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا وقت ہمارے ہاتھوں سے بھی نکل جائے گا؟ کیا ہم بھی اسی طرح زندگی بھر دو تنہا مجسموں کی طرح اس دنیا کے کھنڈر میں گڑے رہیں گے؟ ایسا نہ ہونے دیجئیے شہزادی، اس المیے کو رونما ہونے سے روک لیجئیے۔ سب کچھ آپ کے بس میں ہے۔ ہر امر آپ کے اختیار میں ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ دیکھئیے وقت خود کو دوہرا رہا ہے۔ صدیوں بعد آج پھر گمنام شاعر اور روبینہ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ آج بھی ان دونوں کے درمیان خود تراشیدہ بت ہے۔ آج بھی وہ اس بت کے سامنے بے بس نظر آ رہے ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ اُس وقت یہ بُت جھوٹی انا کے پتھر سے تراشا گیا تھا۔ آج وہ بے معنی خوف کے ملبے سے وجود میں آیا ہے۔ اس بت کو توڑ دیجئیے شہزادی۔ اسے توڑنا اور ریزہ ریزہ کرنا آپ کے بس میں ہے۔"

شہزادی نے مضطرب ہو کر ایک آہ کھینچی۔ "ہم پاگل ہو جائیں گے تابان۔ ہمارے اور اپنے حال پر رحم کرو۔ ہمیں جانے دو۔"

شہزادی نے پہلی بار اس کا نام پکارا تھا۔ تابان کو اپنی سماعت کی قسمت پر رشک آنے لگا۔ ان لمحوں میں اسے موت بھی آجاتی تو مطلق پرواہ نہ کرتا۔ اس نے اس عظیم کامرانی کی مسرت میں سرشار ہو کر کہا۔ "میں آپ کو کیوں جانے دوں شہزادی۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور آپ کے جسم پر یہ لباس اس بات کا گواہ ہے کہ آپ کا دل بھی میری محبت سے خالی نہیں۔ جب ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں تو ہمیں کسی اور سے کیا لینا۔ مجھے بتائیے شہزادی، مجھے اس ویرانے میں زندہ درگور کر کے آپ کس کے پاس جائیں گی۔ اور کون ہے جو آپ کو میرے جیسے دیوانگی سے چاہے گا؟"

اس لمحے تاریک فلک پر بجلیاں تڑپنے لگیں اور گھن گرج سے اطراف گونج اٹھیں۔ شہزادی نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ "ہم سے دور رہو نادان۔ زیوس دیوتا کی قسم، تم اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔ تمہارے سر پر کوندتی بجلیاں تمہیں جلا کر راکھ کر دیں گی۔"

"مجھے موت سے مت ڈرائیں شہزادی۔ اگر آپ کو چھونے کی سزا موت ہے تو میں مرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو اپنے زیوتاس دیوتا کا واسطہ۔ مجھے اجازت دیجئیے شہزادی۔ میں آپ کو اپنی بانہوں میں بھر لوں، اور مر جاؤں۔۔۔۔۔۔۔۔۔مجھے اجازت دیجئیے شہزادی۔"

تابان نے اپنے بازو شہزادی کی طرف وا کر دیئے۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹی۔ اس کا پاؤں چبوترے کے ایک شکستہ حصے پر پڑا۔ وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ ڈگمگائی۔ اس سے پہلے کہ وہ لہرا کر پختہ سیڑھیوں پر گرتی تابان تڑپ کر آگے بڑھا اور اسے بانہوں میں لے لیا۔ وہ لمحے تابان کی عذاب ناک زندگی کا حاصل تھے۔ وہ چند لمحے تھے، شاید چند لمحے بھی نہیں تھے لیکن اس مختصر عرصے پر وہ اپنی سینکڑوں زندگیاں قربان کر سکتا تھا۔ آخر یہ مختصر عرصہ بیت گیا۔ شہزادی لرز کر اس کی بانہوں سے علیحدہ ہوئی اور سخت حیرت کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے سوچ رہی ہو تابان ابھی تک زندہ کیوں ہے اس کے متحرک وجود کی جگہ راکھ کا ڈھیر کیوں نظر نہیں آرہا۔ تابان سرتاپا سوال بنا کھڑا تھا۔

"نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ سر کو شدت سے دائیں بائیں حرکت دیتے ہوئے بولی۔ "یہ ناممکن ہے۔ بہت بڑا جرم ہے۔"

"کیوں جرم ہے شہزادی۔ اگر پیار کرنا اور محبوب کی تمنا کرنا جرم ہے تو انسان پیدائشی مجرم ہے۔ کس زمانے میں اور کس نے یہ جرم نہیں کیا؟ خود کو تاریک توہمات کی زنجیروں میں مت جکڑیں شہزادی۔ ہمت کریں۔ فرسودہ عقیدوں کی "خوف نگری" سے نکل آئیں۔ میں آپ کے لیے بہت تڑپا ہوں شہزادی۔ بہت زخم سہے ہیں میں نے شہزادی۔ اب مجھ میں اور ہمت نہیں میں برداشت کی آخری حد پر کھڑا ہوں۔ اس سے آگے موت کی گہری کھائی ہے۔ مجھے اس کھائی میں گرنے سے صرف آپ بچا سکتی ہیں۔"

آخری الفاظ کہتے کہتے تابان کا گلا رندھ گیا۔ وہ لاچار سا ہو کر ایک بار پھر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ شہزادی مارشا سلگتے چہرے اور جلتی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے لگا کہ اس کی یاقوتی آنکھوں میں کوئی روشنی جاگی ہے لیکن اگلے ہی لمحے یہ روشنی بجھ گئی۔ اس نے سر کو بے قراری سے دائیں بائیں حرکت دی۔

"نہیں۔۔۔۔۔۔۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔۔۔ ہمیں جانا ہو گا۔"

وہ تیزی سے مڑی اور گھوڑا گاڑی کی طرف بھاگتی چلی گئی۔ اس کی عنبریں زلفیں چند ساعتوں کے لیے تابان کی نگاہوں میں لہرائیں پھر انہیں تابان نے ڈھانپ لیا۔ وہ اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہ گیا۔ اس کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں اور رخساروں پر نمی پھیلی جا رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ شہزادی کا بے قرار ہیولا گاڑی تک پہنچا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ گاڑی بان کی مخصوص نشست پر نمودار ہوئی۔ پھر اس نے چابک لہرا کر گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

تابان کا جسم روح سے خالی ہو چکا تھا۔ یوں لگ رہا تھا گمنام شاعر کے مجسمے کے قریب ایک اور شکست خوردہ مجسمہ وجود میں آ چکا ہے۔ نہ جانے وہ کتنی دیر یونہی سکتے کی حالت میں بیٹھا رہا۔ یہ کیفیت زندگی سے دور اور موت کے قریب تھی۔ اچانک اس کی چھٹی حس چلا اٹھی۔ اس کی صداشناس سماعت نے گواہی دی کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں سے روانہ ہونے والی گھوڑا گاڑی آگے جا کر ٹھہر گئی ہے۔ اس کی تمام حسیات سمٹ کر سماعت میں مرکوز ہو گئیں۔ وہ ہوا کے دوش پر صدا کا مدھم ارتعاش سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ گاڑی رک چکی تھی۔ وہ کیوں رُک گئی تھی؟ کیا اس حسین "گاڑی بان" کو اس پر رحم آ گیا تھا۔ یا وہ یکتائے

زمانہ اس کی طرف لوٹ رہی تھی۔ کیا کائنات کا لق ودق کھنڈر پھر آباد ہونے والا تھا؟ وہ سر تاپا سماعت بن گیا۔ لمحے صدیوں پر بھاری تھے، ساعتیں پہاڑوں سے بوجھل تھیں۔ معلوم نہیں کتنی صدیاں اس کی جان سولی پر لٹکی رہی۔ نہ جانے کتنے کوہِ گراں اسے روندتے ہوئے نکل گئے۔۔۔۔۔۔۔ ایک طویل خاموشی کے بعد، آخر تابان کو پھر ٹاپوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ بلاشبہ یہ اس کے لیے رُوئے زمین کی حسین ترین آواز تھی۔ یہ ایک ایسا نغمہ تھا جس کی شیرینی اور لطافت کو احاطہء الفاظ میں لانا ناممکن تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گھوڑا گاڑی واپس لوٹ رہی تھی اس دفعہ گھوڑوں کی ٹاپوں میں کوہی ندی تھی، ہموار آبِ جو کی نرم روی تھی۔ وہ واپس لوٹ رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ جو کسی کو دکھ نہیں دیتی تھی، جس کی آنکھیں پرائے غموں پر بھی بھر آتی تھیں، جو سر تاپا کرم وعنایت تھی۔ وہ اپنے دیوانے کی طرف واپس آرہی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپیں قریب آتی چلی گئیں۔ پھر تابان نے گھوڑا گاڑی کو تاریکی سے نمودار ہوتے دیکھا۔ کن خوش بخت آنکھوں نے ایسا دل پسند منظر دیکھا ہوگا۔ گھوڑے آہستگی سے چلتے محل نُما حویلی کے شکستہ دروازے پر آن رکے۔ ایک بار زور سے بجلی چمکی۔ تابان نے دیکھا زرد پھولوں سے سجے ہوئے سفید لباس والی، راسیں تھامے گاڑی بان کی نشست پر بیٹھی تھی۔ اس کے دراز گیسو شوریدہ سر ہواؤں میں مچل رہے تھے۔ اس نے

سر گھٹنوں میں چھپا رکھا تھا۔ تابان نے اس کی آوازیں نہیں سنیں لیکن وہ جانتا تھا وہ رو رہی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مشعل تھام کر گاڑی کی طرف لپکتا چلا گیا۔ اسی دوران آسمان سے تابڑ توڑ پانی برسنے لگا۔ تابان اور مارشا بند گھوڑا گاڑی کے اندر داخل ہوئے تو اچانک طوفانِ باد وباراں عروج پر پہنچ گیا۔ گہرے سیاہ بادلوں نے آسمان کو اور پانی کی دبیز چادر نے گھوڑا گاڑی کو ڈھانپ لیا۔ برق ایک بار زور سے کوندی اور دو چاہنے والوں کی خلوت میں جھانکنے کی ناکام کوشش کر کے بلندیوں کی طرف لوٹ گئی۔۔۔۔۔۔۔۔ تابان کی بے قرار بانہوں نے مارشا کو سینے میں جذب کر لیا۔ وہ کسمسائی اور پھر خود سپردگی کی کیفیت میں کھو گئی۔ اس کی زلفوں نے تابان کا چہرہ ڈھانپ لیا۔ تابان نے سمندر ہونٹوں کو سامنے دیکھا تو اپنے ہونٹوں پر صدیوں کی پیاس سجالی۔ پھر وہ ایک ریشمی دھند میں کھوتے چلے گئے۔۔۔۔۔۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اس شب کا ذکر ہے مفتوحہ شہر صور کے شاہی مہمان خانے میں اونگھتے ہوئے ہوشمند کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ اس نے شمعدان کے قریب رکھی ریت گھڑی کی طرف دیکھا۔ یہ رات کا تیسرا پہر تھا۔ کھڑکیوں سے باہر طوفانِ باد وباراں کا زور تھا۔ کسی قریبی کمرے میں دو یونانی

کماندار، نزدیکی شہر غزہ اور اس کے دفاع کے بارے میں عسکری نوعیت کی بحث میں مصروف تھے۔ ہوشمند کو ان معاملات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ کل وہ اور تابان سکندری فوج کو خیر باد کہنے کا حتمی فیصلہ کر چکے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔ دفعتاً ہوشمند کی نگاہ ایک چیز پر جم کر رہ گئی۔ یہ ایک انگوٹھی تھی جو ہاتھی دانت کی بنی ہوئی تھی۔ یہ تابان کی انگوٹھی تھی۔ وہ شام کو تقریب پر روانہ ہوتے وقت اس انگوٹھی کو پہننا بھول گیا تھا۔ ہوشمند نے شمعدان اٹھایا اور تپائی کے سامنے سے دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا انگوٹھی میں جڑے ہوئے نارنجی پتھر کا رنگ تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ ششدر رہ گیا۔ اسے خانہ بدوش رقاصہ کی بات یاد آئی۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس پتھر کا رنگ اس وقت تک نارنجی رہے گا جب تک انگوٹھی پہننے والے کو اپنے محبوب کا وصل نصیب نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔ اور نارنجی رنگ تبدیل ہو چکا تھا۔ ہوشمند حیرت سے اس عجیب و غریب پتھر کو دیکھتا چلا گیا۔ ایسے میں اس کے کانوں میں لبنانی رقاصہ کا گیت گونجنے لگا۔ اس کی صدا ہوا کے دوش پر سفر کرتی ہوشمند کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

میں قسم کھاتی ہوں بہاروں کی
اور رُوئے زمین کے سب خوبصورت نظاروں کی
اور ہر اس چیز کی جس کی دید
جھلسے سینوں میں ٹھنڈک اتارتی ہے
کہ جس آنکھ میں انتظار مرتا نہیں
اس آنکھ میں محبوب اترتا ہے
اس آنکھ میں محبوب اترتا ہے

ختم شد

ختم شُد